
نقوش
پطرس نمبر
INK

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

پطرس نمبر

۷۵، ۷۶، ۷۷

ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء

مرتب

محمد طفیل

سالانہ چندہ
بیس روپے

فی پرچہ
سات روپے

ادارۂ فروغ اردو — لاہور

افسانے، ڈرامے، ناولٹ

مزاحیہ مضامین

فنی مضامین

تنقیدی مضامین

نیازمندان لاہور کا سلسلہ

ادبِ لطیف

دیباچے

فہرس

سفرنامے

بچّوں اور عورتوں کے لیے

خطوط

پطرس کے مضامین
(مکمّل کتاب)

تقاریر

پیغامات

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا۔



اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

لاہور ۲۰ جنوری ۵۸ء

احمد شاہ بخاری

AHMED BOKHARI

DAG HAMMARSKJOLD

I first met Ahmed Bokhari soon after taking over my functions as Secretary-General. He was then Head of the Pakistan Delegation to the United Nations, famous for his wit and eloquence, but also respected as an extremely effective spokesman for his country. Our first discussion added something essential but not quite unexpected to his profile as it was known to the outside world. I remember how on that occasion he demonstrated his interest in the English metaphysical poets rather than in the more worldly affairs of the United Nations.

A year or so later, when I was looking for a senior representative in the Secretariat for the Islamic world, my thoughts naturally turned to Bokhari. I was happy to see him willing to join our staff. His first strictly personal assignment was a somewhat unexpected one. In January 1955 he accompanied me to Peking, where I had to negotiate about the release of a group of United States fliers. He was, of course, a wise and subtle counsellor but, outside the professional duties, he derived great satisfaction from this first contact with East-Asian civilization with its parallels to the West-Asian culture in which he was steeped.

On later trips to the Middle East I had, a couple of times, the privilege of his guidance. It was especially on those trips that I got to appreciate how deeply the experiences of his youth, and in particular the traditions of his family, had influenced his personality. As all his friends know, he combined great natural warmth and simplicity with considerable shyness. Back of this blend of qualities was a profoundly aristocratic attitude. There was much natural pride reflected also in such an ironical statement of his, as this one which he made to me a couple of times : " I was brought up camelback".

I have stressed here his attachment to his own background. Others will undoubtedly write about his learning and his deep insight in Western traditions. He was, indeed, a master of the English language as of the languages of his own region, and he was a critic of Western literature of an unusual *esprit de finesse*.

It may be natural for me to sum up what I have said about the qualities of Ahmed Bokhari in a word about how those qualities were reflected in his work as a diplomat. I can do that by a quotation from Jacques Barzun, who says in his recent book "The House of Intellect":

"Diplomacy . . . requires an awareness of others' minds which is one of the chief attributes of the prose writer, second only to his capacity for meeting argument with finesse and clear reason. A self-centered diplomat, an incoherent diplomat, are contradictions in terms".

Ahmed Bokhari was, indeed, a diplomat meeting the requirements which this quotation sets out.

25 June, 1959

احمد بخاری

ہیمر شولڈ (سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ)

احمد بخاری سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب مجھے سیکوٹری جنرل کا عہدہ سنبھالے کوئی زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ اس وقت وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس تھے اور اپنی حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی کی بدولت عظیم شہرت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ملک کے بدرجہ غایت موثر اور باوقار ترجمان ہونے کے اعتبار سے بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہماری پہلی گفتگو نے ان جذبات و احساسات میں کسی قدر اضافہ ضرور کیا۔ لیکن یہ اضافہ ان کی اس خیالی تصویر سے چنداں مختلف نہ تھا جس کے لئے وہ باہر کی دنیا میں معروف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس موقعہ پر انہوں نے اقوام متحدہ کے عالمی مسائل سے زیادہ انگریزی زبان کے ماورائی شعرا کے بارے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

کم و بیش ایک سال کے بعد جب مجھے اس ادارے کے لئے عالم اسلام کے ایک اعلیٰ نمائندے کی جستجو ہوئی تو قدرتی طور پر میرا ذہن بخاری کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے یہ معلوم کر کے مزید مسرت ہوئی کہ وہ ہمارے عملے میں شرکت کے لئے رضامند ہیں۔ یوں پہلے پہل ان کی خود سپردگی کسی قدر اچنبے کی بات تھی۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں وہ میرے ہمراہ پیکنگ گئے جہاں مجھے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہوا بازوں کی ایک جماعت کو رہا کرانے کے لئے بات چیت کرنی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ وہ بڑے ہوشمند اور زیرک مشیر تھے۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ جس بات پر انہیں زیادہ تسکین حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ انہیں مشرق ایشیا کی تہذیب سے رابطہ پیدا کرنے کا اولین موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ تہذیب مغربی ایشیا کی ثقافت کے متوازی اوصاف رکھتی تھی کہ جس رنگ میں وہ خود رنگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے دوروں میں مجھے چند موقعوں پر ان کی رہنمائی سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ انہی سفروں کے دوران، میں نے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا کر یہ محسوس کیا کہ انکی شخصیت پر انکے عہد شباب کے تجربوں اور خاص کر انکی خاندانی روایات کی کتنی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تمام رفقاء اور احباب جانتے ہیں کہ انکی قدرتی گرم جوشی اور سادگی میں حیاداری کس قدر رچی بسی ہوئی تھی۔ ان مرکب اوصاف کے پیچھے ان کے عمیق شریفانہ اطوار کار فرما تھے۔ دراصل وہ ایک احساس فخر بھی رکھتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے میرے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دو موقعوں پر کیا۔ ان میں سے ایک ان طنزیہ الفاظ سے بھی مترشح ہے کہ ”میری پرورش و تربیت اونٹ کے کوہان پر ہوئی،،

میں نے اس جگہ روایات کے اس پس منظر پر خاص زور دیا ہے جس سے انہیں واقعی دل بستگی تھی۔ دوسرے اصحاب بلا شبہ انکی علمی فضیلت اور مغربی اقدار پر انکی بصیرت کا ذکر کریں گے۔ فی الواقعہ انہیں انگریزی زبان اور اپنے علاقے کی زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی اور وہ غیر معمولی طور پر مغربی ادب کے بھی بلند پایہ نقاد تھے۔

قدرتی طور پر میرے لئے لازم ہے کہ احمد بخاری کے اوصاف و کمال کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے اسے چند لفظوں میں سمیٹ کر یہ بیان کروں کہ ان کی یہ خصوصیات ایک سیاسی سفیر کی حیثیت میں کس طرح ظاہر ہوتیں اور اپنا اثر ڈالتی تھیں۔ یہ کام میں جیقس برزون (Jacques Barzun) کی تازہ تصنیف دی ہاؤس آف انٹی لیکٹ کا ایک اقتباس پیش کر کے بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”حکمت عملی (سفارت) کا تقاضہ ہے کہ دوسروں کے افکار و اذہان سے آگاہی حاصل ہو یہ انشا پرداز کا بھی ایک امتیازی وصف ہے مگر اس سے دوسرے درجے پر کہ وہ دوسروں کے دلائل کا جواب کس ہوشمندی اور واضح استدلال کے ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک ’حاضر دماغ‘ سفیر اور ایک ’پریشان خیال‘ سفیر اصطلاح میں ایک دوسرے کی ضد ہیں،،

احمد بخاری حقیقت میں ان اوصاف پر پورے اترنے والے سفیر تھے جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔

۲۵ جون ۱۹۵۹ء

طلوع

محمد طفیل

خبر آئی ۔ بخاری صاحب کا انتقال ہوگیا۔ جی ڈوب سا گیا۔ ذہن ماضی کی طرف پلٹا۔ کوئی مجھ سے مخاطب تھا:۔

مشفقی و مکرّمی، سلام مسنون!

ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے لاہور ضرور آؤں گا۔ اور منجملہ اور احباب کے آپ سے بھی تجدیدِ نیاز کروں گا۔ لیکن افسوس کہ بوجوہ یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ آج شام واپس یورپ جا رہا ہوں۔ اور وہاں سے امریکہ، انشاءاللہ!

آپ کے کرم اور بخشش سے آپ کا رسالہ اکثر مل جایا کرتا تھا۔ اور امید ہے کہ آپ کا یہ فیض اب بھی جاری رہے گا۔ البتہ میرا پتہ اب پاکستان مشن نیویارک نہیں بلکہ یونائیٹڈ نیشنز نیویارک ہے۔ سب سے بہتر تو یہ ہو کہ آپ مجھے معرفت مرکزِ اطلاعات اقوامِ متحدہ کراچی کے پتے سے بھجوا دیا کریں۔ محصول میں بھی بچت رہے گی۔ کراچی کا مرکزِ اطلاعات آگے بھیجنے کا خود ہی انتظام کردے گا۔

آپ کی مہربانیوں کا بے حد شکریہ اور کیا عرض کروں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

خاکسار

احمد شاہ بخاری

میرے نام بخاری صاحب کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اچانک چلا آیا تھا۔

معاً ذہن پھرکی کی طرح گھومنے لگا ——— بڑے آدمی کا انتقال ——— بڑے ادیب کا انتقال ——— بڑے عالم کا انتقال۔ بڑے مفکّر کا انتقال ——— بڑے مخلص کا انتقال ——— بڑے جیالے کا انتقال۔

"شیطان" نے بہکایا ——— اٹھو اور خراجِ عقیدت پیش کرو۔ پطرس نمبر نکالو۔

فوراً ذہن نے تردید کردی۔ یہ کام نہ کرنا۔ لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔ جتنے ذہن اتنے نتیجے۔ کوئی کہے گا اچھا کام کیا۔ کوئی

ئے گا۔ یہ تو اسی دن کے انتظار میں تھا۔

بالآخر دل و دماغ نے یہ فیصلہ کیا — اگر تجھے پطرس سے عقیدت ہی ہے تو چپکے سے رو لے اور بس۔

یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ بخاری صاحب کا دوسرا خط میرے سامنے آیا۔ خط کیا خود پطرس نے مجھ سے باتیں کیں :۔

مشفقی و مکرمی۔ سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ۔ پڑھتا گیا خوش ہوتا گیا۔ مگر خط کی آخری تین چار سطریں میرے لیے بہت بڑا سوالیہ نشان بن گئیں۔ ہاں کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ میری تحریر کی کسی جنبش سے اگر آپ کی دلآزاری ہوئی تو مجھے کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔ انکار کرتا ہوں تو نہ یہ خوش مذاقی کی ذیل میں آتا ہے اور نہ شرافت کی ذیل میں۔ اگر آپ دل کو کڑا کریں اور میں جو کچھ آپ کی کتاب پر لکھ دوں اُسے قبول کر لیں تو بیشک پروف بھیجدیں۔ میں بخوشی مقدمہ لکھ دوں گا۔

ویسے مقدمہ نویسی میرے لیے ہمیشہ آزمائش کا وقت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح عورت بچہ جننے سے۔ مگر کبھی احباب کے کام سے متاثر ہو کر مقدمہ لکھا۔ کبھی احباب کی دوستی کے ڈر سے۔ آپ کس خانے میں جائیں گے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا ویسے میں نے آپ کے دو تین مضمون اس سے پہلے پڑھے ہیں۔ اس لیے جرأت کر کے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ بدمزہ نہ ہوں۔

میرا یہاں قیام دس پندرہ روز کا ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو۔ پروف بھیج دیجئے۔ ورنہ پھر فرصت کے دن نصیب نہ ہوں گے۔

لاہور کے احباب کو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

جس دن بخاری صاحب کا یہ خط ملا تھا۔ دل ناچ اٹھا تھا۔ اترا اترا کے میں نے یہ خط، اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا۔ مسرتوں کی برات کے ساتھ، جلدی جلدی "صاحب" کے پروف تیار کر ڈالے۔ رجسٹری کر کے بھجوائے۔ مگر پروف بھیجنے کے دوسرے دن بخاری صاحب کا ایک اور خط ملا۔ جو بڑا مختصر تھا۔ لکھا تھا :۔

مشفقی و مکرّمی، سلام مسنون

آپ کے پروف اب تک نہ ملے۔ مگر میرے جانے کا وقت آگیا۔ میں آج ہی ایک لمبے دورے پر جا رہا ہوں۔ نہ جانے امریکہ کب پہنچوں۔

مجھے اس کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کی کتاب پر کچھ نہ لکھ سکا۔

خاکسار

بخاری

یہ تینوں خط میرے ذہن پر بھر سوار ہو گئے۔ سوار ہوتے چلے گئے۔
پطرس سے میرا کوئی یارانہ نہ تھا۔ کبھی خط و کتابت نہ تھی۔ رتبہ ایک نہ تھا۔ ایک عالم فاضل، دوسرا جاہل مطلق، ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک، ایک کنویں کا مینڈک، کوئی خوبی، کوئی خرابی، میری ایسی نہ تھی جو پطرس کے دل میں جگہ بناتی۔
خیالات امڈتے رہے۔ کئی پلٹے کھائے ـــ پطرس نے کیوں خط لکھنے میں پہل کی تھی۔ کیوں میری باتیں مانی تھیں۔ یہ جتنا سوچتا، اتنی ہی پطرس کی عظمت میرے دل میں بڑھتی۔
پطرس کی عظمت کے چکر ہی میں گم تھا کہ ایک بار ذہن پھر پٹڑی سے اترا۔
سنو میاں! لوگوں کی پروا نہ کرو۔ پطرس نمبر ضرور چھاپو۔ یوں ڈرتے رہے تو زندگی بھر سلیقے کا کام نہ کر سکو گے۔
خیالات میں تصادم رہا۔ کبھی یوں۔ کبھی ڈوں۔
بالآخر جی کڑا کر کے، کچھ نیم دلی کے ساتھ، میں نے پطرس کے دوستوں کی فہرست بنائی۔ خط و کتابت کی۔ اس سلسلے میں میری جتنی مراسلت ہوئی۔ وہ سب یہاں درج کرتا ہوں۔ سوائے ان باتوں کے جو ذاتی ہیں اور اخفا کی ہیں۔ میرے خطوں کا مضمون یہ تھا۔ پطرس پر لکھیے اور ہمیں بتائیے کہ وہ بہ حیثیت انسان کیسے تھے اور بہ حیثیت ادیب کیا مقام رکھتے تھے۔
بڑے بڑے ادیبوں کے، میرے نام ہزاروں خط آئے ہوں گے۔ جن میں سے کچھ ضائع ہو گئے۔ کچھ کو دیمک چاٹ گئی۔ کچھ ہیں۔ مگر مجھے ان کی اشاعت کا کبھی خیال نہ آیا۔ ان خطوں کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے پطرس کی شخصیت نکھرا اور نکھرے گی ـــ اور پھر معلومات!
یہ خط بلا تبصرے کے بغیر ہی ملاحظہ فرمائیں۔ میرے لیے ابھی اس نمبر کی ترتیب و تدوین کا بہت سا کام باقی ہے۔ ذرا اسے سمیٹ لوں اگر کہیں لقمے کی ضرورت پڑی تو کچھ عرض کر دوں گا۔ ورنہ ضرورت ہی کیا۔

مکرمی طفیل صاحب۔ تسلیم

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بخاری مرحوم کے چند خطوط ارسالِ خدمت ہیں۔ میرے نام اُن کے اکثر خطوط ایسے ہیں جنھیں بہت زیادہ ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے متابلتہً زیادہ دلچسپ اور مجھے زیادہ عزیز وہ خطوط ہیں جو مجھ میں اُن میں کوئی کشیدگی پیدا ہو جانے کے بعد اُنھوں نے مجھے لکھے۔ لیکن اُن میں بعض دوسرے دوستوں کا تذکرہ اور اُن کے طرزِ عمل پر بے تکلفانہ اس قسم کی رائے زنی ہے جسے کسی رسالے میں چھپا ہوا دیکھنا شاید انھیں مرغوب نہ ہو۔ اس لیے انھیں شائع کرنے کے لیے دینا مجھے قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ پھر کئی خطوط میں جا بجا اس قسم کے حوالے اور اشارے ہیں۔ کہ جب تک اُن کی مکمل تشریح نہ کی جائے کسی کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا۔ اور اُن حوالوں اور اشاروں کی تشریح لکھنا آسان کام نہیں۔ اس لیے تعمیلِ ارشاد میں چند ایسے خط بھیجنے کے سوا چارہ نہیں۔ جو مکمل کے مکمل یا بہت تھوڑی سی قطع و برید کے بعد عام دلچسپی کے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے خطوط میں نے زیادہ احتیاط سے نہ رکھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جو اس وقت مل گئے۔ ارسالِ خدمت ہیں۔

ان خطوط کے ساتھ چند ایسے مضامین بھی بھیج رہا ہوں۔ جو ادبی رسائل پڑھنے والوں کی نظر سے شاید نہ گزرے ہوں۔ اس قسم کے کئی مضامین یوں لکھے گئے تھے کہ بخاری صاحب حسبِ معمول مجھے اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانے کے لیے آئے۔ دیکھا کہ اخبار کا کاتب انتظار میں بیٹھا ہے۔ اور میں اُس کے لیے مضمون لکھنے کے تردد میں دفتر سے نہیں اُٹھا۔ میری امداد کے لیے سمجھیے یا جلد از جلد اپنے ساتھ لے چلنے کے خیال سے انھوں نے مجھے تیار ہونے کے لیے گھر میں بھیج دیا۔ اور میری بجائے خود مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ میں شیو غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اور کپڑے بدل کر واپس آیا تو تیار مضمون میرے حوالے کر دیا۔ ایسے مضامین جو قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور ایک ایسے مضامین ہی کیا۔ جو مضمون بھی لکھنے بیٹھ جاتے۔ اُسے عموماً ایک ہی نشست میں ختم کر کے اُٹھتے تھے۔ عبارت کاٹتے چھانٹتے بھی نہ تھے۔ البتہ لکھنے کے بعد مضمون پڑھوا کر سنتے ضرور تھے۔ اُس میں کہیں کوئی لفظ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو کبھی نہ بھولتے۔ مضمون سننے کے بعد وہ لفظ بدل دیتے۔ مگر ایسی تبدیلیاں اتنی کم ہوتی تھیں کہ مسودہ نقل کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی تھی۔

تہذیبِ نسواں اور پھول میں نہ جانے اُن کے کتنے مضامین اسی طور چھپ گئے۔ بعض "پطرس" کے نام سے مضمون زیادہ خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ تو کسی اور فرضی نام سے۔ "رونا رلانا" اسی قسم کے مضامین میں سے ایک ہے۔ نظم "دلّی کی سیر" انھوں نے پھول کے کسی سالگرہ نمبر کے لیے لکھی تھی۔ اخبار میں نظموں کی کمی تھی۔ انھیں اسی قسم کی کوئی انگریزی نظم یاد آئی۔ اُسے ذہن میں رکھ کر ذرا سی دیر میں یہ نظم کہہ ڈالی تھی۔

"کاغذی روپے" کا مضمون بچوں کے لیے اقتصادیات کی ایک کتاب کا باب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مجھے بتائے بغیر دارالاشاعت پنجاب لاہور کو عنایت فرمانے کے لیے لکھنی شروع کی تھی۔ ایک روز اس کے دو تین باب لے کر میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے ارادہ تھا کہ کتاب ختم کر کے چھاپنے کے لیے تمھیں دوں گا۔ مگر بعض دوسری اہم مصروفیتیں نظر آتی ہیں۔ نہ معلوم ان سے کب فراغت ہو۔ اور جب فراغت ہو تو کتاب ختم کرنے کا جوش باقی رہے یا نہ رہے۔ یہ چند باب GETTING OUR LIVING کو سامنے رکھ کر ازسرِنو لکھے گئے ہیں۔ کتاب اب خود مکمل کر لو۔ یہ کتاب میں اب تک مکمل نہیں کر سکا۔ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اسے مکمل کرنے کی ضرورت اب تک محسوس نہیں ہوئی۔ اب پہلی فرصت میں اسے مکمل کر ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے دارالاشاعت پنجاب کے اکثر مشاغل میں وہ مخلصانہ ہمدردی کے ساتھ میرے شریک رہتے تھے۔ ایک بار مجھے تہذیبِ نسواں۔ پھول اور دارالاشاعت پنجاب کی مطبوعات کے پوسٹر تیار کرتے دیکھا۔ تو اگلے روز خود تین پوسٹروں کا مضمون تیار کر کے لے آئے۔ اُن کی عبارت بھی ارسالِ خدمت ہے۔ شاید آپ کے قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہو۔ مثلاً — "عورتوں اور بچوں کے لیے

مردوں اور عورتوں کے لیے

بوڑھوں اور بچوں کے لیے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سب کے لیے

بہترین کتابوں کا ذخیرہ
دار الاشاعت پنجاب لاہور
۱۹۵۔ ریلوے روڈ لاہور
تصنیف را۔ تو خیر۔ مصنف نیکو کند بیاں
ظاہری نفاست کے ہم ذمہ دار ہیں
اور باقی چیزیں خود "بوید"

باقی بخاری پر مضمون لکھنے کے لیے طبیعت فی الحال کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ اُن کے میرے تعلقات ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئے تھے۔ اس وقت وہ نئے نئے پشاور سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تھے۔ اُس زمانے میں اُن کی شخصیت کی رعنائی بقولِ بیدا مرحوم کے اُن کی "بادبیت" سے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۹۳۵ء تک بہت کم دن ایسے گزرے ہونگے۔ کہ وہ اور میں لاہور میں ہوں اور ہم نے سہ پہر سے رات تک کا وقت اکٹھے نہ گزارا ہو۔ البتہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں دہلی چلے گئے تو تعلقات کی صورت کچھ اور بن گئی لیکن تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا زمانہ جو لاہور میں اکٹھا گزرا۔ اُس کی پوری داستان بیان کرنا کچھ آسان نہیں گھومنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ دلچسپیاں۔ تفریحیں۔ ملاقاتیں سب کچھ تھا مختلف مشاغل کے دور آئے اور گزر گئے۔ کئی جنون سر پر سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ وقت اور واقعات نے عجیب عجیب تماشے دکھلائے۔ اتنے لمبے ساتھ میں سے چند باتیں چن کر لکھنا دوستی کی داستان سے بے انصافی معلوم ہوتی ہے۔ سوچتا بھی ہوں تو خیال ساتھ نہیں دیتا۔ کچھ سوجھتا ہے تو لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ دل البتہ یہ ضرور کہتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ اپنے اور بخاری کے تعلقات پر کچھ لکھنے بیٹھوں گا تو بھولے بسرے واقعات آپ سے آپ زندہ ہو کر سامنے آجائیں گے۔ اُن محفلوں اور صحبتوں کی دھندلی سی تصویر کھینچ سکوں گا۔ جن کی جان بخاری تھے اور تناسب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرحوم کی سیرۃ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا دشوار کام اس حد تک سرانجام دے لوں گا۔ کہ جو لوگ اُنھیں نہ جانتے تھے انھیں عہدِ حاضر کی اس عدیم المثال شخصیت کی دلکشی اور رعنائی اور طباعی کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو جائے گا۔

خاکسار سید امتیاز علی تاج
(سید امتیاز علی تاج)

ہیگ۔ ۱۵ر جون ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کی ذہنی پرواز مجھ جیسے "زمین پیماؤں" کی نظروں سے بہت بلند تھی۔ میں اس موضوع پر کچھ کہنے کا اہل نہیں لیکن تعمیلِ ارشاد میں چند سطریں گذارشِ خدمت ہیں۔ ممکن ہے آپ انھیں قابلِ التفات پائیں۔

بخاری کے خط تو میرے نام بہت سے آئے خصوصاً اس زمانہ میں جب وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ تھے لیکن میں جواب دینے کے بعد خط تلف کر دیتا ہوں اس لیے افسوس ہے اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ نہیں۔ والسلام

خاکسار ظفر اللہ خان
(سر ظفر اللہ خاں)

UNITED NATIONS – NATIONS UNIES
NEW YORK

PU 113 (4)

26 June 1959

Dear Mr. Tufail,

Thank you for your letter and for your thoughtfulness in asking me to write a few words about Ahmed Bokhari.

It was a pleasure for me to accede to your request and I send you my contribution enclosed.

Yours sincerely

Dag Hammarskjold
Secretary-General

PAKISTAN MISSION TO THE UNITED NATIONS
PAKISTAN HOUSE
12 EAST 65th STREET
NEW YORK 21, N. Y.

AD/64-59

16 June 1959

Dear Sir :

Your letter of 13th May, 1959 addressed to the Ambassador of Pakistan in Washington. D.C. has been forwarded to us for disposal.

We have sent you by separate post copies of Professor Bokhari's speeches listed below :-

1) The Tunisian Question
2) Speech on South Africa, delivered before the Ad Hoc Political Committee of the U. N. General Assembly on November 13, 1952.
3) Keynote address delivered to the model General Assembly held at Barnard College on April 7, 1952.

Very truly yours,

Riaz Piracha
First Secretary

برادرم طفیل صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا ۲۴ اپریل کا خط عمان ہوتا ہوا نیویارک میں ملا۔ میرا کام عمان میں ۱۵ اپریل کو ختم
ہوگیا تھا۔ وہاں سے براہ لندن اپریل کے آخر میں نیویارک اپنے مستقر پر واپس آگیا۔ لندن انڈیا آفس
لائبریری میں اس مرتبہ متعدد کوششوں کے بعد مولانا آزاد کے سنٹرل ایشیا اور روس کے سفر کے حالات
مفصل مل گئے۔ اب ان کا یہ سیاسی مشن ایک مستقل مقالہ بن سکتا ہے۔ میں نے اس پر کام شروع
کر دیا ہے۔ اور انشاءاللہ اگست تک اسے مکمل کر لوں گا۔

پروفیسر بخاری کی تقریریں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے ۵۴ء میں ختم ہوگئی تھیں۔ اس
کے بعد یہ اقوام متحدہ کے انڈر سکرٹری ہوگئے تھے۔ اور جو انھوں نے کہا وہ محکمے کے لیے کہا۔ البتہ
ان کی ایک تقریر جو سان فرانسسکو میں ہوئی تھی لاجواب تھی۔ میں اس کی نقل آپ کے لیے حاصل
کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر صرف یہی شائع ہوجائے تو سب سے عمدہ رہے گی۔ جو تقریریں
انھوں نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے کی انھیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ مگر اس میں ذرا دیر لگے گی۔
بہرحال پطرس نمبر کے لیے یہ مواد اچھا ہے۔ نیویارک ٹائمز نے ان کی وفات پر جو افتتاحیہ لکھا تھا اسے
ضرور شائع کیجیے۔ اس کی نقل USIS کے لاہور کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ مرحوم کا سامان سنا ہے کہ
واپس پاکستان چلا گیا۔ آپ ان کے صاحبزادے یا ان کی بیوی سے مل کر دریافت کیجیے کہ سامان میں
تقریروں کے مسودے آئے ہیں یا نہیں۔ یہ مسودے بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ اور ان کی اپنی
تصاویر کا البم نہایت مکمل تھا۔ اس سے بھی آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سنا ہے کہ یہ اپنی سوانح عمری بھی لکھ رہے تھے۔ خدا جانے اس کا مسودہ سامان کے ساتھ
گیا ہے یا نہیں اس کے متعلق ضرور دریافت کیجیے۔ اور پھر مرحوم کے ذاتی خطوط بے شمار ہیں۔ ان کا
آخری خط جو مرنے سے ایک ہفتہ قبل انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ آپ نے
غالباً ماہِ نو کے جنوری ۱۹۵۹ء نمبر میں پطرس پر میرا مضمون پڑھا ہوگا۔ اس میں بھی میں نے اس خط کا
ذکر کیا ہے۔

خاکسار

(آغا محمد اشرف)

VICE-CHANCELLOR
B.A. HASHMI, M.A., M.ED., LL.D.

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI

حضرت سلامت

آپ کا والا نامہ اور بعد ازاں نقوش وصول ہوئے۔ شکریہ، کوئی پندرہ بیس سال ہوئے قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر توفیق نہ ہوئی کہ اسے سنبھالوں۔ بہرحال انتہائی کوشش کروں گا کہ ایک آدھ صفحہ خدمتِ عالی میں ارسال کروں۔

پچھلے چند ماہ سے مصروفیاتِ پیہم اور مسلسل ہیں اور یہ سلسلہ ابھی باقی ہے۔ گزارش رسمی نہیں واقعی ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے کچھ نہ کچھ ارسال کرنے کی کوشش کروں گا۔ آخری تاریخ سے مطلع فرمائیے کہ وہ مدِ نظر رکھوں۔

میرے پاس خط ہوتے تو کبھی کے پیش خدمت کر دیتا۔ میں خط پڑھنے کے بعد چاک کر دینے کی عادت کا شکار ہوں۔ ڈاکٹر اقبال اور قائد اعظم کے خطوط بھی اسی لاپروائی کے باعث ضائع کر دیئے میری بے مائگی۔

(محمد بشیر ہاشمی)

UNITED NATIONS — NATIONS UNIES

کراچی۔ ۲۶ رمئی ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ سلام نیاز۔ گرامی نامہ ملا اور "نقوش" کے دو شمارے بھی۔ "نقوش" کے لیے لکھنے میں آپ کے ساتھ "مراسم کی کمی" حائل نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صحافی قسم کی انشا پردازی سے تائب ہو چکا ہوں۔ بخاری مرحوم کے بارے میں آپ کی یا کسی اور کی فرمائش پر جو کچھ لکھوں گا۔ اس کی قیمت صحافت نگاری سے زیادہ کیا ہو گی؟ "عالمانہ" مضمون لکھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اور عالمانہ مضمون لکھنے کے قابل بھی خود کو نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے معذرت قبول فرمائیے۔ آپ کی عالی ہمتی کا ہمیشہ قائل رہا ہوں کیونکہ "نقوش" جیسا رسالہ اس باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہنا، اپنے آپ پر ہزار جبر کے مترادف ہے!

والسلام
آپ کا مخلص
(ن۔ م راشد)

طفیل صاحب، تسلیم

یہ قطعی زیادتی ہے کہ آپ مجھ سے زبردستی مضمون لکھوا ہی لیتے ہیں۔ میں پطرس کو بہت ہی کم جانتی تھی۔ مگر اس پر بھی آپ نے پطرس پر لکھنے کے کیا کیا جواز نکالے۔ میرے پاس جو کچھ تھا بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہے۔ آپ جانیں۔

شاہد عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ آج تک نقوش کے جتنے نمبر نکلے ہیں، یہ طفیل صاحب سے منگواؤ۔ مجھے یہ فرمائش کرتے تکلف سا ہوتا ہے۔ جس پر شاہد کو اور بھی جلن ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا شاہد کی اس ہٹ دھرمی کے بارے میں؟

اچھا ایک مہربانی کیجئے کہ نقوش کا ایک پرچہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج دیں۔ میری جانب سے،

خاک رعصمت۔ (عصمت چغتائی)

کراچی

۸۔ جون ۵۹ء

عزیزم طفیل صاحب

پطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا۔ اور آپ ہیں کہ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اور اپنے تاکیدی خطوں سے حواس مختل کیے دیتے ہیں۔ بقیا مضمون آپ کو ۲۵۔۳۰ جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے، وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ ان دنوں میں کہاں اور لکھنا کہاں، لہذا صبر کیجیے، یا پھر جی کڑا کر کے اپنی سکیم سے نکال دیجیے۔

آپ کا

(غلام عباس)

کراچی

۱۸ر جولائی ۵۹ء

مخترمی۔ تسلیم

۱۔ مجھے افسوس ہے کہ مرزا محمد سعید صاحب سے پطرس کے متعلق مضمون حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور ان سے اصرار کرنا اچھا بھی نہیں لگتا۔ ان کے پاس پطرس کے خط بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آمنہ مجید ملک کے نام یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اگر پطرس نمبر کی ترتیب

مکمل نہ ہوگئی ہو تو شامل کر لیجیے۔

۲۔ پطرس نے میرے والد کے انتقال کے موقعے پر انگریزی میں ایک مضمون ان کے متعلق دہلی کے انگریزی اخبار Statesman میں لکھا تھا۔ وہ مضمون انگریزی میں ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے کہیں سے وہ حاصل کر لیں تو اس کا ترجمہ چھاپ سکتے ہیں۔ اس کے لیے دلی خط لکھنا پڑے گا کہ states man والے ۴۳ء کے فائل نکال کر اس میں سے وہ مضمون تلاش کریں۔ مجھے اس کی تاریخ اشاعت کا بھی علم نہیں۔ اسٹیٹسمین کے نمائندے جو کراچی میں رہتے ہیں آجکل یہاں موجود نہیں ورنہ میں ان سے کہتی۔

پطرس نمبر کب تک نکل آئے گا؟ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص

(قرۃ العین حیدر)

کراچی

۲۶ مئی ۱۹۵۹ء

محترمی، سلام مسنون، حسب فرمائش بخاری مرحوم کا خط ملفوف ہے جس ملاقات کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی، جب میں نے دیارِ غیر میں ان کی موت کی خبر سنی تو سناٹے میں آگیا، ایسے دانائے راز اور زندہ دل صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے،

مستدعی ہوں کہ یہ خط مجھے واپس بھیج دیا جائے، خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

مخلص

(سید ہاشم رضا)

باسمہ سبحانہٗ

برادرِ مکرم، تکلیف فرمائی کے لیے شکریہ، میں نے گزشتہ دس روز میں دو دفعہ آپ کے ادارہ فروغِ اردو کی زیارت کی۔ آپ نہ ملے اور مایوس پھر آیا۔

پطرس کے متعلق میری معلومات زیادہ نہیں۔ اگرچہ ابتدا ہی سے خاص تعلق رہا۔ فی الحال وعدہ نہیں کرتا۔ ذرا فوری کاموں سے فارغ ہو جاؤں تو سوچوں گا۔

ہاں بھائی، غالباً مولوی عبد اللہ قریشی نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ میرے جانے کا مقصد یہی تھا کہ اس کے متعلق پوچھوں۔

ملاقات کو بہت دن ہوگئے۔ یہ دعوتِ تکلف نہیں محض اظہارِ آرزو ہے۔

آپ کا

(غلام رسول مہر)

ذکاء اللہ روڈ ۔ یونیورسٹی علی گڑھ
۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

مکرمی تسلیم

نقوش کے پطرس نمبر کے لیے مضمون کا تقاضا موصول ہوا تھا۔ جو کچھ بن پڑا لکھ ڈالا ہے۔ دو چار دن میں مکمل کر کے ٹائپسٹ کو دے دوں گا۔ اس میں شاید آٹھ دس دن اور لگ جائیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مضمون کم و بیش ۸ — ۱۰ صفحے آپ کے رسالے کے لے لے گا۔

امید ہے آئندہ آپ مضمون کے لیے اس طرح اصرار نہ فرمایا کریں گے۔ مضمون وغیرہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی صورتِ حال کیا کم تکلیف دہ ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کی فرمائش نہ پوری کرنے پر اپنے اوپر نفرین کرنے کا فرض بھی ادا کرنا پڑے۔

یہ نمبر بھی (طنز و مزاح نمبر) اپنے پیشروؤں کی طرح حسب توقع خاطر خواہ نکلا۔ خاص نمبر شائع کرنے میں آج شاید آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ یقیناً اپنے کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں اور ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی
(رشید احمد صدیقی)

کشمیری محلہ ۔ لکھنؤ
۴ جون ۵۹ء

پیارے طفیل ۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں "پطرس کے مضامین" پر ایک مختصر سا تبصرہ حاضر ہے۔ ایک اور مضمون میر پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے جواب میں بھی تیار ہے۔ اگر تم چھاپنا گوارا کرو تو وہ بھی بھیج دوں۔ مگر طویل اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے متعلق میر کی تردید میں ہے۔

میں بہت بیمار رہتا ہوں اور موت کا منتظر۔ خدا تم کو سلامت اور شاد کام رکھے۔ والسلام

تمہارا اثر
(اثر لکھنوی)

برادرم، تسلیم وغیرہ

آپ کے خط کا جواب دینا ضروری تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ میں سید ذوالفقار بخاری کے پاس گیا۔ ان سے وعدہ لیا۔ اور وعدے کے علاوہ ایک تصویر بھی حاصل کر لی۔

آپ غالباً مایوس ہو چکے ہوں گے اور میری اس خاموشی کو طرح طرح کے معنی پہنا رہے ہوں گے، مگر میں بڑے بخاری پیران کے شایان شان چیز لکھ رہا ہوں۔ جو آپ کو امروز فردا میں مل جائے گی۔

طفیل! خدا کی قسم اب اس سرد جنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔ جو میرے اور تمہارے درمیان جاری ہے

اس مفروضہ جنگ پر فطری محبت حاوی ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے تم کو گلے لگانے کو لہٰذا ختم کر دو یہ بیہودگی اور گلے لگ جاؤ۔

بخاری صاحب کا مضمون اور اپنا مضمون جلد بھیجوں گا اور کوئی حکم۔

نیازمند

شوکت

(شوکت تھانوی)

برادرم طفیل صاحب!

جے نقوش۔ پطرس پر مضمون حاضر ہے۔ عنوان ہے، پیر و مرشد، "مرحوم کی یاد میں" اس لیے نہ رکھا کہ یہ مرحوم کے ایک مزاحیہ مضمون کا عنوان ہے۔ پطرس پر سینکڑوں مضامین لکھے جائیں گے لیکن اس مضمون میں آپ کو چند نئی باتیں اور واقعات ملیں گے تعمیلِ ارشاد حسبِ معمول دیر سے کر رہا ہوں امید ہے حسبِ سابق آپ فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

نقوش کا "طنز و مزاح نمبر" بہت پسند آیا۔ کارٹون اس نمبر کی جان کہے جا سکتے ہیں۔ مجھے اپنا کارٹون اتنا پسند آیا۔ کہ ہر واقف ناواقف کو دکھاتا پھرتا ہوں۔ میری طرف سے کارٹونسٹ کو مبارکباد دیجئے۔ اور اس کا نام اور پتہ بھی تحریر فرمائیے۔ بخدا یہ شخص لائق قدر فنکار ہے۔

مضمون کی رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ خطوط کا جواب نہ دینا یا بہت دیر سے دینا میری پرانی عادت یا خباثت ہے۔ مجھے آپ کے خط مل گئے تھے۔ طویل اور مجرمانہ خاموشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

"آج کل" دہلی میں میرا ایک مضمون "پطرس" پر چھپا تھا۔ افسوس کہ وہ میرے پاس نہیں۔ لاہور ہی رہ گیا تھا۔ اگر کسی لائبریری سے (جہاں کہ "آجکل" کی پرانی فائلیں ہوں) پتہ کریں تو شاید مل جائے ویسے عرش ملسیانی حال چیف ایڈیٹر "آجکل" آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اگر انھیں لکھیں۔ تو پرانی فائل میں سے یہ مضمون نقل کروا کر آپ کو بھیج سکتے ہیں۔ مضمون بُرا نہیں تھا۔ پطرس نے اسے خود سراہا تھا۔

کنہیا لال کپور (کنہیا لال کپور)

$\frac{6}{4}$ بلاک II سی۔ ناظم آباد۔ کراچی

۲۲۔ مئی ۵۹ء

بھائی طفیل صاحب۔ السلام علیکم

مئی کا نقوش ملنے کے بعد۔ آپ کو کئی خط لکھے۔ مگر یقیناً ان میں سے کوئی بھی آپ کو نہ ملا ہوگا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی یہاں سے روانہ نہ ہو سکا۔

خیر وہ سب خط آپ کو ایک ساتھ بھیجے دے رہا ہوں:-

نمبر ایک مؤرخہ بارہ مئی نقوش ملا۔ برابر لکھتے رہنے کا وعدہ۔ لاہور آنے کا ارادہ
نمبر دو ۲ " سترہ مئی پطرس نمبر۔ اس کے لیے لکھنے کا ارادہ
نمبر تین " ۲۲ مئی مضمون حسب ذیل

میں اردو کے مزاحیہ نگاروں پر لکھ رہا ہوں۔ ایک مضمون مزاح اور مزاحیہ نگاری لکھا۔ وہ "ماہ نو" والے خدا ان کو نیک ہدایت دے دسمبر سے دبائے بیٹھے ہیں۔ دوسرا مضمون غالب کا مزاح شروع تو ہو گیا مگر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ تیسرا مضمون "پطرس کا ہیومر" غالب والے مضمون کو چھوڑ کر اس سے پہلے لکھ ڈالا تاکہ پطرس نمبر میں آ سکے۔ اب آگے آپ جانیں آپ کا کام جانے!

مضمون منسلکِ دستاویز ہذا ہے۔

فقط

محمد احسن فاروقی
(ڈاکٹر احسن فاروقی)

از وزیر کوٹ سرگودھا
۸ جون

محترمی طفیل صاحب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ تاخیر سے جواب دے رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل اس دوران میں آپ ہی کے لیے مضمون حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ لاہور میں بڑی کوشش کے باوجود ایڈیٹر راوی سے مطلوبہ مضمون حاصل نہ کر سکا کیونکہ وہ خود پطرس نمبر نکالنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

اب صورت یہی باقی ہے کہ کوئی تازہ مضمون لکھ دوں۔ اگر آپ مجھے دس بارہ روز کی مہلت دے سکیں تو توقع ہے کہ سبکدوش ہو سکوں گا۔ دوسری طرف اگر آپ کو ضروری مضامین مل گئے ہوں اور آپ کا پرچہ اس سے قبل ہی آ رہا ہو تو پھر آپ میرے مضمون کی شمولیت کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں۔ آخر اس سے فرق ہی کیا پڑے گا؟

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

مخلص
وزیر آغا
(ڈاکٹر وزیر آغا)

مکرمی!

پطرس پر مضمون آپ کو پسند آیا، غنیمت ہے۔ میں نے بڑی تکلیف میں اس مضمون کو لکھا ہے۔ سانس کی تکلیف الگ تھی اور خون کا دباؤ بڑھا، جو اب بھی ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ عبد المنعم سعیدی میرے ایک دوست تھے جو حال ہی میں کراچی پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھوں نے آسکر وائیلڈ کے ایک ڈرامے کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا جب ٹھیک نہ چلا تو مجھے بھی شریک کر لیا اور ہم دونوں نے لشتم پشتم اسے ختم کر کے چھپوا ڈالا، غلطیاں خاصی تھیں۔ اس پر

محمد دین تاثیر نے ایک سخت تنقید کی جو مخزن (جسے حفیظ نکالتے تھے) میں چھپی، میں نے اس کا جواب لکھا تو پنجاب کے پرچوں نے تاثیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے شائع کرنے سے انکار کر دیا، انھیں دنوں یوپی سے ایک نیا پرچہ نکلا تھا اس میں یہ جواب میں نے چھپوا دیا۔ جو جواب کم اور سب و شتم زیادہ تھا، اس پر محمد دین بپھرے۔ انھیں دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ غنچۂ تبسم شائع ہونے لگا۔ تو میں نے اس مضمون کو بھی اس مجموعہ میں شریک کر دیا اور عبد المنعم سعیدی نے اس کتاب کے مقدمے میں بعض چوٹیں بعض لوگوں پر کیں، اتفاق سے انھیں دنوں میری خط و کتابت پطرس سے ہوئی تو انھوں نے اس قصے کو چھیڑا میں نے اعتراف کر لیا کہ غلطیاں واقعی خاصی ہیں اور اگر ان غلطیوں کی فہرست وہ بنا دیں تو میں آئندہ اس میں ترمیم کروں گا، چنانچہ پطرس نے بڑی مہربانی سے اصل ڈرامے سے اس کا مقابلہ کر کے ایک ضخیم فہرست ان غلطیوں کی بنا دی اور مشورہ دیا کہ اب اس کا دوسرا اڈیشن نکالنے کے بجائے اسے نام اور ذرا سے کردار بدل کر "اردا دو" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ہے غنچۂ تبسم پر مقدمہ، تعارف، وغیرہ کئی ایک چیزیں تھیں انھیں دیکھ کر ڈاکٹر تاثیر نے تبسم وغیرہ چند احباب کو ساتھ لے کر غنچۂ تبسم پر ایک مضمون لکھا جو اس کی مخالفت میں تھا، یہ مضمون نیرنگِ خیال میں "نیازمندانِ لاہور" کے نام سے طبع ہوا۔ میرا خیال یہی تھا کہ پطرس اور سالک بھی اس میں شریک ہیں مگر پطرس نے مجھے لکھا کہ میں اس مضمون سے واقف ضرور ہوں اور اس کی تحریر کی اطلاع مجھے ضرور تھی مگر اُن کے لکھنے میں شریک نہیں ہوں،

یہ ایک ہی مضمون میرے اور غنچۂ تبسم کے خلاف "نیازمندانِ لاہور" کے نام سے چھپا ہے اب نہ تو یہ مضمون ہی میرے پاس ہے اور نہ اس کا سنہ ہی یاد ہے چونکہ اس کا جواب لکھ کر میں نے نیرنگِ خیال میں چھپوانا چاہا اور نیرنگِ خیال نے اس کے چھاپنے سے انکار کر دیا اس لیے میں نے نیرنگِ خیال میں لکھنا انتقاماً چھوڑ دیا۔

احمد جمال پاشا نے حال ہی میں پطرس پر ایک مضمون قومی زبان کراچی میں لکھا ہے جس میں انھوں نے غنچۂ تبسم کے خلاف نیازمندانِ لاہور والے مضمون کو پطرس کا بتایا ہے، چونکہ خود پطرس نے مجھے لکھا تھا کہ اس سازش میں وہ شریک نہیں ہیں اس لیے میں نے اس مضمون کو پطرس کے مضامین میں شمار نہیں کیا۔

آپ کا

(تمکین کاظمی)

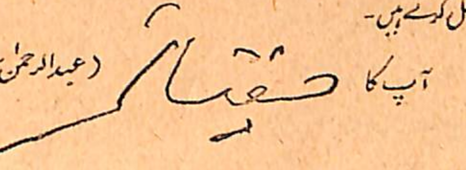
مکرمی طفیل صاحب، سلام مسنون

میں سرکار کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نقوش برسوں سے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور خاص نمبر نکالنے میں بڑے بڑے رسالوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ایک نمبر میری تجویز پر ترتیب دیا جائے اور وہ نظم نمبر ہو اور اس میں ساری دنیا کی بہترین نظمیں ہوں۔

میں پطرس نمبر کا ٹائیٹل ضرور بناؤں گا۔ آپ سے بھی تعلق خاطر ہے اور پطرس سے بھی زندگی بھر کا ساتھ تھا۔ ہو سکا تو مضمون[1] بھی لکھ دوں گا۔ مگر ادھر میری کچھ دنوں سے طبیعت بڑی خراب ہے۔

آپ کی نوازش کا شکریہ ——— کہ آپ ہر موقع پر مجھے بھی یاد رکھتے ہیں اور ہمارے لیے آپ کے رسالے ادبی سرمایہ ہیں، جو ہم حاصل کرتے ہیں۔

آپ کا



(عبدالرحمن چغتائی)

خطوط پڑھ لیے آپ نے، اچھا ہوا۔ نہ چھپنے سے ان کا چھپنا بہتر ہی ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو ان کی عدم اشاعت کے باعث معلوم نہ ہوتیں اب آپ کو معلوم ہو گئیں۔ اگر آپ نے ان خطوط کی اشاعت سے کچھ پایا ہے تو میں سرخرو، ورنہ مجرم تو ہوں ہی، یہ اعزاز مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔

مرحوم کے کئی قریبی دوست لاہور میں تھے۔ ان سے خط و کتابت نہیں ہوئی۔ باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دو تحریریں خط کی صورت میں ملی تھیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ان حضرات سے جو جو باتیں ہوئیں۔ وہ اس نمبر کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ مشوروں کی صورت میں، تحریر کی صورت میں، تکمیل کی صورت ہیں۔

اس پرچے کی ابتدا پطرس پر شخصی نوعیت کے مضامین سے ہوتی ہے۔ ان مضامین پر الگ الگ لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔ ویسے اس حصہ میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں۔ جو محض مضمون ہو اور کچھ نہ ہو۔ ان میں سے ہر مضمون میں پطرس سے ملاقات ہوتی ہے ——— مرحوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ——— اور یہ بھی کہ مرحوم احباب سے ہمکلام ہیں اور احباب مرحوم سے ——— اس سے زیادہ مضمون اپنا کرشمہ کیا دکھا سکتے تھے۔

اس کے بعد پطرس کے فن پر چار ہلکے پھلکے مضمون ہیں۔ اس حصّہ کو ہم نے جان بوجھ کر بھاری بھرکم نہیں بنایا۔ اس لیے کہ مرحوم کے فن پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اصل میں ہم چاہتے ہی نہ تھے کہ جو کام آئندہ ہو سکتا ہو۔ اُسے بھی آج کر کے اپنے کام کو اور بڑھا لیں۔ ہم نے اپنے ذمّہ وہ کام لیا۔ جو آئندہ چل کر مشکل ہو جاتا۔ پھر بھی مرحوم کے فنی محاسن پر یہ مضامین کافی ہیں اور اس نمبر میں ان کی اسی حد تک ضرورت تھی۔

یہاں تک تو جو کچھ پیش کیا گیا۔ وہ یا تو مرحوم کی شخصیت پر تھا یا فن پر، اب مرحوم کے فن پاروں کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا

---

[1] (چغتائی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکے۔ مگر انھوں نے پطرس کی شخصیت اور فن کو اپنے لازوال خطوط کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ نقوش کا سرورق چغتائی صاحب ہی کی اعجاز کاریوں کا شاہکار ہے۔)

مرحوم کی منظوم تخلیقات سے ہوئی۔ مرحوم نے اُردو میں بھی شعر کہے، فارسی میں بھی، کہا بہت کچھ، مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ کہ کہا اور ضائع کر دیا۔ بعض شعری کارنامے صرف تفریحِ طبع کا سامان بنے اور بس۔ چند ایک چیزیں جو محفوظ ہو گئیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم اُردو سے زیادہ اچھے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بیدل شاہجہانپوری مدیر مخزن نے ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا۔

ایک غیر زبان خوش نوا کا ہم صفیرانِ عجم ہونا اور اجنبی نہ سمجھا جانا اگر آئینہ حیرت ہے تو یہ نظم قطعاً مستحق ہے کہ معجزۂ ادب کہی جائے۔ سید احمد شاہ بخاری میرے جذباتِ دوستی کی آرزو اور اعترافِ قابلیت کا ایمان ہیں۔ اس لیے بجائے حقیقت نمائی کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اربابِ کیف کے ذوقِ سلیم کو دوبارہ اس شعر کے تارِ لطیف سے متوجہ کروں ؎

نشانِ سجدہ کام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آں آستاں گم شد

منظومات کے بعد وہ تمام مضامین پیشِ خدمت ہیں۔ جو مرحوم کا زندگی بھر کا سرمایہ ہیں۔ انھیں یکجا اور اکٹھا کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ اس لیے کہ آج کسی بھی لائبریری میں، اچھے اچھے رسالوں کی بھی جلدیں محفوظ نہیں۔ ہم نے پہلے تو لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔ مگر وہ بسلسلۂ پطرس ایسا وقیع نہ تھا جو آپ حضرات کے سامنے پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذاتی لائبریریوں کی خاک چھانی بھی، پھانکی بھی، لاہور میں بھی، لاہور سے باہر بھی، اس کام کے سلسلے میں سیلاب سے بھی واسطہ پڑا۔ کہیں اٹکے، کہیں بھیگے، کہیں پھنسے، کہیں تیرے، غرض جیسے بھی بن پڑا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہم مرحوم کی اس سے بڑی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے تقریباً سارے کام کو یکجا کر دیا ہے۔ ورنہ قارئین کے ذہن میں تو مرحوم کی بس ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ساری چیزیں مرحوم کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مزاح نگار نہ تھے۔ بلکہ ادب کے ہر موضوع پر نہ صرف لکھ سکتے تھے بلکہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں۔ جن کا ترجمہ تو مرحوم ہی نے کیا تھا۔ مگر وہ ان کے نام سے نہیں چھپی تھیں۔ جن میں "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں" اور "نوعِ انسان کی کہانی" اور دیہات میں بوائے اسکاؤٹ کا کام" ہیں۔ ایسے کاموں کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ مگر ہم نے یہ کام بھی کیا یہ کتابیں بچوں کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے ترجمہ کرائی تھیں۔ ان کا ریکارڈ موجود ہے۔ اس نمبر میں ان کتابوں میں سے بھی چند حصے دے دیے گئے ہیں۔

مرحوم کے تنقیدی اور فنی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواہ وہ دیباچوں کی صورت میں ہوں۔ خواہ مضامین کی صورت میں نتیجہ خیز بات کرتے ہیں، فن کی باریکیوں اور اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں، جیسی نظر ان کی تھی کم کسی کو نصیب ہوئی۔ زیرِ نظر شمارہ میں دیکھیے تو کیا کچھ ہے اور کتنے پائے کا ہے۔

ڈرامہ سے بھی مرحوم کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اچھے ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ڈرامے ڈائریکٹ کیے۔ ڈراموں میں کام کیا۔ اور خوب خوب داد حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈراماٹیک کلب کے نکھار میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ چند ڈرامے اس نمبر کی بھی زینت ہیں۔ یہ ڈرامے کاغذ پر بھی خوب ہیں۔ جب یہ سٹیج ہوئے ہوں گے اور خود بخاری صاحب اسٹیج پر موجود ہوں گے۔ نہ جانے اس وقت

کیا قیامت برپا ہوئی ہوگی۔

اس پرچے میں ایک جھگڑے کی بات بھی ہے۔ وہ ہے نیاز مندانِ لاہور کا سلسلہ، پہلی بات تو اس میں جھگڑے کی یہ ہے کہ بعض حضرات ان تحریروں کو صرف بخاری صاحب کی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں ایک اور جگہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ صلاح مشورے کی حد تک، سالک صاحب، تاثیر صاحب اور امتیاز صاحب شریک رہے۔ مگر انہیں لکھا پطرس ہی نے۔ چند ایک اسی نوع کی چیزیں ڈاکٹر تاثیر نے بھی لکھی تھیں۔ مگر ہم نے انھیں پیش نہیں کیا۔ ہم جو تین مضمون پیش کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً پطرس ہی کے ہیں۔ تفصیل میں کیا جائیں۔ ایک آدھ کا تو اصل مسوّدہ موجود ہے۔ دوسرے حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" اس کی شہادت دیتے ہیں (بھلا ایڈیٹر کو مضمون نگار کا پتہ نہ ہو) پھر مرحوم کے قریبی دوست بھی میری ہی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً سالک صاحب، تاج صاحب

"غنچۂ تبسم" کے مصنف نے ایک بات پطرس کے حوالے سے کہی ہے کہ وہ "مضمون میرا لکھا ہوا نہیں"۔ میرے نزدیک یہ حوالہ نقش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اُس مضمون پر ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی تھا:۔

"جس ذریعہ سے ہمیں یہ مضمون ملا ہے۔ اس سے اور مضمون کی گرانقدری سے ہمیں چار احباب پر شک ہو سکتا ہے۔ پروفیسر بخاری، سید امتیاز علی تاج، پروفیسر تاثیر اور قبلہ سالک صاحب۔ ان چار پر اس لیے کہ ایسا وقیع مضمون لکھنے والے "نیاز مند" یہی اربعہ عناصر ہو سکتے ہیں۔ الگ الگ شک کے وجوہ یہ ہیں: (۱) تاثیر صاحب اس سے قبل تمکین کاظمی صاحب کے وائلڈ کے ڈرامہ کے ترجمہ پر لکھ چکے ہیں جس کا آج تک جواب نہیں دیا جا سکا (۲) سلاست اور روانی تاج کی سی ہے (۳) ادبی تنقید اور زباندانی حضرت سالک کی آئینہ دار ہیں (۴) شوخیِ کلام اور اندازِ بیان سید احمد شاہ بخاری کی چغلی کھا رہے ہیں۔ بلکہ کئی فقرے تو مضامینِ پطرس ہی سے لیے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ہم آہنگی اور نگارش کی یگانگت سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں کا کام نہیں۔ ایک ہی قلم کی تراوش ہے۔ حقیقت کچھ ہو ہمارے شکوک ان چاروں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو زیادہ، امتیاز، سالک اور تاثیر کو کم۔"

ایڈیٹر لفظی پینتروں کے ساتھ واضح اشارے تو کرتے ہیں کہ یہ مضمون پطرس ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک ہو تو کیا کیا جائے۔

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ مضمون لکھ کر بخاری صاحب نے اچھا کیا تھا یا بُرا۔ مجھے تو ان کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کم از کم یہ تین مضمون پطرس ہی کے ہیں۔ بس! — زیادہ وضاحت میں گیا یا اپنی رائے کو دخل دیا تو گتھم گتھا ہونے کے بڑے امکانات ہیں۔

مرحوم اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ بلاشبہ ان کی تقریروں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہاں بخاری صاحب کی دو ایک تقریریں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ان کی لسانی خوبیوں کا بھی اندازہ ہو سکے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یو۔ این۔ او میں تقریر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ساری دنیا گوش برآواز ہوتی ہے۔ جن کے سامنے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ مانے ہوئے مدبر ہوتے ہیں۔ ایسے گھاگ قسم کے لوگوں کے سامنے اپنی بات کہنا اور پھر منوانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اپنی ایک تقریر کے بارے (جو ہم بھی پیش کر رہے ہیں) مرحوم ہی نے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"پیرس آیا۔ مشلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدانے اس بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی توجیہ باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو۔این او میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔"

اس نمبر میں مرحوم کی اکلوتی مگر معرکۃ الآرا کتاب "پطرس کے مضامین" بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بہ ظاہر اس کا شامل کرنا عجیب سا لگتا ہے مگر ہم نے اس نمبر کو مرحوم کے تمام تر کارناموں سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اس کی بھی اشاعت ناگزیر تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ کہ منتشر مضامین کو یکجا کرنے کے بعد، ہمیں یہ خیال گذرا کہ ان مضامین سے، مرحوم کی اتنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا۔ جتنا کہ پہلے سے موجود ہے (اس لیے کہ اس میں تو نرم گرم سبھی کچھ موجود ہے) اسی خوف سے کہ کوئی مرحوم کے انہی منتشر مضامین کو سامنے رکھ کر غلط رائے قائم نہ کر بیٹھے۔ اس کتاب کو شامل کیا گیا۔ تیسری بات یہ تھی کہ مرحوم کا سکہ مزاح نگاری کے سلسلے میں رائج ہے۔ منتشر مضامین میں مزاحیہ انداز کی چیزیں کم تھیں[1]

پطرس کے خطوط، اتنی تعداد میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ خطوط کیسے ہیں: ادب میں کیا مقام رکھیں گے؟ میری ناقص رائے میں اس کا فیصلہ بھی اس سے مختلف نہ ہوگا۔ جو مزاح نگاروں کے دربار میں "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہے۔ یہ خوش گفتاری کے تمام آداب کے ساتھ بولتے ہیں۔ اپنا بنا لیتے ہیں۔ پڑھیے گا تو ڈوب جائیے گا۔ سرشاری کی کیفیت پائیے گا۔ پھر نئی ترکیبیں سامنے آتی ہیں۔ نئے استعارے سامنے آتے ہیں جو موہ لیتے ہیں۔ اتر جاتے ہیں ـــ ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کی طرح پطرس فرضی خطوط کے انداز میں مضمون نہیں لکھتے۔ بلکہ ان کا واقعی کوئی مخاطب ہوتا ہے۔ اور یہ واقعی خط ہوتے ہیں جب کوئی ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کے مضمونوں کو (بلاشبہ بلند پایہ ہی) خطوط سمجھ کے پڑھتا ہے تو بڑا ظلم کرتا ہے۔ غالب نے بھی بعض خطوط یہ سمجھ کے لکھے تھے کہ یہ چھپیں گے۔ جیسا کہ نواب امیرالدین احمد خاں نے غالب سے کہا۔ آپ کے خط چھپ رہے ہیں۔ ایک خط میرے نام بھی لکھ دیجیے تاکہ وہ بھی چھپ جائے۔ چنانچہ غالب نے خط لکھا اور وہ چھپا ـــ اس کے برعکس یہ خط، خط ہی ہیں ـــ غالب کے بعد اتنے دلکش خط اور کتنے ادیبوں نے لکھے؟ آپ سوچیں۔ میں ایک دو سطریں اور لکھ لوں۔

ہیمر شولڈ نے کہا ـــ "سیاست دان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ احمد شاہ بخاری میں موجود تھیں۔

بشیر احمد ہاشمی نے کہا ـــ بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔

رشید احمد صدیقی نے کہا ـــ پطرس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا۔ مگر کتنا اونچا مقام پایا۔

عبدالمجید سالک نے کہا ـــ احمد شاہ بخاری کی موت علم وادب اور خلوص و محبت کی موت ہے۔

امتیاز علی تاج نے کہا ـــ پطرس کی ڈرامہ پر بڑی نظر تھی۔ کسی ڈرامے میں خود کام کیا تو اپنی ایکٹنگ کا بھی لوہا منوایا۔

صوفی تبسم نے کہا ـــ بخاری کی حیثیت صرف استاد کی نہ تھی بلکہ وہ طالب علموں کے مشفق رہنما اور دوست تھے۔

عصمت چغتائی نے کہا ـــ نہ جانے کیوں پطرس بھاگتے اور ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔

فیض احمد فیض نے کہا ـــ بخاری صاحب عالم بھی تھے، ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش گفتار بھی۔ سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبّر اور صاحب سیاست بھی۔

---

[1] یوں بھرپور قسم کا نمبر پیش کرنے کے سلسلے میں ادارہ نقوش مولانا عبدالمجید سالک کا شکر گذار ہے کہ انھوں نے بعض شرائط کے ساتھ ہمیں بیگم پطرس سے مضامین کی اشاعت کی اجازت دلوادی۔ اگر ہمیں مولانا سالک اور بیگم پطرس کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ تو یہ نمبر چھپ ہی نہیں سکتا تھا ـــ ادارہ محترمہ بیگم صاحبہ کا بے حد ممنون ہے۔

عالمی شہری

جب سے کپلنگ نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" کا گیت گایا ہے اسی دن سے ہم مختلف اور متصادم معاشروں کے تعلقات کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ہمیشہ ہم اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرکب مل جائے جو ہر ایک کی بہترین خوبیوں کو محفوظ کر دے۔

کبھی کبھی ہمیں کسی ایسی ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے جو ہمارے تخیلات کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پاکستان کے سفیر پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت کی شکل میں ایسی ہی ایک شخصیت کے ضیاع کا سامنا ہوا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ میں رئیس شعبۂ اطلاعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں وہ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھے۔

پروفیسر بخاری کا تعلیمی پس منظر مشرق اور مغرب —— پنجاب یونیورسٹی اور کیمبرج —— دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہے وہ دنیا کے دونوں حصوں کی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور محاوروں کا راگ الاپا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے نزدیک عالم تھے۔

لیکن مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے —— حاضر جواب، شائستہ دانش مند زندہ دل، اور گرم جوش۔ وہ خود پسندی کی نمائش سے پاک تھے، انہیں زندگی سے اُنس تھا۔ وہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں سے ان کی قومیت رنگ، نسل، مذہب، یا پیشے کا خیال کئے بغیر محبت کرتے تھے۔ ان کی روح ان کے ذہن کی طرح تنگ سرحدوں کی قائل نہ تھی۔

ہزاروں امریکی جنہیں ان سے ذاتی شناسائی کا شرف حاصل ہے ان کی موت کو اپنا ذاتی رنج محسوس کر رہے ہیں سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ دوست تھے۔ لیکن یہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا ایک ایسے شخص کے اٹھ جانے سے مفلس تر ہو گئی ہے جو ہمیں بہتر طریق سے یہ دکھاتا تھا کہ آسودہ مستقبل کے لئے کون کون سی اچھی باتیں ممکن ہیں۔

(نیویارک ٹائمز مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کا اداریہ) (ترجمہ)

پروفیسر بخاری — آخری لمحات

مارملی ہچمین

"وہ آخری لمحے تک زندہ رہے" ان کے ڈاکٹر کا قول ہے "وہ کام کرتے ہوئے مرے"۔ اقوام متحدہ میں ان کے ایک رفیق کار کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات پروفیسر احمد شاہ بخاری سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے ان کے ڈاکٹر ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور انہوں نے بخاری کے سفر زندگی کی رفتار کو حتی المقدور کم کرنا چاہا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ لوگ انہیں محبت سے کہتے تھے) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معذور ہونے کا اعلان کر دیں۔ گو وہ چند سال سے اچھے خاصے بیمار رہتے تھے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۹ ر اگست ۱۹۵۳ء کو پڑا۔ پروفیسر بخاری کو اس کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ جب اسپتال میں طبی مشورے کے لئے گئے تو انہوں نے اپنا نام "مسٹر براؤن" لکھوایا۔ اس دورے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام شروع کرنے سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ چارج لینے سے قبل ہی مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کے ساتھ چین کے تاریخی دورے میں کام شروع کر دیا۔

وہ بڑی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن وقتاً فوقتاً ان پر دل کا دورہ پڑتا تھا۔ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے تو انہیں آکسیجن میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ دن آرام کرکے پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر اس طرح مستعد نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گذشتہ چند سال سے ان کی صحت بری طرح گرنے لگی تھی۔ دل کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ ان کی صحت جلد گر جانے کے کئی وجوہ تھے۔ اول تو زندگی سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ پھر وہ ریشہ دوانیاں جو ان کے خلاف ہوتی رہیں۔ جب کوئی تیز اور ذہین آدمی کسی بین الاقوامی ادارے میں اعلےٰ جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب مسٹر ہیمرشیلڈ کی مدت عہدہ کے پانچ سال ختم ہو گئے۔ اور ان کے نائبین کے استعفےٰ دینے کی بات ہوئی تو رسم کے مطابق سب کو ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ یہ مدت توسیع اپریل ۱۹۵۹ء میں ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد پروفیسر بخاری کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے۔ پہلے مہینے وہ بہت پریشان ہوئے۔ جب کہ اسمبلی کی ایک کمیٹی نے شعبہ اطلاعات کے بارے میں تحقیقات شروع کی۔ وہ چونکہ حد درجے کے حساس تھے اس لئے اس تحقیقات کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کئی سال سے شعبہ اطلاعات کے مصارف کم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اس کمیٹی کی تحقیقات اس لئے کئی سال کی جدوجہد کا آخری مرحلہ تھی۔ نومبر میں جب اس پانچویں کمیٹی کی بحث ہوئی تو ان لوگوں کو کامیابی ہوئی جو نام نہاد ماہرین کی سفارشات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور یہ طے پایا کہ یہ کام صدر دفتر کے ذمہ کر دیا جائے۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کو محض پروپیگنڈا بیورو بنا دینے کی نامہ نگاروں نے سخت مخالفت کی اور خود مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کو بھی اس پر شدید اعتراض تھا۔

موت کی باتیں

بحث کا جو نتیجہ نکلا اس سے گو پروفیسر بخاری مطمئن ہو گئے مگر اس بحث و مباحثہ کے دوران ان پر جو بار پڑا، اس سے ان کی وفات کا وقت قریب تر آگیا۔ اگر یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو شاید وہ مزید چھ ماہ سے دو سال تک زندہ رہ سکتے تھے لیکن جو کچھ ہوا یہ نہ ہوتا تب بھی غالباً زیادہ دن دنیا میں نہ رہتے وہ اپنے ڈاکٹر سے اس تلخ ترین حقیقت (موت) کے بارے میں اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے کہ "بتائیے خدارا بتائیے موت کب آئے گی؟"

گذشتہ اپریل میں نامہ نگاروں نے مسٹر ہیمر شولڈ کے اعزاز میں جو لنچ دیا تھا، اس میں پروفیسر بخاری بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے انہیں کچھ ٹھیک ٹھاک کردیا۔ انہیں انجکشن لگایا گیا جس سے ان کا بلڈ پریشر کم ہو گیا۔ اور وہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ انتقال سے ایک دن قبل پھر ان کو انجکشن لگایا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ چلنے پھرنے اور اٹھنے سے انہیں نقصان ہوگا مگر وہ اٹھ بیٹھے اور آخر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور انہیں آکسیجن میں رکھ کر گھر پہنچایا گیا ڈاکٹروں نے جو کر سکتے تھے کیا، شام کو انہیں کچھ افاقہ معلوم ہوا۔

ڈاکٹر کو بھی بخاری کی طرح شکسپیر سے بڑی محبت تھی۔ اس شام کو ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔ کہ کیا میں رات آپ کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں، پروفیسر بخاری نے کہا "نہیں، نرس موجود ہے آپ زحمت نہ کریں۔" اور پھر ڈاکٹر نے جاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا "خدا حافظ، شہزادہ شہ ہیں!"

صبح ہوتے ½۵ بجے نرس نے ڈاکٹر کو اطلاع دی کہ مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔ سوا چھ بجے وہ اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ انہوں نے موت کا کرب تک محسوس نہ کیا۔ جمعہ کو اقوام متحدہ کی جتنی کمیٹیوں کے جلسے ہوئے سب میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اور اسمبلی کے اجلاس میں بھی ان کا سوگ منایا گیا۔ پہلی کمیٹی میں جب انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا جا چکا اور آغا شاہی اس کا جواب دینے کے لئے اٹھے تو ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ پرنس علی خاں نے اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کہا "ان کے اٹھ جانے سے اقوام متحدہ کے برآمدے سنسان نظر آئیں گے۔"

اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں جو لوگ ان کے ساتھ کام کرتے تھے وہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اب یہ لوگ بہت اُنسردہ نظر آتے تھے نامہ نگاروں کو جو انہیں ایک مندوب کی حیثیت سے جانتے تھے (اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاکستان کے بہترین مندوب تھے اور پاکستان کو عرصے تک ایسا مندوب مشکل سے ملے گا) اب یہ احساس ہوگا کہ ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ جملوں میں کس قیامت کی ذہانت پوشیدہ ہوتی تھی۔

نامہ نگاروں نے انہیں شمالی افریقہ کی آزادی کے لئے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے سیاست دانوں سے سوال و جواب کرتے دیکھا ہے اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کبھی ان مباحثوں میں زیر نہ ہوئے تھے۔

ہمہ دم مسکراتی اور پُر مذاق شخصیت کے پس پردہ ایک سنجیدہ بخاری بھی تھے۔ وہ مزاح کی نقاب اتار کر ضرورت کے وقت انتہائی سنجیدہ بات کر سکتے تھے اور کرتے تھے لیکن مزاح کی نقاب وہ تحفظ کے طور پر اکثر و بیشتر ڈالے رہتے تھے۔

بھلے مانس بنو

نیو یارکر

ہم نے سُن گُن پائی کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے پروفیسر احمد شاہ بخاری ہیں جو عام طور پر عرب ایشیائی بلاک کے قابل ترین ترجمان سمجھے جاتے ہیں اور وہ پاک و ہند کے سرکردہ مزاح نویس بھی ہیں۔ مستقل نمائندوں اور مزاح نویسوں میں مجموعی طور پر یا الگ الگ دلچسپی رکھنے کے باعث ہم نے پروفیسر بخاری کی تصانیف حاصل کرنی چاہیں لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا۔ ہم نے یہ ٹھان کر کہ ان کا پیچھا ضرور کریں گے خود پروفیسر صاحب کو ٹیلی فون کیا اور ہمیں اقوام متحدہ کی عمارت میں لنچ پر حاضر ہونے کی دعوت مل گئی۔

بہرکیف پروفیسر صاحب ان چند خوش دل، بامروت اور ذی علم مستقل نمائندوں یا مزاحیہ نویسوں میں سے ایک ہیں جن سے ہم مدت کے بعد ملے ہیں۔ انہوں نے دریائے ایسٹ سے توجہ ہٹا کر کھانے کی میز کی طرف ہماری راہنمائی کی۔ بھنا ہوا گوشت اور ٹماٹو منگوایا اور کہا کہ "پاکستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء تک وہ ایک استاد، مترجم اور مصنف تھے، سیاسی سفیر نہ تھے۔ ۱۹۴۷ء سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر (پرنسپل) تھے۔ تیس برس وہ اس کالج میں ادب کے پروفیسر رہے۔ انہوں نے اس درس گاہ کے تجرباتی تھیٹر کے لیے دوسری چیزوں کے علاوہ شیکسپیر اور شا کے بہت سے ڈرامے اردو میں ترجمہ کر کے دیے جن میں ابسن[1] کا ڈرامہ "گڑیا کا گھر" اور المر رائس[2] کا ڈرامہ "جمع کرنے والی مشین" بھی ہیں۔" پروفیسر نے ہمیں بتایا کہ "ہارون الرشید کے زریں دور کے بعد گذشتہ چالیس سال کا زمانہ اسلامی دنیا میں تراجم کے لیے بڑا سازگار رہا ہے۔ پہلے زمانے میں مسلمان ہر اس چیز کا ترجمہ کر لیتے تھے جو فلسفہ اور سائنس میں ان کے ہاتھ لگتی تھی۔ اب ادب کے تراجم پر زور صرف ہو رہا ہے۔ تمہیں شیکسپیر کو اردو میں سننا چاہیے۔ لاہور کی مقامی بولی میں 'پینڈا' نہایت ظریفانہ لفظ ہے۔ شیکسپیر کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو ڈرامے سے کچھ نہ کچھ لطف حاصل ہو ہی جاتا ہے۔"

تیز نیلی آنکھوں والے پروفیسر بخاری نے جو ٹویڈ کا سوٹ پہنے اور نیلے رنگ کی ٹائی لگائے ہوئے تھے برطانیہ اور امریکہ کی غیر افسانوی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو کا ایک مزاحیہ رسالہ بھی مرتب کرتے رہے ہیں انہوں نے انگریزی اور اردو میں ادبی تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت تین یا چار سو مختصر افسانوں پر پھیلی ہوئی ہے جو انہوں نے پطرس کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ان افسانوں کی مقبولیت کی بعض وجوہ یہ ہیں کہ وہ غلط ہیں نقادوں نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ افسانے اگرچہ مزاحیہ ہیں لیکن انہیں بے دھڑک گھروں میں لے جایا جا سکتا ہے۔"

ھ۱ ABSON'S "A DOLL'S HOUSE ______ ھ۲ ELMER RICE'S "THE ADDING MACHINE"

پطرس کو پاکستان میں شگفتہ ترین شخص مانا جاتا ہے۔ ان کے چند افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے، جنہوں نے اہلِ برطانیہ کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ برطانیہ والے کہتے ہیں کہ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک مشرقی مزاحیہ نگار ایسا بھی ہے جو "غزالی" آنکھوں اور ناموافق حالات کو اپنی تحریروں کا مرکز نہیں بناتا۔ ہم نے پوچھا "آخر پطرس اپنی توجہ کا مرکز کس چیز کو بناتا ہے؟" پروفیسر بخاری نے جواب دیا "میری کہانیوں کا مثالی کردار ہمیشہ ایک معمولی آدمی ہوتا ہے جس میں بہت سی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں۔ حادثات اسے ایسے ناموافق ماحول میں پھینک دیں جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔ وہ ہمیشہ بڑا سیاستدان اور عظیم ادیب بننے کے خواب دیکھتا ہو۔ ایک کہانی میں وہ خطرناک سرغنہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ناکام رہنے کے نتیجے میں بہتر آدمی بن جاتا ہے میں نے اپنی تحریروں میں واحد متکلم اور جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے تاکہ طنز کا نشانہ خود بیان کرنے والا بنے۔ پاکستانی اس بات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ

"کھلے مانس بنو"

پروفیسر بخاری ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی بیس اور تیس برسوں کے درمیان چھ سال انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کی سفارتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ء میں اس وقت ہوا جب وہ بین الاقوامی "ہائی فری کونسی براڈکاسٹنگ کانفرنس" منعقدہ میکسیکو میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ وہ لسانیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کوکنی (COCKNEY) کے اختلافی لب و لہجہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے چھ مہینے صرف کئے تھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں بتایا "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کوکنی زبان اپنی گرامر اور حروفِ علت کا مخصوص نظام رکھتی ہے۔" ہم امیدوار بن کر انتظار کرنے لگے۔ لیکن انہوں نے کہا "اب میں کوکنی لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی جرات نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ میں پھر شاہی انگریزی کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ اور بولوں کی جون سے نکل چکا ہوں۔"

ہم نے دریافت کیا کہ آپ سفارتی فرائض اور مزاح نویسی کو کس طرح یکجا کرتے ہیں؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ "مزاحیہ نویسی میں میری پیداوار بہت کم ہو گئی ہے ایک مشکل یہ ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ سفارتی کاروبار میں آپ بعض چیزوں پر ہنس تو سکتے ہیں لیکن مضحکہ اڑانے کی مقدار روایات نے مقرر کر دی ہے۔"

"مجھے نیویارک سے پیار ہے۔ میں بڑے شہر کا باشندہ ہوں تاہم ابھی مجھے ملامت کی جاتی ہے کہ میں چلنے میں بہت سست ہوں۔ دواؤں کے ذخیرے مجھے بہت دل چسپ نظر آتے ہیں۔ جب میں پہلے پہل یہاں آیا تو میں نے ایک سینڈوچ (سموسے) کی فرمائش کی۔ سٹال والے نے پوچھا۔ "سفید یا رئی (ریو گندمی)؟" اس کی بات سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اور وہ یہ ہے تمہاری زبان، چک کا مطلب ہے بل۔ باقی کیا رہا؟ میں اپنے شاگردوں کو لاہور میں امریکہ کے متعلق طویل خط لکھا کرتا تھا تاکہ وہ مجمعوں کے سامنے پڑھ کر سنائے جائیں۔ ایک خط میں، میں نے لکھا کہ یہاں کے کونے کونے پر ایک ڈرگ سٹور موجود ہے۔ انہوں نے جواب میں بڑے خطرے اور تعجب کا اظہار کیا۔ مجھے اگلے خط میں اس کی تشریح کرنی پڑی کہ یہ ڈرگ سٹور زہریلی اور نشہ آور چیزیں نہیں بیچتے، جب معلومات اور واقفیت بڑھ جائے گی تو ممکن ہے کہ پطرس امریکہ کے بارے میں کچھ لکھے۔"

۱۸ ستمبر ۱۹۵۴ء

(ترجمہ)

ہر نغمہ جس کا حُسنِ تمنّائے گوش تھا

محمد عبداللہ قریشی

پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پاکستان کے نہایت ذہین، نہایت روشن دماغ، بے حد ہنس مکھ، خوش پوشاک، خوش گفتار، مشہور ماہرِ تعلیم، انگریزی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب، منفرد مزاح نگار اور کامیاب سفیر تھے۔ ان کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مشہور مبلغ اسلام خواجہ کمال الدین مرحوم نے جب پشاور میں وکالت شروع کی تو بخاری کے والد سید اسد اللہ شاہ ان کے منشی تھے۔ وہیں یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو سیّد احمد شاہ پیدا ہوئے۔ سید محمد شاہ رفعت مرحوم ان کے بڑے بھائی تھے اور سیّد ذوالفقار شاہ بخاری چھوٹے بھائی ہیں جو حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کرنے کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کا ہر امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں انھیں شعر و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میگزین "راوی" کے ایڈیٹر تھے انھوں نے اپنے استاد اٹکنس سے عقیدت کی بنا پر اپنا قلمی نام پطرس اٹکنس اختیار کیا اور اسی نام سے انگریزی کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں کئی مضامین لکھے جنھیں معاوضے کے قابل سمجھا گیا۔ مختلف اُردو رسائل میں بھی بہت سے مضامین لکھے جو ادب، فلسفہ، طنز و مزاح اور فنونِ لطیفہ کے موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو میں وہ صرف پطرس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ "مضامینِ پطرس" اسی عہد کی یادگار ہیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے انگلستان کا رُخ کیا جہاں امانوئیل کالج کیمرج میں داخلہ لے کر انگریزی ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ کی رائے تھی کہ "بخاری کا علم اس قدر فراخ اور وسیع و بسیط ہے کہ ایک انگریز کے لیے بھی اتنا علم اس عمر میں رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔"

وطن واپس آنے کے بعد وہ پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہو گئے۔ ان کی توجہ سے گورنمنٹ کالج کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار میں بہت ترقی ہوئی۔ انھوں نے مباحثوں میں حصّہ لیا، مذاکروں میں جان ڈالی، ڈراموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کے جوہر دکھلائے۔ اپنے دوست سیّد امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر کئی انگریزی ڈراموں کے اُردو ترجمے کیے جن میں برنارڈ شا کا کھیل "آرمس اینڈ دی مین"، ٹرنر کا کھیل "دی مین ہو ایٹ دی پوپوموبک"، چیکوسلاویکی مصنف کیرل چیپک کا ڈراما "آر یو آر" اور ایک ایکٹ کی نقل "باکس اینڈ کاکس" وغیرہ شامل ہیں۔

خالص تعلیمی کاموں میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مبلغ دس ہزار روپے کی رقم مخصوص کر کے یہ اسکیم منظور کی کہ انگریزی کی بعض معلوماتی کتابیں جن سے لڑکوں اور لڑکیوں کو خاص دلچسپی ہو مروجہ دیسی زبانوں میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ اُردو ادب کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس کے بعد کمیٹی ہر سال اس مقصد کے لیے روپیہ منظور کرتی رہی۔ ابتدا میں ڈاکٹر آر۔ ایچ وائٹ ہاؤس اور پروفیسر بخاری اس کے ایڈیٹر اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر وائٹ ہاؤس طویل رخصت پر چلے گئے اور جے۔ ای پارکنسن صاحب ان کی جگہ ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ ایک دفعہ پروفیسر بخاری نے بھی رخصت لی مگر ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی نامزد نہ کیا گیا۔ فروری ۱۹۳۱ء میں جب پارکنسن صاحب بھی ولایت تشریف لے گئے تو کمیٹی نے ایک ایڈیٹوریل بورڈ بنا دیا جو مسٹر جی۔ سی چیٹرجی، اے۔ ایس بخاری اور لالہ رنگ بہاری لال پر مشتمل تھا۔ یہ "پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس" کہلاتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ ترجمے کے لیے کتابیں منتخب کر کے قابل اساتذہ سے انھیں اُردو، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرائے اور خود نظرثانی کر کے انھیں شائع کرنے کا اہتمام کرے چنانچہ مختلف موضوعات پر بیسیوں مفید اور دلچسپ کتابیں شائع ہوئیں اور محکمے کی طرف سے سکولوں میں بطور پیش کش بھیجی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کی تمام کتابیں نظرثانی کے لیے بخاری کے حصے میں آئی ہوں گی۔

۱۹۳۱-۳۲ء میں بخاری کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا گیا چنانچہ اپنے فرائضِ منصبی کے علاوہ چار پانچ سال تک اس خدمت کو بھی باحسن الوجوہ انجام دیتے رہے۔ سیکرٹری کی حیثیت سے آپ نے مندرجہ ذیل سالانہ رپورٹیں مرتب کیں جن سے کمیٹی کی کارگزاریوں کا پتہ چلتا ہے:-

سال ۱۹۳۱-۳۲ء	حجم ۱۵۲ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۳ر جون ۱۹۳۲ء
سال ۱۹۳۲-۳۳ء	حجم ۱۱۶ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۵ر جون ۱۹۳۳ء
سال ۱۹۳۳-۳۴ء	″ ۱۵۴ ″	″ ″ ۱۵ر جون ۱۹۳۴ء
″ ۱۹۳۴-۳۵ء	″ ۸۵ ″	″ ″ ۲۶ر مئی ۱۹۳۵ء

پطرس بخاری نے اس عرصہ میں دو تین ضخیم انگریزی کتابیں خود بھی ترجمہ کیں۔ ان میں ایک تو برٹرنڈ رسل کی تصنیف تھی جس کا ترجمہ "تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ۴۰۷ صفحات کی کتاب ہے جس میں تعلیمی نصب العین، تربیت سیرت اور عام اصولِ تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

دوسری کتاب ہنڈرک فان لون کی سٹوری آف مین کائنڈ تھی جس کا ترجمہ "نوعِ انسان کی کہانی" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں طبع ہوا۔ یہ ۵۲۰ صفحات کی کتاب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ ترجمہ منہ سے بولتا ہے کہ پطرس کا کیا ہوا ہے۔

تیسری کتاب ایف۔ ایل برین صاحب کی تھی۔ انڈین سول سروس کے اس انگریز حاکم نے "دیہات سدھار"، "سقراط ہندوستان کے گاؤں میں"، "ہندوستان کے گاؤں کی اصلاح" وغیرہ کئی مفید کتابیں انگریزی میں لکھی تھیں جو بے حد مقبول ہوئی تھیں ان کی ایک کتاب کا ترجمہ بخاری نے غلام عباس کی مدد سے کیا جو "دیہات میں لوائے سکاؤٹ کا کام" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ دو سو صفحات کی اس کتاب میں دیہاتی سکاؤٹوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنے گاؤں کی بہتری کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

بخاری انگریزی کی روح میں ڈوب کر اردو کی بلند سطح پر ابھرتے اور اس بے تکلفی سے ترجمہ کرتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہونے لگتا تھا اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو مسٹر فیلڈن کنٹرولر نے بخاری کی خدمات مستعار لے کر انھیں اپنا نائب منتخب کیا۔ وہ سات برس تک ریڈیو سے منسلک رہے اور ۱۹۴۰ء میں کنٹرولر جنرل مقرر ہو گئے۔ اس عہدے کی بدولت ان کو بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران دولتِ برطانیہ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے جو سپریم کمانڈ بنی تھی اس میں بھی ان کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ حکومت وقتاً فوقتاً ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس سلسلے میں ان کو حکومتِ ہند کی طرف سے افغانستان بھی بھیجا گیا جہاں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

قیامِ پاکستان سے کچھ قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس حیثیت میں انھوں نے نہ صرف کالج کو فسادات کی زد سے محفوظ رکھنے میں اپنے غیر معمولی تدبر کا ثبوت دیا بلکہ گورنر مغربی پنجاب کے ایما سے حکومت کے مہیا کردہ مستند مواد کی بنا پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام، کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم، راشٹریہ سیوا سنگھ کی تخریبی سرگرمیوں اور سکھوں کی سازشوں اور سفاکیوں کے بارے میں چند رپورٹیں بھی مرتب کیں جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہوئیں۔ یہ ایسی قیمتی دستاویزات ہیں کہ اس عہد کی تاریخ لکھنے والا کوئی مورخ ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

گورنمنٹ کالج ہی سے وہ لندن بھیجے گئے جہاں پاکستانی نمائندے کی حیثیت میں انھوں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا جن کا تعلق انڈیا آفس کے املاک کی تقسیم سے تھا۔

۱۹۴۸ء میں میکسیکو کے مقام پر ریڈیو کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ بخاری نے اس میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی اور ایک نہایت مفید رپورٹ لکھی۔ ۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں آپ نے دولتِ پاکستان کی طرف سے شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں جب خان لیاقت علی خان مرحوم نے وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو ہر شخص نے بخاری کی لیاقت کا لوہا مانا۔ بخاری اس تاریخی دورے میں ہر جگہ ان کے ہمراہ رہے۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے روزانہ اکیس گھنٹے نہایت جانفشانی سے کام کر کے پاکستان کی عزت میں اضافہ کیا۔ اس سے اعصاب پر اتنا بوجھ پڑا کہ صحت خراب رہنے لگی مگر آپ کی خدمات کو اتنا سراہا گیا کہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب نامزد کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ اس جگہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آیا کہ وہ ایک باوقار مقرر اور سلجھے ہوئے سیاست دان بھی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی مجلسِ شوریٰ کی صدارت بھی کی اور خوب نام پیدا کیا۔

حفاظتی کونسل کی مجالس میں بخاری کی شگفتہ اور متوازن تقریریں اتنی پسند کی جاتی تھیں کہ دنیا گوش بر آواز ہو کر سنتی تھی۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ ہر نغمہ حسنِ تمنائے گوش تھا۔ تقریروں کے بعض حصے تو شیکسپیئر اور دوسرے بلند پایہ انگریزی ادیبوں کے حوالوں اور لطیف طنز و مزاح سے مزین ہونے کی وجہ سے ادب پارے ہوتے تھے۔ پاکستان کے مسائل کو جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے آپ نے پیش کیا کہ وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ تیونس کے بارے میں انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار جس انداز میں پیش کیا اس سے تمام دنیا کے مسلمان انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں بخاری کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ کی خواہش پر آپ کو اقوامِ متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ آپ پہلے ایشیائی ہیں جو اس عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ اس عہدے سے اپریل ۱۹۵۹ء کے آخر میں سبکدوش ہونے والے تھے۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں ادبیاتِ انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش قبول بھی کر لی تھی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو نیویارک میں آپ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ افسانۂ حیات سمٹ گیا اور یہ قیمتی وجود اجنبی دیار میں پیوندِ خاک ہو گیا۔

وہیں آرام گاہِ آخری ہے اس سپاہی کی
ہمیشہ جو رہا سرگرمِ جنگِ زندگانی میں

پروفیسر بخاری کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی اور ان کی موت شہادت کی موت۔ انھوں نے ملک و ملت کی خاطر ہر محاذ پر جنگ کی اور اس عزیز وطن کی خدمت میں جان دی جہاں انھوں نے اپنا شباب رنگین کیا اور جوانی چھڑکی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سیاحت کے لیے نئی دنیا

کا ہر ملک خوب ہے لیکن کوئی بیمار رہے تو اپنے وطن میں اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ کیونکہ "انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے کہ اس کے مر جانے پر کچھ غلغلہ ہوگا، کوئی تھامے گا، کوئی اٹھائے گا، کوئی روئے گا، کوئی چلائے گا" مگر ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوئیں ؎

دامن کو منہ پہ ڈال کے رویا نہیں کوئی ۔۔۔ دنیا سے وہ اٹھے بھی تو کس بے کسی کے ساتھ

پروفیسر بخاری کی وفات سے نہ صرف پاکستان کو زبردست ملی نقصان پہنچا بلکہ اقوامِ متحدہ کی سیاسی اور علمی محفلیں بھی سُونی ہوگئیں چنانچہ جنرل اسمبلی نے قراردادِ تعزیت میں ان کے سانحۂ ارتحال پر افسوس کا اظہار کیا اور ہر ملک کے نمائندے نے شاندار الفاظ میں ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا اعتراف کیا۔ ایرانی نمائندے نے کہا کہ بخاری کی ذات نہ صرف اپنے ملک کے لیے مایۂ ناز تھی بلکہ عالمِ اسلام کے لیے بھی سرمایۂ افتخار تھی۔ وہ فارسی خوب جانتے اور بولتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے اور فارسی کے قدیم و جدید ادب سے بخوبی واقف تھے۔

ایک ممتاز عرب خلیل عیلی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے گہرے جذباتِ رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ؎

اقول وقد فاضت لعینی عبرۃ ۔۔۔ الارض تبقی والاخلاء تذھب

یعنی میری آنکھیں اشکوں سے تر ہیں اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ زمین تو وہیں کی وہیں ہے لیکن احباب رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔

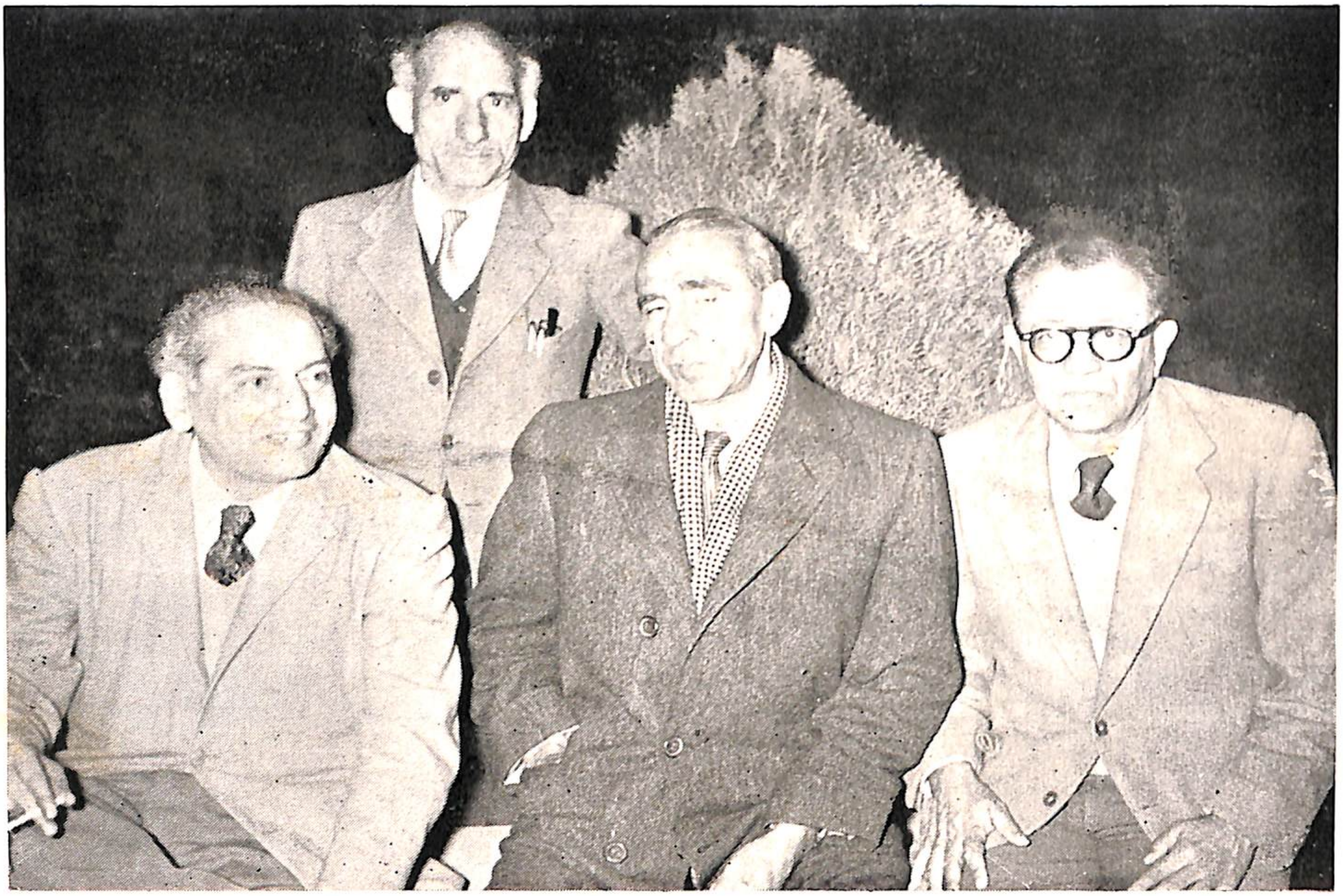
پروفیسر احمد شاہ بخاری کی ذات میں مشرق و مغرب کی خوبیاں جمع تھیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا۔ مسٹر ہیمر شولڈ سیکرٹری جنرل مجلس اقوامِ متحدہ نے ان کی رحلت پر جو اعلامیہ شائع کیا اس میں آپ کی خدمات اور صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پروفیسر بخاری مشرق و مغرب کی میراث کے مالک تھے۔ یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے جس کی بدولت ہم بین الاقوامی مسائل حل کر سکتے ہیں کیونکہ وسعتِ نظر و فکر کے بغیر یہ مشکل کام حل نہیں ہو سکتا۔ نئی دنیا میں وحدت پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ بزرگ میراث اور روایات پر کامل نظر ہو۔ جدید نسل کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی فضائل و مکارم پیدا کرے جو بخاری کی شخصیت میں آشکار تھے۔"

پروفیسر بخاری کی دنیا محدود نہ تھی۔ ان کا مزاج مشرقی، ذہن مغربی اور طرزِ فکر عالمگیر تھا۔ انھوں نے علمی اور ادبی یادگاریں زیادہ نہ چھوڑیں جو کچھ لکھا خوب سمجھ سمجھ کر لکھا۔ ان کی ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے۔ آخری زمانے میں فرینکلن پبلیکیشنز والوں نے تالیف و ترجمے کے کام میں ان کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ بخاری نے سنکلیئر لیوئس کے ناول "ایرو سمتھ" کے ترجمہ کا ذمہ لے بھی لیا مگر اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باعث اسے مکمل نہ کر سکے۔

اس کے بعد ان کی طرف سے بخاری کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ امریکی مصنف مرو کے سلسلہ کتب "دس آئی بی لیو" کی طرز پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دیں۔ بخاری نے اس سلسلے کی کتابوں سے مجوزہ کتاب کے لیے چند ایسے مضامین انتخاب کیے جو پاکستان کے پڑھنے والوں کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ ان منتخبہ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ کرایا گیا اور کچھ نئے مضامین پاکستانیوں سے لکھوائے گئے کہ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر زندگی سے کیا سبق حاصل کیے۔ بخاری نے ترجموں نیز دیگر مضامین پر بڑے غور سے نظرِ ثانی کی اور کتاب کا مختصر دیباچہ بھی لکھا۔ یہ مسودہ عین اس روز لاہور پہنچا جس کی شام کو ریڈیو پاکستان نے بخاری کی وفات کی خبر نشر کی ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ



چار یار

(۱) تاج (۲) پطرس (۳) تبسم (۴) فیض



چھوٹے بخاری　　　　　　بڑے بخاری

بھائی بھائی

سید ذوالفقار علی بخاری

سید ذوالفقار علی بخاری اپنے برادر محترم سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی موت کے بعد ان تمام یادوں کو جو اُن سے وابستہ ہیں "بھائی بھائی" کے نام سے ایک کتابی صورت میں یکجا کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے اُس سراپا زندگی بھائی کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھین کر اپنے لیئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی موت کا یقین کر لینے کے بعد زندگی کا اعتبار اور بھی اُٹھ جاتا ہے۔

سید ذوالفقار علی بخاری کی اس کتاب کا ابھی بچپن ہے مگر اسی دور کے چند اقتباس ہم نے اس لیئے حاصل کر لیئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ سب کا پطرس خود اپنے بھائی کے لیئے کیا تھا۔

میں جناب غلام عباس کا ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھ کو یہ اقتباس نقوش کے لیئے حاصل ہو سکے اور طفیل صاحب سے سرخروئی ہوئی۔

(شوکت تھانوی)

بھائی جان سکول میں پڑھتے تھے اور میں ابھی سکول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ والد گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ میری والدہ سے کہا "لو مبارک ہو۔ کل پیر احمد شاہ کو سکول میں انعام ملے گا"۔

"بھائی گھر آئے تو میں نے کہا لالہ سکول میں مار پٹتی ہے یا انعام ملتا ہے"۔

پوری رات بھر ہم دونوں بھائی جاگتے رہے۔ وہ مجھے سکول کے قصے سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ مجھ سے کہنے لگے "تم بڑے ہوتے تو میں تم کو کل ساتھ لے جاتا"۔

میں رو پڑا۔ انھوں نے مجھے اُٹھ کر پیار کیا اور کہا "اچھا دیکھو کل میں تمہاری شلوار پہن کر انعام لینے جاؤں گا"۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہنسی خوشی سو گیا۔ اگلے دن وہ میری شلوار پہن کر انعام لینے کے لیئے گئے۔ ان کو کچھ کتابیں انعام میں ملی تھیں۔ جن پر سرخ رنگ کا دفتری فیتہ بندھا ہوا تھا۔ کئی دن تک وہ فیتہ میرے پاس رہا اور میں محلے کے لڑکوں کو دکھاتا رہا۔

مَیں سکول میں داخل ہوگیا۔ بھائی جان کے ساتھ سکول جانے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں کچھ ڈھیلے ڈھیلے تھے۔ کبھی بغل میں سے بستہ سرک جائے کبھی تختی پھسل جائے۔ کبھی میں گر پڑوں۔ چنانچہ بھائی میرا بستہ خود اٹھا لیتے اور انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ چلاتے۔

جب میں نے سڑک پر جم کر پاؤں رکھنا سیکھ لیا تو بھائی جان نے اپنا بوجھ مجھ پر لادنا شروع کر دیا۔ اب ان کا بستہ میں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ کبھی ان کو سکول جاتے ہوئے کچھ اور لڑکے مل جاتے تو یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے۔ میں رو پڑتا اور روتے روتے سکول پہنچتا۔

سکول میں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس وقت ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے اور وہی جلسے کے صدر تھے۔ شہر کے تمام روؤسا اور حکام جلسے میں شریک تھے۔ ہمارے والد بھی تشریف رکھتے تھے۔ سکول کے کئی لڑکوں نے نظمیں پڑھیں۔ بھائی جان نے بھی انگریزی میں ایک نظم پڑھی ان کی خواندگی کی بہت داد دی گئی۔ سر جارج روس کیپل بھی بہت خوش ہوئے۔

جلسہ ختم ہوگیا اور لوگ ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے بھائی جان اور میں والد کے پاس کھڑے تھے۔ لوگ والد کو مبارکباد دے رہے تھے اور بھائی جان کو پیار کر رہے تھے کہ اتنے میں بھائی جان کیلئے ڈھنڈیا پڑی۔ ہمارے ایک ماسٹر صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور کہا "چلو پیر احمد لاٹ صاحب بلا رہے ہیں"۔

میں بھائی جان کو لیے ہوئے جلدی جلدی وہیں جمگھٹے میں پہنچا جس کے بیچ میں سر جارج روس کیپل کھڑے تھے۔ والد آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آنے لگے۔ جب سر جارج روس کیپل نے بھائی جان کو دیکھا تو آگے بڑھے اور بھائی جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں کہا۔

"تم نے نظم بہت اچھی طرح پڑھی۔ تمہارا لہجہ بھی اچھا ہے اور تلفظ بھی۔ شاباش"

اتنے میں والد بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ سر جارج روس کیپل نے میرے والد سے مصافحہ کیا اور بھائی جان کے متعلق تعریفی جملے پشتو میں کہے۔ والد نے کہا "صاحب جو لفظ کہہ رہے ہو یہیں لکھ دو تاکہ یہ لڑکا تمام عمر تمہارے کہے کی لاج رکھے"۔

سر جارج نے بھائی کی بغل سے انعام کی کتابوں کے بنڈل میں سے ایک کتاب کی جلد کے اندر کی طرف پنسل سے یہ الفاظ لکھے۔

"اے کاش مَیں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر۔ پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے"۔

یہ سند بہت مدت تک والد نے سنبھال کر رکھی تھی۔ اگلے دن صوبہ سرحد کے واحد اخبار افغان میں اس سند کی کہانی شائع ہوئی۔ عنوان تھا۔

"چھوٹا پیر ـــــــــ پیر احمد شاہ"

بھائی بڑے ہوتے گئے اور ہر سال سکول میں انعام پاتے رہے ـــــــــ میں بھی پانچویں سوار کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ہمارے ایک بڑے بھائی تھے۔ پیر محمد شاہ اللہ انھیں غریق رحمت کرے بہت تیز مزاج بزرگ تھے۔ ہم دونوں کو ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ لیکن کئی باتوں میں ہم ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کو انگریزی ڈھب کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ ہم کو بھی یہ شوق لاحق ہوا۔ وہ شعر کہتے تھے اس لئے والد کے منظور نظر تھے۔ ہم دونوں نے بھی شعر کی طرف توجہ کی۔ جب ہماری شعر گوئی کی خبر بڑے بھائی تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور والد نے بھی اس بات کو نہ سراہا کہ ہم سکول کا کام

چھوڑ کر شعر و شاعری میں پڑ جائیں۔ خود والد شعر کہتے تھے۔ لیکن بچوں میں سے کسی اور کا شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہونا شروع شروع میں انھیں پسند نہ آتا تھا۔ بھائی شعر کہتے مگر انھیں فضول سمجھ کر پھاڑ دیتے۔ میں شعر کہتا اور فضول بھی کہتا تو لوگوں کو سناتا۔ میں نے بہت سے تخلص کھے ماثر۔ ذوالفقار۔ واجداں مگر ان میں سے کوئی نہ مجھے پسند آیا نہ میرے بھائی کو۔ ایک دن جب اس تخلص کا جھگڑا در پیش تھا تو کہنے لگے تخلص کیوں ضروری ہے۔ میں نے کہا مقطع کے لئے۔ پھر کہا مقطع کیوں ضروری ہے، میں نے کہا تاکہ معلوم ہو کہ غزل کس کی ہے اور کہا باقی شعر۔ میں چپ ہو گیا۔ اور تخلص رکھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد بھائی جان گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور ان کے خط آنے لگے۔ ایک خط میں بھائی نے مجھے لکھا کہ میں نے یہاں راجا غضنفر علی خان اور پنڈت اوتار لال بقایا کو دوست بنایا ہے۔ راجا غضنفر علیخاں تو بہت بے سُرے ہیں لیکن پنڈت اوتار لال بہت خوب گاتے ہیں اور باجا بھی بجاتے ہیں۔ میں نے بانسری بجانی سیکھ لی ہے اور اُن کے باجے کے ساتھ بانسری بجاتا ہوں۔ بھائی نے مجھے تاکید کی کہ اس بات کو صرف اپنے تک رکھوں۔

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

سر ظفر اللہ خاں

احمد شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء کے آخری ایام میں ہوئی جب وہ (لاہور میں) کالج کے طالب علم تھے۔ میری ان کی رفاقت چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ ابتدائی دور ہی میں ان کے جگمگاتے اوصاف ہر اس شخص کا دل موہ لیتے تھے جسے ان کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا۔ انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی یہ امتیازی خصوصیت کیمبرج اور بالآخر امریکہ میں بھی برابر قائم رہی۔

بخاری ہر اس صحبت یا اجتماع کی روح ورواں ہوتے تھے، جس میں انہیں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا۔ وہ بڑے تیز فہم اور حاضر جواب تھے ان کی شخصیت گوناگوں صفاتِ حسنہ کی حامل تھی۔ انگریزی زبان پر قدرت، ہر دور کے انگریزی ادب سے قریبی واقفیت، ملٹن اور شیکسپیئر کی تصانیف سے گہری شیفتگی، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو بخاری کی شخصیت میں متوازن طور پر جمع ہو گئی تھیں۔ اور ان کی گفتگو، حاضر جوابی، مکالمے اور مباحثے کے دوران پھلجھڑیاں بن کر اپنے اظہار کی راہیں تلاش کر لیتی تھیں۔ اسی طرح اردو میں بے تکلف اظہار اور اس کی آمد برابر کا وصف سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں، لیکن بخاری بانسری بجانے میں بھی قابلِ تعریف مہارت رکھتے تھے۔

وہ مغربی پاکستان کی قدیم ترین تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے انگریزی کے پروفیسر اور بعد میں پرنسپل مقرر کئے گئے۔ یہ بات انگریزی زبان اور ادب میں ان کے بلند مقام کی آئینہ دار ہے۔ مگر یہ ان کے ایک جز کی قدردانی تھی۔ انہوں نے سفارت کے میدان میں اس کے برابر امتیازی مراتب کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر بین الاقوامی تنظیم میں داخل ہو کر اپنی زندگی کے سفر کا اعلےٰ ترین مقام پا لیا۔ زندگی کی دوڑ میں جو نمایاں طور پر درخشاں تھی وہ جہاں رکے اور جس رتبے پر فائز ہوئے وہاں ہر شخص نے انہیں صفِ اوّل کے لوگوں میں شمار کیا۔

بخاری زندگی کے ابتدائی دور ہی میں صحت کی تشویش ناک خرابی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور عمر بھر یہ روگ پالتے رہے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں مسٹر فیلڈن کے ساتھ کام کر رہے تھے تو حیاتی لحاظ سے بہت آزردہ اور دل شکستہ رہتے تھے۔ انہیں خرابیِ صحت کی شدید کیفیت کا مقابلہ بھی درپیش تھا جس نے بعد ازاں کم و بیش دائمی مرض کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان ایام میں انہوں نے اس مرض کے پے در پے تکلیف دہ حملوں کا مقابلہ بڑی ہمت اور پامردی سے کیا۔ اور اپنی جسمانی تکالیف کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں حائل نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب وہ مسٹر فیلڈن کی جگہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل بنائے گئے۔ تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس بات نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ کسی قدر کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ۱۹۵۳ء میں ان پر بیماری کا جو ناگہانی حملہ ہوا اسے ان کی مستقل رنجوری سے کوئی علاقہ تھا یا نہیں تاہم یہ حملہ شدید تھا

جس کی وجہ سے انہیں کئی ہفتے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس حملے سے وہ بچ گئے تو ہم سب نے اپنے آپ کو مبارک باد کا مستحق گردانا کہ وہ اپنی دلچسپی کے مختلف میدانوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں گے۔ ہم پُر امید ہو گئے کہ مناسب احتیاط سے وہ اپنی فیض رساں اور لطف اندوز زندگی کے کئی مزید سال ہمارے درمیان بسر کر سکیں گے۔

جتنا عرصہ انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے کام کیا ہمیں مل جل کر بہت قریب رہنے کا موقعہ ملتا رہا۔ انہی دنوں مجھے بخاری کی ذہانت و تدبر کے بعض ایسے اوصاف کو بہ نظر غائر دیکھنے کا موقع ملا جو پہلے چنداں واضح اور روشن نہ تھے۔

اس اطلاع نے کہ بخاری خون کے دباؤ سے صاحبِ فراش ہو گئے مجھے اچانک صدمہ پہنچایا لیکن جب میں نے نیویارک پہنچ کر دیکھا کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اگرچہ انہیں تندرست ہونے کے لئے کئی ہفتے انتظار کرنا پڑا۔

اٹھارہ ماہ بعد وہ اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ اس بات نے ان کے لئے موقع مہیا کیا کہ وہ اپنی قابلیت اور استعداد احسن طریقے پر پوری وسعت کے ساتھ بروئے کار لائیں۔ اقوام متحدہ میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ابھی انہوں نے اقوام متحدہ میں اپنے فرائض انجام دینے شروع نہیں کئے تھے کہ مجھے اپنے موجودہ منصب کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد مجھے بخاری سے ملنے کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ البتہ جب کبھی میں نیویارک جاتا تھا۔ تو ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا تھا۔ میرے دل میں یہ خطرہ پیدا ہونے لگا تھا، کہ بخاری کے قوائے جسمانی پر جو بوجھ پڑ رہا ہے وہ بہت بھاری ہے اور آخرکار ان کے دل پر اثر ڈال کر رہے گا۔ ایک اور بات جس نے میرے اس احساسِ خطر کو تیز تر کیا یہ تھی کہ بخاری تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اس حال میں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے حد درجہ متاثر، فکرمند اور غمگین ہو جاتے تھے جنہیں عام حالات میں نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت کا یہ رخ سنبھالا ثابت ہونے کی بجائے ان کی گرتی ہوئی صحت کی ایک علامت بن گیا۔

اچانک، ان کے انتقال کی اطلاع، جو مجھے لندن کے اخبار "ٹائمز" کی وساطت سے ملی، میرے لئے صدمہ عظیم تھی اس صدمے کے اثر سے میں کچھ وقت گذرنے کے بعد ہی سنبھل سکا۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز عدالت کے پرائیویٹ اجلاس میں، میں اپنے پیڈ پر کچھ لکھتا رہا یہ میری عادت کے سراسر خلاف بات تھی۔ میں ٹھٹھکا اور جو کچھ میں نے لکھا تھا اسے دیکھا وہاں یہ شعر نظر آیا ؎

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ بخاری کے نمایاں ذہنی و فکری اوصاف کے لئے میرا لاشعوری خراجِ تحسین تھا۔ اور اس نقصان پر احساسِ رنج و الم کا اظہار، جسے ہم اس لئے زیادہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں ترقی برسوں سے لے کر بلندیوں پر پہنچنے کے وقت سے جانتے چلے آئے ہیں۔

خدا ان کی روح کو آسودگی نصیب کرے۔

(ترجمہ)

میرا نام بخاری ہے

بی۔ اے۔ ہاشمی

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"آجائیے"

"السلام علیکم ...... امتیاز ہیں؟"

"کمرہ آپ کے سامنے ہے دیکھ لیجئے۔"

نمایاں طور پر مسکراتے ہوئے "میرا نام بخاری ہے امتیاز نے کہا تھا وہ آپ کے پاس آئیں گے تو ابھی نہیں پہنچے۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں
یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کر لوں۔"

"بسم اللہ"

یوں میری اور بخاری صاحب کی ۱۹۲۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی۔

بخاری صاحب بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتیں کرتے رہے پھر دلی شہر گفتگو کا موضوع بن گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک دلی کے آثار قدیمہ
سے لے کر کارخانہ داروں کے طور طریق اور رہن سہن کی باتیں ہوتی رہیں۔ سورج ڈھل گیا۔ مغرب کی اذانیں ہونے لگیں۔ بخاری صاحب بولے۔ دیکھئے
امتیاز نہیں آئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ زبان پر یہ لفظ تھے لیکن چہرے پر شادابی کہ اچھا کیا تیرا وقت ضائع کیا۔ پھر بولے آپ شام کو ٹہلنے نہیں
جاتے۔ میں نے کہا۔ التزاماً اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ جی چاہے تو چلئے۔ یوں بخاری صاحب اور میں ٹہلنے نکلے جو پھر مہینوں لیکن بے قاعدگی
سے جاری رہا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ واپس آئے تو پھر میرے کمرے میں۔ ملازم نے کہا میاں کھانا لے آؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ اپنی کرسی پر اطمینان
سے بیٹھتے ہوئے فضا کو مخاطب بنا کر بخاری صاحب بولے اب چلنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا دال روٹی یہیں کھا لیجئے۔ انڈوں اور دہی کے اضافے کے
بعد کھانا آیا۔ ہم دونوں نے معمولی اور مختصر کھانے کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں ختم کیا۔ ساڑھے نو کے قریب بخاری صاحب بولے۔ اچھا بھائی میں
چلا۔ میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کواڈرنگل میں رہتا ہوں۔ میں بھی ہمراہی کے لئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور نیلے گنبد کے چوک سے واپس آگیا۔

اس دن کے بعد کم و بیش بلاناغہ شام کی ملاقاتوں کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔

ہمارے ایک مشترکہ دوست کو بخاری صاحب کا اس باقاعدگی سے میرے پاس تشریف لانا کچھ گراں گزرا۔ ایک دن وہ بولے کہ دیکھو
بخاری! باوجود دیرینہ رسم کے تم میرے پاس نہیں آتے اور ہاشمی کے پاس روز آتے ہو۔ بخاری صاحب نے جواب دیا ملک صاحب یہ دل ملے کے سودے

ہیں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں روز حاضر ہوں۔ تو میرے آنے کی ٹیوشن بلکہ 'وزی ٹنگ فی' مقرر کر دیجئے۔ سو روپیہ مہینہ پر روز ایک گھنٹہ کے لئے مقررہ وقت پر حاضر ہوا کروں گا۔ البتہ اتوار اور چھٹی کے دن نہیں۔

بخاری صاحب بڑی ہموار طبیعت کے آدمی تھے۔ اکثر باتیں ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ غالباً وہ چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کو دوسروں کا مذاق اڑانے کا خمیازہ سمجھ کر ایسا کرتے تھے لیکن جب گرم ہوتے تو بہت گرم ہو جاتے مگر شاذ و نادر۔

بیدل صاحب اس زمانہ میں انار کلی کے دہلی مسلم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان کے پاس کبھی کبھی امتیاز، بخاری اور چند اور دوست ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن بیدل صاحب نے ازراہِ شفقت دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا شروع ہوا تو بیدل صاحب کو خیال آیا کہ بخاری صاحب کو دہی سے بہت رغبت ہے۔ بولے آپ لوگ دہی کھائیں گے۔ یک زبان ہو کر سب نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ بیدل صاحب نے آواز دی۔ ارے لمڈے۔ ایک آنے کا دہی لے آ۔ سستا زمانہ تھا لیکن ایک آنے کا دہی تو اس وقت بھی ایک ہی آنے کا ہوتا تھا۔ بخاری صاحب بولے۔ بیدل صاحب یہ دہی کیا ملنے کے لئے منگایا ہے۔ بیدل صاحب ذرا تنک مزاج تھے برہم ہو گئے۔ بخاری صاحب نے بھی خلافِ معمول برہمی کا جواب برہمی سے دیا۔ بہر حال بات آئی گئی ہوئی لیکن لوگ بدمزہ ہو کر لوٹے۔

بخاری صاحب غیر ارادی طور پر ہمیشہ محفل کی توجہ کا مرکز خود ہی رہنا چاہتے تھے۔ کبھی علم میں ٹھٹھول کی چاشنی اور کبھی ٹھٹھول میں علم کی لاگ لفظوں کے الٹ پھیر سے، بات کی برجستگی سے ذہانت اور حسبِ موقع معصوم رونی تھے سے وہ ہر بات اور ہر حرکت میں ایک ایسی لذت بھر دیتے تھے کہ محفل کی نگاہیں اور کان ان کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔

ایکٹر اور تمثیل کار ایک معنوں میں خوش نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنے پارٹ تجویز کرتے ہیں۔ کبھی تخت شاہی اور کبھی کاسۂ گدائی، کبھی ہمہ وقت خوش باشی اور خوش کامی اور کبھی پیہم مصائب و آلام۔ لیکن زندگی کا رنگ نرالا ہے۔ اس میں اپنی پسند اور انتخاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اس میں رنج اور خوشی توام ہیں۔ تاہم ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کاری بنا لے۔ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا صرف وہی رخ پیش کرے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو۔ بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ یہی تھا۔ تاہم ان کے نیازمندوں میں دو تین ایسے شخص بھی تھے جن کے سامنے وہ دکھ سے رو دئیے ہوں یا خوشی سے ہنس پڑے ہوں۔ شاذ و نادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ چہکنے والا بخاری اور ہر بات میں امرت گھولنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے ایسے موقعوں پر اس کا دل اس کی زبان سے زیادہ بلاغت اور ندرت سے اپنی کہتا تھا۔ اور دوسروں کی سنتا تھا۔ یہ لمحے اس کے نیازمندوں کو نہیں بھول سکتے اور خواہ کوئی خود کو کتنا ہی زبان آور اور قلم کا دھنی کہے، بیان نہیں کئے جا سکتے۔

محبت کے فسانے دیدۂ و دل کی امانت ہیں
خیانت سے زباں کو محرمِ اسرار کر لینا

بخاری صاحب احسان فراموش نہیں تھے لیکن احسان مندی کے اعلان کے بھی قائل نہ تھے ان کی رائے میں اظہار احسان مندی محسن کو خفیف اور خود کو بھکاری بنا دینے کے مترادف تھا۔ محکمہ تعلیم اور پھر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں وہ ہمیشہ جوکھی لڑتے رہے لیکن یہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ عمر یا زید سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک بار ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں دشمن نے نرغہ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک مسلمان ممبر نے بے طلب و درخواست پانسہ بخاری صاحب کے حق میں پلٹ دیا اور یوں بخاری صاحب نے تشویس سے نجات پائی لیکن اس کے بعد بخاری صاحب ان

صاحب کے سامنے پڑنے سے بچتے رہتے۔ میں اس قصے سے آگاہ تھا ایک دن میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ دیکھو فلاں نے تمہاری یہ مدد کی اور تم یوں طرح دے جاتے ہو کہ سامنے جا کر سلام دعا بھی نہیں کرتے۔ وہ تمہارے شکریہ کے محتاج نہیں لیکن تمہاری شرافت کا تو یہی تقاضا ہونا چاہیئے کہ تم شکر گذار ہو۔ بولے۔ سنو بھائی یہ پرانے زمانے کے بزرگ ہیں۔ بے کہے انہوں نے کرم فرمایا تھا۔ ان کے احساس خوش کاری اور فسخ مندی کو میں شکریہ کے چند جملے کہہ کر کیوں ضائع کروں۔

دورانِ ملازمت میں ہر ملازم کی طرح بخاری صاحب کو بھی اکثر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرنی پڑتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کے چیرمین کی جگہ خالی ہوئی۔ بخاری صاحب کو نظر انداز کر کے ایک فرنگی کو چیرمین بنا دیا گیا۔ بخاری صاحب نے پرنسپل سے تحریری احتجاج کیا۔ اس نے اپنے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے بخاری صاحب کی درخواست ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس بھیج دی۔ ڈائریکٹر نے بھی پرنسپل کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ بخاری صاحب نچلے نہ بیٹھے اور درخواست صوبے کے گورنر کو محکمانہ وسیلے سے ارسال کر دی۔ گورنر نے روبہ کاری کو بلایا۔ اور کہا کہ گورنمنٹ کالج میں تو انگریزی کا چیرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیئے۔ بخاری صاحب نے جواب دیا۔ حضور کا ارشاد بجا لیکن اگر گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کا چیرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیئے تو اس انگریز کے پاس انگریزی کی فرسٹ کلاس ڈگری بھی ہونا چاہیئے۔ بخاری صاحب کی ڈگری فرسٹ کلاس تھی اور دوسرے شخص کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ فرنگی گورنر نے تالی بجا کر کہا کہ ملاقات نعرہ تحسین کے بعد ختم کی جاتی ہے اور بخاری صاحب شعبہ انگریزی کے چیرمین ہو گئے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ایک دو سال اچھے خاصے بدمزہ سے گذرے لیکن انہوں نے کبھی اپنی پریشانی کا حال بیان نہیں کیا۔ اپنے تمام حربے استعمال کرتے رہے اور آخر کار تمام دشواریوں پر فتح پائی۔ ان کے ایک مچانے کا قصہ سنیئے :—

میں لاہور سے دلی گیا ہوا تھا۔ صرف ایک آدھ روز کے لئے۔ بغیر اطلاع بخاری صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ محکمے کے فرنگی افسرِ اعلےٰ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان کی اور میری بے تکلف ملاقات تھی۔ وہ سمجھے کہ میں ان سے ملنے کو آیا ہوں۔ نہایت گرمجوشی سے ملے تھوڑی سی گفتگو کے بعد جب انھوں نے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا تو میں نے بتایا کہ میرا مقصود اس وقت بخاری صاحب ہیں۔ یہ بات اسے اچھی لیکن خلش کو دور کرنے کے لئے اس نے سلسلہ گفتگو دراز کر دیا۔ اچھے خاصے پندرہ منٹ کھڑے کھڑے اور باتیں کرتے گزر گئے تو بولا چلو میں تمہیں بخاری کے کمرے میں پہنچا دوں۔ بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میرے اچانک پہنچنے پر متعجب اور خوش ہوئے۔ فوراً غالب کا مصرع پڑھا۔

آئے خدا کرے یہاں، پر نہ کرے خدا کہ یوں

مجھے بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچا کر فرنگی رخصت ہو گیا۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ وہ صاحب پھر آ گئے۔ کاروباری بات کی مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ایک ضروری دورے پر وہ اگلے ہفتہ خود مدراس جائیں گے اور اس لئے بخاری صاحب کے پیشِ نظر جو بھی پروگرام ہو وہ منسوخ کر دیا جائے۔ چونکہ بخاری صاحب کو دفتر میں موجود رہنا ہوگا۔ نہایت خوش ہو کر بخاری صاحب بولے۔ آپ ضرور مدراس جائیے شکر کا مقام ہے کہ میں گرمی کے زمانے میں ریل میں بیٹھ کر ریگستان کی خاک پھانکنے سے بچ گیا۔ دلی کا خوش گوار موسم، دفتر کا دل پسند کمرہ، میں نہایت خوشی سے دفتر میں رہوں گا۔

وہ فرنگی افسرِ اعلےٰ بخاری صاحب کو میرے آگے ہلکا بنانے آیا تھا لیکن خود سبک ہو کر واپس ہو گیا مگر خراشیدہ باہست قصد خراش۔

دس منٹ کے بعد پھر آیا اور بولا بخاری صاحب مجھے کاغذات دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اگلے ہفتہ ایک دو معاملات کے لیے میری دلی میں موجودگی ضروری ہوگی۔ اس لیے اب تم ہی دورے پر مدراس چلے جاؤ۔ بخاری صاحب اچھل پڑے۔ تالیاں بجانے لگے "اللہ وہ تاڑ کے لمبے لمبے جھومتے ہوئے درخت۔ وہ نیلا سمندر، وہ خاموش فضائیں، وہ فلاں اور فلاں سے ملاقات، یقین جانو صعوبتِ سفر دو لمحے بھی یاد نہ رہے گی۔" اس شخص نے بھونچکا ہو کر بخاری صاحب کا منہ دیکھا اور کچھ کہے بغیر کلغی گرائے کمرے سے چلا گیا۔

میں اس ڈرامے کا تماشائی تھا۔ بخاری صاحب بولے۔ بھائی اگر یہ سال بھر اور رہ گیا تو یہاں سے پاگل خانے جائے گا۔

قصہ مختصر سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں لیکن آل انڈیا ریڈیو کا فرنگی چند ماہ کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ اور بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے افسرِ اعلےٰ مقرر ہوئے۔

بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل ہو گئے لیکن بوجوہ یہ زمانہ بخاری صاحب کے دوستوں اور بخاری صاحب کے لیے خود ایک آزمائش کا دور تھا۔ آل انڈیا ریڈیو ایک نیا اور اس لیے پھیلنے اور بڑھنے والا محکمہ تھا۔ روز نئی نئی نوکریاں نکلتی تھیں اور ہر نوجوان اس محکمہ میں نوکری کا خواہش مند تھا۔

بخاری صاحب کے دوستوں نے بہ قدر تعلقات میں سفارشی خطوط لکھنے شروع کئے اور اپنے اپنے امیدواروں کی ناکامی پر ابتدا میں خفیف سی خفگی اور بعد ازاں رنجش کا اظہار شروع کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کبھی کسی کی سفارش بخاری صاحب سے نہ کی۔ لیکن ایک روز گفتگو کرتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ مرد خدا فلاں دوست نے جو ہمارا محترم اور محسن ہے اپنے بیٹے کے لیے تمہیں لکھا اور تم آئیں بائیں شائیں کر گئے۔ یہ کیا طور ہے صاف لکھ دیتے کہ اس کو ملازمت دینا ممکن نہیں لیکن لیت و لعل میں ڈال دینا قطعی غلط ہے۔ بخاری صاحب نے جواب کی تمہید میں سرکاری قسم کی توجیہات پیش کیں جن سے ہر سرکاری ملازم واقف ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ بھائی ہر ایک خواہش مند کو نوکری کہاں سے دوں البتہ میں اس کمی اور کوتاہی کو اور ذرائع سے پورا کر دیتا ہوں۔ مثلاً کوئی فلاں صاحب کا خط لائے تو میں کہہ دوں گا۔ دفتر میں خط لائیے۔ اور فلاں صاحب کا خط ہو تو کھول کر پڑھتا ہوا برآمدے میں آ کر عرض گزاروں سے ملاقات کروں گا۔ غرضیکہ اسی طرح کسی سے دفتر کے کمرے میں اور کسی سے ڈرائنگ روم میں ملتا ہوں بہت محترم اور عزیز دوستوں کے سفارشیوں کو گھر پر ٹھہرا بھی لیتا ہوں۔ موٹر میں صفدر جنگ اور ہمایوں کے مقبرے کی سیر بھی کرا دیتا ہوں۔ نہایت لذیذ گفتگو کے بعد بولے کہ بھائی سفارشی خطوط کی پذیرائی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔

بخاری صاحب نے شعر و نثر میں بہت ہی کم لکھا ہے شعر میں ایک نظم جس کا عنوان میں بھول رہا ہوں اور جو شاید کبھی چھپی بھی نہیں۔ دو تین غزلیں اور چند متفرق شعر۔ نثر میں پطرس کے مضامین کے علاوہ ایک کہانی عشق کی خودکشی اور چند متفرق مضامین جو کہکشاں میں چھپے اور گالزوردی کا ایک ترجمہ سیب کا درخت۔ مجھے یاد نہیں کہ انگریزی میں ایک دو مضمون کے علاوہ جو پاکستان ٹائمز میں چھپے اور کوئی چیز بخاری صاحب نے لکھی ہو۔ اس سرمایۂ ادب کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت اس کا انوکھا پن ہے .... وہ پچیس تیس بلکہ چالیس پچاس شعر کہتے۔ دو ایک دوستوں کو ایک ایک کر کے کبھی ایک کبھی دوسرا شعر سناتے۔ تنقید سے مستفیض ہوتے جو شعر معیار پر پورا اترتا اسے رکھتے اور باقی اس طرح بھول جاتے، جیسے کبھی لکھے ہی نہ تھے۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ بخاری صاحب پر بحیثیت ادیب یا نقاد کچھ عرض کروں۔ مجھ سے بہتر بہت سے حضرات ہیں جو مبسوط مضامین تحریر فرمائیں گے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ بخاری صاحب کو قدرت نے یہ دولت فراوانی سے عطا فرمائی تھی کہ وہ چھپے ہوئے کونوں میں اپنی ذہانت کی

روشنی ڈال دیں۔ اور ان گوشوں کو منور کر دیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔

بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔ اعلانِ آزادی کے بعد گورنمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تو پھر طالبِ علمی کے زمانے سے ملتی جلتی محفلیں گرم کرنے کی سوجھی۔ میں اس زمانے میں ٹریننگ کالج میں تھا اور اس لئے بہر نوع ان کے بہت قریب۔ سال ڈیڑھ سال ایسا گذرا کہ "من دانم و دل داند و داند دلِ من" ہم دونوں کو بہت سی آسانیاں میسر تھیں اس لئے بلا لحاظ وقت یا قید لباس جب جی میں آیا ایک دوسرے کے پاس پہنچ گئے۔ شام کے بعد اور رات گئے تک کی صحبتوں میں میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اس معاملے میں کچا ہوں اس لئے اس وقت بخاری صاحب موٹر میں بیٹھ کر ادِہر اُدہر دوستوں پر یورش کیا کرتے تھے بلکہ ملاقاتوں کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے ہر دس پندرہ دن کے بعد اپنے گھر رات کے کھانے کی دعوتوں کا سلسلہ شروع کیا جو کئی مہینے چلتا رہا دعوتوں میں ان کے پانچ چھ نیازمند شریک ہوتے تھے ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میرے دوستوں کا خون سفید ہے۔ کھانے کو بلاؤ تو بلا تامل آ بیٹھتے ہیں ویسے ادہر کا کبھی رُخ بھی نہیں کرتے۔ دس بارہ برس گذر گئے لیکن ؎

کسے کہ محرم بادِ صبا است میداند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

یہ قصے کہاں تک لکھے جائیں اگر اس زمانے میں انتہائی عدیم الفرصتی نہ ہوتی تو بھی یہ داستان اتنی طویل ہے کہ اس کا لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔

ایک بار میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ میرے نزدیک "کلچرڈ" آدمی کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ تنہائی سے نہ گھبرائے اور آپ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی سے خوف زدہ رہتے ہیں یعنی میرے نزدیک آپ کلچرڈ آدمی نہیں ہیں یا میری 'کلچرڈ' ہونے کی تعریف غلط ہے۔ باوجود میرے کچھ کہنے کے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرے پر افسردگی نمایاں ہو گئی۔ میرا گمان ہے کہ بخاری صاحب کے تحت الشعور میں ان کی زندگی کے کم از کم آخری دس پندرہ سالوں میں جان لیوا مرض کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس کو ظاہر کریں۔ لیکن وہ ہمیشہ انجامِ مرض سے خائف رہے۔

اس دن کے بعد میں نے اس قسم کی کوئی بات بخاری صاحب سے نہ کی۔

گورستانِ ادب کا فقیر

عبدالمجید سالکؔ

مسلم ٹاؤن لاہور

مکرمی، السلام علیکم

آپ کے دو تین خط ملے لیکن میں کسی ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ حالانکہ یہ کوتاہی میری وضع کے خلاف ہے۔ بخاری کا مرنا، میری محفلِ احباب کا قطعی طور پر اجڑ جانا ہے زندگی بالکل بے مزہ و بے رنگ ہو کر رہ گئی۔

آپ کو غالباً معلوم نہیں، میں کوئی سال بھر سے عوارضِ قلب میں مبتلا ہوں۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ چکا ہے۔ مرکھپ کر ایک آدھ نثری تقریر ہفتہ میں لکھ لیتا ہوں اور بس۔ آج کل بھی بلڈ پریشر میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر محمد یوسف مہینوں سے علاج کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں تو بے حد شرمندہ ہوتا ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ تعمیلِ حکم کر سکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو شاید کچھ لکھ دوں نہ ہوا تو معذور جان کر معاف فرما دیجئے گا۔

عبدالمجید سالکؔ

مولانا عبدالمجید سالک کا یہ خط مجھے ۱۳ر دسمبر ۵۸ء کو ملا تھا۔ مگر اس عرصے میں مولانا موصوف کی صحت اور بگڑ گئی، اتنی بگڑی کہ ہم لوگ دم سادھ کے رہ گئے۔ مضمون لکھوانا تو درکنار ہمیں اپنی زندگی ان کے حساب میں جمع کرانا پڑی۔ تب کہیں انہیں دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

ابھی دو چار روز کی بات ہے کہ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی ہوئی تو پھر پطرس پر لکھنے کے لئے کچھ عرض کروں گا۔ انہیں دیکھا تو کچھ کہا نہ گیا۔ دل کی دل ہی میں لے کے واپس آ گیا۔

بخاری صاحب کے جتنے گہرے تعلقات مولانا عبدالمجید سالکؔ سے تھے۔ اتنے اور کسی سے نہ تھے۔ دین تھے تو یہ، دنیا تھے تو یہ، دوست تھے تو یہ، بھائی تھے تو یہ، مشیر تھے تو یہ، استاد تھے تو یہ، گویا سب کچھ بخاری صاحب کے لئے سالکؔ صاحب ہی تھے۔

بیماری نے انہیں اس حد تک نڈھال کر دیا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ پطرس کے لئے کچھ نہیں لکھ سکتے حالانکہ اتنا کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ آپ پڑھ پڑھ کر خوش ہوں اور یہ لکھ لکھ کر۔

مجبوری کے عالم میں' مولانا موصوف کی دو چھوٹی چھوٹی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو بخاری کی وفات پر ریڈیو پر ان کا پیغام ہے دوسرے ایک اور مطبوعہ تحریر جس میں پطرس بھی ہے اور مجید بھی۔

(محمد طفیل)

(۱)

احمد شاہ بخاری کی موت پاکستان میں علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے اس کے دوست اشکبار ہیں اور پورا ملک نا قابلِ تلافی نقصان پر ششدر و مبہوت ہو رہا ہے۔ اس بے نظیر قابلیت کے افراد ہمارے ملک میں نایاب ہیں جو زندگی کی ہر مصروفیت میں اپنے اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئیں۔ بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کی حیثیت سے' آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے' پھر اپنے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے' اس کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت سے۔ جہاں کہیں بھی رہے سر بلند، ممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ ادب و انشا، طنز و مزاح اور تنقید عالیہ میں دور دور تک اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ صرف پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ پورے برصغیر میں بخاری کے بیسیوں شاگرد اپنی اپنی حکومتوں کے اعلٰے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اور بہترین خدمات بجا لا کر اپنے عالی قدر استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بخاری نے ادب و انشا میں بہت قلیل سرمایہ چھوڑا ہے، لیکن اس کے قلم سے جو چند تنقیدی مضامین اور جو ایک دو کتابیں نکلیں۔ وہ ہمیشہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کو صحیح الخیالی اور بالغ نظری کا سبق دیتی رہیں گی۔ اور پاکستان ہمیشہ اپنے اس عدیم المثال اور عالی دماغ فرزند پر ناز کرتا رہے گا۔

(۲)

جن دنوں میں کراچی میں مقیم تھا۔ بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہئیے کوئی نیا دوست بھی بنایا۔ میں نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو۔ کبھی دوست بھی بنائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس عمر میں؟ دوست تو نوجوانی میں میسر آتے ہیں۔ اور خود بخود بن جاتے ہیں۔ البتہ بعض مخلص نوجوان زندگی کے ہر حصے میں ملتے ہیں جن کے خلوص پر جان قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً تم نے مجید لاہوری کا نام سنا ہوگا، کراچی میں یہ شخص میرا انتہا رفیق اور دوست ہے۔ اسے عالم اور ادیب ہونے کا دعوےٰ نہیں۔ لیکن طبیعت کی جودت کی وجہ سے اچھے اچھے عالم اور ادیب اس کی قدر کرتے ہیں۔ کہنے لگے تو پھر ہم سے اس کی ملاقات ضرور کرا دیجئے۔

ایک دن میں مجید کو لے کر برسٹل ہوٹل کے پاس بخاری کے ہاں گیا۔ "جنگ" کا "حرف و حکایت" تو پڑھتے ہی تھے۔ اب اس کے مصنف کو دیکھا تو بے حد نہال ہوئے اور جب باتیں سنیں تو اور بھی زیادہ فریفتہ ہوئے۔ مجید کی بھولی بھالی صورت' اس کے بے ضرر تفنن اور مخلصانہ سادگی کی وجہ سے پہلی ہی ملاقات میں اس سے یوں پیار کرنے لگے۔ جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ مجید کی نظمیں سنیں تو اور بھی لٹو ہوئے۔ اس کے بعد قرار پایا کہ ہر روز رات کے وقت کھانے کے بعد سالک کے مکان پر "خلوتِ اُنس" برپا ہوا کرے۔ جس میں بخاری اور مجید کے سوا کوئی نہ ہو۔ چنانچہ عقب ریڈیو اسٹیشن والے مکان میں یہ نشست باقاعدہ منعقد ہونے لگی۔ خشک پھل کی پلیٹیں تپائیوں پر پڑی ہوتیں۔ چلغوزوں کا انبار موجود ہوتا اور نمکین اور گرما گرم کشمیری چائے کے بھرے ہوئے تھرمس تیار رہتے۔ بخاری' مجید اور میں چائے کی چسکیاں لیتے' چلغوزے کھاتے اور غزلیں پڑھتے۔ یہ صحبت بعض اوقات دو دو بجے رات کو ختم ہوتی۔

ان صحبتوں میں مجید کراچی کی سیاسیات' پاکستان کے بعض اکابر کی خصوصیات اور بعض ادبی' مجلسی اور اقتصادی (یعنی تجارتی) شخصیتوں

کے لطیفے اپنے مخصوص انداز میں سنانا۔ بخاری بے حد شگفتہ ہوتے۔ اور اقوام متحدہ اور امریکہ کے واقعات کی "جگالی" کرتے۔ اور پرانی یادوں سے اپنے خزاں رسیدہ دورِ زندگی کی ویرانیوں کو لالہ زار بناتے اور پھر جب رات بوڑھی ہونے لگتی۔ تو بخاری مجید کو اپنی موٹر کار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچاتے اور پھر اپنے گھر جاتے۔

جب تک مجید زندہ رہے بخاری پر دالہ و شیفتہ رہے اور بخاری بھی نیویارک سے جب کوئی خط مجھے لکھتے، مجید کا حال ضرور پوچھتے، اور "نمکدان" بھیجنے کا تقاضا کرتے چنانچہ ہم "نمک دان" کے پرچے جمع کر کے وزارتِ خارجہ کے ذریعے "ڈپلومیٹک بیگ" میں بخاری کو ارسال کر دیتے۔

مجید کے انتقال پر بخاری اس قدر غمزدہ ہوئے۔ کہ ان کا تعزیتی خط جو میرے نام آیا خود روتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

ابھی حسرت و مجید کا ماتم ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ہم لوگوں کو بخاری جیسے عظیم الشان دوست اور عظیم الشان انسان کے فقدان پر سینہ کوبی کرنی پڑی۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ گویا گورستانِ ادب کا فقیر ہوں جنازے دھڑا دھڑ آرہے ہیں یہاں تک کہ انہیں دفن کرتے کرتے تھک گیا ہوں چاروں طرف نظریں ڈالتا ہوں تو تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

زندگی کی شاہراہ حوادث کے آفتاب کی تمازت سے تپ رہی ہے، آہ! اے موت کی سیاہ سرزمین! تو کہاں ہے؟ کہ راہِ حیات کے مسافر تیری ٹھنڈی چھاؤں میں آرام پا سکیں اور ان گئے گذروں سے جا ملیں، جو اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے اس تیرہ خاکدان سے نجات پا کر جا چکے ہیں ؎

یارانِ موافق ہمہ از دست شدند — از دستِ اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر — یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

رشید احمد صدیقی

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعۃً ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے اللہ تعالےٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لئے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آراء کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے "راوی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہئے کس پر ہنسنا چاہئے کتنا ہنسنا چاہئے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہئے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔ بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنن۔ ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِّ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو ابھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِّ عمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔ نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آگئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا

ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی ناپختگی کی دلیل ہے۔ فن ٹیکنیکل اور میکینکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں۔ جن پر طنز و ظرافت کامل کوشش کئے بغیر بھی کارگر ہو سکتا ہے مثلاً بیوی، نیتا، مولوی، والدین، قرض، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے جیسے کسی گھٹنے ہارے شاعر کو اس سے زیادہ گھٹنے ہارے شعر پر اسی طرح کے حاضرین داد دیتے ہوں۔ مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روائتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے ہر جگہ ہر بات میں انہوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے جیسے "صحرا کو مسکرا کے گلستاں بنا دیا" ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے مرکب نہیں۔ بعض اطبا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لئے بھی مرکب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے ہیں علاج دونوں مستند ہیں۔ لیکن اول الذکر زیادہ مشکل اس لئے زیادہ قابل تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں۔ اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغ کی غزلوں اور مرزا شوق کی مثنویوں سے دے سکتے ہیں جس طرح ان بے نظیر فن کاروں نے ماجرائے حسن و عشق کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا ہے۔ مزرع آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی و دامانی ہی رکھا ماورائی و لامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں۔ اور جلد کہہ دیتے ہیں۔ انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسحور رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں بھی مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے ازبر کر لئے جائیں جن کو موقع بے موقع (کبھی ایسے بھونڈے طریقے سے جیسے بعض شعراء اپنا کلام سنانے کے لئے کسی شریف آدمی کو دفعتاً گھیر لیتے ہیں۔) سناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے تجارت کے لئے نہیں تواضع کے لئے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے بلکہ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی۔ اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ طراز تھے لطیفہ خواں نہ تھے۔ ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے

ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔

غالباً ۱۹۴۵ء میں پی۔ ای۔ این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا۔ ای۔ ایم۔ فاسٹر، سروجنی نیڈو، جواہر لال نہرو، راداہا کرشنان، صوفیا وادیا، مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری اور کتنے اور مشاہیر علم و ادب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے شریک جلسہ تھے۔ موسم خوش گوار، جے پور کا تاریخی خوب صورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسمٰعیل کا انتظام، جو اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ پی۔ ای۔ این کا ایسا شاندار اجلاس ہندوستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے۔ علمی مذاکرے رہے۔ بے تکلف ملاقاتیں اور پر تکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و ذہین خدوخال، سجل اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو، مزے کی بھی پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یونہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آجاتے جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی۔ اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں یہ "ذو لسانی" کش مکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں دوسری طرف انگریزی ادب کے اصلی خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لئے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا، نتیجہ ظاہر ہے وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لئے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بے گانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی۔ اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ کتنے اہم موضوع پر کتنی فکر انگیز بات، کس وضاحت سے، کتنے بڑے مبصر نے کہی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرر ایک بورڈ نے کیا جس میں مسٹر فیلڈن ڈائریکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودی، اور کچھ اور لوگ تھے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ صدر فیلڈن تھے اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد، جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومت ہند کے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں تک کی پروا نہ کرتے تھے لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے امیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھر کم جثہ، ایسی ہی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ تھوڑی بہت ان امیدواروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلہ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آچکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا۔ ڈاکٹر حیدر دیکھو اگر تم نے آئندہ امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے پھر مصافحہ کے لئے

فیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حیدر کے داد دینے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدیقی صاحب! ادھر آ بیٹھو، فیلڈن کے نشانے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اب فیلڈن کا وہی حال تھا جو پروفیسر حیدر کا تھا۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے نہ مایوس نہ متفکر، توازن اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے، لیکن اس دوران میں مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے کہ حریف کو قایل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلۂ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کار آزمودہ جرنل کی مانند۔ حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

یہ سماں ایک بار آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دیکھا جب بخاری اس کے ڈائریکٹر جنرل اور . . . . . مسٹر انچارج تھے۔ جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری کے عاشق زار نہ تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ آئے دن وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے وفد نازل ہوتے رہتے۔ بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا مگر وہ مطلق فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو "نامۂ الفت" کہا کرتے تھے۔ اور وفود کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیر مقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ موقع کی اہمیت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور تقریر کو ختم کیا چند خوشنما، توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بگڑے دل لیکن غبی اراکین تھے۔ جن کو متعارف ہوتے وقت انہوں نے اپنی بے غلط ذہانت سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیوا بیانی سے وفد ڈانوا ڈول ہو گیا۔ اور ممبروں کے وہ کڑے اور کڑوے تیور مضمحل ہو گئے۔ جن کے ساتھ وہ "غالب کے پرزے" اڑانے آئے تھے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ اس کو ان سورماؤں نے پورا کر دیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا۔ اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابلِ بیان و ناقابلِ گرفت شہ پا کر جس کے وہ امام وقت تھے اپنے ساتھیوں ہی سے بدکنے اور رد و قدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور ہمہ تن ان ممبروں کی تکریم و تواضع پر مائل ہو گئے۔ جو یقیناً قابلِ لحاظ تھے لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بڑے عالمانہ اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی۔ اردو ہندی کے مسئلے پر مبنی کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد اور ان سے اخذ ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے۔ ان کے نصف مواد تک بھی وفد کے ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال، کرشمہ کار اور ناقابلِ تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز۔ بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ میٹنگ میں ہر طرح کے "کیل کانٹے سے لیس" ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اراکین بھی "زیر دام" آ گئے اور بخاری نے "علیٰ قدر مراتب" کسی سے ہاتھ ملا کر، کسی کو گلے لگا کر، کسی کی شان میں دو چار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر جو اتنے ہی مغالطہ انگیز بھی ہوتے، وفد کو ہنسی خوشی رخصت کر دیا۔ علیٰ قدر مراتب کا ان کا اصول اور دوسرے کا المیہ یہ تھا کہ جس کو جتنا تہی مغز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے "سوگن التفات" ہوتے اس سے حساب لگایا جا سکتا ہے کہ جس سے انہوں نے معانقہ کیا ہوگا

اس کا ان کے ہاں کیا درجہ رہا ہوگا۔

اس حربے سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس حربے کا خود شکار ہو جائے گا۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر انتخاب جس تیزی اور یقین سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ڈائریکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندوستانی ڈکشنری کی تالیف میں معروف ہو گئے تھے جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہل قلم ان کے شریک کار تھے۔ یہ کام ان ہی کی نگرانی میں ہوتا تھا اس میں ان انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ہندوستانی مترادفات دئے گئے تھے۔ جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا اتنا ہی نازک اور مشکل تھا اس لئے "ہندوستانی" کا لفظ یا تصور (جسے ہندی اردو کا سنگم کہتے تھے) اردو اور ہندی دونوں کے علمبرداروں کے یہاں نامقبول تھا۔ ڈکشنری کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ لی گئی تھیں۔ اور نظرثانی کے لئے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علیحدہ علیحدہ خانوں میں دی گئی تھیں۔ کہ متلاشی کو انتخاب میں دقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا مکمل ہو جاتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے محکمہ نشر و اشاعت کے لئے بہت کارآمد اور بچھلے ماتسوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعر و ادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا۔ ہم سب جانتے ہیں لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، ٹھہری ہوئی اور خوش آئند فضا محسوس کرتے ہیں۔ جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر ان کی اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی جنیس کا پتہ نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں کبھی کبھی ادھ کچرے طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اردو کے روائتی شاعرانہ الفاظ یا انداز میں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پہ اندازہ ہوگا نہ انگریزی زبان کا نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا لیکن انگریزی کے پرتو سے ان کی اردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

الہامی اور قانونی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے اس کے بعد میرے نزدیک یورپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے جہاں فن، بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابل گرفت وارداتوں کا سامنا ہوتا ہے جس طرح سیسموگراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے ارتعاش مرتسم کر لیتا ہے اسی طرح اچھا ڈراما سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی سوسائٹی کے مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے کے علاوہ اردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرنے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اردو کا کوئی معمولی واقف کار اس غیر معمولی فریضے سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بخاری نے اردو کی ایک نئی جینیس اور ایک نئی توانائی کا انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن اردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلم ہے اور یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا ہے۔ گذشتہ ۲۰۔۲۵ سال میں اردو تنقید پر کافی توجہ کی گئی اور اب تو ادبی مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید نگار تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوں اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اردو میں جدید تنقید کا بیشتر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اردو کے کس صنفِ ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصنافِ ادب پر تنقید ملتی ہے ادب کی وہ صنفیں اردو میں ہیں بھی یا نہیں یا اردو میں جو صنفِ ادب ملتی ہے اس کے لئے مغرب نے کوئی اصول تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں، ادب کہیں کا ہو کسی طرح کا ہو، تنقید مغربی ہو گی۔ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ، تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھیں۔ انہوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطۂ نظر کا تابع نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلے یا شخص میں خوابیدہ یا بیدار موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے، کہ وہ کسی ادبی تخلیق یا شخصیت پر قلم اٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جزو اور کل دونوں گرفت میں آجائیں نہ یہ کہ جزو سے کل کی نشان دہی کرے اور کبھی کل سے جزو کو روشناس کرائے تصوف میں یہ روا ہے تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید یا پرکھ کے لئے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون "کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں" ہے عصمت چغتائی کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں" ایک شور طوفان خیز" اٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آرا ہوا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسا بے لاگ تجزیہ، اتنی گہری بصیرت کے ساتھ، اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں ہم ہو گئے البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا۔ ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں" نیازمندان لاہور" کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا۔ نیاز مندوں کے جلسے میں بخاری کا انداز قد بے تکلف پہچانا جا سکتا تھا اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اعلےٰ پایے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اور ان کے رفقاء علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لئے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آگئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں

سے ہم آہنگ کرنے اور قومی عزائم کے مطابق اس کی تنظیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقا ر یونیورسٹی میں اردو کی اعلے تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے کتنی حوصلہ انگیز، دور رس اور گراں قدر یہ سکیم تھی، جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرون ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ برا ہونے کا حوصلہ دکھاتا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے اکابر موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایات کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لئے دعوت کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو۔ وہاں یہ بے علمی و بے حوصلگی کیسی۔ اس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے طور پر چلے ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکریہ ضرور ہے

مغلیہ سلطنت کے زوال پر اہل فضل و کمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہو گیا تھا اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان میں کہیں اللہ کم نظر آئے گی جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا۔

تھے ہنرمند اتنے تجھ میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ان میں سے سر سید نے اپنے رفقا ر کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیات نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم و فنون کے کتنے اور کیسے کیسے جامع کمالات، ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں جن میں " جوانان سعادت مند" کے " پیر دانا " سر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر سر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر بعض وجوہ کی بنا پر موخر الذکر دو کو علیحدہ کر دیں تو سر شیخ عبدالقادر یقیناً ان لوگوں میں تھے جو پنجاب کے سر سید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی بزرگی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے انہوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لئے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا۔

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی وہی ان مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے ایک حد تک انہوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا کسی عظیم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے، صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا غیر متقین، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے پاکستان کے نوجوان کو مناسب اور بر وقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا کسی اور سے ناتہ جوڑے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوان کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ دراصل وہ اپنے شباب کی وارداتوں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

اسی حلقے ("نیاز مندان لاہور" یا ناموران لاہور) سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی۔ کہ پنجاب میں جو یہ " میں نے جانا ہے" یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا۔ اردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے فارسی عربی کے علاوہ مغرب

کی زبانوں اور خزانوں سے بھی انہوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے وغیرہ۔ اس لئے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے۔

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا لیکن جلد ہی ختم ہو گیا۔ اور بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی و ادبی نہیں جتنی تفریحی۔ یوپی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو بے تکلف روئے سخن میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے: "پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا آپ کے ..... (نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کر لیں۔ یہ جملہ غلط کیوں ہو؟" میں نے کہا "ہاں کیوں ہو"۔ کچھ مسکرائے، کچھ نرم پڑے لیکن انداز کی برہمی قائم رکھتے ہوئے بولے: "بتائیے نا، آپ تو صرف و نحو میں خواہ مخواہ مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟" میں نے کہا: "میں صرف و نحو سے قطعاً معصوم ہوں۔ آپ کبھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہو گا۔ لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو، میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں۔ اس میں ہزار عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے۔" بولے: "یعنی چہ؟" عرض کیا: "اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے۔" بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے بولے۔ صدیقی صاحب میرے ساتھ چلئے، میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں، کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس ملوا کرا سکتا ہوں۔

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لئے یہ رشتہ آنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے SAFETY FIRST. یا SELF FIRST کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ "آمیزشے کجا گہر پاک او کجا" کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی شیرینی اور تازگی تھی وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا اور وہ اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ دکان اور مرجوعہ دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہر فن نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن بخاری اس کے فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی تقاضے کے لئے، کبھی سوٹ میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے، اس پابندی اور شغف سے آتے تھے۔ جیسے بعض مصنفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے بھالنے، کاتب کے گھر یا پریس کا چکر لگاتے رہتے ہیں اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو عدہ خلافی پر درزی سے کچھ دیر مصروف واسوخت خوانی رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر، سلائی، کاج، بٹن کے بارے میں ایسے ایسے نکتے درزی کے ذہن نشین کرانے لگے ضمناً میرے بھی کہ میں حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے: "کیوں صدیقی صاحب آپ کو سوٹ سے کبھی دل چسپی ہے۔" عرض کیا "کیوں نہیں، لیکن مردوں کے نہیں، عورتوں کے سوٹ سے"!

بخاری ہنس پڑے لیکن فقرے کی داد درزی سے دلوائی یہ کہہ کر کہ صاحب کو سلام کرو۔ صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں سلام تو اس نے کیا لیکن جیسے اسے اس کا یقین نہ ہو کہ اس پسند کا اظہار میں نے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرات کی ہو گی۔ مدتوں بعد، تقسیم ملک

سے کچھ پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلیٰ نسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے دیکھ کر ہم دونوں بیک وقت مسکرائے لیکن ستم یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا کچھ روپے بھیج دیجئے کار خیر کے لئے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دئے توقع سے زائد، میں نے شکریہ کے خط میں لکھا بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کار خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لئے ایسی ہی ثابت ہوگی۔ بخاری نے لکھا مژدے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو "شرح مبادلہ زر" اتنا خاطر خواہ نہ رہے ـــــ تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے بخاری ان کے نہ تھے وہ یقیناً ان کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن مقررہ خانوں میں۔ ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہو گی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپئے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے تحریر و تقریر سے لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک لہ تھے ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور شریک کار منتخب ہو، بخاری بڑے بت شکن تھے جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے ـــــ اقوام متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور "یاران باصفا" سے ملنا ہو جاتا تھا تو جس محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصے سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "باد شمال" کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا ـــــ پی ای این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں، چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے یا ادب کی خدمت کرنا چاہیے، کتنی غلط جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے۔ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا پھر دبی زبان اور غم گین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یوں یاد آ رہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوام متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے لیکن اسے کیا کہئے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندان حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

"پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالے نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔"

..... کہ گوہرِ مقصودِ گفتگوست

فیض احمد فیض

دوستی تو وہی اور مستعدی کا نام ہے یارو، محبت تو یونہی کہنے کی بات ہے، دیکھو تو ہر روز میں تم میں سے ہر پاجی کو ٹیلیفون کرتا ہوں، ہر ایک کے گھر پہنچتا ہوں، اپنے گھر لاتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، سیر کراتا ہوں، ہنساتا ہوں، شعر سناتا ہوں، پھر رات گئے باری باری سب کو گھر پہنچاتا ہوں، سب بیویوں کی بددعائیں میرے حساب میں لکھی جاتی ہیں، آدھی تنخواہ پٹرول میں اڑ جاتی ہے یعنی اوّل نقصانِ مایہ، مایہ نہیں مائع یعنی پٹرول دوم شماتتِ ہمسائی، ارے یار یہ شماتت کیا لفظ ہے، شں۔ ما۔ تت کچھ پنجابی گالی معلوم ہوتا ہے نہیں"............ قہقہہ۔

"کچھ تو خدا کا خوف کرو دوستو، کسی کم بخت کو توفیق نہیں کہ کبھی خود ہی اٹھ کر چلا آئے، میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہوں؟ شوفر ہوں؟ میراثی ہوں؟ مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے آپ کا؟ یا آپ کے دہنِ مبارک سے حکمت و موعظت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمدان کا دامن گنج ہائے گراں مایہ، اوئے مایہ، پٹرول والا مائع نہیں۔ دوسرا، عثمان نوٹ کرو، بابا، تیسرا پنجابی والا، نونِ غنہ کے ساتھ، اوئے سمجھ آئی جے؟ (عثمان نوٹ کرو کی تلمیح کسی معتبر بزرگ کی جانب تھی جسے بخاری صاحب نہ جانے کب ملے تھے؛ روایت یہ تھی کہ ان بزرگ کے فرزندِ اکبر عثمان بھی سفید ریش اور کبرسنی کی منزل میں تھے لیکن بڑے میاں انھیں وہی طفلِ مکتب گردانتے اور انھیں اسی ڈھب سے خطاب کرتے، چنانچہ اگر محفل میں کسی نے کہا کہ میر صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر آپ کا پوچھ رہے تھے تو میر صاحب کڑک کر بولے "صحیح تلفظ ڈیپوٹی ہے، عثمان نوٹ کرو! سمجھ آئی جے، کا قصہ میں نے انھیں سنایا تھا اور مجھے خورشید انور نے، بھاٹی اسلامیہ ہائی اسکول میں کوئی ماسٹر صاحب تھے جو تختۂ سیاہ پر ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے بعد قریب قریب ہمیشہ اپنے طلبا سے پوچھتے "اوئے سمجھ آئی جے" اور لڑکے ہمیشہ جواب میں کہتے "نہیں جی" اس پر ماسٹر صاحب جھنجھلا کر ایک موٹی سی گالی دیتے اور کہتے "نہیں سمجھ آئی تو جاؤ فلاں کی فلاں میں" بخاری صاحب سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے، کہنے لگے "یار اگر اسے یہی کہنا تھا تو پوچھتا ہی کیوں تھا؛ اس کے بعد عثمان نوٹ کرو کے ساتھ "سمجھ آئی جے" بھی ان کی محفل کے روزمرہ میں شامل ہو گیا)

ان کی فریاد ابھی جاری تھی۔

"دیکھو یارو اگر کل میں تم میں سے کسی کو ٹیلیفون کر دوں کہ بھائی جان مجھے ہیضہ ہو گیا ہے، پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہے، ڈاکٹر جواب دے

گئے ہیں، لبوں پہ دم ہے، للہ آ کر منہ دیکھ جاؤ تو سو فیصدی یہی جواب ملے گا کہ موٹر میں آ کر لے جاؤ.....؟

"ہمارے پاس موٹر جو نہیں ہے" تاثیر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں اور آپ ہر روز کالج تو میری ہی موٹر پر تشریف لے جاتے ہیں، اور دن بھر جہاں جہاں بھی آپ حضرات جھک مارا کرتے ہیں۔ اس خاکسار ہی کے ساتھ تو جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ تم سب نہایت بُرے دوست ہو، کاہل، بے قاعدہ بے سلیقہ، اگر میں اس شہر میں نہ ہوں تو تم مہینوں ایک دوسرے کی صورت بھی نہ دیکھو۔"

اور یہی ہوا بھی ع "ان کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا" ادھر بخاری صاحب لندن اور میکسیکو روانہ ہوئے اُدھر یہ بساط اُلٹ گئی، اُن کی محفل شبینہ کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر کبھی یکجا نہ ہو سکا۔ ۴۹ء؁ میں وہ مختصر سے عرصے کے لئے لاہور لوٹے تو یہاں کی صورتِ احوال سے بہت رنجیدہ ہوئے، کہنے لگے "یار تم لوگوں نے سب چوپٹ کر دیا ہے، اب ہم جاتے ہیں" اور اس کے بعد ایسے گئے کہ اپنی مٹی بھی پردیس ہی کو سونپ دی۔

بخاری صاحب کی شخصیت کا ہلکا سا نقش بھی قلم کی گرفت میں کب آتا ہے، یہ کام تو انھیں کے کرنے کا تھا، ہاں انھیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو یہی تن دہی، مستعدی، قاعدہ اور سلیقہ طرح طرح سے یاد آتے ہیں، خوش وقتی کے لئے احباب کی محفل کا اہتمام تو شاید ایسی بڑی بات نہیں۔ اگرچہ ہم میں سے بیشتر اتنا بھی نہیں کرتے اور بخاری صاحب ایسی تن دہی سے تو کوئی بھی نہیں کرتا لیکن وہ تو جو کچھ کرتے تھے ایسے ہی ڈوب کر کرتے تھے، دفتر ہو یا گھر، تحریر ہو یا گفتگو، دقیق علمی بحث ہو یا ہلڑ بازی،

مغنی نے غزل شروع کی۔

بجوانی دو چشمت چشم بلا نشستہ
چوں قبیلہ گردِ لیلیٰ ہمہ جا بجا نشستہ

تو اسی مطلع پر سحر ہو گئی، قوال اس شعر پہ پہنچے،

"صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل
ویں بے خبراں جامہ دریدن نگزارند"

تو گھنٹوں وارفتگی کا عالم رہا، کوئی شعر، کوئی مصرع، کوئی ترکیب، کسی محراب کا خم، کسی کتبے کا خط، کسی خوانچے والے کی آواز، کوئی محاورہ، کوئی گالی جہاں بھی دل کو وجد و اہتزاز کا ذرا سا اشارہ ملا۔ اپنی واردات میں سبھی کو شریک کر لیا۔

دہلی کی جلتی ہوئی دوپہر میں کبھی بھٹک کر گھٹا آ گئی تو جنگ عظیم، ہٹلر اور مسولینی، آل انڈیا ریڈیو، دولت مشترکہ انگلشیہ اور ایسے سبھی دفاتر یک لخت بے معنی ہو گئے۔ دوستوں کے افسروں کو ٹیلیفون ہو گئے کہ ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو فلاں فلاں صاحب سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ہم لوگ جھاگم بھاگ پہنچے، بخاری صاحب دفتر میں دربار لگائے بیٹھے ہیں، آغا حمید، سید رشید احمد، غلام عباس، یا ایک آدھ اور، تاثیر پہنچے، مجید ملک آئے، میں گیا، بخاری صاحب کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آئیے آئیے۔ آپ کانفرنس کرنے آئے ہیں؟ تو کرو"۔ اور سب پر اسکول سے بھاگے ہوئے بچوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی، دن جو قطب میں گزارا، شام کو جامع مسجد کی دیوار تلے کباب کھائے، ایک قطعی غیر معروف محلے میں پان خریدے، آدھی رات تک انڈیا گیٹ کے سامنے بیٹھ کر بیت بازی کی پھر کناٹ پلیس کے جس قہوہ خانہ کا در کھلا پایا وہاں سے ملک شیک پیا، اور وہیں کناٹ پلیس کے میدان میں غالب اور نظیری،

حافظ اور سعدی، اقبال اور گوئٹے، ہاپکنز اور ڈیلن ٹامس کے محاسن و معائب کے بارے میں کچھ بھی طے نہ ہو پایا کہ مرغ اذانیں دینے لگے، میں نے کہا ہمارے ہاں چلئے چائے پئیں گے؟ بخاری صاحب بولے۔ ہرگز نہیں، ایک اصول یاد رکھو، آدمی رات چاہے کہیں گزارے لیکن صبح ہمیشہ اپنے بستر سے اٹھنا چاہیے، عثمان نوٹ کرو!

خیر یہ قصے تو ان کی اپنی دلچسپیوں سے متعلق ہیں لیکن دوستی میں ان کی مستعدی اور سلیقے کے ہزار گونہ مظاہر اور بھی تھے۔ ایک رات میرے ہاں محفل عین عروج پر تھی۔ تاثیر مرحوم، حسرت مرحوم، صوفی تبسم، عابد علی عابد، آغا بشیر احمد اور بخاری صاحب، حسرت صاحب نے انہی دنوں اپنا عجیب و غریب عربی گانا ایجاد کیا تھا اور فلک شگاف آواز میں نظیری کی کسی غزل پر کسی عربی دھن کی چھری چلا رہے تھے، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ہمارے رپورٹر میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے، کہنے لگے۔ ابھی ابھی ایک ٹیلیفون آپریٹر نے گورنمنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون ملاتے میں سنا ہے کہ قائد اعظم فوت ہو گئے ہیں، آپ تحقیق کر لیجئے۔ میں نے پیغام دہرایا تو سناٹا ہو گیا، میں نے کہا۔ آپ لوگ بیٹھئے، میں دفتر جاتا ہوں۔ بخاری صاحب نے کہا ہم بھی چلتے ہیں۔ دفتر پہنچ کر ہر اہم جگہ سے خبر کی تصدیق چاہی لیکن کسی نے کچھ بتا کر نہ دیا، میں نے طے کیا کہ پاکستان ٹائمز اور امروز کے ضمیمے بہر حال تیار کر لئے جائیں۔ ممکن ہے رات میں کسی وقت کوئی اطلاع پہنچ جائے۔ میں اداریہ لکھنے بیٹھا، بخاری صاحب مرحوم کے سوانح حیات مرتب کرنے لگے، صوفی صاحب قطعہ تاریخ کی فکر کرنے لگے، تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم امروز کی ترتیب میں مصروف ہو گئے، میں نے رات بھر کام کیا، تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہوئی اور جب ہم دفتر سے نکلے تو پو پھٹ چکی تھی اور سحر خیز لوگ کار و بار یا کوئے یار کا رخ کئے گھروں سے روانہ ہو چکے تھے، بخاری صاحب کو صحافت یا خالص سیاسی کار و بار سے لگاؤ نہ تھا لیکن انھوں نے اسی ڈھب سے کئی راتیں پاکستان ٹائمز کے دفتر اور چھاپے خانے میں بسر کیں، گاندھی جی کے قتل کی رات، پریس میں نئی روٹری مشین چالو ہونے کی رات، ۱۳/۱۴ اگست کی درمیانی رات اب شاید یہ بتا دینے میں بھی مضائقہ نہیں کہ اس زمانے کے پاکستان ٹائمز کے تین یا چار اداریئے اور مختلف ناموں سے بہت سے مراسلے بخاری صاحب ہی کے قلم سے ہیں، مراسلوں کے کالم میں ایک پُر لطف بحث مجھے خاص طور سے یاد ہے جو ہفتوں چلتی رہی، اس کا سہرا دراصل ان حقیقی یا فرضی بزرگ کے سر ہے جو مولوی تبیچی کے نام سے مشہور تھے اور بقول خلق ہر بے نقاب خاتون کی چڈیا پر دست درازی کی فکر میں رہتے تھے، ایسے دو چار واقعات سننے میں آئے تو بخاری صاحب نے مولوی صاحب کی خدمت اور بے نقاب خواتین کی حمایت میں ایک بہت موثر مراسلہ MERE WOMAN کے نام سے لکھا، اس پر آزادیٔ نسواں کے حامیوں اور مخالفین میں بہت زوروں کی بحث چلی اور جب تک چلتی رہی بخاری صاحب ان میں سے بیشتر خطوط کی تصحیح و ترتیب پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھ کر خود کرتے رہے۔

انھیں بچوں سے خاص رغبت نہ تھی (" چھوڑ دیار، عورتوں کا محکمہ ہے ") لیکن وہ قریب قریب ہر چھٹی کے دن ہمارے اور تاثیر صاحب کے بچوں سے "لاج" میں آنکھ مچولی کھیلتے، ان کے لئے نئے نئے کھیل ایجاد کرتے، گیت گاتے اور کہانیاں سناتے۔"

وہ بوڑھوں سے اور بھی زیادہ نفور تھے۔ لیکن انہی دنوں لندن سے میری بیوی کے والدین ہمارے ہاں وارد ہوئے تو بخاری صاحب نے ایک ہی ملاقات میں انہیں بھی رام کر لیا، یہ بچارے اگلے وقتوں کے سیدھے سادے سفید پوش انگریز لوگ جنہیں بخاری صاحب کے ذہنی مشاغل سے دُور دُور علاقہ نہ تھا۔ اس شام بخاری صاحب پہنچے تو میں اور میری بیوی دونوں یہ سمجھے کہ آج ان کا رنگ نہ جمے گا اور بات رسمی تکلفات سے آگے نہ بڑھ سکے گی، خیر تعارف اور دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، پھر بخاری صاحب اچانک بولے "مسز جارج آپ کو پہلی جنگ عظیم کے بعد کا کوئی گانا یاد ہے، مثلاً فلاں اور کوئی پرانا انگریزی گیت گنگنانے لگے، ہماری خوشدامن کو گانے سے شغف تھا، فوراً کھل گئیں اور پھر دو گانوں کا ایسا تانتا بندھا کہ کسی

کو زمان و مکان کی سدھ بدھ نہ رہی یہاں تک کہ دونوں موسیقار ہانپنے لگے، یہ ایکٹ ختم ہوا تو بخاری صاحب بڑے میاں سے مخاطب ہوئے "مسٹر جارج چھوڑیے ان عورتوں کو، چلئے ہم دونوں چلیں۔"

"کہاں لے جاتے ہو میرے بڈھے کو؟" مسز جارج پکاریں۔

"ہم عیش کرنے جا رہے ہیں مسز جارج، GOING TO PAINT THE TOWN RED." اور رات گئے تک انھیں لاہور کے ریستورانوں میں گھماتے اور اینگلو انڈین لڑکیوں کا رقص دکھاتے رہے۔

لیکن ان سب اداؤں کے باوجود ناآشنا لوگ بخاری صاحب کو بہت ہی کم آمیز بڑا صاحب سمجھتے تھے اور یہ تاثر چنداں غلط بھی نہ تھا، عمر بھر کی بے تکلفی کے باوجود ہم میں سے بھی کسی کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ ان کے اوقات میں مداخلت کرے یا ان کی فرمائش کے بغیر ان کی کسی مصروفیت میں حارج ہو، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ بخاری صاحب لباس بدلتے ہیں تو ساتھ ہی شخصیت بھی بدل لیتے ہیں، دفتر میں اور، گھر میں اور، محفل میں اور۔ اصل میں یوں تو نہ تھا بلکہ یہ ان کے بہت ہی سوچے سمجھے قاعدے اور سلیقے کا اظہار تھا۔ ایک بار ایک بہت ہی باتکلف لیکن کچھ غیر دلچسپ حضرت میرے گھر پر تشریف لائے۔ میں بخاری صاحب کے ہاں جانے کی فکر میں تھا۔ کہنے لگے "مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے، مجھے بھی لے چلو" میں نے کہا چلئے۔ بخاری صاحب کی پیشانی پر انھیں دیکھتے ہی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی، یہ صاحب پہلے تو گم سم بیٹھے رہے، پھر ایک آدھ یونہی سی بات کی، بخاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہنے لگے "صاحب اس وقت بدقسمتی سے میں مصروف ہوں، معافی چاہتا ہوں، ان شاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی" ہم چلنے لگے تو چپکے سے پوچھا "اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا دفتر جاؤں گا، میں اپنے ساتھی سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر میں بخاری صاحب بھی آ گئے، پوچھا یہ کون تھے، میں نے بتایا کہ فلاں فلاں ہیں، بہت بھلے آدمی ہیں، کہنے لگے "تکلف میں تضییع اوقات تک تو خیر جائز ہے لیکن تکلف میں بور ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں، وہ امرتا شیر گل تمھیں یاد ہے؟ کیا غضب کی عورت تھی! ایک دفعہ اس کے اعزاز میں یہیں فلیٹیز میں ایک بہت بڑی دعوت تھی، بڑا بڑا خان بہادر اور رائے بہادر بیٹھا تھا، امرتا آ کے بیٹھیں آس پاس کے لوگوں سے کچھ دیر گفتگو کی اور کھانا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ اٹھ کھڑی ہوئیں "میں بور ہو گئی، میں جاتی ہوں" میزبان اور مہمان دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ کھٹ کھٹ یہ جا وہ جا! اخلاقی جرأت اسے کہتے ہیں، مجھے آج تک اس واقعے سے رشک آتا ہے۔"

یہ تو ایک قاعدہ تھا، دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ کام کے وقت ڈٹ کر قاعدے سے کام کرو تاکہ کام کے بعد ڈٹ کر بے قاعدگی کر سکو۔

اور قاعدے کی صورت یہ تھی کہ آل انڈیا ریڈیو کی پہاڑ سی عمارت اور ہندوستان بھر میں بکھرا ہوا چیونٹیوں کا سا عملہ لیکن اور دفتری کام کے علاوہ اس عمارت کی ہر کھڑکی کے ہر شیشے، ہر دروازے کے ہر قبضے، ہر کمرے کے ہر کونے کی صفائی اور اس عملے کے ہر فرد کی ہر سرکاری و غیر سرکاری حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اور یہ تو خیر ممکن ہی نہ تھا کہ مستقل ہنگامہ آرائی، کوچہ گردی اور رت جگوں کے باوجود ان کی گاڑی ہر صبح نو بجنے سے پانچ منٹ قبل دفتر کی عمارت میں داخل نہ ہو۔

لیکن اس ساری قاعدے بازی میں ساتھ ہی ساتھ ان کی خوش طبعی اور اپج بھی کسمساتی رہتی تھی، ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ گھر میں آتشدان کے سامنے بہت سی فائلیں لئے بیٹھے ہیں اور فائلوں میں سے کاغذات نکال کر آگ میں جھونکتے جا رہے ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو، اس کو انگریزی زبان میں کہتے ہیں QUICK DISPOSAL بات یہ ہے کہ ان سب فائلوں میں محض خرافات بھری ہے اور اس خرافات سے چھٹکارا پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ اس کا نام و نشان صفحۂ دفتر سرکار عالی مدار سے محو کر دیا۔" یہ دوسری بات ہے کہ اس نوع کی خرافات وہ خود ہی ایجاد بھی کرتے رہتے تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد بھی تھے اور

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ ایک دن ہم دو تین دوست کسی کام سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے دفتر گئے، بخاری صاحب نے دیکھا تو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ کہنے لگے "تمہیں معلوم ہے اس دفتر میں کیا کام ہوتا ہے، یہ دیکھو۔" اور کاغذات میں سے ایک کافی ضخیم فائل نکالی جس کے سرورق پر لکھا تھا "OFFICE CAT" یعنی دفتر کی بلی۔ "یہ کون سی درسی کتاب ہے۔" ہم نے پوچھا۔ بولے "قصہ یوں ہے کہ ایک دن میرے کمرے میں ایک بلی آگئی مجھے اچھی لگی، میں نے کسی سے کہا اسے تھوڑا سا دودھ لا دو، پھر وہ بلی ہر روز آنے لگی اور ہر روز اسے دودھ بھی ملنے لگا، مہینے کے آخر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دفتر کے اخراجات کا بل مجھے بھیجا نیز اس کے ساتھ ایک تحریری سوال یہ بھی منسلک تھا کہ بلی کے دودھ پر جو دو روپے ساڑھے چھ آنے کی رقم صرف ہوئی ہے وہ کس مد میں جائیگی؟ میں نے لکھ بھیجا (Contingency یعنی متفرق خرچ میں ڈال دو، تھوڑے دنوں کے بعد اکاونٹنٹ جنرل کے دفتر نے بل لوٹا دیا اور یہ تحریری فہمائش کی کہ Contingency کی مد دفتر کے ساز و سامان اور دیگر غیر جاندار اشیاء کے لئے مخصوص ہے۔ بلی جاندار شے ہے اور اس کے اخراجات Contingency میں شامل نہیں کئے جا سکتے، اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے مزید تحریری ہدایت طلب کی، میں نے لکھا کہ جاندار غیر جاندار کا قصہ ہے تو یہ خرچ Establistment یعنی عملے کی مد میں ڈال دو، دوبارہ بل خزانے کو روانہ ہوا اور تھوڑے دنوں میں لوٹ آیا، اب کے ایک کافی طویل مراسلے میں یہ استفسارات تھے کہ اگر یہ خرچ عملے کی مد میں جائے گا تو واضح کیا جائے کہ اس رقم کو تنخواہ تصور کیا جائے یا کہ الاؤنس؟ اگر تنخواہ ہے تو بموجب قاعدہ نمبر فلاں فلاں، فلاں دفتر کی پیشگی منظوری درکار ہے اور اگر یہ الاؤنس ہے تو بموجب قاعدہ فلاں فلاں، فلاں افسر سے اس کی تصدیق لازمی ہے .... چنانچہ یہ فائل چھ مہینے سے چل رہی ہے اور اس میں ایسے ایسے نازک اور باریک نکتے بیان ہوئے ہیں کہ اندازہ نہیں۔" ..... پھر ایک اور فائل نکالا، سرورق پر یہ عبارت درج تھی، خط و کتابت مابین پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی، پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔ کہنے لگے "سنو، یہ پہلا خط ہے از جانب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی۔

بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔

جناب والا!

آپ کی یاد دہانی کے لئے معروض ہے کہ گزشتہ ماہ آپ کو پانچ کتابیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ریویو کی غرض سے ارسال کی گئی تھیں لیکن ریویو ابھی تک موصول نہیں ہوئے، مہربانی سے جلد توجہ فرمایئے۔

آپ کا نیاز مند :۔ اے۔ ایس بخاری

اس کے بعد یاد دہانی کے دو خط اور ہیں۔ اور نمبر ۴ خط یہ ہے۔

از جناب پروفیسر اے ایس بخاری۔ سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج۔ لاہور۔

جناب والا!

بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، آپکو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے جو پانچ کتابیں ارسال کی گئی تھیں (تفصیل درج ذیل ہے) ان میں سے تین کے ریویو وصول ہو گئے ہیں جس کیلئے کمیٹی آپ کی ممنون ہے، لیکن کمیٹی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ انتہائی اصرار کے باوجود آپ نے دو کتابوں (یعنی فلاں اور فلاں کتاب) کے بارے میں ابھی تک اپنی رائے تحریر نہیں فرمائی، کمیٹی اس تاخیر کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے، آپکو متنبہہ کی جاتی ہے اگر فلاں تاریخ تک آپکی رائے وصول نہ ہوئی تو آپکا نام ریویو کرنے والوں کی فہرست میں سے خارج کر دیا جائیگا۔

آپکا نیاز مند :۔ اے ایس بخاری

اور اس کا جواب یہ ہے،

منجانب اے۔ ایس بخاری وغیرہ بنام اے ایس بخاری وغیرہ

جناب والا! بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، بقیہ ریویو ملفوف ہیں۔ میں یہ گوش گزار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے خط کا آخری پیراگراف انتہائی

قابلِ اعتراض ہے۔ سینیئر (SENIOR) افسروں سے خطاب کا یہ انداز قطعی غیر موزوں ہے۔

آپکا نیازمند :۔ اے ایس بخاری

پھر بخاری صاحب نے فائلیں اور کاغذات سمیٹے اور بولے "اچھا اب تم خورد! رفو چکر ہو جاؤ، مجھے بہت کام ہے۔"

لیکن یہ سب کچھ تو صرف بخاری صاحب کی باتیں ہیں بخاری تو نہیں ہیں، وہ عالم بھی تھے ادیب بھی، استاد بھی ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش تحریر بھی، سخت گیر منتظم بھی بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحب سیاست بھی، لیکن یہ سب صفات گنوا دینے سے بھی کیا ہوتا ہے، ان کی زندگی کا بنیادی پہلو تو یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی لمحہ بے مقصد اور بے مصرف نہیں گزرا اور ان میں سے بیشتر لمحات موجودات کے ہر مظہر سے خوبی اور حسن اور انبساط کے اخذ و استفادہ میں گزرے اور وہ قلب و نظر کی اس دولت کو عمر بھر محفلوں، دانشکدوں، ایوانوں اور گزرگاہوں میں یوں بکھیرتے رہے کہ اپنے نام کی یادگار کے لئے اس کا عشرِ عشیر بھی نہ بچا۔ مجھے اس دور کی کوئی ایسی شخصیت معلوم نہیں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کے لئے اس قدر لطف و مسرت دریافت اور تخلیق کی ہو۔ وہ سب لوگ جن کے لئے دوسرے اہلِ کمال گفتار و تحریر کی کیسی بھی نعمتیں مہیا کریں۔ یہی فریاد کریں گے کہ

"عشوۂ زاں لبِ شیریں شکر باز بیار"

ہنستے ہنستے

عصمت چغتائی

ہنستے ہنستے بے حال ہو کر زیر تخت سے نیچے لڑھک گئی۔

"بس کرو اللہ کا واسطہ" میں نے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھ کر خوشامد سے کہا۔ ہمارے پیٹوں میں مروڑیاں اٹھ رہی تھیں۔ سانس پھول گئی تھی۔ ہنسی چیخوں میں بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اگر ہنسی کا یہی زناٹا رہا تو کچھ دیر میں جسم بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنسی آتی تھی۔ کوئی پھسل پڑا ہنسی چھوٹ نکلی۔ مرغی نے کتے کے پلّے کے ٹھونگ مار دی۔ وہ پیں پیں کر کے بھاگا اور قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا اور جو کہیں کسی نے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں ہنس رہی ہیں تو بس پھر تو ہنسی کا وہ شدید دورہ پڑ جاتا کہ معمولی مار پیٹ سے بجائے تابو میں آنے کے اور بھی تیز ہو جاتا۔ ہنسی آسیب بن کر سوار ہو جاتی۔ ہنس ہنس کر شل ہو جاتے۔ ٹڈیاں چٹخنے لگتیں جبڑے دکھ جاتے۔

کسی صورت افاقہ نہ ہوتے دیکھ کر اماں اپنی چپٹی سلیم شاہی لے کر تل پڑتیں۔ اور ساری ہنسی ناک کے راستے نکال دینے کی دھمکی دیتیں۔ تب ہم ناکیں پونچھتے پیٹ پکڑے نیم تلے پڑے ہوئے اپنے مخصوص جھلنگے میں جا گرتے اور نئے سرے سے ہنسنے لگتے۔

عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامینِ پطرس چرا کر پڑھنے کے بعد بھی ہم اسی قسم کی جان لیوا ہنسی کے بھنور میں پھنس گئے ہماری کھی کھی کھوں کھوں سے ہماری بردبار اور غم گین آپا کی سمع خراشی ہونے لگی دو دھپ سر پر جمائے اور کتاب چھین لے گئیں۔ گر یہ ہم نہ جانے کون سی بار کتاب پڑھ چکے تھے۔ ہمیں جملے کے جملے یاد ہو گئے تھے جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائے جاتے تھے اور قلابازیاں لگائی جاتی تھیں نجانے ایک عمر میں کیوں بے بات ہنسی آتی ہے اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔

اس وقت تک عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھے تھے۔ ملا رموزی کے مضامین پر اتنی ہنسی نہیں آتی تھی جیسی کبھی آیا کرتی تھی۔ کچھ پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں بس پطرس بھا گئے اور ایک جان چھوڑ ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے نہ جانے کیوں تخیل میں وہ اپنے ہم عمر سے نظر آتے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو ہم ضرور انہیں پڑپڑ بندھی اس بان کی کھٹولی پر چڑھا لے جائیں جو کنوئیں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور چنو نے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں —— جی ہاں میں انہیں باتیں ہی کہوں گی کیونکہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھیں۔ ان میں بڑی یگانگت اور قربت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھیں چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "قصرِ صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن و پردہ" "حدیث و پردہ" بڑی لچر معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں

ان کے کچھ مضامین اقتصادیات پر "ریاست" میں نکلتے تھے وہ بھی ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس رغبت سے پڑھتے دیکھا تو کچھ لکدڑ سے ہو گئے۔

نانی عشو پڑھ کر ہنسنے کا دور گذر چکا تھا۔ سخت روٹھنک افسانوں سے کبھی شدید دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس بے طرح پسند آ گئے۔ "میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا اماں تک نے پڑھ ڈالا۔ اور جب اپنی پلنگڑی پر بیٹھ کر وہ ہنسیں تو پان دان کی کلھیاں کھڑک کھڑک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔ میں تنقید نگار نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ "میں ایک میاں ہوں" کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں میں جھلکنے لگا۔ عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان میں سے پہلے اس انداز میں کس نے لکھنا شروع کیا۔ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کس سے متاثر ہوا اور کس نے کس کی پیروی کی۔ مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے۔ میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں۔ مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی بھی لگتیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آ کر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت ——— "تہذیب نسواں"۔ خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یا اللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے آپا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا۔ بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے کبھی دانت مار دیا، کبھی گدگدا دیا کبھی پنجہ سے اٹھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ہماری گت اسی طرح بنتی رہی۔ ہمارا خط اونچی آواز سے ابا کے سامنے پڑھا گیا ہر فل سٹاپ پر سرپر چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ہم نے انہیں مسخرا لونڈا سمجھ کر نہایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ہوا ہے برسوں خیال ہی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ہمیں تنبیہہ دینے کے لئے بار بار پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے اپنی دانست میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔

"ابے پطرس! کیا تو گھاس کھا گیا ہے؟"

عام "اس جملے سے ہماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ بے تکلف ہمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاہر ہے کہ اس صلائے عام پر ہر نکتہ داں نے لبیک کہا۔ ہم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ہم مجرم جو تھے صرف اس لئے نہیں کہ پطرس سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے اس لفافے پر جو ٹکٹ لگایا تھا اس پر "سروس" لکھا تھا جو صرف سرکاری ڈاک کے استعمال کے لئے ہوتا تھا۔ آٹھ آنے جرمانہ الگ تھا۔ سچ پوچھئے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ہماری چڑ تو بن گئے۔ ہماری جملہ شیطانیوں کی فہرست بنانے وقت ہمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اہمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر کتنے دن نقش رہتا ہے۔ برسوں گذر گئے۔ لوگ بھول بھال گئے۔ مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں کئے سال بھر گذرا ہو گا کہ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کوئی بہانہ کر دوں۔ کہہ دوں کہ بیمار ہوں، پھر سوچا یہ کیا حماقت ہے۔ پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں اور میں ان سے ملتے جان چرا رہی ہوں یعنی ان کو کیا پتہ کہ ایک دن ان کی بدولت میرے چپتیں پڑ چکی ہیں۔ وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو

بلایا ہے۔ خیر لنچ کا وعدہ رہا۔

مگر میں نے شاہد سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے بلایا تو شاہد کو بھی تھا لیکن میں نے بہانہ کر دیا کہ انہیں قطعی فرصت نہیں، وہی میری نیم کے نیچے پڑے ہوئے جھلنگے والی ذہنیت! یہ ڈر کم بخت کاہے کا تھا۔ ٹھہریئے آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذہین اور جملہ باز لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی شخصیت مجھے اپنی جانب کھینچتی بھی ہے اور دور بھی ڈھکیلتی ہے۔ اور پھر پطرس کا مجھ پر ویسے ہی رعب بیٹھا ہوا تھا۔ خواہ مخواہ ان سے مل کر احساس کمتری دونا ہو جائے۔ بڑی کوفت ہوئی، نہیں جاتی ہوں تو نہ جانے پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں کریں گے۔ ضرور میں بدتمیزی پر اتر آؤں گی۔ قطعی جوجھیل جاؤں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شاہد کے سامنے میرا پول کھل جائے۔ وہ فوراً منٹو سے کہہ دیں گے کہ پطرس نے محترمہ کو وہ پٹخنیاں دیں کہ گھگھی بندھ گئی۔

رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اُف میری حماقت! میں نے اپنے پروفیسروں سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوکنے رہتے تھے۔ میری کئی استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔ مگر اس دن احساسِ کمتری بے طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا۔ میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی گلے پر چھری رکھ دیتا۔ تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوّا بن کے ڈرانے کی کوشش کی۔ تو میں نے اس ہوّے کی پنڈلی کی بوٹی اتار لی تھی اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ مگر پطرس کے ہوّے نے مجھے ہولا ہو کر شل کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی ساڑی نکالی جس کا ذہن پر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تاکہ کوئی حوالہ نہ دیا جا سکے۔ ہر شے مبہم ہو جائے۔ پطرس کے سامنے دال تو گلے گی نہیں۔ صرف غائب ہو جانے والی ٹوپی پہننے ہی میں عافیت ہے۔

جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑ گئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اُٹھ آئے۔ ہسپتال سے فون کروا دوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے عصمت کی بچی تجھ پر پھر تو وہ ضرور ہسپتال عیادت کو آئیں گے۔ بیگم اب تو مرنے میں بھی رہائی نہیں۔ کاندھا دینے تو وہ آہی پہنچیں گے۔ پھر میرے چغتائی خون نے للکارا۔ میرے سکڑ دادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر خاصہ تناول فرمایا تھا۔ اور میں ایک حقیر پطرس کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ ایسا بھی کیا ہے۔ ٹانگ کھینچیں گے تو اپنی ازلی بدزبانی پر اُتر آؤں گی مزاج ٹھکانے آجائیں گے شاہ صاحب کے!

بیجئے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہونچی۔ تو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"آداب عرض!"

"گڈ مارننگ" جواب ملا

"اف بور" میں نے سوچا۔ اب فراٹے کی انگلش کا رعب ڈالیں گے۔ وہ کاغذوں پر جھکے تھے۔ میں نے غور سے معائنہ شروع کر دیا۔ "صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں" میں نے سوچا۔ سیدھی سادی سانولی سلونی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں ملتی۔ قطعی مختلف!

"کتنے دن قیام رہے گا" میں نے انہیں کاغذوں میں لوٹ پوٹ دیکھ کر پوچھا۔ سوچا میں پہلے بولنا شروع کر دوں تو پہلا وار میرا رہے گا۔ مگر دل ڈوبنے لگا کہ پہلا وار نہایت پھسپھسا رہا۔ ضرور اس جملہ کی دھجیاں اڑیں گی۔

"جی" وہ کاغذوں میں سے ابھرے "میرا تبادلہ بمبئی کا ہو گیا ہے۔"

یہ لیجئے سنا تھا کسی میٹنگ کے سلسلہ میں بمبئی گئے ہیں بہت جلد جانے والے ہیں یہ آخر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ کوئی اس میں بھی چال ہوگی۔ اس سے قبل کوئی اور سوال جھاڑتی۔ فرمانے لگے۔

"چلئے!"

"خاصہ لو ہے" میں نے بٹوہ اٹھا کر پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ یہ دانت کیوں بار بار نکوستا ہے؟ سارا ریڈیو اسٹیشن گھما کر ایک کمرے میں مجھ سے جانے کو کہا۔ سامنے میز پر ایک اونچے کاغذوں کے ڈھیر کے سامنے ایک عقاب کی سی صورت کا گورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی ناک، بھاری بھاری آنکھیں

"آیئے آیئے ...... معاف کیجئے گا میری میٹنگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"

"اوہ" میں نے سانولے سلونے پطرس کے جانے کے بعد کہا "میں سمجھی تھی آپ وہ ہیں۔"

"کیا؟ ..... میں وہ ہوں ..... آپ میری ہتک کر رہی ہیں" وہ برا مان گئے۔ "وہ مکھشن ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں" ایک جھٹکے سے سارا اعصابی دباؤ بھک سے اڑ گیا۔ ایر کنڈیشن کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ یا خدا ناحق میں نے اس شخص کی اپنی جان پر اتنی ہیبت سوار کر لی ایسا معلوم ہوا میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں یہ عقاب تو قطعی فاختہ نکلی۔ پھر جو باتوں کا ریلا چلا ہے تو میرا سارا ریہرسل بے کار ہو گیا۔ سارے تماشے ہوئے جلے اڑن چھو ہو گئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلاف بھی ہو گیا۔ میرے خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی ملاقات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سنی۔

"میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ٹھیک۔ آیئے۔"

یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی۔ کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کہانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بڑی نٹ کھٹ سمجھتے ہیں۔

میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہی۔ وہ پلنگ پر پھیلے ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لیتے رہے اور دو قینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کر کے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھرلی گھوٹنے پر بھی کر بحث نہ ہو سکے گی اس لئے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے جہالت اور کم مائیگی کے لئے بہترین ڈھال۔

مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے مجھ سے کئی سال پرانا اور اکھاڑے کا کج بحث ہے تیر کی نوک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹا دیتا ہے اس میدان میں بھی کھلی مات سے بہتر ہے کہ بزرگ مان کر ہتھیار ڈال دوں۔ شاگرد بن کر مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ لکچر جھاڑ کر حلق خشک کرے۔ موقع پاؤں تو ڈنک مار دوں۔ مگر توبہ کیجئے پطرس گھسے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹایئے بھی یہ بورنگ باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔

میں نے بھی چڑ کر ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کر دی انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الو کہہ دیا۔ میں

نے بھی کلس کر نہایت تہذیب اور سلیقہ سے انہیں احمق کہدیا جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے۔ میں نے پھر پٹھ کر ان کا ساتھ دیا گو جی یہ چاہ رہا تھا سرہانے رکھا ہوا لیمپ اسٹینڈ ان کے سر پر گر پڑے اور میں ہنستی رہوں۔

"ارے ڈیڑھ بج گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے۔ پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل میرے بدذات بھائی جنو کی طرح۔ ایک دفعہ اس کے چڑانے پر میں نے گال پر ایسا پنجہ مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔

"جلدی چلنا چاہئے ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہو گیا اور ہم نہایت اطمینان سے ڈائننگ ہال میں جا کر مینو پڑھنے لگے "اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں" میں نے پھر جلانے کی کوشش کی "یہ سب کھانے سارڈین کی طرح بدبودار اور لس لسے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد مچھلیوں، گھونگوں اور سیپیوں پر بحث ہونے لگی اب انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا ہر بات پر اتفاق کرنے لگے جس پر کوفت دوگنی ہو گئی۔ اور میں اس نتیجے پر پہونچی کہ پطرس اتر جائیں تو ذہن جانے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا اس وقت میں ان کی کہانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھپکیوں پر مسکرا کر جی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ فوراً ادب کی محفل سے چھلانگ مار کر کھانے پر آ گئے۔ کافی بدمزہ کھانا تھا۔ اسٹو لچا تھا جیسے چمڑا چبا رہے ہوں اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے بولے۔

"دوست یہ بجا تو سینگ مار رہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا تمہارے ہاں۔" بیرا بے چارہ کھسیانا ہو کر ہنس دیا۔ اور جب وہ پلیٹیں اکٹھا کر چلا گیا تو ایک دم سے بولے۔

"تم نے لکشمن کو پطرس کیوں سمجھا اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی۔" مجھے مسکراتا دیکھ کر بولنے سے پہلے جلدی سے بولے "شاید گدھے کو شکایت ہوتی"۔ میں نے اتنی زور سے ٹھٹہ مارا کہ ہال میں مہذب لوگ بُدبُد کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں

"درمیانہ درجہ کی، چار دیواریوں میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے کیسے واقف ہو سکتی ہے۔" ان کا خیال ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت تک یہ پہلا اتنا شاندار ہوٹل جسے صرف دیکھنے کے لئے گئی تھی۔ تکلفات، سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت تحقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دلچسپ قسم کے مہمان آتے تھے تب اس پر سے سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گدڑولنا اتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی چادر بچھا کر چینی کی پلیٹیں سجا دی جاتی تھیں۔ آپا بڑے چاؤ میں آ کر نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ اسے احمقانہ بناوٹ اور بے کار کی زحمت سمجھ کر نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نیپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو تام چینی کی رکابیوں میں کھانا لے کر بان کی چارپائی پر سینی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی ادوائن ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزہ آتا۔ کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں رس آتا۔ بان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پتلے شوربہ کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہمارا گھرانا ماہر تھا۔

تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میرے کندھے انجانے بوجھ سے تھک گئے۔ اور چغتائیت کو سخت ٹھیس لگی اور

مجھے فوراً احساس برتری ہونے لگا کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز اسی طرح طمطراق سا کھانا پڑتا ہوگا۔ انہوں نے شاید کبھی کھاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہوگا۔ خاص کر جب کہ اس میں پڑوسی کے باغ سے چرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔ اس کے بعد بیرے نے پلیٹوں میں نہ جانے کیا لا کر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ بڑے دھواں دھار طریقے پر کرشن چندر، بیدی، اور منٹو پر بحث ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا میں تکلف میں ان کی تعریفیں کرتی ہوں تاکہ لوگ مجھے برادریا دل سمجھیں اور میں کہتی تھی میں خدا کی بھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید نگار یا ایک کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دل بہلانے کو پڑھی ہیں۔ کچھ بُری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں ترازو ہو گئی ہیں۔

"یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا وہ سمجھے میں بن رہی ہوں۔ حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیئے تھے۔ ان کی علمی بزرگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا جو کہا وہ نہایت بے رخی سے سنی ان سنی کر گئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم سے کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

دو گھنٹے پنج سے کھیلتے گذر گئے

"آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یونہیں" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقہ سے کتر بیونت کرنے کے بجائے آپ انہیں دانتوں سے کھسوٹتی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذا رسانی کی لذت کا نشا ابھر آیا۔

جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور یہ پلیٹس کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسڑ جائے۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے رہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی آتار کر نہایت نرمی سے کہا۔ "اچھا...... اب نہیں لکھوں گی۔" انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

"مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے"۔ 'اونہ' میں نے سوچا۔ یہ میرے مکالمے تھوڑی ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں میں دوسری زبان کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈ شا سے متاثر ہیں؟"

"بے حد، میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈ شا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اٹھا لیا ہے کیوں کہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ مجھے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن 'جواب داری' کرنا ہوگی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک فلمی کہانی کے لیے اڑایا تھا۔"

میں نے سوچا اس سے پہلے یہ میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سر پھوڑ لوں۔ "آپ بھی کے جروم جروم اور پی۔ جی وڈ ہاؤس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہہ تو دیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی۔ یعنی دونوں مزاح نگار تھے۔ شاید چڑھ کر کہہ دیا ہوگا وہ نہایت ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا۔ بڑی پریشان صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا۔

"معاف کیجیے گا۔" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی پھر سرگوشی میں بیرے سے کچھ کہا۔ وہ بڑے زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"صاحب! آپ اطمینان رکھو۔ کوئی بات نہیں۔" بیرے نے ہمت بڑھائی۔

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو . . . . ." پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا۔

"آپ بولو صاحب"

"منیجر کو تو کچھ . . . . ."

"نہیں صاحب منیجر کو کون بولے گا؟ . . . . . ہم کو بولو . . . "

پطرس نے بڑی شکر گذار نظروں سے اسے دیکھا پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے۔

"کافی"

"کافی؟" بیرا چکرایا۔

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی۔" بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھنے لگا۔

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے . . . . . شاباش"

"نہیں صاحب اطمینان رکھو۔" بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو "دماغ تو سلامت ہے حضور کا؟" پطرس نے نہایت معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگار ہی نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلاپن ہے۔ ان کی زبان میں لپیٹنے ہیں اور برتاؤ میں ہلکا پھلکا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے۔ انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رُخ نہیں دیکھا۔ وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے۔ آزاد زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجلاہٹ سے مکدر سے ہو جاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ زیادہ مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں میں کسی سے بھی ملتی تھی۔ "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا میری چڑ سی ہو گئی۔ پطرس نے لحاف ہی نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔

"میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں۔" میں نے انہیں ذرا رسانیت کے موڈ میں پا کر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کا خیال ہے۔ انگریزی کا جامہ پہن کے تحریر زیادہ بلند ہو جائے گی۔"

پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انسان اتنا خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنے سے پیسے زیادہ ملتے ہیں احمد علی نے ایک کہانی کے مجھے چار پونڈ دلوائے تھے۔"

کچھ لاجواب سے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔ "فکر نہ کیجیے ایک دن آئے گا لوگ خود ہی اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔

ایک ایک لمحہ پر لطف گذرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی زنبیل میں بہت کچھ تھا وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے۔ میں ان دنوں ملاڈ رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جو میں نے نہیں پڑھا لوگوں سے ٹکڑے سنے۔ ایک بار دلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا وہاں فیض بھی تھے۔ مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی جس کا میرے دماغ پر دھندلا سا بھی عکس نہیں کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہوئیں جو میرے پلے

نہیں پڑیں۔

سال بھر بعد میں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سی نظر آنے لگی۔ میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ نہ جانے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہئے کہیں بھی ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گذر نہیں ہوگی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھ سو روپے کی نوکری معہ تقرر کے خط کے مل گئی۔ اس عرصہ میں مجھے ایک فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں نے پطرس کو بڑی شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔

پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہوگیا۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلا گیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہونچ گئے۔

مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نجانے کیوں محسوس ہوا ...... پطرس دور جا کر بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔ آج ہی میں نے مضامین پطرس خریدی ہے پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتر رہی ہے وہ قلم جو تھکے ہوئے دماغوں کو ایک لمحے کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہو چکا۔ مگر دور میرے تخیل میں وہ کھاری کھاری غلافی آنکھیں آج بھی بے ساختہ مسکرا رہی ہیں۔

اے۔ایس۔بی

شوکت تھانوی

"زیڈ۔اے۔بی" کے بڑے بھائی کو ہم لوگ "اے۔ایس۔بی" ہی کہا کرتے تھے ورنہ محض بخاری صاحب کہنے میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کون سے بخاری صاحب بڑے یا چھوٹے؟ اور پورا نام لینے میں یعنی احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کہنے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتنی سی تو عمر ہے اتنے بڑے بڑے نام لے کر اس کی خواہ مخواہ فضول خرچی کیوں کی جائے لہٰذا ریڈیو والے عموماً ان دونوں بھائیوں کو اے ایس بی اور زیڈ اے بی ہی کہنے میں کفایت شعاری کے زرّیں اصول پر عمل کیا کرتے تھے ۔۔۔ لیکن یہ میں نے بیچ ادھر سے ریڈیو کی بات کہاں شروع کردی۔ ریڈیو سے تو میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا ہے جب آل انڈیا ریڈیو کا لکھنؤ اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور میں اے ایس بی سے بحیثیت پطرس کے اس سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ یعنی اس وقت جب میں لکھنؤ سے بحیثیت "ٹاکر" تقریباً ہر ہفتہ آل انڈیا ریڈیو دہلی جایا کرتا تھا۔ اور ٹھانے بیٹھا تھا کہ پطرس بخاری سے ملاقات ہوتے ہی ان کو بھی اسی طرح پھانس لوں گا جس طرح مولانا نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، اور رشید احمد صدیقی کو پھانس چکا ہوں۔ اپنے ایک مجموعہ مضامین پر مولانا نیاز فتحپوری سے مقدمہ لکھوا چکا تھا۔ اس مجموعے کا نام بحرِ تبسم تھا۔ دوسرے مجموعہ سیلاب تبسم پر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ تیسرے مجموعہ طوفان تبسم پہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے مقدمہ لکھا تھا، چوتھے مجموعہ دنیائے تبسم پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ تھا۔ اور اب ایک اور مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کو پطرس بخاری پر نشانہ باندھ چکا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو اپنی تقریر نشر کرنے دہلی گیا تو اس نئے مجموعے سے مسلح ہو کر گیا اور بخاری صاحب کو ان کے دفتر میں جا لیا۔ بڑے خلوص سے ملے بلکہ مجھ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ نہیں مل رہا ہوں یعنی میں ان سے مرعوب ہونا چاہتا تھا اور وہ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مجھ کو اس سے کیا میں تو ایک عظیم مزاح نگار کے سامنے ان کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر تھا۔ اور ان کی عظمت کا احساس مجھ پر طاری تھا۔ جس کو وہ اپنے انتہائی یگانگت اور مساوات کے برتاؤ سے غیر محسوس بنائے دیتے تھے۔ آخر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں حرفِ مطلب زبان پر لایا اور بخاری صاحب سے اپنے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خندہ پیشانی سے بولے

"یہ کیا مقدمہ بازی لے بیٹھے آپ؟"

میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں یہ چھوٹا منہ بڑی بات تو ضرور ہے مگر میں آپ سے وعدہ لئے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔"

مجھ ہنستی ہوئی آنکھوں سے گھورا۔ کچھ سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا عاجز آ کر مسکراتے ہوئے بولے: "اگر آپ اپنے مقدمہ نگاروں کی ٹیم ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے لکھ دوں گا مقدمہ۔"

یہ وعدہ لے کر میں بڑے فاتحانہ انداز سے واپس آیا۔ مگر اس ملاقات کے بعد ہی حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے لکھنؤ میں بھی

اپنا اسٹیشن کھول دیا اور اس اسٹیشن کے ڈائریکٹر ذوالفقار جگل کشور مہرا اور پروگرام ڈائریکٹر ملک حبیب احمد نے اپنے محکمہ کو بجانے کیا پٹی پڑھائی کہ مجھ کو بھی صحافت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہوجانا پڑا اور اس کے چند ہی دن بعد میرا وہ مسودہ جو میں بخاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا مجھ کو ان کے اس خط کے ساتھ واپس مل گیا کہ "اب جب کہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہوچکا ہے عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیں اور میں مقدمہ نہ لکھوں۔" بات بھی ٹھیک تھی لہٰذا یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ اور بقول بخاری صاحب کے میرے مقدمہ نگاروں کی ٹیم مکمل نہ ہوسکی۔ اب بخاری صاحب محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے اور میں محکمہ کا ایک ادنیٰ کارپرداز۔ لہٰذا جب کبھی وہ لکھنؤ کے اسٹیشن کے معائنہ کے لئے تشریف بھی لائے تو میں نے ان سے وابستہ کرانے کی کوشش کی مگر خود انہوں نے عمداً گھیر گھار کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اسی توجہ سے کام لیتے رہے مگر مجھ کو اپنے حدود کا اندازہ تھا اور میں ان حدود سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ کچھ دن کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری صاحب کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا اُن کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت کھاری بھرکم قسم کے سڑے دئے افسر بنے رہتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی نجی صحبتوں میں ان ہی سب کے بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے جن پر ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا لطیفے سنا رہے ہیں نئے لطیفے سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ بات سے بات پیدا کر رہے ہیں ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔ ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری بات یاد کر کے ٹہلتے ہوئے میرے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا؟"

"میں نے کہا" کسی پر نہیں۔ وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کے چھپ گیا۔"

کہنے لگے" اور میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے نہ پڑھ سکوں۔"

میں کتاب پیش نہ کرنے پر ابھی پوری طرح نادم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا" آخر لوگ مقدمے لکھواتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر ٹہل رہا ہو بلکہ انگلی پکڑ کر میلہ دیکھنے گیا ہو۔"

میں نے اعتراف کیا کہ" جی ہاں میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں اور اب اس مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔"

بڑی سنجیدگی سے بولے" اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے۔"

کچھ ہی دن بعد مجھ کو لاہور سے پنچولی آرٹ پکچرس والوں نے طلب کر لیا۔ اور میں نے ریڈیو سے علیحدگی کے وقت بخاری صاحب کو ایک الوداعی خط لکھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا کہ:۔

"امتیاز (سید امتیاز علی تاج) کے بعد آپ کے بھی پنچولی آخر نکل ہی آئی۔ خداوند کریم آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ جا رہے ہیں خدا حافظ۔ ریڈیو کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ صرف جانے کے لئے نہیں آنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔"

اور جب پنچولی آرٹ پکچرس سے گزیٹڈ افسر بننے کے شوق میں سونگ پبلسٹی آفیسر ہو کر میں پھر لکھنؤ آگیا تو بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر نہیں بلکہ کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی حیثیت سے لکھنؤ کے دورے پر آئے اور مجھے خاص طور پر ملنے کے لئے بلا بھیجا۔ میں نے اپنی تازہ کتاب شیش محل پیش کی اور جب دوسرے دن ریڈیو والوں نے ان کے ساتھ ہی مجھ کو بھی لنچ پر مدعو کیا تو میری صورت دیکھتے ہی بولے:۔

"ساری رات شیش محل کی سیر کی ہے نشہ ابھی تک باقی ہے۔ کیسے کیسے بھرپور مصرعے کہے

ہیں جابجا ـــ ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتونِ مشرق کو جو احسان کے بچوں کی ماں تک ہے۔
احسان کی رفیقۂ حیات ہونا تو درکنار ـــ اور وہ افسر میرٹھی کے لئے کیا لکھا ہے کہ بچپن سے
ان کو دیکھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے برابر ہی نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ لوگ فریجیریٹر
میں بیٹھ کر عمر کو ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی لگانے والا مسالہ اپنے زندہ جسم پر لگا لیتے
ہیں۔"

اور مجھ کو اس تبصرے سے زیادہ خوشی اس کتاب کی رائلٹی وصول کرتے وقت بھی نہ ہوئی تھی اتنے بڑے مزاح نگار کی یہ سند میرے اترانے کے لئے بہت کافی تھی۔

سونگ پبلسٹی کے محکمہ میں چار پانچ سال تک گانے بجانے کی گز بیٹڈ افسری کر کے میں پھر اپنی اوقات پر آگیا۔ اور پنچولی آرٹ پکچرس سے پھر وابستہ ہو گیا مگر ۱۹۴۷ء ہی میں جب قیام پاکستان کے بعد پنچولی صاحب بمبئی سدھارے اور ریڈیو پاکستان کی داغ بیل پڑی تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل چھوٹے بخاری یعنی سید ذوالفقار علی بخاری نے مجھ کو پروانۂ تقرر دیتے ہوئے کہا کہ "یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ یہاں آپ کیا کریں گے اپنے لئے کام خود پیدا کیجئے۔" چنانچہ میں اپنے لئے کام پیدا کرنے میں اس طرح مصروف ہو گیا کہ اپنے کو بحیثیت قاضی جی کے پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اے ایس بی ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے اپنے آپ کو سبکدوش کرا کے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے دہلی سے لاہور آچکے تھے۔ اور اب ان کے بنگلے پر شام کی نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، صوفی تبسم مع اپنے حقّہ کے، جگل کشور مہرا جو مشرف بہ پاکستان ہو چکنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے کے ارادے کر رہے تھے۔ سید رشید احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، اور سید امتیاز علی تاج کے اجتماع رہتے تھے جو نہیں آتا تھا اس کو بخاری صاحب خود جا کر پکڑ لاتے تھے جو آجاتے تھے ان کو رات گئے بلکہ کبھی کبھی صبح ہونے سے قبل اپنی کار پر گھر چھوڑنے جاتے تھے اور یہ نصیحت کرتے جاتے تھے کہ رات کو خواہ کہیں رہو مگر صبح اپنے بستر ہی سے اٹھو۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو تین بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑا اور کوشش کی گئی کہ پگھلے ہوئے آئس کریم والوں کو جس طرح بھی ہو اسی وقت جگایا جائے اور حیرت ہے کہ اس وقت بھی ان کو کہیں نہ کہیں آئس کریم مل ہی گئی اور آئس کریم والے جمے جمائے ڈھونڈ ہی لئے کہیں نہ کہیں سے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر جگل کشور مہرا پاکستان کے زندہ باد ہونے کے بعد خود عجیب مردہ باد بن کر رہ گئے تھے کہ بخاری، اردو اور لاہور کی محبت میں رہ تو پڑے پاکستان میں مگر بجائے کیوں ان کو اپنا جگل کشور مہرا ہونا پاکستان میں کچھ بیوند سا نظر آرہا تھا بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے بخاری نے ان کو سمجھایا دوسرے دوستوں نے بھی اس جلد بازی سے روکا مگر ہوا یہی کہ ایک دن چند مخصوص احباب کی موجودگی میں بخاری صاحب کے گورنمنٹ کالج والے بنگلہ میں وہ مولانا غلام مرشد کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہو کر کلمہ شہادت پڑھتے اور مولانا غلام مرشد سے اس کا تفصیلی بلکہ تفصیلی سے بھی کچھ زیادہ ترجمہ سمجھتے نظر آئے اور عین اس وقت جب وہ جگل کشور سے یکا یک احمد سلمان بن چکے تھے اسی جگہ ان کی ترقی کے احکام موصول ہوئے کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر کر دئے گئے۔ اس کے بعد ہی دوسرا شرعی اجتماع خود احمد سلمان صاحب کی کوٹھی پر اس وقت ہوا جب ان کے نکاح کا مرحلہ درپیش تھا۔ اور محمود نظامی صاحب کے ذمہ تھا قاضی کو بلانا جو تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوارا نشاد مولانا کو نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے۔ بخاری صاحب نے ان مولانا کو بڑے غور سے دیکھا اور میرے کان میں کہا کہ "نکاح کے لئے قاضی اور چھوارے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں نظامی ان دونوں چیزوں کو ملا کر لے آیا ہے۔" اس تقریب میں سید ذوالفقار علی بخاری دولہا کے ولی بنے اور میں دلہن کا ولی۔ ہم دونوں مہر کے تعین پر تھوڑا بہت لڑ جھگڑ کر آخر تصفیہ تک

پہنچ ہی گئے۔ بخاری صاحب صرف تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ چھوٹے بخاری وکیل بنے گواہ میں بنا اور دوسرے گواہ محمود نظامی صاحب اور جب دلہن سے پوچھ کر ہم لوگ قاضی صاحب کے پاس آگئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کو محض یہ سمجھانے میں کتنے لوہے لگے ہیں کہ دلہن کا نام سلطانہ نہیں بلکہ انور ہے اور دولہا کا نام انور نہیں بلکہ سلطان ہے اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ قاضی صاحب نے ان دونوں میں سے کس کو دولہا اور کس کو دلہن سمجھ کر نکاح پڑھایا ہے بہر حال یہ طے ہے کہ نکاح ان ہی دونوں کا ہوا تھا اور غالباً یہ بات ان ہی دونوں پر چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنا دولہا دلہن ہونا خود آپس میں طے کرتے رہیں البتہ جو خطبہ بعد میں پڑھا ہے اس کے متعلق بخاری صاحب کا بیان یہ تھا کہ یہ خطبہ نکاح کا نہیں بلکہ جمعہ کا تھا اس خطبے کے بعد بخاری صاحب نے دور سے ایک چھوارا ان مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا: "مولانا چھوارا" اور مولانا نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا "جی بسم اللہ" بخاری صاحب نے "جزاک اللہ" کہا اور چھوارا کھا گئے۔

اس کے بعد ہی یہ شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کا ہیڈ کوارٹر کراچی چلا گیا۔ چھوٹے بخاری صاحب معہ رشید احمد صاحب اور احمد سلمان صاحب کے کراچی چلے گئے، بڑے بخاری صاحب یو این او میں جا پہنچے میں لاہور ہی میں رہ گیا اس سنائے میں اپنے کو الجھانے کے لئے۔ کئی سال بعد کراچی میں اپوا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا بخاری صاحب ان دنوں امریکہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اس مشاعرے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا کہ کراچی میں بخاری صاحب سے ملاقاتیں رہیں گی۔ سلمان صاحب بھی وہیں ہیں رشید صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب بھی وہیں ہیں ایک مرتبہ پھر پچھلی صحبتیں گرم ہو جائیں گی اور کراچی پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی بخاری صاحب ہی کر رہے ہیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ مشاعرے میں پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ چنانچہ جب میں پہونچا ہوں تو بخاری صاحب فی البدیہہ صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور ذکر کچھ میرا ہی تھا کہ: "اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شوکت تھانوی بھی آئے ہوئے ہیں جن سے میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں کہ آخر وہ کس تھانے یا کس تھان سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ ان کا کوئی ایسا گہرا راز ہے کہ وہ کسی طرح اسے کھولنا گوارا نہیں کرتے" ——— اس مشاعرے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن بخاری صاحب نے اپنے گھر پر اپنے چند نیاز مندوں کو بلا لیا۔ اس میں شرکت کے لئے جب میں پہنچا تو بخاری صاحب محض ایک نکر پہنے باقی مہاتما گاندھی بنے دھوپ میں بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا پہنچا ہڈیوں کا ایک نحیف و نزار ڈھانچہ تھا ان کے قلب کے دورے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی آج ان کا یہ لاغر جسم دیکھ کر بیساختہ دل سے ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں نکلنے لگیں مگر بخاری صاحب نے اپنے لطائف و ظرافت سے بہت جلد اس اضمحلال کو ختم کر دیا البتہ کھانے کی میز پر جب کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے ایک ڈش سے جیلی اپنی پلیٹ میں نکالی ہے تو بخاری صاحب دوڑ پڑے: "یہ نہ لینا کھو کا مر جاؤں گا میں"۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف "ناشپاتی" کے ابلے ہوئے چند ٹکڑے اور یہ جیلی ہی کھا سکتے ہیں یہی ان کی غذا ہے اور یہی غذائیت سے بے نیاز غذا کھا کر وہ جی رہے ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کتنا ترس آیا ہے ان پر۔ کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ ان سے کہوں کہ اب آپ امریکہ نہ جائیں مگر میں ان پر وہ خطرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو خود محسوس کر رہا تھا۔ آخر پچھلے سال جب میں ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہو کر پھر صحافت میں آ گیا اور روزنامہ جنگ کی ادارت کے سلسلہ میں مستقلاً کراچی کا ہو گیا اور آخری مرتبہ بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اب آپ کراچی سے نہ جائیں اور اس کا جواب بھی سن لیا کہ "اگر آپ پکے کاغذ پر یہ لکھ دیں کہ میں کراچی میں رہ کر نہ مروں گا تو میں امریکہ جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کو تیار ہوں"۔ چنانچہ وہ پھر امریکہ گئے اور اب کبھی امریکہ سے واپس نہ آئیں گے اب کراچی میں کوئی ان کا انتظار نہ کرے گا اب کوئی ان سے اصرار نہ کرے گا کہ امریکہ نہ جائیے ———

———

پیرومُرشد

کنہیالال کپور

پطرس میرے استاد تھے۔ ان سے پہلی ملاقات تب ہوئی، جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگلش میں داخلہ لینے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انٹرویو بورڈ تین اراکین پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ڈکنسن (صدر شعبہ انگریزی) پروفیسر مدن گوپال سنگھ اور پروفیسر اے ایس بخاری۔ گھر سے خوب تیار ہو کر گئے تھے کہ سوالات کا کرارا جواب دے کر بورڈ کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے۔ بخاری صاحب نے ایسے سوال کئے کہ پسینے چھوٹنے لگے جونہی کمرے میں داخل ہو کر آداب بجا لائے انہوں نے خاکسار پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا: "آپ ہمیشہ اتنے ہی لمبے نظر آتے ہیں یا آج خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟" لاجواب ہو کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی نہیں"

"دیکھنے میں تو آپ مجنوں لاہوری نظر آتے ہیں"

پروفیسر مدن گوپال سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "بخدا ان کی شکل خطرناک حد تک مجنوں گورکھپوری سے ملتی ہے"۔ پھر میری جانب متوجہ ہوئے "آپ کبھی مجنوں گورکھپوری سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں"

"ضرور ملیے۔ وہ آپ کے ہم قافیہ ہیں۔"

پھر پوچھا "یہ آپ کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ آپ کتابی کیڑے ہیں۔ جانتے ہو کتابی کیڑا کسے کہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ جو شخص ہر وقت مطالعہ میں منہمک رہتا ہے۔"

"کتابی کیڑا وہ ہوتا ہے، جو کتاب کی بجائے قاری کو کھا جاتا ہے۔"

پروفیسر ڈکنسن نے بخاری صاحب سے دریافت کیا "ان کے بی اے میں کتنے نمبر آئے تھے؟"

انہوں نے میرا ایک سرٹیفکیٹ پڑھتے ہوئے جواب دیا۔ "۳۲۹۔ فرسٹ ڈویژن۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" پروفیسر مدن گوپال سنگھ نے پوچھا۔

بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "داخل کرنا ہی پڑے گا۔ جو کام ہم سے عمر بھر نہ ہو سکا، وہ انہوں نے کر دیا۔

پروفیسر ڈکنسن نے چونک کر پوچھا" کونسا کام بخاری صاحب ؟"

سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے فرمایا" یہی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لینے کا!"

دوسرے دن کلاس روم میں گئے۔ بخاری صاحب کا ان دنوں عالم شباب تھا پینتیس سال کے قریب عمر ہوگی۔ دراز قد گھنی بھنویں، سرخ و سفید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبوترا چہرہ۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ افغان یا ایرانی دکھائی دیتے تھے۔ ریشمی گوؤن (GOWN) پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔ حاضری لئے بغیر لیکچر شروع کیا کرتے۔ عموماً لیکچر سے پہلے اپنے عزیز شاگردوں سے وہ ایک چونچیں ضرور لڑایا کرتے تھے۔ بلراج ساہنی (مشہور ہندوستانی اداکار) ان کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ اکثر ایک آدھ فقرہ اس پر کستے تھے "کیا بات ہے ساہنی، آج کچھ کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔ جانتے ہو جب کوئی نوجوان اداس رہتا ہے تو اس کی اداسی کی صرف دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یا وہ عشق فرمانے کی حماقت کر رہا ہے یا اس کا بٹوہ خالی ہے۔"

لیکچر کسی کتاب یا نوٹس (NOTES) کی مدد کے بغیر دیتے تھے۔ انگریزی کا تلفظ ایسا تھا کہ انگریزوں کو رشک آتا تھا۔ فرسودہ یا روایتی انداز بیان سے چڑ تھی۔ غلطی سے بھی کوئی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ "ڈرامہ" پڑھانے میں خاص کمال حاصل تھا۔ "ہیملٹ" HAMLET پڑھا رہے ہیں تو چہرے پر وہی تاثرات پیدا کریں گے جو موقع محل کی عکاسی کرتے ہوں۔ کنگ لیر (KING LEAR) پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ طوفان میں گھرا ہوا بوڑھا شیر غرا رہا ہے۔ شیکسپیر کے مشہور کرداروں کی تقریریں زبانی یاد تھیں انہیں اس خوبی سے ادا کرتے کہ سامعین کو جھرجھری سی آجاتی حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اکثر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لیکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کتاب انہوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے۔

ایک بار فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب "LAUGHTER" (مزاح) کی وضاحت فرماتے وقت انہوں نے طنز و مزاح سے متعلق بہت دلچسپ باتیں بتائیں فرمایا "انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا "کیونکہ وہ انسان کا جد امجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "ہنسنے کے لئے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں لیکن اگر ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا عقل بڑی یا بھینس ...... ہمدردی یا ترحم کا جذبہ ہنسی کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے تو آپ اس پر ہنسیں گے لیکن اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آپ کبھی نہیں ہنس سکیں گے اگر ایک ریلوے گارڈ گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سست کہے۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکنے والے ہر بچے کو سرزنش کرے ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہو جانا چاہئے۔ اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجئے بھرے میلے میں کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے کچھ لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے۔ یہ بات دوسروں کے نقطہ نگاہ سے طربیہ اور خود اس شخص کے نقطہ نظر سے المیہ ہے۔..... مزاح بالکل اسی

طرح تیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے صابن یا خوشبودار تیل۔ فارمولا یہ ہے کہ دونوں چیزوں میں نامطابقت پیدا کر دیجئے۔ مثال کے طور پر یہ کہنے کی بجائے کہ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔" یہ کہئے کہ "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں۔" مزاح پیدا ہو جائے گا۔"

بخاری صاحب مزاحیہ تقریر کرنے کے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ سر عبدالقادر کا دورِ زریں تھا۔ ہر ادبی مجلس میں کرسیٔ صدارت اور سر عبدالقادر لازم و ملزوم تھے۔ یونیورسٹی ہال میں ایک ادبی مباحثہ ہو رہا تھا موضوع زیرِ بحث تھا THE PROPER STUDY OF MANKIND IS WOMAN. (صنفِ نازک ہی مطالعہ کا صحیح موضوع ہے) جب پروفیسر دیوان چند شرما، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، تقاریر کر چکے تو سر عبدالقادر نے بخاری صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کو کہا۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے کہ انہیں پوری توقع تھی اب ہنسی مذاق کے فوارے چھوٹیں گے۔ بخاری صاحب جھومتے جھامتے اسٹیج پر آئے۔ صاحب صدر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سامعین پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور فرمایا۔

"صاحب صدر! میں بدقسمتی سے پروفیسر واقع ہوا ہوں۔ جس کالج میں پڑھاتا ہوں وہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کلاس روم میں طلبا کی توجہ کا مرکز صنفِ نازک ہی ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں طلبا کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا، در بسا اوقات مجھے صنفِ نازک پر رشک آنے لگتا ہے صاف ظاہر ہے طلبا یہ نکتہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنفِ نازک ہی مطالعہ کا اصلی موضوع ہے ...... صاحب صدر! صنفِ نازک کے مطالعہ کے بغیر سائنس کا مطالعہ ناممکن ہے، کیا آپ MAGNETISM (مقناطیسیت) کا مطالعہ صنفِ نازک کے بغیر مکمل سمجھیں گے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پرکشش ہستی خداوند تعالےٰ نے پیدا نہیں کی۔ کیا آپ HEAT (حرارت) کا مطالعہ کرنے میں عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی عورت کی موجودگی کی مرہونِ منت ہے کیا آپ ELECTRICITY (برقیات) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ کو معلوم ہے کہ حوا کی بیٹیاں بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں..... صاحب صدر! صنفِ نازک آرٹ کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر لیونارڈو، رافیل اور مائیکل اینجلو نے عورت کے خط و خال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کی تخلیق کر سکتے۔ جن کا شمار عجائباتِ عالم میں ہوتا ہے۔ کیا کالی داس، شکنتلا، شیکسپیر، روزالنڈ (ROSALIND) اور دانتے، بیتریس (BEATRICE) کا تصور بھی ذہن میں لا سکتے۔ اگر انہوں نے صنفِ نازک کے مطالعے میں شب و روز نہ گزارے ہوتے...... صاحب صدر! صنفِ نازک نے موسیقاروں سے ٹھمریوں اور دادروں، شاعروں سے مثنویوں اور غزلوں، اور رقاصوں سے کتھک اور کتھاکلی کی تخلیق کرائی۔ اگر آج فنونِ لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ کے اصلی موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جن سے بجلی کے پنکھے، بھستی بسی فلمیں، اور اکثر جنبل تو معرضِ وجود میں آ سکتی ہے لیکن "میگھ دوت"، "دتائیں" اور منی پوری رقص" کی توقع کرنا بے کار ہے۔"

مرحوم تقریر نہیں سحر کیا کرتے تھے۔ ان کی ساحری کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد پروفیسر آر ایل مہتہ کے اصرار پر ڈی اے وی کالج لاہور میں گالزوردی کے ناول A MAN OF PROPERTY پر لیکچر دیا۔ پروفیسر مہتہ ان دنوں ڈی اے وی کالج میں ملازم تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا مطلع ابر آلود تھا ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لاہور کے کالجوں کے سینکڑوں طلبا و طالبات لیکچر سننے کے لئے ڈی اے وی کالج کے سائنس تھیٹر میں اکٹھے ہوئے۔ بخاری صاحب نے لیکچر کی تمہید اس فقرے سے کی "خواتین و حضرات! ڈی اے وی کالج میں یہ میرا پہلا اور آخری لیکچر ہے وجہ یہ کہ اس کالج کے طلبا کا انگریزی کا تلفظ اتنا عجیب واقع ہوا ہے کہ جب وہ مجھے انگریزی میں بولتے ہوئے سنیں گے۔ تو یہ سمجھیں گے میں انگریزی کی بجائے فرانسیسی یا جرمن میں تقریر کر رہا ہوں"۔ مرحوم کو انگریزی فکشن (ناول) پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ جب وہ گالزوردی کے ناول کی وضاحت کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا خود مصنف اپنی تخلیق کا تجزیہ کر رہا ہے۔ طلبا ان کے لیکچر کے NOTES لے رہے تھے۔ بخاری صاحب

کی فصاحت اور بلاغت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک خوب صورت فقرے کے بعد دوسرا وضع کرتے تھے، اور طلبا تذبذب میں پڑجاتے کہ کون سا فقرہ نوٹ کریں اور کون سا نظر انداز کردیں۔ یکلخت باہر بارش تیز ہوگئی۔ بجلی ایک دم جو زور سے کڑکی تو کمرے کی تمام بتیاں گل ہوگئیں۔ بخاری صاحب نے سلسلہ تقریر منقطع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھُپ اندھیرے میں اپنے اسی شگفتہ انداز میں تقریر کرتے رہے اور طلبا اندھیرے میں ان کے فقرے نوٹ کرنے کی کوشش میں محو رہے۔ کہیں سے شور و غل، چیخ و پکار کی آواز نہیں آئی۔ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد بتیاں پھر روشن ہوئیں۔ بخاری صاحب نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر کے سننے کے بعد اکثر طلبا کا یہ ردِ عمل تھا کہ جو باتیں ان کے اپنے پروفیسر دو سال میں نہیں بتا سکے وہ بخاری صاحب نے ایک گھنٹہ کے دوران میں بتادیں۔ اسی تقریر سے متعلق مجھے ان کا ایک فقرہ یاد رہ ہے۔ فرمایا:

"مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر بیکر (BAKER) نے انگریزی ناول پر آٹھ جلدیں لکھی ہیں جن کا مجموعی وزن کوئی چار سیر ہوگا۔ ایک اور انگریز نقاد جے بی پریسٹلے (J. B. PRIESTLY) نے ناول پر ایک کتابچہ لکھا جس کا وزن چار تولے ہوگا۔ میری رائے میں اگر بیکر کی تمام جلدیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور پریسٹلے کا کتابچہ دوسرے میں۔ تو یقیناً پریسٹلے کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

سناتن دھرم کالج میں ایک ادبی مباحثہ ہوا۔ بخاری صاحب وہاں صاحبِ صدر کی حیثیت سے موجود تھے۔ موضوع زیرِ بحث تھا ـــــ FRAITLY, THY NAME IS WOMAN (عورت تمہارا دوسرا نام کمزوری ہے) لاہور کے بہترین مقرر اس مباحثے میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر یورپ کی سیر کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں یورپین عورتوں کو خاص طور پر آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ نے ہندوستان کی تاریخ سے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ عورت نے ہر گام پر مرد کو دھوکا دیا ہے۔ سکھ مہارانی "جنداں" کا ذکر کیا گیا۔ حوّا کی کمزوری کی طرف بھی بار بار اشارے کئے گئے۔ بحث کے اختتام پر بخاری صاحب نے فرمایا "میں نے مخالفین کے دلائل بڑے غور سے سنے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلائل صحیح اور نتائج غلط ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ عورت مرد کو ہمیشہ گمراہ کرتی رہی ہے تو میرے خیال میں یہ مرد کی کمزوری اور عورت کی شہ زوری ہے ..... حالانکہ میں نے بھی یورپ کی سیر کی ہے لیکن عورتوں سے متعلق میرا تجربہ اتنا وسیع نہیں جتنا میرے چند دوستوں کا جنہوں نے یورپین عورتوں کی کمزوری کا بیان چٹخارے لے لے کر کیا...... کہا گیا کہ یورپ میں عورت شکاری اور مرد شکار ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں ہر شیر اور عقاب کو کمزور سمجھنا چاہیے۔ دراصل بات یہ ہے خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ نہ ہر عورت کانچ کی چوڑی ہے اور نہ ہر مرد فولاد کا پنجہ۔"

بخاری صاحب اپنے طلبا میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ رٹے رٹائے فقروں سے انہیں بہت نفرت تھی۔ ادھر کسی طالب علم نے کسی مشہور نقاد کے قول کا حوالہ دیا ادھر جھٹ انہوں نے پھبتی کسی "منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اجی حضرت یہ فرمان تو اے سی بریڈلے (A.C. BRADLEY) کا ہے۔ خاکسار بریڈلے کی نہیں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہے" جب ہمارا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا تو میں نے اپنے پرچے میں متعدد مشہور نقادوں کے فقرے نقل کر دیئے۔ بخاری صاحب نے مجھے "صفر" نمبر عطا کرتے ہوئے پرچے کے ٹائیٹل پیج (TITLE PAGE) پر لکھا: "آپ کا سارا پرچہ واوین میں ہونا چاہیئے۔ آپ نے جگہ جگہ ایف ایل لوکس (F.L. LUCAS) اور پروفیسر کلر کوچ کے اقوال نقل کر دئے ہیں۔ یہ دونوں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں کہ اپنے استادوں کا ممتحن بن سکوں۔ مجھے تو آپ کا امتحان لینا ہے۔"

کلاس روم میں کبھی کبھی جان بوجھ کر الٹی بات کہہ دیتے۔ ساری کلاس پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑجاتی۔ وہ ہر ایک معترض کو ایسا دندان شکن جواب دیتے۔ کہ بے چارہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ سارا پیریڈ بحث مباحثہ میں گزر گیا۔ سب کو قائل کرنے کے بعد فرماتے "یہ بات میں نے صرف اشتعال دلانے

کے لئے کہی تھی۔ ورنہ اس میں کون کافر شک کر سکتا ہے کہ شیکسپیر بہت بڑا فن کار ہے۔" SEMINAR کے پیریڈ میں جہاں طلبار کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی، وہ ہر ایک طالب علم پر جرح کیا کرتے تھے۔ ایسی کڑی جرح کہ طلبار کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ خون خشک ہو جاتا۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے جواب مضمون میں لکھا ہے کہ ٹینی سن (TENNYSON) کے کلام میں موسیقیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ موسیقیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"موسیقیت سے میرا مطلب یہ ہے کہ ٹینی سن کا کلام پڑھتے وقت ایک دلکش لَے یا تال کا احساس ہوتا ہے۔"

"لَے یا تال کیا چیز ہے؟"

"آواز کا اتار چڑھاؤ"

"ٹینی سن کے کسی مصرعے کا حوالہ دے کر بتائیے۔"

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں یونہی ایک مصرع پڑھ دیا۔ فرمانے لگے "یہ تو اتنا کرخت ہے کہ اس کے مقابلے میں کوّے کی آواز زیادہ سریلی معلوم ہو گی کہیں یہ بات تو نہیں کہ آپ موسیقی اور شور وغل کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔"

سیمنار (SEMINAR) میں اکثر ہندوستانیوں کی عادات پر دلچسپ تبصرہ کیا کرتے تھے۔ "ہم ہندوستانی بھی تین لوک سے نیارے ہیں۔ انگلینڈ میں اگر کسی کے گھر موت واقع ہو جائے تو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا دور دراز کا رشتہ دار اللہ کو پیارا ہو جائے تو ساری رات دھاڑیں مار مار کر ہمسایوں کے علاوہ گلی محلہ والوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔"

"شور وغل کا ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے۔ انگلینڈ اور فرانس میں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اتنی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہیں گویا کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ہم ہندوستانی 'مدہم کی بجائے "پنجم" میں باتیں کرنے کے عادی ہیں، بجنداہم بولتے نہیں چلاتے ہیں۔"

"ہم ہندوستانی جب تقریر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گھر والوں سے لڑ کر آئے ہیں اور سامعین پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ماتمی قرارداد بھی ہم اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے ہمسایہ ملک سے اعلانِ جنگ کر رہے ہوں۔"

"مبالغہ آمیزی ہماری طبیعت کا شعار بن چکی ہے۔ یہاں ہر کانفرنس 'آل انڈیا' یا 'بین الاقوامی' ہوتی ہے۔ چاہے شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک درجن کیوں نہ ہو...... چند دن ہوئے میں نے موچی دروازہ کے اندر ایک دکان دیکھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا ہارمونیم اور خستہ حال طبلہ پڑا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا" انٹرنیشنل اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈانسنگ۔"

"ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے جوش نہیں۔ کیمبرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد ڈکنز کو پچے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "بور کرنے کے لئے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا۔ آپ نے چھ سات سنوانے کا خواہ مخواہ تکلف کیا۔"

بخاری صاحب سے آخری ملاقات جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ تب وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو چکے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے فرمانے لگے۔ "آپ ڈی اے وی کالج میں یونہی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ غیر ادبی ماحول میں رہنا ذہنی خودکشی کے مترادف ہے میں جلد ہی آپ کو گورنمنٹ کالج میں لانے کی کوشش کروں گا۔" ان دنوں تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ کسی پروفیسر نے کہا اگر پاکستان بن گیا تو ہم کپور کو ہندوستان میں نہیں جانے دیں گے۔ البتہ انہیں مشرف بہ اسلام ہونا پڑے گا۔" بخاری صاحب نے چونک کر

فرمایا "حضرت پہلے ہم اور آپ تو مشرف بہ اسلام ہو لیں۔ اس غریب کی باری تو بعد میں آئے گی آخر ہم اور آپ میں کون سی مسلمانی رہ گئی ہے۔"

آل انڈیا ریڈیو کا تذکرہ چھڑا، کہنے لگے "ایک بار میرے متعلق پارلیمنٹ میں کہا گیا کہ میں دوست پرور ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو میں میں نے اپنے دوست اور شاگرد اکٹھے کر رکھے ہیں۔ میں نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں کہا یہ الزام سو فی صد درست ہے مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ بدقسمتی سے میرے تمام شاگرد اور احباب قابل ترین اشخاص واقع ہوئے ہیں، اور قابل دوست یا شاگرد جاہل دشمن سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔"

بخاری صاحب ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کا مقبرہ دیارِ غیر میں بنا۔ ہندوستان اور پاکستان سے اتنی دور کہ ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس پر آنسو بہانے یا شمع جلانے کی سعادت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن فہم و فراست کی شمعیں جو وہ خود جلا گئے۔ ان کی روشنی ابدی ہے ان کی دین صرف 'مضامینِ پطرس' نہیں۔ ان کی اصلی دین ان کے وہ مایہ ناز شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ادب اور فن میں نئی راہیں نکالیں۔ اور جنہیں اپنے "پیر و مرشد" پر جسد خاکی کے آخری سانس تک فخر رہے گا۔

پطرس بخاری مرحوم

۱۳۷۸ھ

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

بخاری صاحب کی زندگی کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اگر یہ کہا جائے کہ ان کی بعض وابستگیوں کے ڈانڈے ایک بین الاقوامی افق سے ٹکراتے تھے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بقول ان کے ان کے دل میں تنہا ایک ملک یا قطعہ ارضی کی یاد نہیں بلکہ بیک وقت چھ ملکوں کی یادیں سمائی ہوئی تھیں وہ ان سب کو سینے سے لگائے رکھتے اور کسی ایک وقت بھی دل سے الگ نہ ہونے دیتے۔ یہ ان کے وسیع القلب ہونے کی دلیل تھی۔

اس وسعت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں ایک لوچ بھی تھا۔ وہ جہاں بھی ہوتے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس ماحول میں سمو لیتے یا یوں کہیے کہ اس ماحول کو اپنا لیتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک یاد ان کے دل سے ہمیشہ لپٹی رہتی اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ پڑتی وہ لاہور شہر کی یاد تھی اور اس شہر کا وہ بلند اور نمایاں ٹکڑا جسے دنیا گورنمنٹ کالج کے نام سے پکارتی ہے۔

بخاری مرحوم اس کالج کے طالب علم بھی رہے تھے۔ ان کی اعلےٰ تعلیم کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا، ان کی علمی اور ادبی زندگی یہیں پروان چڑھی تھی وہ یہیں استاد بھی رہے اور رئیس درس گاہ بھی۔

ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس ادارے کو چھوڑ کر باہر جانا پڑا، ان کے قدم دنیا بھر میں گھومے، ان کے فکر و ذہن نے بڑی بڑی پروازیں دکھائیں لیکن اس کالج کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے۔

ریڈیو کے محکمہ میں تقریباً دس سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے اوائل میں دوبارہ کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے وارد ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دن کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کا سامان ٹرک سے اتارا جا رہا تھا تو وہ میرے ساتھ کالج کے وسیع صحنوں اور سرسبز میدانوں میں گشت لگا رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کا تبسم صاف صاف بتا رہا تھا کہ انہیں اس قدیمی ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن میں کالج کی عظیم الشان عمارت کا گوشہ گوشہ بدستور تازہ تھا وہ ان میں سے یوں گزر رہے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے گھر میں پھر رہا ہو۔ وہ جہاں کوئی نئی چیز بھی دیکھتے تو انہیں اس میں اجنبی پن محسوس نہ ہوتا۔ جہاں کوئی چیز اپنی اصلی جگہ سے ہلی ہوتی تو کہتے "ہیں! یہ کیا ہوا؟"

بہرحال وہ اس کوچے کے ذرے ذرے سے آشنا تھے۔ کیونکہ ادھر مدتوں آئے گئے تھے۔

ان کے کالج میں آنے کے فوراً بعد حالات بگڑ گئے۔ لاہور میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہوئے لیکن بخاری صاحب مرحوم نے کالج کی فضا کو بڑی خوش اسلوبی سے محفوظ رکھا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد حالات ابھی مخدوش تھے۔ مقامی طلبار اور اساتذہ کی طبیعتیں اکھڑی تھیں۔ اور باہر سے

وارد ہونے والے اصحاب سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔ اس ابتری کی حالت میں انہوں نے کالج کو سنبھالا اور اس احتیاط اور محبت سے سنبھالا کہ اس کی روایات اور شان میں فرق نہ آیا۔

مجھے خوب یاد ہے کالج میں فسٹ ایئر کے داخلے کے دن قریب آرہے تھے۔ اخبارات میں داخلے کا اعلان ہوچکا تھا۔ داخلے کے فارم تقسیم ہو رہے تھے۔ داخل ہونے والے بچوں کی ہر طرف چہل پہل تھی۔ بخاری صاحب کے قدم غیر معمولی طور پر تیزی سے ہر طرف اٹھ رہے تھے۔ کبھی وہ نو وارد امیدواروں کو دیکھتے۔ کبھی دفتر کے کلرکوں پر نظر ڈالتے، کبھی دوسرے کالجوں میں پہنچ کر وہاں کی فضا کو بھانپتے ان کے دماغ میں ایک خلجان تھا۔ وہ یہ کہ کیا گورنمنٹ کالج میں آنے والے طلبار اسی قدیم معیار کے ہوں گے؟ کیا اس کی شان حسب معمول بلند رہے گی؟ کیا اس کی روایات میں فرق تو نہیں آئے گا؟

جب درخواستیں گزارنے کا آخری دن آیا تو وہ صبح سے بے چین رہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ہیڈ کلرک سے امیدواروں کی تعداد اور ان کی استعداد کے بارے میں پوچھتے جب شام کو پانچ بجے انہیں معلوم ہوا کہ فسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے امیدواروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تک پہنچ چکی ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور بے ساختہ کہنے لگے ــــــــــــ صوفی! ہمارے بچوں میں بڑی جان ہے!! اس کالج کو زندہ رکھیں گے۔

داخلے میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا؛ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ان کے شریک کار رہے۔ اللہ جانے انہوں نے کتنے بلکتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھے، کتنے نادار اور مایوس انسانوں کی ڈھارس بندھائی۔ اس عالیشان عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتے، ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا۔ اور اس کام کے لئے انہیں محکمہ تعلیم، افسران بالا، وزرا کے آستانوں غرض جہاں جہاں بھی جانا پڑا گئے اور امداد لے کر آئے۔ ایسے مخدوش حالات میں انہوں نے کالج کے لئے وہ کچھ کیا کہ شاید کوئی دوسرا نہ کر سکتا۔

ایک دن چند بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔ دوستو! تمہیں معلوم ہے گورنمنٹ کالج کا فارغ التحصیل طالب علم جہاں کہیں بھی ہو سب میں ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات، اس کا لب و لہجہ فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے ماحول اور ہمارے معیار کی بدولت ہے۔ اب اردو ایم اے کی کلاس شروع ہونے والی ہے میں سوچتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر ہم نے انگریزی ایم اے کلاس کی طرح اسے بھی نہ سنبھالا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی حیثیت ادیب فاضل اور منشی فاضل کی سی نہ رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اردو کی ایم اے کلاس کو یونیورسٹی سے الگ تھلگ چلایا اور اس میں بڑی سرگرمی اور تندہی سے کام کیا۔ اگر وہ امریکہ نہ چلے جاتے تو اس کے لئے کیا کچھ نہ کرتے۔

کالج کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں اور اگر انہیں یہاں ٹھہرنے اور کام کرنے کا موقعہ ملتا تو یہ ادارے اللہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ لیکن حکومت ان سے اور خدمت لینا چاہتی تھی۔ انہیں بار بار باہر جانا پڑتا لیکن اس غیر حاضری میں بھی ان کا دل کالج کی یاد سے خالی نہ ہوتا۔ چند مہینوں کے بعد جب وہ لوٹ کر آتے تو گھر پہونچنے سے پہلے کالج کے سامنے موٹر کو کھڑا کر کے اِدھر اُدھر نظر ڈالتے اور ایک خوشی کی لہر ان کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے ایک ایک ذرّے سے لپٹ رہے ہیں۔

گورنمنٹ کالج میں ان کی حیثیت محض ایک معلم، استاد، یا پرنسپل کی نہیں تھی۔ وہ طالب علموں کو صرف پڑھاتے نہیں تھے، وہ زندگی میں ان کے مشفق رہنما اور دوست بھی تھے۔ طالب علموں کی ذہنی استعدادوں کو ٹٹولنا، انہیں ابھارنا، ان کی محنتوں کو صحیح راہ پہ چلانا، ان کی زندگی کو سنوارنا، ان کا ایک اہم فریضۂ حیات تھا۔ اور ایک دلچسپ مشغلہ۔ اس کے لئے وہ نئے نئے تعلیمی، ادبی، تفریحی حیلے سوچتے رہتے۔ مشاعرے، ڈرامے، مناظرے

ادبی مجلسیں قائم کرتے اور اس طرح طالب علموں کو مصروفِ کار رکھتے۔

کالج کے مشاعروں میں وہ نہ صرف صدارت کرتے بلکہ دادِ سخن بھی دیتے اور خود بھی شعر سناتے۔ ڈراموں میں ان کی عملی شرکت نے اس فن کو اس سرزمین میں ایک خاص معیار عطا کیا تھا۔ وہ خود نئے نئے ڈرامے ترجمہ کرتے، خود پارٹ بھی کرتے اور اداکاری کے ساتھ ساتھ ہدایت کار بھی ہوتے۔ انہوں نے کالج میں ادبی سوسائٹیوں کے ہوتے ہوئے ایک الگ "اردو مجلس" قائم کی جس کے ہفتہ وار جلسے انہیں کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس میں شریک ہونے والے کچھ احباب اور کچھ مخصوص طالب علم ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں علمی، ادبی مقالے پڑھے جاتے اور ایک نہایت بے تکلف فضا اور ماحول میں ان پر بے لوث تنقید بھی کی جاتی۔ تنقید کا مقصد تخریب نہیں بلکہ تہذیب ہوتی تھی۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے اوّل اوّل طلبا، وہ نوجوان تھے جو آج اپنی علمی ادبی حیثیت سے اپنے دیس کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ میری مراد آغا حمید، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیارپوری، ن۔م۔ راشد جیسی شخصیتوں سے ہے غرض بخاری صاحب مرحوم غیر معمولی طور پر گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کی یاد کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور جہاں بھی رہے اسے فراموش نہ کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود کالج کی سرزمین بھی ان کی یاد سے خالی نہ تھی۔ آج جگہ جگہ ان کی محبت کے آثار نظر آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے شاگردوں کے دل اس محبت کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کالج کی فضا میں جن استادوں کی یادیں اور آوازیں گونجتی رہی ہیں ان میں بخاری کی آواز "نوائے زمزمہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری اور میں بیٹھے کالج کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی اور ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے۔ "صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم نے سنائے اور میں نے سن کر داد دی۔"

میں چپ ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے "سنو! تم استاد ہو، اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درس گاہ کے نظم و نسق کو عملی طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجویز جو عملی صورت میں نہیں آتی۔ خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو، محض ذہنی عیاشی ہے اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔"

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنانی شروع کر دی۔

رات کچھ بے چینی سی رہی۔ ایک مدت سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیش نامہ" مرتب کر لیا۔ اور اس کی تین نقلیں بھی تیار کر دیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پر پہنچا۔

انہوں نے پوچھا۔ "ضلع کچہری سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، گھر سے آ رہا ہوں۔"

"تو یہ پلندہ کیسا ہے؟"

"میرے ذاتی کاغذات ہیں۔"

"ٹھیک، بیٹھو۔"

ان دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔ ایک آدھ اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا۔

میں نے کہا "عام شائقین کے لئے اردو کی اعلیٰ تدریس کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے جملہ نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور درس و تدریس کا کفیل کالج ہی ہو"

حسب معمول کہنے لگے: "یہ طرحیہ اشعار ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔ مطلع سنا چکا ہوں۔ پوری غزل یہ رہی۔"

یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے پڑھتے جاتے تھے اور ان کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتماتا جاتا تھا درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے میں جواب دیتا اور کہتا "آپ سارا مسودہ پڑھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذات ختم ہوئے تو بولے۔

"ہوں، گویا میں بھی پڑھاؤں گا۔"

میں نے کہا "آپ فقط پرنسپل ہی نہیں۔ استاد بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں"

اس کے بعد انہوں نے ایک سگرٹ سلگایا۔ جس کا دھواں تھوڑے ہی وقفے میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرا رہا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہل فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری پرچار میں آدھی رات گذر گئی۔

صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی، کوچے کوچے میں گشت لگا رہی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہو گئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہار و اعلان اور درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔

پروفیسر بخاری اپنے روزمرہ مشاغل میں خواہ وہ فرائض منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسے ہی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ زندگی میں ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی تھی۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے اس کے حسن و قبیح اور دور رس نتائج کو دیکھتے تھے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل بڑی تیزی سے کام کرتی تھی یا وہ کسی خیال کے آتے ہی اسے فی الفور عملی جامہ پہنا دینے کے عادی تھے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دن تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوچتے تھے۔ دوسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسنِ تدبر سے کام لیتے تھے کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصل راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انہیں پورا اطمینان ہو جاتا تھا تب وہ قدم اٹھاتے تھے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے تھے۔

کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا وہ اپنے عملی اقدام کا پرچار بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے دوستوں کی ہمدردی اور رفیقانِ کار کی اعانت ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھی پھر ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آئند ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ خود ان کے شریک کار بن جاتے تھے اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے تھے۔

بخاری کا مقولہ تھا کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں، بلکہ چسکا ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے، کہ گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے ان کا یہ ذوق و شوق ایک سہولت اور آسانی پیدا کرتا، ان میں ایک قدرتی روانی اور حسن آ جاتا اور ان کی تکمیل ایک فطری تقاضے کی تکمیل معلوم ہوتی تھی۔

بخاری جس کام کو کرتے، ایسی سرگرمی، ایسے انہماک اور شغف سے کرتے، کہ معلوم ہوتا یہی ان کا فطری مشغلہ ہے اور قدرت نے انہیں اسی کام کے لئے بنایا ہے لیکن وہ تمام کاروبار زیست کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہر کام کے لئے ایک پیشہ ورانہ مہارت درکار تھی۔ جب تک کوئی مشغلہ فن نہیں بن جاتا اپنی صحیح حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ انسان کام کرے تو حسن کار کو کام میں لائے، نہیں تو بے کار رہے

بخاری نے ایک بے چین طبیعت پائی تھی ان کا دماغ ان کے جسم سے اور ان کا جسم ان کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا تھا۔ ان کے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے۔ اس لئے انتہائی مصروفیتوں میں بھی ان کی طبیعت پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں پڑتا بلکہ ہر تکمیل کار ان کے لئے خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ وہ کسی شے کو معمولی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے ان کی طبیعت کی اُپج اس میں ہر روز کوئی نہ کوئی تغیر چاہتی تھی اگر یہ تغیر واقع نہ ہو تو ہر مشغلہ اپنی دلچسپی کھو دیتا ہے اور اس کی یکسانیت اسے بے کیف بنا دیتی ہے بخاری کو یہ یکسانیت کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ ایسی یکسانیت سے نہ صرف کام کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے بلکہ کام کرنے والے کی طبیعت کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں مجلس کا قیام، محکمہ تعلیم میں منتخب کتابوں کے تراجم، ریڈیو کے نئے نئے نشری پروگرام سب کے سب اسی اپج کا نتیجہ تھے۔

بخاری کی تیز رفتاری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ مجلس کے ہفتہ وار ادبی اجلاس پہلے پہل انہی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ایک شام جب مجلس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ وہ ساتھ کے کمرے سے نکل کر آئے۔ آستینیں چڑھی ہوئیں۔ ہاتھ گرد آلود تھے بولے آج میں سخت مصروف ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں میں شریکِ محفل نہ ہو سکوں گا۔ بات ختم ہوئی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ آپ نے رات بھر میں ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی پچیس سالہ کارگزاریوں کی ایک رپورٹ مرتب کر لی۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں انہیں سینکڑوں مسلوں کو کھنگالنا پڑا، متفرق اوراق سے ضروری مواد کا انتخاب اور اس کی تدوین و تہذیب کوئی آسان کام نہ تھا۔ دفتری کارروائی کی جاتی تو شاید مہینے لگ جاتے لیکن یہ کٹھن کام ان کے تنہا ہاتھوں نے ایک رات میں سرانجام دیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ صبح سویرے بخاری صاحب یہ رپورٹ لے کر دفتر پہنچے۔ ان کا خیال تھا، افسران بالا ان کی اس خدمتگذاری اور تیز کاری پر خوش ہوں گے لیکن وہاں اس وقت کرسیٔ منصب پر ایک ایسے صاحب براجمان تھے جن کی قابلیت محض کہنہ سالی تھی۔ انہوں نے بڑی تمکنت اور رعونت سے رپورٹ کو ہاتھوں میں لیا۔ اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر نہایت بے پروایانہ انداز میں بولے "یہ کیا لکھا ہے..... خیر کوئی بات نہیں میں درست کر لوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے رپورٹ کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دی۔ بخاری نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا۔ کوئی صاحبِ ذوق یہ لفظ کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ایک نااہل کا اس افسرانہ لہجے میں گفتگو کرنا نہایت ناگوار گزرا انہوں نے لپک کر رپورٹ اٹھائی اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔

"ہیں ہیں یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟"

"اگر یہ رپورٹ اچھی نہیں تو اس کا رکھنا بے کار ہے۔"

بخاری یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ افسر کے کمرے میں دفتر کے چپراسیوں کا ایک بڑا دستہ بیٹھا رپورٹ کے پھاڑے ہوئے کاغذات کے ٹکڑے جوڑ رہا ہے۔

صلہ کارکی کسے تمنا نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی کام کسی لالچ کے بغیر یا حصولِ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کیا جائے اور وہ بھی دوسروں کی خاطر
کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرا دیا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نااہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان پھٹے
ہوئے کاغذوں پر چیپیوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی چابکدستی دونوں طرح اپنا جوہر دکھا
کے رہی۔

ایک مرتبہ ان کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے
لگے۔ بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہیئے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہیئے۔
ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوشش ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد
کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا
ہوں۔"

بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے۔ اور کاموں کی تکمیل میں ایک رکاوٹ سا نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور
ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں۔ تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔
رکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحیتیں اور استعدادیں اور بھی ابھرتی تھیں ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی
محسوس نہیں کرتے تھے اور تو اور خود ان سے ٹکرانے والا جب ان سے شکست کھاتا تھا۔ تو اسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا جتنا ان کی عظمت اور
برتری کا۔

ریڈیو کے محکمے میں ان کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انہوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو
کو جو وسعت اور شہرت دی وہ ان کی ذہانت اور مستعدی کی بیّن دلیل ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا
کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکام اور ان کی پالیسی بارہا ان کے آڑے آئی۔ لیکن انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف ان کے
تصرفات کی روک تھام کی، اور دوسری طرف اپنی پالیسی کے پیشِ نظر ریڈیو کے وقار کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام کا سب سے اہم کام
ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے عملے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اسے موزوں بنانے بلکہ ایک نئی شکل و صورت دینے
میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا اس میں ان کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انہیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں ایک مرتبہ حسبِ معمول انہوں نے حکومت کو لکھا کر ریڈیو پروگرام میں بہت سی چیزیں مستقل اہمیت
رکھتی ہیں۔ اگر انہیں شائع کر کے محفوظ کر لیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہو گی چونکہ جنگ کا زمانہ تھا انہوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں
جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کار آمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصول ہوا۔ تجویز
رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے۔ وہاں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کا چھپنا بے موقع ہے بخاری نے اس
دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست، لیکن اگر ہماری حکومت اسی رفتار سے کام کرتی رہی تو "امن" کا دور بھی جلد ختم ہو جائے گا۔

پطرس کے مضامین بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہی ہلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی
طرح ایک لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور

شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہو سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسانی آنکھ انہیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انہیں بروئے کار لاتا ہے اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحت شعور سے ابھر کر اجاگر ہو جاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی اور پھر اسے بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھتے سمجھتے اور چمکاتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا ریڈیو مسل کا التوا میں پڑ جانا روزمرہ کا معمول ہے کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا، لیکن بخاری کی نظر التوا کے تمام پہلوؤں پر پڑی تھی۔

مشاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے تھے۔

بخاری کا مزاحیہ انداز ان کی تحریروں تک ہی محدود نہیں ان کی تقریریں بھی مزاح سے مزین ہوتی تھیں وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے اسی حربے کو کام میں لاتے تھے۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں ان کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی اور لوگ پہروں ان کے پاس بیٹھنے سے نہیں اکتاتے تھے۔

لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہئے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش تھی وہ محض ان کی مزاح گوئی کی وجہ سے تھی۔ بے شک ان کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا تھا لیکن انہیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں خلوص بھی تھا وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے تھے۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوست داری بھی ہوتی تھی۔ اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے تھے کہ طبیعت کو خوش گوار معلوم ہوتی تھی وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر تھے لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے ان کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔

بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا تھا بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوق محسوس بھی کرتے تھے اور اس تفوق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلاتے بھی رہتے تھے۔ جہاں کہیں ان کی طاقت لسانی کارگر نہیں ہوتی تھی وہ اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتے تھے جو دوسروں کو چپ کرا سکے یا انہیں شکست دے سکے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو بنگال کے ایک صاحب اقتدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پُرزور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انہیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی دوسرے روز وہ بزرگ اپنے عقائد کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے۔ بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا آپ ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی، تاڑ گئے، ہو نہ ہو یہ اعداد و شمار کا پلندا ہے۔ انہوں نے چپکے سے وہ پلندہ نکال لیا جب وہ بزرگ پرجوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پر آئے۔ اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور یہ معصوم صورت بنائے ان سے ہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے۔ ان کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندا اٹھا کر انہیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا۔

"آپ یہ تو نہیں تلاش کر رہے؟"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور ساری بات ہنسی مذاق کی نذر ہوگئی۔

دوستداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی تھا۔ اگرچہ اس دوست داری میں گرم جوشی اور وفورِ جذبات کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ وہ آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذبات محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل تھے۔ اس بارے میں ان کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں سانس لیتا رہتا تھا اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا تھا۔

بظاہر دیکھو تو بخاری صاحب پورے "صاحب لوگ" تھے۔ ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپین انداز ٹپکتے تھے۔ وہ مشرقی طرز بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا تھا انہیں یہاں کی کوئی حرکت پسند نہیں۔

"وہ دیکھو، تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص۔"

"سبحان اللہ چپلی کے ساتھ پتلون۔"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے۔"

"یہ دیکھئے اس نے بائیسکل بازار میں بغیر اشارے کے گھما دی۔"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں میں موٹر کہاں سے گزاروں۔"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انہیں سنتے سنتے اپنے ملک بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا۔ جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظر آئے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طریق زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ تھے اور ان میں کوئی لوچ نہیں تھا۔ ان کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی تھا۔ ان کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی تھی۔

ان کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو تو انہیں گھر کی چار دیواری میں دیکھئے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالیانہ پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے لنڈن یا نیویارک کے کسی مکان میں دلی کے بلی ماروں کے محلے والے اچانک آ بسے ہوں، اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول ان کے لئے اجنبی ہو۔

کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو ان کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا ان کا روزمرہ کا شیوہ بلکہ معمول تھا، کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں محض گھومنا اور گھومنا اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، یہ تھی ان کی تفریح جس میں ان کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپیر کے ڈرامے، ایلیٹ کی مجرد نگاری، منٹو کے افسانے انہی خوش گپیوں کے تحت میں آ جاتے تھے۔

راتوں کی یہ بیداری ان کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پر چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر کر لیٹتے تھے اور ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد حسب معمول اٹھ کر روزمرہ مشاغل میں کھو جاتے تھے اور اس معمول پر

وہ سختی سے کاربند تھے۔ اور خود ہی نہیں بلکہ اپنے رفیقانِ کار سے خواہ وہ ان کے کتنے ہی بے تکلف دوست کیوں نہ ہوں' اسی باقاعدگی اور ضبط و نظم کی توقع رکھتے تھے۔ کسی طرح کی بے قاعدگی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

بارہا ایسا ہوا کہ رات بھر گھومنے کے بعد ہم پانچ بجے صبح کو گھر لوٹے۔ پونے آٹھ بجے انہوں نے میرے یہاں ٹیلی فون کر کے پوچھا "صوفی کہاں ہے؟"

بچوں نے کہا "وہ یونیورسٹی گئے ہیں، کوئی کام؟"

"کوئی نہیں، یونہی پوچھا تھا۔"

ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رات کی سیر نے مجھے اپنے فرائضِ منصبی سے غافل کر دیا ہو۔ ان کے نزدیک دوستی اور فرائض کی بجاآوری دو الگ الگ خانے تھے۔

ریڈیو کے زمانے میں ان کے ایک دوست سے کوئی کوتاہی ہوئی۔ انہوں نے بڑی سختی سے مواخذہ کیا۔ دوست ان کی غیر معمولی خفگی پر بگڑ گئے اور استعفےٰ لکھ کر ان کے حوالے کیا، انہوں نے بڑے افسرانہ وقار کے ساتھ لے لیا اور کہا بہت اچھا آپ تشریف لے جائیے۔

ڈنر کے بعد بخاری صاحب اس دوست کے مکان پر بیٹھے دیگر احباب کے ساتھ معافی مانگ رہے تھے۔

پروفیسر بخاری کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ ان کی وفات پر یوں احساس ہوتا ہے کہ بیک وقت بہت سی شخصیتیں ہم سے الگ ہوگئیں ان کے رخصت ہونے سے دنیا ایک معاملہ فہم، ہوش مند مفکر، سے محروم ہوگئی، علم و دانش کی درس گاہوں سے ایک شفیق استاد چل بسا۔ اُردو ادب ایک خوش فکر، خوش نگار انشا پرداز پطرس کا ماتم کر رہا ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی موت ان کے دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے ایک ایسا صدمہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک مخلص مشفق دوست کو کھو بیٹھے ہیں۔ ایسے مہربان دوست دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔

بخاری صاحب میرے محترم استاد بھی تھے، رفیق کار بھی اور پیارے دوست بھی۔ میرا ان کا تعارف ۱۹۲۴ء میں ہوا، اور اس کم و بیش تیس سال کے عرصے میں ان کا احترام، ان کی ہمدردانہ رہنمائی اور خلوص دوستی ایک عجیب امتزاج کے ساتھ دل کو لبھاتی اور گرماتی رہی۔ ان کی خوش ذوقی، ان کی بذلہ گوئی، ان کے قہقہے جہاں دوستوں کی محفلوں کو جگمگاتے وہاں ان کی پُرسکون خاموش گرم جوشی اور محبت اور شفقت کی تڑپ احباب کے دکھی دلوں کی آہوں اور آنسوؤں کا ساتھ بھی دیتی۔

آخری بار جب وہ امریکہ سے لاہور آئے اور چند روز یہاں ٹھہرے تو ایک بار پھر یہ محفلیں جاگ اٹھیں اور زندگی کی بہت سی یادیں پھر زندہ ہوگئیں۔ اس ایک بات کو تقریباً ایک سال گذر چکا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ کل ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کتنا تازہ تھا ان کا پیار اور کتنی تیز تھی ان کی یاد۔ ان کی ایک نظر زندگی کے بہت سے گوشوں کو ٹٹولتی اور ایک بات کئی ایک سوئے ہوئے جذبات کو اکساتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل کی گم شدہ دنیائیں از سرِ نو آباد ہو جاتیں۔ اور زندگی پیچھے کو کروٹیں لے لے کر مٹے ہوئے نقش ابھارتی چلی جاتی۔

ان کی کونسی بات ہے جو رہ رہ کر نہیں ستاتی لیکن وہ جب کبھی کچھ عرصہ ملک سے باہر رہ کر لاہور میں آتے تو یہی کہتے۔ "دوستو! غربت میں تمہاری یاد بہت ستاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت، اس کا احترام طوفان جذبات بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ انسان کا ہر قدم منزل دوست کی طرف اٹھ رہا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی طرف والہانہ انداز میں لپک لپک کر جا رہا ہو۔ تم لوگ

یہاں بیٹھ کر اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔

مجھ سے بخاری کی جدائی کا حال نہ پوچھئے۔ ان کی محبت، ان کا مسلسل خلوص، یہ احسان اور اس احسان کا احساس ہمیشہ تیز اور تازہ رہتا اور خیال ہوتا کہ زندگی تو کیا اپنی موت بھی اسی کے آنسوؤں کا سہارا لے گی لیکن کیا خبر تھی کہ ان آنکھوں کو اُن کے فراق میں آنسو بہانے پڑیں گے۔

کتنی جدائیوں کے کھائے ہیں زخم دل پر
کتنی محبتوں کے ماتم کئے ہیں ہم نے

ضابطہ، بے ضابطہ

عشرت رحمانی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں،
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بات ۱۹۳۴ء کی ہے۔ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ محکمہ کے کنٹرولر ذہین و طباع انگریز مسٹر لائنیل فیلڈن، اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر اسٹیپلٹن اور پروگرام ڈائریکٹر سید ذوالفقار علی بخاری (ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل) تھے۔ ان کے علاوہ آغا محمد اشرف (نبیرۂ آزاد) اور سجاد سرور نیازی جیسے اہلِ فن حضرات بھی عملہ کے رکن تھے۔ مسٹر فیلڈن خود ایک ماہر اہلِ قلم ہونے کے ساتھ نشریات کے رموز سے بھی کماحقہٗ واقف تھے جو ارباب ہنر انہوں نے جمع کئے تھے ان کے لئے ایسے سرگروہ کی تلاش تھی جو ان کی صحیح قیادت کی اہلیت رکھتا ہو اور ملک کے لئے نشریات کا موزوں لائحہ عمل مرتب کر کے ان کو مناسب طریقہ پر چلا سکے۔ چنانچہ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کی تمام یونیورسٹیوں کو مراسلے بھیجے کہ وہ اپنے اداروں سے ایسے لائق اہلِ علم و ہنر چن کر اس کام کے لئے بھیجیں جن کے تعاون سے وہ اپنے دست و بازو مضبوط کر کے باضابطہ کام چلا سکیں چنانچہ کئی اداروں کے اربابِ اقتدار نے چند اہم شخصیتوں کو منتخب کر کے مسٹر فیلڈن سے ملاقات کے لئے بھیجدیا۔ ان میں دو نام خاص تھے۔ ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پطرس۔ یہ حسنِ اتفاق تھا یا حسنِ انتخاب کہ یہ دونوں حضرات اردو کے مشہور مزاح نگار اور بلند پایہ ادیب بھی تھے اور ادب انگریزی کے پروفیسر بھی۔

فیلڈن صاحب نے تمام منتخب حضرات کا ملاقات کے دوران میں ضابطہ بے ضابطہ جائزہ لیا اور سید احمد شاہ بخاری کو اپنا دستِ راست منتخب کر لیا۔ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کے قیام کے دوران میں آغا محمد اشرف سے اردو پڑھی تھی لیکن یہ استعداد معمولی تھی۔ وہ بخاری صاحب کی اردو ادیب کی حیثیت سے بے مثال خوبیوں کا اندازہ تو نہ کر سکتے تھے لیکن ابتدائی ملاقات میں ان کی شخصیت دکمال کا بخوبی جائزہ لے کر اس حقیقت کے معترف ہو چکے تھے کہ پطرس بخاری انگریزی زبان و ادب کی مہارت میں اس برصغیر میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اور اپنی طباعی، غیر معمولی ذہانت اور مختلف علوم و فنون میں واقفیت رکھنے کے سبب ان کی متنوع شخصیت گوناگوں کمالات کی حامل ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی باخبر حضرات اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا تھے اور ہیں کہ پطرس بخاری کی شگفتہ مزاجی، بزلہ سنجی اور ہمہ گیر لیاقت و ذہانت ہر نشلے اور ادبی محفل میں ان کی ذات کو ممتاز بنائے رہتی اور بڑی سے بڑی مجلس میں ان کی صفات غالب و نمایاں نظر آتیں۔ بیک وقت ان کو متعدد زبانوں اردو، انگریزی، فارسی، پشتو اور

فرانسیسی وغیرہ پر قدرت حاصل تھی۔ چونکہ میرے پیشِ نظر بخاری صاحب کے ادبی و لسانی کمالات سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کی باضابطہ شخصیت کی چند یادوں کا بے ضابطہ تذکرہ مقصود ہے اس لئے ان تفصیلات سے گریز مناسب ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اسٹیشن پر پروفیسر سید احمد شاہ بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور دہلی کی علمی ادبی مجالس میں پطرس کے چرچے ہونے لگے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ پطرس بخاری نے محکمہ میں اپنی قابلیت کا سکّہ جما لیا لیکن اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے انداز فکر و نظر کے لحاظ سے اس برصغیر میں نشریات کی تاریخ کی تدوین کا آغاز کر دیا اور متحدہ طور پر مستحکم تنظیم کی بنا ڈالی۔ اب نشری دنیا میں یہ دو شخصیتیں "بڑے بخاری" اور "چھوٹے بخاری" کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ کچھ عرصہ بڑے بخاری "اسٹیشن ڈائریکٹر" اور "چھوٹے بخاری" "اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر" رہے لیکن پھر بڑے بخاری ڈپٹی کنٹرولر مقرر ہوگئے اور چھوٹے بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فیلڈن صاحب کنٹرولر رہے مگر انہوں نے بڑے بخاری صاحب کو ان کی ذہانت و قابلیت کے بھروسے پر محکمہ کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

ڈپٹی کنٹرولر بخاری نے برصغیر میں نشریات کا جال بچھانا شروع کیا۔ نئے نئے اسٹیشن کھولے۔ ضروری قواعد منضبط کئے اور گوشے گوشے سے ہونہار شخصیتوں کو کھینچ کر کسی نہ کسی حیثیت سے محکمہ نشریات میں لا شامل کیا۔ تعلیمی اور ادبی حلقوں سے متعدد نامور حضرات آکر مختلف اسٹیشنوں پر جمع ہوگئے۔ پروفیسر رشید احمد (حال ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) سومناتھ چب (حال سیکرٹری ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ، ہند) ن۔ م۔ راشد (حال ڈپٹی ڈائریکٹر اقوام متحدہ امریکہ متعینہ کراچی) محمود نظامی (حال ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ، مغربی پنجاب) الطاف گوہر (حال کنٹرولر محکمہ درآمد و برآمد حکومت پاکستان) اعجاز بٹالوی (بیرسٹر) سید انصار ناصری (حال ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان) ملک حسیب احمد (حال پبلک ریلیشن آفیسر این ڈبلو آر) رفیع پیرزادہ۔ کرشن چندر (مشہور بھارتی ادیب و فلم نگار) سعادت منٹو مرحوم۔ راجندر سنگھ بیدی۔ خورشید انور (حال فلم ڈائریکٹر) مسعود پرویز (فلم ڈائریکٹر) فیروز نظامی (میوزک ڈائریکٹر) راقم الحروف اور متعدد اصحاب تھے جو بڑے بخاری صاحب کے عہد میں ان کے اشارے یا تحریک پر نشریات میں "داخل دفتر" ہوئے ان میں سے بعض حضرات نے بعد میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی نیا میدان تلاش کر لیا اور بعض اب تک ریڈیو پاکستان میں موجود ہیں لیکن بخاری صاحب کی نظرِ انتخاب نے جن لوگوں کو قابل اہلکار تصور کیا تھا وہ اب خواہ کسی میدان میں بھی ہوں سربیان ہی نظر آتے ہیں۔

ڈپٹی کنٹرولر ہونے کے زمانے میں بخاری صاحب فیلڈن صاحب ہی کی نظر میں نہیں بلکہ اعلیٰ انگریز حکام اور اقتدار اعلیٰ کی نگاہوں میں بھی معتمد الیہ تصور کئے جانے لگے ان کا ضابطہ تحریر و تقریر دونوں حیثیت سے ناقابلِ تسخیر تھا۔ جو تجویز یا تحریک ہوتی معقول اور مدلل۔ جوبات کرتے پختہ اور مناسب، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ افسران بالا سے منوا کر نہ چھوڑتے۔

بخاری صاحب کی بے ضابطہ شخصیت کے رموز و نکات اور ادبی کمالات سے تو ہر عام و خاص بخوبی واقف ہے اور پطرس کی حیثیت سے جاننے والے ان کے طنز و مزاح کی بے مثال خوبیوں کے دلی مداح ہیں۔ لیکن ایک باضابطہ سرکاری افسر اعلیٰ کی حیثیت سے صرف وہی لوگ ان کی نکتہ رس شخصیت سے آگاہ ہیں جنھوں نے ان کے ماتحت براہِ راست یا بالواسطہ محکمہ نشریات میں کام کیا ہے۔ بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر ہی تھے کہ میں ان کے ایماء سے اسی محکمہ میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا اور میں اس وقت دہلی کے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے سے منسلک تھا۔ میرے ڈرامے اور تقریریں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا کرتی تھیں۔ دہلی میں رہتے سات آٹھ سال گذرے تھے۔ میں اور چھوٹے بخاری دہلی کی بزم احباب کے قدیم رکن تھے۔ بڑے بخاری صاحب سے مجھے نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ایک مجلس میں نشریات پر بات ہو رہی تھی۔ بحث کے دوران میں بڑے بخاری صاحب نے بڑی شفقت سے حاضرین میں سے چند اصحاب کو مخاطب کر کے مشورہ دیا بلکہ ڈانٹا کہ آپ لوگوں کو ریڈیو کے محکمے میں باضابطہ داخل

ہو کر کام کرنا چاہیئے تاکہ آپ اپنے رجحان کے مطابق کچھ مفید کام کر سکیں۔ علمی ادبی دلچسپیوں کا مرکز اب محکمہ نشریات کو بننا چاہیئے۔ اسی سلسلے میں ایک مشہور ادیب
کا نام لے کر فرمایا: ــــ صاحب لکھنؤ سے مجھے ملنے آئے تھے۔ آج کل جو آسامیاں پروگرام اسسٹنٹ کی ہمارے یہاں خالی ہیں ان کے لئے پر زور اصرار
کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ اس جگہ کے لئے موزوں نہیں۔ ضابطہ کی پابندی ہر ادیب کے بس کی نہیں!" چونکہ میں ان صاحب سے واقف تھا۔
بخاری صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ "کیا خیال ہے؟" میں سمجھا کہ بخاری صاحب ان کی نسبت مجھ سے دریافت کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: "بجا
ارشاد ہے۔" بخاری صاحب نے مخصوص انداز سے زیر لب تبسم فرما کر کہا: "بھئی میں ــــ صاحب کے بارے میں آپ کا خیال نہیں پوچھ رہا۔ میں کسی
کے بارے میں یونہی رائے قائم نہیں کیا کرتا نہ اپنی رائے پر داد حاصل کرنے کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ میں تو اس آسامی کے لئے آپ سے دریافت کر رہا
ہوں اگر آنے کا خیال ہے تو درخواست دے ڈالئے۔ ہو جائے مقابلہ ــــ" میں پہلے تو کچھ نادم ہوا پھر سوچ میں پڑ گیا کہ جواب کیا دوں۔ بخاری صاحب
نے میرے تذبذب کو تاڑ لیا فرمایا: "سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ جلدی نہیں۔ مقابلہ ذرا سخت ہے۔ انتخابی بورڈ میں دس بارہ ممبر ہوتے ہیں۔ فیلڈن صاحب صدر
ہیں میں تو دانستہ بورڈ میں شامل نہیں ہوتا۔ سفارشوں کے طومار کون بھگتے، پھر ضابطہ کرے تو معقولیت ضبط۔ بے ضابطہ کارروائی اپنے بس کی نہیں۔ پھر اِدھر
اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجلس برخواست ہوئی۔ چلتے ہوئے بخاری صاحب نے مجھے فرمایا: "پھر درخواست آتی ہے؟" میں نے عرض کیا: "سوچ رہا
ہوں۔" بولے "صرف یہ سوچو کہ اگر انتخاب میں آ گئے اور داخل دفتر ہو گئے تو یکسوئی ملتی ہے۔ منتشر خیالات میں کچھ بات نہیں بنتی۔"
میں نے چند احباب و اعزا سے مشورہ کیا۔ درخواست بھی دی۔ منتخب بھی ہو گیا۔ پروگرام اسسٹنٹ کے عہدہ پر تقرر ہوا اور لکھنؤ اسٹیشن
کی تعیناتی ملی میرے لئے دلی چھوڑنا سخت تکلیف دہ تھا ــ بارہ خواجاؤں کی چوکھٹ ــــ ادیبوں، شاعروں اور سب سے بڑھ کر عزیز دوستوں کی
جدائی بڑی شاق تھی۔ احباب کی رائے ہوئی کہ بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر لکھنؤ کی تعیناتی کی جگہ دلی اسٹیشن کی تقرری منظور کرا لوں۔ یہ معاملہ
قطعی بخاری صاحب کے اختیار کا تھا۔ میں نے ٹیلی فون کے ذریعے بخاری صاحب سے حاضری کی اجازت لی۔ اب میں   ڈپٹی کنٹرولر نشریات کے دفتر
میں ایک پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ لیکن بخاری صاحب نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب سابق تپاک سے ہاتھ ملایا۔
اور بیٹھ کر چند ضابطہ کی ہدایات شروع کر دیں کیونکہ میں اس محکمہ میں نووارد تھا اور وہ ایک مخلص مہربان افسر اعلیٰ۔
بعد ازاں میں نے اصل معاملہ پیش کیا۔ اور اپنی لکھنؤ کی تقرری کے احکام کی تبدیلی اور دلی میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ بخاری صاحب
نے نہایت سنجیدگی سے کہا: "عشرت صاحب! آپ کا تقرر لکھنؤ کے لئے محض اتفاقیہ نہیں بلکہ دانستہ ہے۔ آپ عرصہ دراز سے دلی میں مقیم ہیں۔ آپ
کے تعلقات یہاں کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں وسیع ہیں آپ کا تقرر دلی ریڈیو کے کسی شعبہ میں ہو تو آپ کی جان ضیق میں ہو جائے گی۔ لوگ آپ، کو
شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ پر کسی حلقے کی بے جا طرفداری اور کسی کی بے جا مخالفت کے الزام لگائے جائیں گے جس محکمہ کا پبلک سے
قریبی واسطہ ہو وہ عوام و خواص ہر طبقہ کی نظروں میں رہتا ہے۔ ریڈیو کے محکمے کا بھی یہی حال ہے اس لئے ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ دار اور کسی حد تک بھی
با اختیار اہلکار کا اس اسٹیشن (مقام) پر تعینات ہونا خود اس کے اور محکمہ دونوں کے حق میں مفید نہیں۔ آپ خاص مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں، خود ادیب
ہیں شاعر ہیں آپ کے دوست بھی ادیب اور شاعر ہیں اور دشمن بھی۔ ان میں سے بعض آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ اور بعض مخالف۔ آپ کس کس کو خوش
رکھ سکیں گے۔ اپنے متعلقہ شعبہ میں آپ سارے شہر کے ادیبوں اور شاعروں کو پروگرام نہیں دے سکیں گے اس لئے بہت جلد مطعون ہو جائیں گے
اور ضابطہ بے ضابطہ ہر طرح سے آپ کی کڑی نگرانی ہونے لگے گی۔ اور نتیجہ آپ کے حق میں مضر ہوگا۔"
بخاری صاحب کی یہ مشفقانہ نصیحت اور مجرب گر دل کو لگے۔ لیکن دلی کی مفارقت کا خیال ستا رہا تھا۔ میں نے پھر بھی عرض کیا: "آپ

، سنے جو کچھ فرمایا بجا ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ دلی میں اور رہ لیتا اس کے بعد کہیں بھی بھیج دیا جاتا۔"

بخاری صاحب ذرا سر اونچا کر کے گردن ہلاتے ہوئے حسبِ عادت مسکرائے اور بولے "آپ سمجھ رہے ہیں میں ٹالنے کے لئے آپ کو بہلا رہا ہوں۔ بات معمولی ہے آپ کو کچھ عرصہ کے لئے نہیں مستقلاً دلی میں رکھا جا سکتا ہے مگر بات اب کی ہے ابھی آپ کا قیام دلی میں آپ کے لئے مناسب نہیں۔ ابتدائی ایام میں دلی کی ادبی مجالس راس نہ آئیں گی ان سے دور دلجمعی سے کام کرنے کا موقعہ ملے گا اور پھر یہ جدائی عارضی ہے 'یار زندہ صحبت باقی' اطمینان سے روانہ ہو جائیے اور لکھنؤ پہنچ کر کام میں دل لگائیے۔ اچھا! خدا حافظ" اور کرسی سے اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے بخاری صاحب کے سنجیدہ تبسم چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بعد سلام رخصت ہوا۔ میرے مخلص احباب میں سے ایک محترم بزرگ اکبر حیدری مرحوم تھے۔ میں نے ان سے بخاری کی گفتگو کا حال بتایا انہوں نے بخاری صاحب کی رائے کی حرف بحرف تائید کی اور کہا "بخاری صاحب نے نہایت معقول فیصلہ کیا ہے۔ دلی کے ادبی حلقوں میں اس قسم کی چہ میگوئیاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ بعض ادیب احباب کو پروگراموں کی امید ہے بعض اس انتظار میں ہیں کہ اگر تم دلی اسٹیشن پر تعینات ہو جاؤ تو تمہارے خلاف جائیے جا شکائتوں کا محاذ کھڑا کر دیں۔ بات ختم ہوئی۔ میں لکھنؤ چلا گیا اور بس!

جیسا کہ بخاری صاحب نے فرمایا تھا۔ یہ واقعی معمولی بات تھی اور ایک ادنےٰ ماتحت کے ساتھ (جو اس محکمہ میں ہنوز قدم رکھنے آیا تھا) اس قدر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ حسبِ ضابطہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتے تھے کہ جس اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی ہے وہی مناسب ہے اس حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بخاری صاحب کا ضابطہ اس کا خوگر نہ تھا۔ انھوں نے ابتدا ہی سے مجھے اپنی ناصحانہ گفتگو سے اس محکمہ میں کام کرنے کے ضوابط اور نشیب و فراز سمجھا دئے جن سے میں نے بہت سیکھا اور اپنی ملازمت کے دوران ان پر کاربند رہ کر اپنی ذات اور محکمہ کے لئے مفید ثابت ہوتا رہا۔ نیز انہوں نے حاکمانہ انداز اختیار کر کے سرسری طور پر میری درخواست رد کرنے کے بجائے بے ضابطہ طور پر ضابطہ کو اس خلوص اور محبت سے سمجھایا کہ میں قائل ہونے کے ساتھ ہی مطمئن واپس آیا۔

اس واقعہ کی عمومیت یہاں تفصیل طلب تھی: تاکہ بخاری صاحب کے ضابطہ کی خصوصیت واضح ہو سکے۔ ایک اعلےٰ افسر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محکمہ کے نظم و نسق کو اسی طرح منضبط کیا تھا ان کے ہر قول و فعل اور فیصلہ میں ہمیشہ خود اعتمادی، نکتہ رسی، دور اندیشی اور قطعیت ہوا کرتی اور لطف یہ کہ کسی کے خلاف فیصلہ کی صورت میں اس کی دل آزاری کا اظہار تک نہ ہوتا۔ وہ ضابطہ کے ہر معاملہ میں معمولی بات کو خاص اہمیت دئے بغیر نہ ٹالتے اور اہم بات کو عام انداز میں اس طرح طے کر ڈالتے جیسے نہایت معمولی ہو۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ایک پروگرام اسسٹنٹ کا وقار اور اختیار بھی خاصہ وقیع و وسیع ہوتا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر اور پروگرام ڈائریکٹر کے فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر پروگرام اسسٹنٹ کی تجویز و رائے پر ہوا کرتی۔ کانگریس و مسلم لیگ اور ہندو مسلم مناقشات کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کے پیش نظر مسلمانوں کا مفاد اور ان کی آزادی کا حصول تھا۔ کانگریس ہندو گردی پر اڑی ہوئی تھی۔ لکھنؤ یو۔پی کا مرکز ہی نہیں سارے صوبے کی سیاسیات کا مرکز تھا۔ ایک بار ایک بڑے ہندو مہاشے کی تقریر نشر ہونا تھی۔ میں نے تقریر کا مسودہ پڑھ کر مہاشے جی سے چند تبدیلیوں کے لئے کہا کیونکہ وہ باتیں پالیسی کے خلاف اور مناقشات کو بڑھانے والی تھیں۔ مہاشے جی نہ مانے۔ معاملہ اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچا انہوں نے میری تجویز کے مطابق فیصلہ کیا۔ مہاشے جی بگڑ کر چلے گئے اور تقریر نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز مہاشے جی کی خفگی اور ریڈیو اسٹیشن کی کارروائی ضابطہ تمام اخباروں کی سرخیاں بن گئیں۔ ریڈیو کو موردِ الزام قرار دے کر خوب لے دے کی گئی۔ کانگریسی اخبارات نے ریڈیو کے محکمے اور مرکزی حکومت کو ہلا ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ میری موقوفی کا مطالبہ کیا گیا۔

غیر معمولی ہنگامہ تھا۔ ڈائریکٹر جنرل (بخاری صاحب) کو دلی سے بہ نفس نفیس تحقیقات کے لئے آنا پڑا۔ بخاری صاحب نے تقریر

کا مسودہ پڑھا۔ صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اور پھر خود مہاشے جی سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد بخاری صاحب ریڈیو اسٹیشن واپس آئے مہاشے جی ان کے ہمراہ تھے۔ بخاری صاحب مسکرا رہے تھے اور مہاشے جی خاموش تھے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں میری طلبی ہوئی۔ سامنے پہنچتے ہی مہاشے جی نے بڑی خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا اور بولے: "میری غلط فہمی بھی تھی مگر آپ کا انداز ناخوشگوار تھا۔" بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے: "آپ بزرگ ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی مجبوریاں احتیاط کی متقاضی ہیں۔" معلوم نہیں بخاری صاحب کی حکمتِ عملی اور شگفتہ بیانی نے مہاشے جی پر کیا جادو کیا کہ وہ اپنی ساری منطق بھول کر اسی رات مجوزہ تقریر نشر کرنے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے خود ہی اخبارات کے منہ بند کر دئے اور ہماری دوستی کا دم بھرنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بخاری صاحب کے علم و فضل اور حسنِ گفتار و کردار کی خوبی تھی جس نے آل انڈیا ریڈیو کے محکمہ کو ایسے طوفانی زمانے میں فرقہ وارانہ تفرقوں سے محفوظ رکھا۔ عملے کے ادنیٰ و اعلیٰ اراکین میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب فرقوں کے خواتین و حضرات شامل تھے۔ لیکن باستثنائے چند ہر اسٹیشن پر اتحاد و یگانگت کے روابط قائم تھے۔ ہندو مہاسبھا نے بار بار اس قسم کی تفرقہ اندازی کی کوشش کی۔ خصوصاً اردو زبان کو مٹا کر ہندی رائج کرنے کی بڑی جدوجہد کی۔ مگر مہاسبھائی جوڑ توڑ بخاری صاحب کے تدبر و حکمت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دئے۔ نام بدل گیا ہندستانی ہوا مگر زبان کی سلامت اور رچاؤ بدلنے نہ پایا۔ اور جب ایک وقت آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے "زبان" اور مسلمان دونوں کے گلے پر چھری چلائیں تو انہوں نے کھلم کھلا انکار کر کے اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوشی اختیار کر لی۔

جب کانگریس کی حکومت برصغیر پاک و ہند میں قائم ہوئی۔ اس وقت سردار پٹیل جو کٹر مہاسبھائی ذہنیت کے مالک تھے محکمہ اطلاعات و نشریات کے وزیر مقرر ہوئے مسٹر پٹیل نے کرسی وزارت پر متمکن ہوتے ہی محکمہ نشریات میں ہندوگردی کا آغاز کر دیا۔ زبان ہندی، پروگراموں کی ترتیب ہندی اور موسیقی کے لئے احکام نافذ کئے گئے کہ تمام پیشہ ور موسیقار خواتین گانے کے پروگراموں سے یک قلم خارج کر دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ شوقیہ گانے والی خواتین سے مراد صرف غیر مسلم خواتین تھیں۔ بیک وقت مسلم دشمنی اور ہندو نوازی کی پالیسی مرتب ہو گئی۔ اردو زبان کی جگہ کھلم کھلا ہندی کا رواج تجویز ہوا۔ ڈائریکٹر جنرل (مسٹر بخاری) نے پہلے تو وزیر پٹیل کو سمجھایا بجھایا کہ اس انداز سے پروگرام بے جان ہو جائیں گے۔ یہی زبان اور آرٹسٹ دونوں کے مسئلہ کو مناسب اور موزوں طریقہ سے حل کرنا چاہئے اور ایک متوازن و خوشگوار تناسب قائم رکھنا چاہئے۔ لیکن مسٹر پٹیل کا منشا ہی کچھ اور تھا وہاں تناسب کی جگہ تناسخ کا مسئلہ زیرِ نظر تھا۔ چنانچہ ذی ہوش، صاحبِ خرد و حوصلہ مند بخاری نے اس بے بسی اور بے اختیاری کے تحت اس اعلیٰ عہدے کو قبول کرنا اپنی کسرِ شان اور موجودہ پالیسی کو اختیار کرنا اپنی دیانت و لبالت کے منافی تصور کیا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور واپس آئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ایک ہندو مہاشے (مجوزہ اسکیم کے مطابق) مقرر ہو گئے۔ بخاری صاحب نے اپنے اصول اور ایمان و ایقان کی قربانی گوارا کی نہ جاہ و منصب کی طلب میں سرِ تسلیم خم کیا۔

بخاری صاحب ضابطہ و قاعدہ کے سختی سے پابند ہونے کے باوجود ہر معاملے کو چٹکی بجاتے باتوں باتوں میں طے کر دیتے تھے مشکل سے مشکل مسئلے کو نہایت خندہ پیشانی سے بآسانی حل کرنا ان کے ضابطہ کا خاصہ تھا۔ ان کی ضابطہ کی زندگی کے بے شمار واقعات و مطائبات مشہور ہیں جن کا بیان اس مختصر مضمون میں دشوار ہے۔ وہ اپنے تمام ماتحت اہلکاروں سے ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک ناصحِ مشفق کا سلوک اختیار کرتے۔ ہر شخص کی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کو بخوبی پرکھ لیتے۔ اس کے ساتھ اسی انداز سے ہم کلام ہوتے اور اس کے عین مطابق برتاؤ کرتے۔ شگفتہ بیانی ان کا خاص کمال تھا۔ اور ہر شخص کے ساتھ گفتگو کے دوران میں اس کا دل موہ لینا اور بڑی سے بڑی شخصیت پر چھا جانا ان کا ادنیٰ کرشمہ تھا ان کے حلقۂ احباب

ئیں سیاسی لیڈر، سرکاری افسرانِ اعلیٰ، پروفیسر، عالم فاضل اور ادیب و شاعر سب ہی تھے لیکن سب ہی کو ان کی لیاقت اور حسنِ گفتار کا معترف پایا۔ ان احباب میں سے اکثر ان کے ضابطے کے کاموں میں سفارشیں بھی کرتے لیکن وہ تمام معاملات میں وہی فیصلہ کرتے جو حق و دیانت کے مطابق ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ خلافِ فیصلہ کی صورت میں بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ اور بڑے اطمینان و سکون سے اس طرح سمجھا کر ٹال دیتے کہ صاحبِ معاملہ مطمئن ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

بخاری صاحب کا حاکمانہ برتاؤ اپنے ماتحت افسران ہی کے ساتھ مشفقانہ نہیں تھا بلکہ تمام درجوں کے ملازمین کے ساتھ بھی پسندیدہ تھا ہر اہلِ کار ان کے حسنِ سلوک اور اخلاقِ حمیدہ کا گرویدہ اور معترف تھا۔ ماتحت عملہ میں جو ادیب، شاعر اور ان کے دوست احباب شامل تھے ان کے ساتھ دفتر میں نہایت باضابطہ اور باقاعدہ ڈائریکٹر جنرل نظر آتے لیکن نجی صحبتوں میں اسی انداز کی بے تکلفی برتتے جس حیثیت کے تعلقات ہوتے۔ ضابطے کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک بار اسٹوڈیو کے محافظ نے ان کو حسبِ ضابطہ بغیر پرمٹ دروازے کے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ نئی دہلی پارلیمنٹ اسٹریٹ کے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں بالائی منزل پر ڈائریکٹریٹ جنرل کے دفاتر تھے۔ اور زیریں منزل میں دہلی اسٹیشن کے دفاتر اور اسٹوڈیوز واقع تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن بخاری صاحب اپنے دفتر سے اٹھ کر بغرض معائنہ اسٹوڈیوز کی عمارت میں جانے لگے۔ اسٹوڈیوز کے دروازے پر محافظ موجود تھا جس کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ اندر جانے والے ہر شخص کو ٹوکے اور داخلے کا پرمٹ دیکھ کر دروازہ کھولے ورنہ باہر ہی روک دے۔ بخاری صاحب کا حکم تھا کہ اس ضابطے کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اور وہ خود پرمٹ کارڈ اپنے لئے بھی ساتھ رکھتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے پرمٹ ساتھ لے جانا بھول گئے۔ محافظ نے حسبِ ضابطہ ادب سے سلام کیا۔ اور عرض کیا: "حضور پرمٹ!" ڈائریکٹر جنرل بخاری نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرمٹ کارڈ نہ پایا۔ خاموشی سے مسکرائے اور واپس اپنے دفتر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی آیا اور محافظ کی طلبی کا حکم سنایا۔ "ڈائریکٹر جنرل کو اس طرح بے باکی سے روک دیا۔ اب خیریت نہیں۔" محافظ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا۔ باضابطہ پیشی ہوئی۔ اور محافظ جو ڈرتا ہانپتا حاضر ہوا تھا خوش خوش اکڑتا ہوا اپنی ڈیوٹی پر واپس گیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس کی فرض شناسی اور مستعدی کی تعریف کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اور کئی روز تک اس محافظ کے چرچے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں ہوتے رہے۔

عام طور پر حکومتِ انگریزی کے زمانہ میں جب افسرانِ بالا اپنے ماتحت دفاتر میں معائنہ کی غرض سے جاتے تو عملہ کی جانب سے شاندار ضیافتیں ہوا کرتیں لیکن بخاری صاحب جب کسی شہر میں ریڈیو اسٹیشن کے معائنہ کو جاتے اور دستور کے مطابق ان کو اسٹاف کی جانب سے دعوت دی جاتی تو وہ منظور کرنے کے بعد یہ شرط طے کرتے کہ دعوت کے مصارف ان کے ذمے ہوں گے وہ صاف طور پر کہہ دیتے کہ آپ لوگوں کا مقصد مجھ سے ملاقات کرنا ہے مجھے آپ سب کے ساتھ مل بیٹھنے سے مسرت ہوگی لیکن آپ کو جو خوشی ہوگی اس کی قیمت آپ کی جیبوں سے ادا کر کے بارِ خاطر نہیں بننا چاہتا وہ ان دعوتوں میں تمام اہلِ کاروں سے نہایت بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور بے ضابطہ طور پر ان کی مشکلات کا حال دریافت کر کے ان کے حل بتلاتے رہتے۔ آل انڈیا ریڈیو کی تعمیر و تنظیم بخاری صاحب کی دانش و تدبر کی رہینِ منت تھی۔ نئی دہلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس کی تعمیر، پروگراموں کی ترتیب، برصغیر کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نشری مرکزوں کا قیام اور ان کا استحکام انہی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ہندوستان میں نشریات کی توسیع کا جو کام ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد عمل میں آیا اس کا خاکہ بخاری صاحب نے کئی سال قبل مکمل کر لیا تھا یعنی چپہ چپہ پر نشریات کا ملک گیر جال بچھانے کا دستور العمل انہوں نے تیار کر دیا تھا جس پر بعد میں عمل درآمد ہوا۔ اس عالی دماغ اہلِ علم و بصیرت نے نشری دنیا میں اپنے تدبر و حکمت اور فن کارانہ صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہند و پاکستان کے درمیان محکمۂ نشریات کے سامان کی تقسیم کے لئے جو کمیٹی،

اور ان کے دستِ راست برادرِ عزیز سید ذوالفقار علی بخاری ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے (جو حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں) اس طرح ریڈیو پاکستان کی بنیاد بھی انہی کے لائق ہاتھوں سے پڑی۔ اس کے صدر اور مشیر اعلیٰ بخاری صاحب ہوئے۔ بنائی گئی۔

پطرس بخاری نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔ اور ملک و قوم کا پرچم بلند کیا۔ اقوام متحدہ کے محکمۂ نشریات اور اطلاعات کے شعبوں کی تنظیم کی مہم بھی بخاری صاحب نے انجام دی خصوصاً اقوام متحدہ سے اردو نشریات کے سلسلے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

بخاری صاحب کی نغز گوئی، بیدار مغزی، اور شگفتہ بیانی اقوام عالم کے سربر آوردہ نمائندگان میں ضرب المثل ہو چکی ہے اور انہوں نے اپنے حسنِ گفتار اور دانش و حکمت کا دنیا بھر سے لوہا منوا لیا۔ لیکن اس بین الاقوامی شہرت اور عز و افتخار کے مالک ہونے کے باوجود ان کا دل وطن اور احبابِ وطن کے لئے ہمیشہ بے چین رہا۔ افسوس کہ ان کی آخری حسرت بر نہ آئی۔ اور وہ سرزمینِ وطن و یارانِ وطن سے دور دیارِ غیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ یارانِ وطن ان کے دیدار سے محروم رہے اور انہوں نے بین الاقوامی شہرت کے دامن میں دائمی آرام گاہ بنائی۔ ہم ان کے نام کام اور گفتار و کردار کی یادگار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے۔ ؎

بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

پطرس

حکیم یوسف حسن

جینئس بننے یا کہلانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی پشت پر بہت سی تصنیفات لدی ہوں یا اس کے سینے پر بہت سی تعلیمی ڈگریوں کے طلائی تمغے جھلملا رہے ہوں۔ جینئس پیدائشی ہوتا ہے اکتسابی نہیں ہوتا اس کی غیر معمولی ذہانت ہی اسے اس رتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔

اس ربع صدی کے نامور اور ذہین ادبا پر ایک نظر ڈالی جائے تو زیادہ سے زیادہ ایک درجن ناموں پر نگاہ رکتی ہے اور اس نظریہ کے ثبوت میں کہ غیر معمولی ذہانت کا ڈگریوں سے کوئی تعلق نہیں ہمیں تاثیر و پطرس کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

تاثیر میرا دوست، میرا ساتھی اور نیرنگ خیال کا مدیر معاون تھا اس لحاظ سے تاثیر مرحوم کے مجھ پر بہت سے حق حقوق ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تاثیر کیمبرج میں داخلے کے لئے پہنچے تو انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ اور پطرس نے بھی بی اے ہی میں داخلہ لیا۔ لیکن تاثیر نے انگریزی ادب کے متعلق اتنا کچھ پڑھا ہوا تھا کہ اگر میں کہہ دوں کہ وہ کئی لائبریریوں کو نگل چکا تھا تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ کیمبرج کے پروفیسروں سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ وہ تاثیر کی عظیم واقفیت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے براہِ راست ایم اے میں داخلے کی اجازت دے دی اور پھر ایم اے میں اس کی قابلیت کے جوہر جو کھلے تو کیمبرج کے مروجہ دستور کے علی الرغم انہیں پی ایچ ڈی میں بیٹھنے کی اجازت کیمبرج کونسل کے ایک اسپیشل اجلاس میں دے دی گئی۔ تاثیر کو پی ایچ ڈی کے لئے قرون وسطیٰ کی انگریزی نظم میں تصوف کے رجحانات پر تحقیقی مقالہ تیار کرنا تھا۔ عنوان ہی سے اس کی سنگلاخی ظاہر ہے مگر تاثیر نے کیمبرج سے پی ایچ ڈی نمایاں حیثیت سے حاصل کر لی۔ شاید تاثیر پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ فضیلت حاصل ہوئی تھی۔ تاثیر مرحوم نے اس واقعہ کی تفصیل اپنے ایک خط میں دی ہے، جو نیرنگ خیال میں شائع ہو چکا ہے۔

پطرس جب بی اے (کیمبرج) بن کر آئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ تاثیر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ حکیم صاحب! تاثیر وہاں پڑھنے تھوڑا گیا ہے وہ تو پروفیسری کر رہا ہے۔

تاثیر اور پطرس کی کیمبرج کی ڈگریوں میں عظیم تفاوت ہے۔ تاثیر کا انگریزی ادب پر عبور محیر العقول ہے لیکن جہاں تک فطری ذہانت کا تعلق ہے پطرس کا مقام بہت آگے ہے تاثیر اور پطرس کی انگریزی اور اردو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پطرس میں جو رنگینی، لطافت اور لچک پائی جاتی ہے۔ وہ تاثیر میں موجود نہیں۔

تاثیر نے بھی مزاحیہ رنگ میں چند مضامین نیرنگ خیال میں لکھے تھے، جو ادب میں اچھا مقام رکھتے ہیں لیکن ہم انہیں پطرس کے مزاحیہ مضامین کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔

پطرس کا ادبی کارنامہ صرف "پطرس کے مضامین" ہیں۔ اس ننھی سی کتاب کے متعلق کیا کہیں۔ شیخ سعدی نے فرمایا تھا کہ ؎

ہرچہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر

اس کے مصداق یہ چند مضامین ہی پطرس کی عالمگیر شہرت اور ناموری کا باعث بن گئے۔ اگر میں یہ کہدوں کہ ہند و پاکستان کی تمام مزاحیہ کتابوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالا جائے اور پطرس کے مضامین دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں۔ تو پطرس کے مضامین بھاری رہیں گے۔

پطرس کے مضامین کے بعض حصے نیرنگِ خیال میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور پطرس کی یہ مزاحیہ تصنیف تو قریباً ہر پڑھے لکھے آدمی کی نظر سے گذری ہو گی۔ لیکن پطرس نے ان مزاحیہ مضامین کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس کا مجموعہ نقوش کے اس خاص نمبر میں آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا۔ اور جس سے معلوم ہو گا کہ پطرس نے ادب اور زندگی کے ہر شعبہ میں بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں۔

پطرس کی شہرت ان مضامین سے بھی ہوئی تھی۔ جو نیازمندان لاہور کی طرف سے نیرنگِ خیال اور کاروان میں شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نیازمندانِ لاہور کون تھے؟ یہ سوال مدتوں لوگوں کو پریشان کرتا رہا۔ نیازمندان لاہور سے مراد تین اصحاب تھے۔ پطرس، تاثیر اور سالک، جو مضمون بھی شائع ہوتا تھا اس پر تینوں متفق ہوتے تھے۔ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ دفتر نیرنگِ خیال میں تبادلہ کے رسائل اور ریویو کے لئے کتابیں موصول ہوتی تھیں۔ جب ان میں کوئی چیز ایسی آجاتی جس پر بحیثیت پنجابی ہونے کے ہمیں توجہ کی ضرورت ہوتی تو میں وہ مواد تاثیر کے سپرد کر دیتا کہ اس کتاب یا اس رسالے کے فلاں مضمون پر نشتر زنی کی ضرورت ہے تاثیر صاحب وہ مواد اپنے خیالات اور تحقیق کے ساتھ پطرس صاحب تک پہنچا دیتے۔ اور پطرس صاحب اس پر ایک مضمون قلم بند فرماتے جس میں آخری پچ جناب عبدالمجید صاحب سالک کے ہوتے تھے۔ اور پھر وہ مضمون نیرنگِ خیال میں شائع ہو جاتا۔ ان مضامین کی ان دنوں یوپی اور اہل زبان میں بڑی دھوم تھی۔ ان میں مزاح سے زیادہ طنز اور تنقید ہے۔

پطرس صاحب زندہ مزاح تھے۔ احباب کے ساتھ جس مجلس میں بھی وہ بیٹھتے۔ ان کے درخشاں اور شگفتہ چہرے سے مزاح کی نفاذ ترقی پکڑتی تھی۔ ان کے منہ سے مزاح بھرے فقرے اور الفاظ اس طرح مسلسل ادا ہوتے تھے کہ تمام مجلس لوٹن کبوتر بنی رہتی تھی۔ اس مزاح میں عامیانہ اور گھٹیا انداز میں کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بیٹھے پطرس کی باتیں سنتے رہیں۔

جب پطرس صاحب آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ تو ریڈیو کی بعض پالیسیوں کے متعلق میں نے نیرنگِ خیال میں سختی سے نکتہ چینی کی یہ سلسلہ کوئی دو مہینے چلا ہو گا کہ پطرس کا ایک خط مجھے ملا جس میں اس قسم کے الفاظ تھے "تُو میرے خلاف سب کچھ لکھیں تو میں برداشت کر لوں گا لیکن میرے خلاف نیرنگِ خیال میں کچھ لکھا جائے تو میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔" خط کے پہنچتے ہی میں نے یہ سلسلہ نیرنگِ خیال میں فوراً روک دیا۔

ایک دفعہ ہمارے دوستوں نے نیرنگِ خیال کو نیچا دکھانے کے لئے مخزن کا سہارا لیا۔ تاثیر مع اپنے "عملہ" کے مخزن کے دفتر میں جا پہنچے صبح سے شام تک پورا عملہ مخزن کو بڑھانے اور مقبول بنانے میں مصروف نظر آتا تھا۔ پطرس سالک اور امتیاز کو بھی اپنے ڈھب پر لانے کی انہوں نے کوشش کی اور ان کے بعض مضامین جو نیرنگِ خیال کو ملنے تھے۔ انہوں نے راستے ہی میں اچک لئے اس معرکہ میں پطرس صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا، کہ "چوہے بلی کے گلے میں گھنٹی تو باندھیں گے لیکن اس کی میاؤں کا کیا علاج کریں گے۔ تمہارے طائفہ کے پاس سب کچھ ہے لیکن حکیم صاحب کی سوجھ بوجھ کہاں سے لاؤ گے؟" چنانچہ اس جماعت کی یہ تمام کوشش پوری طرح ناکام ہو گئی۔

پطرس نیرنگِ خیال کے دورِ اوّل کے لکھنے والوں میں سب سے نمایاں شخصیت تھے۔ بلکہ مجموعی طور پر انہوں نے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لکھا ہے۔ ان تحریروں میں ڈراما، فلم، افسانہ، ادب لطیف، تنقید، طنز و مزاح سبھی کچھ شامل ہے۔

جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

آغا بابر

جس قلم سے آج یہ چند منتشر خیالات خراجِ عقیدت کے طور پر پروفیسر بخاری مرحوم کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ قلم چلانا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ وہ میرے استاد تھے، مشفق تھے۔ زندگی کی جنگ لڑنے کا اعتماد، حوصلہ نہ ہارنے کا جذبہ سب کچھ انہیں کی تہذیب و تربیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی ناگہانی موت سے خیالات اس طرح پریشان ہیں کہ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں کا رشتہ ترتیبِ قلم کے قابو سے باہر ہے۔ دماغ میں جو کچھ آ رہا ہے جس ترتیب سے آ رہا ہے اسی طرح پیش کر رہا ہوں ؎

خاط مسلسل است پریشاں چوں زلف یار
بیم مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

گورنمنٹ کالج لاہور ہندوستان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی درس گاہ تھی۔ اس کی تعلیم کا ڈھنگ، علمی و ادبی صحبتیں اور پروفیسروں کی قابلیت کا شہرہ دور دور تھا۔ لڑکے اس درس گاہ سے منجھ کر نکلتے۔ انہیں بھی فخر ہوتا اور پروفیسروں کو بھی۔ جب میں فرسٹ ایر میں یہاں داخل ہوا تو پروفیسر بخاری انٹرویو بورڈ میں تھے بلکہ بورڈ میں انہیں کی رائے چلتی تھی۔ گردن میں آپریشن ہونے کی وجہ سے ایک گڑھا سا پڑتا تھا جس کی وجہ سے نسیں کھنچی رہتیں۔ شکل و صورت ایرانیوں کی سی تھی۔ ان دنوں مسٹر گیرٹ پرنسپل تھے۔ پروفیسر بخاری کی وضع قطع، باتیں کرنے کا ڈھنگ، لباس اور اطوار سے یورپین انداز ٹپکتا۔ کسی پروفیسر کی کیا مجال کہ گیرٹ کے کمرے میں سگرٹ پیتے ہوئے گھس جائے۔ مگر پروفیسر بخاری جب پرنسپل کے کمرے میں جاتے تو ہم 'کی ہول' (KEY HOLE) میں سے دیکھتے۔ گیرٹ کے سامنے وہ کھڑے سگرٹ پیتے۔ دھواں نتھنوں سے نکلتا۔ کبھی کش لیتے تو دھواں منہ سے نکلتا نہ نتھنوں سے۔ باتیں کر رہے ہیں دھواں غائب۔ اتنی دیر میں دھواں نتھنوں سے نکلتا پھر منہ سے۔ یہ تماشا سرکس میں دیکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج کے چوٹی کے پروفیسر کا یہ انداز اپنے اندر عجیب وقار، حسن، اور کشش لیے ہوئے تھا۔ پروفیسر بخاری بی۔ اے کو ڈراما پڑھاتے تھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان کی باتیں سنوں۔ ان کی صحبت میں بیٹھوں۔

اردو مجلس کے وہ صدر تھے۔ اجلاس ان کے مکان پر ہوتے تھے وہ ان دنوں میکلوڈ روڈ پر رتن چند کپور بلڈنگ میں رہتے تھے۔ پہلی دفعہ مجھے وہیں پروفیسر بخاری کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ فلیٹ کے برآمدے کی آرائش اور ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ہر شے میں مغربی انداز جلوہ گر تھا۔ اس مغربی ماحول میں اردو مجلس کی میٹنگ۔ پھر گفتگو کا انداز اتنا بے تکلف۔ سب کے ساتھ خلوص آمیز میل ملاپ۔ اس مجلس میں سید امتیاز علی تاج اور سالک صاحب بھی تھے۔ ان سے بخاری گفتگو کرتے تو بات بات کے فوارے سے عجب پھلجھڑیاں اور شرارے پھوٹتے۔ تین گھنٹے کی مجلس رہی، مگر وقت گزرنے کا پتہ

ان کی ذات میں مشرق و مغرب کا جو لطیف امتزاج موجود تھا، پہلی صحبت ہی میں آدمی اس سے متاثر ہوتا۔ کمال تو یہ تھا کہ وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کس طرح مزاح و ظرافت سے اسے حل کر کے رکھ دیتے تھے۔ ان کے مزاح کی آراستگی ساری محفل کو گرما دیتی۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی گرنت تھی کہ خواہ مخواہ طبعیتیں کھنچی چلی آتیں۔ وہ ان دنوں گورنمنٹ کالج کی تہذیبی سرگرمیوں کے روح رواں تھے۔ گھر پر اردو مجلس کی کھیتی کو سینچ رہے تھے۔ راشد اور فیض کو جدید شاعری کے گل بوٹے سجانے پر شاباشیاں مل رہی تھیں۔ شام کو انگریزی ڈرامے دی مین ہو ایٹ دی پوپومیک (THE MAN WHO ATE THE POPOMACK) کا ریہرسل کرا رہے ہیں۔ انگریزی مباحثوں میں حصہ لے رہے ہیں ادب اور فلسفہ پر لیکچر تیار کر رہے ہیں۔ پھر آستینیں چڑھی ہوئی ہیں، ہاتھ گرد آلود، ڈرامے کی سٹینگ کی ٹھونک ٹھانک ہو رہی ہے۔ وقت کے ایک ایک لمحے سے اس کا اس طرح رس نچوڑ رہے ہیں کہ وقت اپنی تہی دامنی پر نادم ہے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ اتنا خوش آئند ہوتا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک ولولہ جاگ اٹھتا۔ جو لوگ ڈرامے کا ریہرسل دیکھنے آتے وہیں کے ہو رہتے۔ وہ لڑکوں کو یونیورسٹی ڈی بیٹ کے لئے تیاری کراتے تو لڑکوں کا یہی جی چاہتا کہ وہ بس، ڈی بیٹ ہی کو زندگی کا مسلک بنا لیں۔ یہ بخاری صاحب کے خلوص کار کے کرشمے تھے۔

صوفی تبسم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:—

> "بخاری کا مقولہ ہے کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہئے چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔"

ان کا اپنے شاگردوں سے بڑا مشفقانہ برتاؤ ہوتا تھا، کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی۔ اس کے باوجود ان سے جی ڈرتا۔ وہ اس لئے کہ جہاں کوئی اصول کی بات آجاتی وہ معاف نہ کرتے، ڈانٹ پڑ جاتی۔ میں نے بی اے میں ان سے ڈرامہ پڑھا، شیکسپیئر کے وہ عاشق تھے۔ "ہملٹ" ہمارے نصاب میں تھا۔ جہاں پلونیس لی آرٹیز کو تقریر کرتے ہوئے عقل و دانش کی باتیں سمجھاتا ہے جو انسانی زندگی اور دنیوی تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ اس مقام پر شیکسپیئر نے جو باتیں سجھائی ہیں ان کے متعلق پروفیسر بخاری ہمیں نوٹس لکھوانا چاہتے تھے۔ ہم نے اپنا اپنا قلم سنبھالا۔ اصغر (اب کمانڈ کنٹرولر راولپنڈی) میرے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ اس نے موٹا سا پیلے رنگ کا قلم نکالا۔ نوٹ بک پر اس روز کی تاریخ لکھی۔ اور میری نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے قلم سے تاریخ لکھنی چاہی تو قلم نے لکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا۔ پھر قلم کو انگلی سے ذرا ٹھونک کر لکھنا چاہا۔ قلم نے نہ لکھا۔ میں نے اصغر کو زور سے کہنی ماری اور کہا۔

"ادھر مت دیکھو میرے قلم کو نظر لگ رہی ہے۔"

پروفیسر بخاری نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہم اگلی بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ دو سال ہوئے میں نے اپنے افسانوں کا تازہ مجموعہ "لب گویا" ن۔ م۔ راشد کے ہاتھ بخاری صاحب کو نیویارک بھیجا۔ میں نے اس پر لکھا ـــــ اپنے نالائق شاگرد کی طرف سے یہ کتاب قبول فرمایئے جو اگلی بنچوں پر اس لئے بیٹھا کرتا تھا کہ آپ پچھلی بنچوں پر بیٹھنے والوں سے سوال پوچھا کرتے تھے"ـــــ بخاری صاحب مسکرا کر کتاب دیکھنے لگے اور اگلے روز نئے سال کا کارڈ مجھے روانہ کیا جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے، ہملٹ کا وہ نسخہ بھی جو پروفیسر بخاری ہمیں پڑھایا کرتے تھے میرے پاس موجود ہے حقیقت میں تو ہمارے پاس

ان کے وہ تحفے ہیں جن کو ہم نے زندگی بھر اپنائے رکھا ہے۔ یہ لکھنے کا روگ جو ہم طالب علمی کے زمانے سے پال رہے ہیں انہیں کی بخشش ہے۔ ڈرامے کا شوق بلکہ چسکا انہیں کا دیا ہوا ہے۔ جذبات کی یہ آگ جس نے استخواں تک کو جلا دیا ہے اور ابھی "آرزوئے سوختن باقیست" انہیں کا کرشمہ ہے انہوں نے ن م۔ راشد کی حوصلہ افزائی کی، فیض کی کمر ٹھونکی۔ آغا عبدالحمید (سی ایس پی)، بشیر قریشی (سی ایس پی)، علی اصغر (سی ایس پی)، رشید احمد (ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) اور مظہر علی خاں (سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) پروفیسر بخاری کے وہ شاگرد ہیں جن کی علمی استعداد اور ادبی تہذیب و تربیت بخاری صاحب کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ وہ روشنی کا چراغ جس سے ہزاروں چراغ جلے، سینکڑوں نے اکتساب نور کیا، آج اپنی لو ختم کر چکا ———

پرانے واقعات تابڑ توڑ ذہن پر وارد ہو رہے ہیں جن سے اپنے استاد کی تعظیم و تکریم میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس عظیم انسان کا وقار فضیلت بڑھ رہا ہے مرحوم کی شخصیت کا ایک پیارا پہلو یاد آیا ———

اصغر حسین قلعہ گوجر سنگھ میں رہتا تھا پروفیسر صوفی تبسم نے کہا "تم میکلوڈ روڈ سے گذرتے ہوئے بخاری صاحب کے ہاں چلے جانا اور ان سے کہنا کہ آج شام کو چھ بجے اردو مجلس کی میٹنگ ان کے مکان پر ہوگی۔"

اصغر نے عطر چند کپور بلڈنگ کے ساتھ بائیسکل رکھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند۔ بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے انگلی رکھ کر بٹن کو زیادہ زور سے دبایا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب وہ انگلی رکھ کر دباتا ہی چلا گیا۔

بخاری صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے آئے۔ دروازہ کھول کر بولے: "جو گھنٹی کے بٹن کے اوپر لکھا ہے تم نے پڑھا۔"

وہاں لکھا ہوا تھا "BE BRIEF AND PATIENT"

اصغر کچھ نہ بولا۔ انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "NO MISTAKE IN FUTURE" اور چلے گئے۔ اصغر حیران کہ اچھا پیغام دینے آئے کہ الٹی ڈانٹ کھالی اور اس مرد خدا نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں آئے کیا بات ہے؟

اصغر نے گھنٹی کو زور سے بجایا۔ سیڑھیاں اترا۔ بائیسکل لیا اور بھاگ گیا۔ اگلے دن پروفیسر بخاری کے پیریڈ میں اصغر کا دل دھڑک رہا تھا وہ حاضری لے رہے تھے جب نمبر ۱۵۶ بولا تو رک گئے۔ اصغر کا برا حال، بخاری نے رجسٹر سے نظر اٹھائی۔ اصغر کی طرف دیکھا۔ ذرا سا ڈرامائی وقفہ دے کر بولے ——— "I LIKED IT"

اور حاضری لینے لگے

اسی زمانے کی بات ہے۔ یونیورسٹی سے کہہ سن کر پروفیسر بخاری نے کالجوں میں پراکٹوریل سسٹم رائج کرایا۔ طلبا کو شناختی کارڈ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نو بجے سے اوپر بغیر اجازت نامہ کے طالب علم گھر سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں ایک دن پکڑا گیا

میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ساتھ ایک کھانے پر مدعو تھا۔ انہوں نے مجھے گنڈیریاں لینے بھیج دیا۔ میں گوالمنڈی کے چوک میں گنڈیریاں تلوا رہا تھا کہ ایک کار آکر رکی۔ بخاری صاحب بولے۔ "اجازت نامہ؟"

میں نے کہا "میں تو ———"

بولے "کل صبح" اور چلے گئے۔

میں نے عاشق صاحب سے اجازت نامہ لیا کہ میری اجازت سے باہر گیا تھا، مگر بخاری صاحب نے دس روپے جرمانہ کر دیا۔ بولے "اس

وقت تمہارے پاس اجازت نامہ کیوں نہیں تھا؟ تم نے اصول توڑا ہے۔"

آج جب ہم اپنے بچوں سے اصول برتتے ہیں تو انہیں کیا معلوم کہ اس میں ہمارے پروفیسر کی تربیت بول رہی ہے ہم نے جو کچھ اپنے استاد سے سیکھا اگلی پود کو دیکھا کچھ دے رہے ہیں۔

گذشتہ جنوری میں وہ ڈھائی برس کے بعد رخصت لے کر امریکہ سے پاکستان آئے۔ راولپنڈی میں اپنے بڑے لڑکے ہارون کے پاس چند دن رہے۔ میں ملنے گیا۔ وہی پرانی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت، پوچھنے لگے "سنا ہے تم نے پنڈی میں ڈرامے سٹیج کئے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی لگائی ہوئی آگ ابھی تک نہیں بجھی" یہ سن کر مسکرائے۔

میں نے کہا "لٹل تھیٹر گروپ آپ کو چائے کی پیالی پلانے کا خواہشمند ہے۔"

بولے "میں ان تکلفات (FORMALITIES) سے بڑا اکتا گیا ہوں۔ تم بلاؤ تو آ جاؤں گا۔ کراچی اور لاہور میں میں نے کسی ادارے کی دعوت قبول نہیں کی۔"

میں نے کہا "لٹل تھیٹر کو کوئی پیغام ہی دے دیں۔"

بولے "پیغام تو بڑے آدمی دیا کرتے ہیں۔"

راولپنڈی میں انہوں نے اپنے شاگردوں اور مداحوں کے ساتھ ایک شام بسر کی۔ عابد علی کے ہاں تین گھنٹے محفل جمی اور گفتگو کے بادشاہ کو ہم نے پھر بلندیوں پر اڑتے دیکھا۔ دل خوش ہوا کہ دل کے دوروں نے ابھی تک اس عظیم شخصیت کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وقت سے زندگی کا پورا رس نچوڑ لینے والا یہ انسان ابھی زندہ رہے گا۔

وہ اپنے قیام کے دوران اپنے شاگردوں اور دوستوں سے پہلا سوال یہی کرتے رہے "کیا تم مطمئن ہو نا؟"

اس سوال کو اولیت دینے کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ پاکستان کا ہر شخص شاکی نظر آتا ہے۔ میں یہاں ایک عام فرسٹریشن دیکھ رہا ہوں بے دلی، بے اطمینانی اور محرومی کا احساس چاروں طرف دکھائی دے رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی ذات میں دلچسپی انتہائی طور پر بڑھ گئی ہے سب قوموں میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ ان کی قوم کا کوئی فرد امریکہ میں آئے تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ ہمارے ملک کا ممتاز اور قابل ترین فرد ہے۔ واحد پاکستانی ایسا شخص ہے جسے میں نے کبھی اپنے ملک کے فرد کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ وہ تو دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ "سب سے ممتاز اور قابل ترین فرد تو میں ہوں" یہ تو بس ایسوں میں سے ہی ہے۔ اگر کسی کو کوئی اچھا عہدہ مل جائے۔ کسی منصب پر کوئی جا پہنچے اور کسی پاکستانی سے کہا جائے "کیوں بھئی۔ وہ اچھے عہدے پر جا پہنچا؟" تو پتہ ہے وہ کیا جواب دیتا ہے —— "اوچھڑ وجی —— یہاں پھر اکرتا تھا!" پھر میری طرف دیکھ کر بولے —— "کوئی اگر یہ کہے کہ بابر نے بڑا اچھا ڈرامہ سٹیج کیا تو کہیں گے 'اوچھڑ وجی —— کل ایتھے لگا پھر دا سی'۔"

اس چھڑ وجی میں ہماری کم ہمتی، محرومیوں اور اہلیتوں کی بہت بڑی جھلک موجود ہے۔ پاکستان چھوٹا سا ملک ہے آخر یہاں ہی کے لوگ اچھے عہدوں پر متمکن ہوں گے مگر اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ پاکستانی خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرا اگر کچھ کرے اور اسے نیک نامی حاصل ہو جائے تو عام ردِ عمل یہی ہوتا ہے "اوچھڑ وجی۔"

کہنے لگے امریکہ میں ایک بین الاقوامی تقریب پر چودھری سر ظفر اللہ خاں کسی سے تنبورے کا ذکر کر رہے تھے۔ کسی غیر ملکی نے پوچھا تنبورے اور تان پورے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کہنے لگے "چلو بخاری سے پوچھیں وہ آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہ چکا ہے۔"

میں نے کہا "آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہنا تنبورے اور تان پورے پر کوئی اتھارٹی نہیں ہو سکتا۔ آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"

بولے "پینسٹھ سال"

میں نے کہا "جہاں آپ نے پینسٹھ سال تان پورے اور تنبورے کا فرق معلوم کئے بغیر گزار دیے ہیں دو چار سال اور بھی گزار دیجئے۔"

پروفیسر صوفی تبسم کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ پروفیسر بخاری کے رفیقوں میں سے ایک یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ بخاری کہنے لگے "بھائی صاحب میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں کسی سے الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہیئے اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہئے ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

جب علامہ اقبال کے کلام کے سلسلے میں یوپی کے بعض اہل قلم کی طرف سے اعتراضات اٹھنے لگے تو "زندہ دلان" پنجاب نے ان سے جو جنگ لڑی تھی بخاری اس میں پیش پیش تھے۔

ٹکراؤ اور پھر استعدادِ کار کا حرکت میں آنا، یہ بات ان کے ڈرامے سے غایت درجہ شغف رکھنے کا ایک طبعی باعث قرار دی جا سکتی ہے اس طرح الجھنے اور ٹکرانے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ کبھی تھکن محسوس نہ کرتے۔ میں نے انہیں ۱۹۳۵ء میں ہملٹ کا پارٹ ادا کرتے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر بخاری واقعی پرنس ہملٹ ہے۔ ڈرامائی ٹکراؤ، واقعاتی الجھاؤ، کرداری رکاوٹیں ہملٹ کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اور وہ کس کس طرح ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ ہملٹ کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آ گئی تھی۔

نیویارک کے جس ڈاکٹر کے وہ زیرِ علاج رہے وہ بھی شیکسپیئر کا بڑا دلدادہ تھا۔ مریض اور ڈاکٹر دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہتے۔ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کے بعد پروفیسر بخاری جب بھی ڈاکٹر سے طبی مشورہ کرتے تو مسکرا کر پُرمعنی انداز میں ضرور پوچھتے "کب ڈاکٹر؟ بتاؤ تو سہی کب؟"

نیویارک میں ملک ملک کے چوٹی کے اخباری نمائندے مقیم ہیں۔ وہ بخاری کی صحبت میں بیٹھنے کو بہت بڑا پُرمسرت اعزاز سمجھتے۔ ہر شخص ان کا مداح تھا۔ پروفیسر بخاری نے ایک بے چین اور مضطرب طبیعت پائی تھی۔ اس سیماب صفت انسان کا دماغ اس کے جسم سے اور اس کا جسم اس کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

موت کا فرشتہ دہلیز پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "اگر تم چاہو تو میں حاضر ہوں۔ رات تمہارے پاس ٹھہرتا ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔"

پروفیسر بخاری نے کہا "نہیں، نرس جو میرے پاس موجود ہے۔"

ڈاکٹر نے مذاق سے کہا "اچھا سویٹ پرنس شب بخیر۔"

مگر یہ رات اس کی آخری رات تھی۔ موت کے فرشتے نے دہلیز الانگ لی۔

بچے باپوں سے پوچھتے ہیں آج کون مر گیا آپ اداس جو ہیں کون بتائے ننھی پود کو کہ آج وہ مر گیا جس نے کہا تھا، بچوں کا بہلانا سہل ہے

بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔

پروفیسر بخاری کی شخصیت کی عظمت کا بہت پیارا پہلو یہ تھا کہ عام عالموں کی طرح علم کے اظہار و بیان کو دہ بوریت اور یبوست کی کوئی چیز نہ بننے دیتے۔ بلکہ اپنی فطانت اور ظرافت کے امتزاج سے اسے اتنا پر معنی اور پرکشش بنا دیتے تھے کہ سننے والے کی سوچ کو تحریک بھی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ پھلجھڑیاں بھی بہار دکھاتی رہتیں۔ آج وہ اہل فکر و دانش و رہم میں نہیں۔ جو فضا میں بیٹھتا تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا، لکھتا تو موتی پروتا، بولتا تو زندگی کی چاندنی اور شگفتگی بلائیں لیتے۔ گھری ہوتی۔ بچوں سے باتیں کرتا تو سخت مزاج والدین منہ تکنے لگتے۔

جذبات کی باریکیوں کو سمجھنے والا یہ حقیقت پسند، حقیقت نگار انسان، زندگی کو زندوں کی طرح گزارنے والا خوش ذوق و سخن سنج ادیب؛ پاکستان کا شہری نہیں۔ دنیا کا شہری" اپنی سرزمین سے دور جا لیٹا جس کی نظافت، طباعی اور تحریر و بیان کے دلدادگان ملک ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شہزادہ علی خان نے اس کی میت پر آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ بخاری کی موت سے اقوام متحدہ کی لابیاں سنسان ہو گئی ہیں — ہائے ان آنکھوں میں کون جھانکے گا جو اس کی میت سے دور آنسو بہا رہی ہیں اور ان دلوں کا حال کون جانے گا جو یہاں ویران اور سنسان ہیں

نمی دانم حدیث نامہ چون است

ہمیں بینم کہ عنوانش بخون است

چند پرانی یادیں

غلام رسول مہر

میں نے بخاری صاحب کو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔ ترکِ موالات یا لاتعاون کی تحریک اوجِ شباب پر تھی اور اس کے اوجِ شباب کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لفظوں میں اس کا صحیح نقشہ پیش کرنا مشکل ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ صاف نظر آرہا تھا حکومت برطانیہ کے قصرِ اقتدار میں ایک خوفناک زلزلہ آگیا ہے اور یہ قصر تھوڑی ہی دیر میں زمیں بوس ہو جائے گا۔

سالک صاحب "زمیندار" کے مدیر کی حیثیت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مقدمہ چل رہا تھا اور اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ شفاعت اللہ خاں مرحوم "زمیندار" کے منیجر تھے اور انتظام کے علاوہ تحریر کا زیادہ تر کام بھی وہی انجام دیتے تھے۔ انھی کی تحریک پر سید عبدالقادر شاہ مرحوم نے مجھے ادارۂ تحریر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے بلایا تھا۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم بھی اس وقت "زمیندار" ہی سے وابستہ تھے۔ خبروں اور مختلف مضمونوں کا ترجمہ ان کے ذمے تھا۔

"زمیندار" کا دفتر دہلی دروازے کے باہر اس بڑی عمارت میں تھا جو جہازی بلڈنگ کے نام سے مشہور تھی۔ ایک روز شام کے وقت دو گورے چٹے جوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بادی النظر میں صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے کھڑے کھڑے شفاعت اللہ خاں سے باتیں کیں۔ غالباً اس روز سالک کے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی۔ اسی کی کیفیت پوچھتے رہے اور چلے گئے۔ شفاعت اللہ خاں نے مجھے بعد میں بتایا کہ ان میں سے ایک احمد شاہ بخاری تھے اور دوسرے سید امتیاز علی تاج۔ میں ان دونوں سے ناواقف تھا اور محض نام سن کر میری معلومات میں کیا اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کے متعلق کچھ پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا، البتہ اس بات پر تعجب ہوا کہ قومی تحریک کے نہایت اہم مرحلے پر بھی بعض مسلمان انگریزوں کی سی وضع قطع قائم رکھنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے۔

چند روز بعد میں گھر واپس چلا گیا اور "زمیندار" کے ساتھ تعلق قائم نہ رکھ سکا اس لیے کہ میرے اقربا خصوصاً والدہ مرحومہ کو یہ تعلق منظور نہ تھا۔ دو تین مہینے کے بعد شفاعت اللہ خاں اور مرتضیٰ احمد خاں میکش خود میرے گاؤں پہنچے جو جالندھر شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور اقربا کو راضی کر کے مجھے دوبارہ "زمیندار" میں لے آئے۔ اس وقت سے مستقل طور پر میری اخبار نویسی کی ابتدا ہوئی۔ سالک صاحب کو ایک سال قید کی سزا ہو چکی تھی اور وہ لاہور سے میانوالی جیل میں منتقل ہو چکے تھے۔ بخاری

اور امتیاز وقتاً فوقتاً سالک صاحب کی صحت و عافیت دریافت کرنے کی غرض سے "زمیندار" کے دفتر میں آتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ان سے شناسائی ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ سالک صاحب کے نہایت عزیز دوست ہیں۔

۱۹۲۲ء کے اواخر میں سالک صاحب رہا ہو کر آگئے اور ان سے وہ برادرانہ تعلق استوار ہوا جسے زندگی کا ایک عزیز ترین سرمایہ سمجھتا ہوں۔ ان کی وجہ سے بخاری اور امتیاز کے ساتھ بھی ایک خصوصی علاقہ پیدا ہوگیا۔ بخاری صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اس علاقہ میں آخری وقت تک کوئی خلل نہ آیا۔ امتیاز صاحب کو خدا تا دیر سلامت رکھے، ان کے ساتھ یہ علاقہ آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے تیس پینتیس سال پیشتر قائم تھا۔

پھر بخاری صاحب سے زیادہ مفصل ملاقاتیں اس زمانے میں ہوتی رہیں جب منشی نعمت اللہ صاحب مرحوم دہلی مسلم ہوٹل چلا رہے تھے اور بخاری صاحب نے اسی ہوٹل میں اپنے لیے ایک یا دو کمرے لے لیے تھے۔ یہ ہوٹل اسی جگہ تھا جہاں اب اس نام کا ہوٹل موجود ہے لیکن اس کی عمارت بالکل بدل گئی ہے۔

بخاری صاحب کی باتیں اس زمانے میں بھی سب سے نرالی ہوتی تھیں۔ ہم لوگوں کے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ لاتعاون اور آزادی کے جوش سے معمور تھا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ ایک روز انھوں نے خاص احساسِ ذمہ داری کے ساتھ فرمایا کہ آزادی کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے ضرور کرنا چاہتے مگر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جس قوم کا لباس ایک نہیں، جس کے کھانے کے اوقات مقرر نہیں، جس میں یکسانی اور یکجہتی کا کوئی بھی پہلو نظر نہیں آتا، وہ آزادی سے کیا فائدہ اٹھائے گی؟ کوشش کرو کہ اس سرزمین میں بسنے والے لوگ واقعی ایک ایسی قوم بن جائیں جو ایک نظامِ زندگی کی پابند ہو۔

اس وقت یہ سن کر احساس ہوا کہ بخاری صاحب کا دل آزادی کے جذبے سے بالکل خالی ہے لیکن جب بنیادی حقائق کے صحیح اندازے کا شعور پیدا ہوا تو پتہ چلا کہ یہ ارشاد ان کے بلوغِ نظر کی ایک روشن دستاویز تھا۔

اسی طرح مجھ سے انھوں نے بارہا کہا کہ آپ اخبار میں ایک چوکھٹا مستقل طور پر لگاتے رہیں جس کے اندر جلی حروف میں یہ عبارت مرقوم ہو کہ "بائیں ہاتھ چلو"۔ روزانہ یہ چوکھٹا چھپتا رہے گا تو یقین ہے کہ ہزاروں آدمیوں کو بائیں ہاتھ چلنے کی اہمیت کا احساس ہو جائے گا۔

میں خود ماضی پر نظرِ بازگشت ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ سیاسیات پر خدا جانے کتنے ہزار صفحے لکھ ڈالے۔ اپنے نقطۂ نگاہ کی توضیح کے لیے دلائل و شواہد کے سینکڑوں ہزاروں طومار مرتب کر دیے لیکن منظم قومی زندگی کے مبادی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور آج بھی جبکہ آزادی پر بارہ سال گزر چکے ہیں، قوم ان مبادی سے اسی طرح ناآشنا ہے جس طرح تیس پینتیس سال پیشتر ناآشنا تھی۔

بخاری صاحب ابتدائی دور میں بھی بعض نہایت ممتاز خصوصیتوں کے مالک تھے مثلاً:-

۱- جو کچھ لکھتے یا بولتے تھے اس میں تکلف بالکل نہ ہوتا تھا، تاہم ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی نادر خوبی ضرور ہوتی تھی۔ پھر وہ

فطری صلاحیت مزاج کی بنا پر اس میں خاص دل آویزی پیدا کر دیتے تھے۔

۲۔ میں نے انھیں کسی بھی معاملے کے متعلق بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے نہ دیکھا۔ جو موضوع زیرِ بحث آتا اس کے متعلق ایک دو سننے کی باتیں ایسے انداز میں کہہ دیتے جیسے کوئی بے تعلق سا آدمی کسی حقیقت کا اظہار کر دیتا ہے اور دوسرے معاملے پر گفتگو شروع کر دیتے۔

۳۔ کسی کی کم علمی یا واقفیت کی فرومائگی کا مذاق انھوں نے کبھی نہ اُڑایا۔ ساتھ ہی وہ کبھی کسی بہت بڑے آدمی سے بھی مرعوب نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک مشہور لیڈر سے ملاقات ہوئی جس نے مسئلہ تعلیم کے متعلق وہی عامیانہ سی باتیں شروع کر دیں جو پبلک جلسوں میں کہی جاتی تھیں۔ بخاری صاحب دو چار منٹ سُنتے رہے پھر لیٹے کہ صاحب! یہ موضوع چھوڑیئے اور کوئی دوسری بات کیجیے۔

ایک تعجب انگیز معاملہ یہ ہے کہ کم از کم مجھے ان کی خداداد صلاحیتوں کا پورا اندازہ کبھی نہ ہو سکا۔ علم و فضل اور شخصیت کے اعتبار سے وہ تعلیمی دائرے کے ایک بلند پایہ فرد تھے۔ اسی دائرے کے لیے انھوں نے یہاں اور ولایت میں تعلیم و تربیت پائی تھی لیکن جب انھیں آل انڈیا ریڈیو میں لیا گیا تو بہت ہی کم مدت میں ہر متعلقہ آدمی کو احساس ہو گیا کہ بخاری صاحب بے شک و شبہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے کمالات کا حصر مشکل ہے۔ چنانچہ ان کی نگرانی میں آل انڈیا ریڈیو نے جو مدارج ترقی طے کیے ان کی نظیر ان سے پیشتر یا ان سے بعد کے دور میں شاید ہی مل سکے۔

پھر قومی یا بین الاقوامی سیاسیات سے انھیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا تاہم جب پاکستان کی طرف سے انجمن اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کا منصب انھیں سونپا گیا تو وہ تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف اسلامی اور مشرقی ممالک کے نمائندوں کی صف میں ممتاز ترین حیثیت اختیار کر گئے بلکہ بین الاقوامی دائرے کے بھی ہر شخص کے دل میں ان کے لیے انتہائی احترام پیدا ہو گیا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن محقق بخاری صاحب ہی تھے جنھوں نے ایک طرف بہترین قومی اور اسلامی مصلحتوں کی نگہداشت کا حق ادا کیا اور دوسری طرف اہلِ وطن کے سامنے انھوں نے بار بار وہ مسلک واشگاف طریق پر پیش کر دیا جو بین الاقوامی دائرے میں کامیابی و فائز المرامی کا واحد ذریعہ تھا۔

اسی بالغ نظری، اسی حقیقت شناسی، اسی واقفیت و دوستی اور فکر و نظر میں اسی توازن کی بنا پر انھیں انجمن اقوامِ متحدہ میں وہ مقام حاصل ہوا جو غالباً مشرقی ممالک کے کسی فرد کو میسر نہ آ سکا۔ انجمن اقوامِ متحدہ کے سکرٹری جنرل کو ان کی رائے اور صوابدید پر جتنا اعتماد تھا اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔

اگر بخاری صاحب کو حیاتِ مستعار کی مزید مہلت ملتی تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ فضائل و مکارم کی کن بلندیوں پر پہنچتے۔ کمال یہ ہے کہ ان کے دل میں سب کے لیے محبت اور الفت موجزن تھی۔ عداوت کسی سے نہ تھی۔ وہ ایک نادر الوجود انسان تھے اور علم و سرگرمی کے جس حلقے میں پہنچے انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار پیش کیا۔ اسی وجہ سے سب لوگ انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اصلاً علمی آدمی تھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں پہنچے تو وہاں بھی اپنی علمی خصوصیات کو بہتر سے بہتر انداز میں نمایاں کیا

اور انجمن اقوام متحدہ کی سٹیج بھی ان کی علمی خصوصیات کی جلوہ فرمائی سے منور ہوتی رہی۔ یہ جلوہ فرمائی بخاری صاحب کے بغیر شاید ہی اس سٹیج کو نصیب ہو سکے۔

بخاری صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ دوستوں کے لیے ان کے قلب و دماغ میں لامتناہی محبت تھی۔ اسی اشاعت میں ان کے چند خطوط شائع ہو رہے ہیں ان کے ملاحظے سے واضح ہو گا کہ جس زمانے میں ان کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لے رکھی تھیں وہ چاہتے تھے کہ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ان کی ترقی درجات کا سلسلہ بے خلل جاری رہے۔ حکومت پنجاب نے اس وقت یہ مسلک طے کر لیا تھا کہ جن لوگوں کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ اس طرح زیادہ مشاہرے پانے لگتے ہیں انھیں اصل محکمے میں اس وقت تک ترقی نہ ملنی چاہیے جب تک وہ باہر سے واپس نہ آجائیں کیونکہ یہ طریقہ ان لوگوں کے جائز حقوق کے خلاف ہو گا جو اپنے محکمہ سے باہر نہیں جاتے لیکن بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت کے پیش نظر حکومت نے ان کے معاملے کو طے کردہ مسلک سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔

جس وقت ان کا معاملہ وزارت پنجاب میں پیش تھا عین اسی موقع پر مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات کے لیے ایک ابتلا کی صورت پیدا ہو گئی جس کی تفصیل خطوط کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ بخاری صاحب مسٹر من موہن کی پریشانیوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ مجھے لکھا میں مسٹر من موہن کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی ترجیح دیتا ہوں۔

دوستوں کے لیے ان کے جذبۂ ایثار کی اور مثالیں بھی میرے پیش نظر ہیں لیکن میں پرانی یادوں کے اس مرقعے کو فی الحال زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔

یہ چند چیزیں بے اختیار زبانِ قلم پر آگئیں۔ بخاری صاحب کے متعلق لکھنے کے اصل حقدار سالک اور امتیاز ہیں جنھیں مرحوم کے ساتھ مجھ سے بدرجہا زیادہ گہرا علاقہ تھا اور ان کی معلومات بھی مجھ سے بہت زیادہ ہیں۔ میں اس بارے میں ان دونوں سے منزلوں پیچھے ہوں لیکن طفیل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ایک عزیز اور محترم دوست کی یادگار میں خاص نمبر مرتب کرتے وقت مجھے بھی دعوت شرکت دے دی۔ اس طرح دوسروں کے شاداب و دل آویز گلدستوں کے ساتھ مجھے بھی چند تنکے یہاں شامل کر دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مرحوم افراد کے متعلق ذکر کا ایک عام شیوہ یہ ہے کہ جو جگہ انھوں نے خالی کی وہ پُر نہ ہو سکے گی لیکن بخاری صاحب یقیناً ان معدودے افراد میں سے تھے جن کی جگہ پُر کرنے کے لیے متعدد اور گوناگوں خصوصیتوں کا جامع شخص درکار ہے۔ افسوس کہ زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھتے ہوئے ان خصوصیتوں کا جمع ہونا مشکل ہے۔ مشرقی و مغربی علوم میں غیر معمولی مہارت، فکر و نظر میں غیر معمولی توازن، رائے اور انداز میں غیر معمولی تعادل، پھر اخلاق و عادات میں مشرقی شرافت اور مغربی محاسن کا غیر معمولی امتزاج، یہ چیزیں فرداً فرداً بھی شاذ ہی نظر آتی ہیں ان کی جامعیت کے نظارے کے لیے آنکھیں بظاہر ترستی ہی رہیں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میرا شہرہ آفاق اُستاد

ڈاکٹر حمید الدین

میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سینکڑوں نہیں تو بیسیوں ایسے احباب سے معذرت طلب کرنی چاہیئے جو مجھ سے کہیں زیادہ پروفیسر بخاری سے واقفیت کا دم بھرتے ہیں۔ میں پروفیسر بخاری کی روح سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے میں اپنے بیان میں بعض ایسی باتیں کہہ جاؤں جو موصوف کی شخصیت کے بارے میں سو فیصدی درست نہ ہوں۔

جب مجھے پروفیسر بخاری کا خیال آتا ہے۔ تو میرا ذہن دوسری دہائی کے آخری برسوں اور تیسری دہائی کے آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اُن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اور وہ کیمبرج سے تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ جہاں انھوں نے انگریزی ادب میں وہ امتیاز حاصل کیا تھا۔ جو اُن سے پہلے کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ کیمبرج میں کئی ہندوستانیوں نے داخلہ لیا۔ مگر دو تین کے سوا کسی کو اُن جیسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

دراز قد، خوبرو، عالمانہ پیشانی، تیز دلکش آنکھیں رکھنے کے باعث پروفیسر بخاری دور کھڑے بھی دیگر پروفیسروں سے الگ پہچانے جاتے اور ممتاز نظر آتے تھے۔ پروفیسروں کی اس جماعت میں دُبلے پتلے، لمبے ترنگے مونچھوں والے پروفیسر لینگ ہارن، مادن گوپال سنگھ جیسے محنتی اور پروفیسر فرتھ جیسے سراپا حرکت لوگ شامل تھے۔ اس سے پہلے پروفیسر مرزا سعید شاید کسی ڈگری کالج کے پرنسپل ہو کر باہر جا چکے تھے۔ اور ایک دو سال بعد پروفیسر ڈکنسن بھی علی گڑھ سے یہاں آ گئے تھے۔

مجھے پروفیسر بخاری سے پہلی بار واسطہ اس وقت پڑا جب میں تیسرے یا چوتھے سال میں تھا۔ وہ ہمیں مختصر افسانہ پڑھاتے تھے۔ ہماری جماعت اُس کمرے میں بیٹھتی تھی۔ جسے توڑ کر آجکل پرنسپل اور کالج کے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ جماعت صبح کے وقت ہوتی تھی۔ وہ ہمیں سٹیونسن کی مارخائیم پڑھا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے پہلے لیکچر کے بعد ہمارے تاثرات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ خاص طور پر مختصر افسانہ، اس طریقے سے مختلف تھا جس کے ہم عادی تھے۔ انھوں نے دو تین لیکچر دیئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پورا ایک ہفتہ زیادہ تر یہ بتانے پر صرف کیا کہ انھوں تے لندن میں ایک عام آدمی کو کس حال میں دیکھا۔ انھوں نے مصنف اور اس کی کہانی کے متعلق ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اگرچہ بعد میں ایسا ہوا کہ لندن کے عام آدمی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس کا ڈرامائی خاتمہ سے خود بخود ہو گیا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ پروفیسر بخاری دوسروں سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں [illegible] ہے۔ اگر کوئی ان سے سوال پوچھتا یا ان پر نکتہ چینی کرتا تو وہ اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں [illegible]

اس کے بعد پروفیسر بخاری کی ذات کا جائزہ ہمارا موضوع بن گیا ہم سیدھے سادے انداز میں اُن کے قیام لندن کے ظاہری اثرات معلوم کرنا چاہتے تھے مگر مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اُن کی ظاہری دلچسپیوں سے اِس کا سراغ لگانے میں قطعاً ناکام رہے۔ اُن کے جیکٹ کے سخت کالر کے سوا جو ایک خوش پوش آدمی کا نشان ہے۔ اُن میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے دیکھ کر آدمی کہہ سکے کہ وہ دوسروں کو لاشعوری طور پر مرعوب کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اُن سردیوں میں وہ روزانہ ہلکے بادامی رنگ کے ٹویڈ کی جیکٹ اور شاید دیسی ہی فلالین کی سلیٹی رنگ کی پتلون پہنتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا کوٹ پتلون نہایت صفائی سے استری کیا ہوتا تھا۔ تاہم ٹائی کے انتخاب میں مجھے اُن میں کبھی نمایاں نازک مزاجی کا ثبوت نہ ملا۔ دھاری دار کپڑے پہننے کی کمزوری تو اُن میں شروع سے آخر تک پائی گئی۔ وہ خانے دار قمیض کا استعمال اسی قسم کے ہلکے لیکن نمایاں چیک کوٹ کے ساتھ ہرگز معیوب نہ سمجھتے تھے۔ البتہ انھیں بو ٹائی لگانے کا شوق ہمیشہ رہا۔

اس طرح قریب سے جائزہ پڑتال کرنے کے باوجود ہم اُن کی وضع قطع کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکے۔ ہم جہاں تھے وہیں رہے اور ابھی تک یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اُن میں ایسی کون سی بات تھی جس کی وجہ سے فقط وہی واحد پروفیسر تھے جنھیں تنگ نہیں کیا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں کوئی اُستاد ایسا نہ تھا جو دوسرے سے پانچویں سال کے طلبہ کی شرارتوں کا تختۂ مشق نہ رہا ہو۔ پانی کی طرح رواں اور غلطی سے پاک انگریزی شاذ و نادر ہی نوواردوں کے کام آتی تھی۔ در اصل ایسا استاد جتنا تیز ہوتا اور جتنا زیادہ رعب جمانے کی کوشش کرتا۔ اتنا ہی زیادہ وہ بے نقاب ہو جاتا۔ لیکن پروفیسر بخاری ایسی تمام شرارتوں سے بچے رہے۔

جذبۂ خلوص ہی ایک ایسی خوبی ہے جس کی بنا پر تمام دنیا کے شاگرد اپنے استادوں کی قدر کرتے ہیں۔ پروفیسر بخاری میں ایک استاد کی حیثیت سے یہ وصف نمایاں تھا۔ اُن کے شاگرد شروع ہی سے جان گئے تھے کہ پروفیسر بخاری کی اہمیت ایک اُستاد سے اگر زیادہ نہیں تو کسی صورت کم بھی نہیں۔

پروفیسر بخاری کے نزدیک ادب پڑھانے کا مطلب صرف یہ نہیں تھا کہ مشکل الفاظ کے معنی بتا دیئے یا محاوروں کی تشریح کر دی یا کسی شاہکار کی ہیئت اور ساخت کا تجزیہ کر دیا یا کسی عظیم مصنف کے فن، ٹیکنیک اور پُرکاری پر روشنی ڈال دی۔ یہ سب کچھ کرنے کے علاوہ بہت کچھ اور بھی تھا۔ وہ اوّل تو اپنے آپ کو کسی شاہکار میں کھو دیتے تھے۔ پھر اپنی حقیقی زندگی اس کے سانچے میں ڈھال کر ایسا بنا دیتے تھے کہ مغایرت کا احساس باقی نہ رہتا تھا۔ منشاء یہ تھا کہ طلبہ اس عمل کو اپنی شخصیت کی ہر سطح میں دہرائیں۔ اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اس کام کے پہلے حصے میں کامیابی حاصل کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ البتہ اس کا دوسرا حصہ خاصہ مشکل ہے۔ کیونکہ صرف وہی معلم اس خواب کو پورا ہوتے دیکھ سکتا ہے جو ادب کو ایک وقتی پیشے یا مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ زندگی کی شاہراہ کے طور پر اختیار کرتا ہے۔

بہت جلد پروفیسر بخاری کی جماعتوں کی شکل کچھ سے کچھ ہو گئی۔ ان کا زیادہ کام ایک اُستاد کے بے کیف لیکچروں اور طلبہ کے نوٹ لینے کا نام نہ تھا۔ ان میں گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ ہر طالب علم کسی نظم یا ڈرامے کے ٹکڑے کی ٹیکنیک کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یہ سوقیانہ ہے۔ یہ ارفع ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے، یہ عیب ہے۔ پروفیسر بخاری خود بحث کا آغاز کرتے بلکہ اسے چلانے کے لیے خود بھی حصہ لیتے۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ زید کے حق میں دلیلیں دے رہے ہوتے لیکن بہت جلد معلوم ہو جاتا کہ وہ کلیتہً اس کے حق میں نہیں بلکہ جزوی طور پر اس سے متفق ہیں۔ ایسی بحثوں کا ایک پہلو نہایت قابل تعریف ہوتا۔ وہ یہ کہ کوئی شخص محض منطق کے زور پر انھیں قائل نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لیے لازمی طور پر یہ بحث مصنف کی تخلیق ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈنی پڑتی تھی۔ اس کی دلیل بظاہر کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو اس وقت تک قابل قبول نہ سمجھی جاتی تھی جب تک وہ یہ ثابت نہ کرے کہ اس نے اصلی کتاب کو عقلمندی سے سمجھ سوچ کر پڑھا ہے۔ اس طرح پروفیسر بخاری کی نظروں میں مقبول ہونے کے لیے ایک طالب علم کو اپنے میدانِ مطالعہ میں چاق چوبند چوکس رہنا پڑتا تھا۔

اپنے طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کا جذبہ پروفیسر بخاری میں عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس سے نہ وہ بوجھ محسوس کرتے تھے نہ ان کے اپنے مشاغل

جن کی واقع ہوتی تھی۔ بلکہ یہ شوق بڑھتا ہی جاتا تھا یہاں تک کہ ادب سے ملحق تھیں ان تمام شاخوں کے مطالعہ کے لیے بھی مہمیز کا کام دیتا تھا جن کے سمجھے بغیر مطالعہ میں جان نہیں پڑ سکتی۔ تھیٹر، مشاعرہ، مذاکرہ اور کالج میگزین سے اُن کا دلی لگاؤ بھی اس بات کا ظاہری ثبوت ہے کہ انھیں ادب اور زبان سے گہری شیفتگی تھی۔ ان کے دوست جانتے ہیں کہ زبان کی باریکیوں اور اسلوب بیان کے حسن سے انھیں انتہائی رغبت تھی۔ یہی لسانی حرارت ان کی شخصیت کے پھلنے پھولنے میں کام آئی۔ اور اہم ترین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ زبان کو اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی کہ وہ چند منجمد علامتوں کا ایک نظام ہے۔ مگر ان کی نظر میں یہ ایک زندہ تحریک تھی۔ وہ اسے ایک ایسا جال تصور کرتے تھے جس کے ذریعے ادیب شیدائی زندگی کے بے پایاں سمندر سے الفاظ اور محاوروں کی جھلملاتی مچھلیاں شکار کر سکیں۔

وہ زندہ اور خوبصورت الفاظ سے محبت کرتے تھے اور یہ قدرت کا ایک ایسا عطیہ تھا جس کی بدولت وہ ہر لمحہ اور ہر حال میں پیچیدگیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ اسی میں ان کی بذلہ سنجی، مزاح، طنز اور بات چیت کے جادو کا راز مضمر ہے۔ پروفیسر بخاری ان چند خیال انگیز خوش بیانیوں میں سے ایک تھے جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسی سحر آفرینی کے باعث ان کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا گیا اور اب بھی مداحین کا دائرہ بڑھتا رہے گا۔ جو ان کے نزدیک آتا ہر قیمت پر چند لمحے ان کے ساتھ گزارنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا۔ وہ ایک ایسے دانشور تھے جن کی طنز و ظرافت سے ان کے ملاقاتی اپنی علمی استعداد اور فہم و فراست کے مطابق حظ و فرحت حاصل کرتے تھے۔ کند ذہن آدمی ہنسی کی بات سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ان کا مزاج ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ قہقہے نہیں لگاتے تھے۔ ان کا تمسخر نہیں اڑاتے تھے۔ بلکہ ان کی کلفت و پریشانی ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ ان کی طنز ان کی ادراکی قوت کی پیداوار ہوتی تھی۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی کمزوری بھی اسی طرح بے نقاب کرتے تھے۔ جس طرح بڑے سے بڑے اکڑباز اور طرح دار کی۔ زندگی کا سارا تانا بانا ان کے لیے میدان کارزار تھا اور ان کی دیانت ان کی شمشیر، وہ کسی کو نہ بخشتے تھے اور کسی سے یہ توقع نہ رکھتے تھے کہ انھیں معاف کرے۔

پروفیسر بخاری نے جتنے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ اور طالبات کو پڑھانے میں صرف کیے، ان کا جائزہ لینے کے بعد آدمی کہہ سکتا ہے کہ اپنی قابلیتوں کو بروئے کار لانے اور شاگردوں میں ذہنی اوصاف اور رجحانات پیدا کرنے کے لیے کالج اور کلاس روم بے پناہ امکانات رکھنے کے باوجود ان کے لیے محدود جولاں گاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے اردگرد ارباب فضل و ہنر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں صرف منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ مجلس اردو اسی کی ایک شکل ہے۔

یہ سوسائٹی کالج کے ذہین نوجوانوں اور پروفیسر بخاری کے زیادہ تجربہ کار احباب کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ہر وہ شخص جو طبع زاد افسانہ، ڈرامہ، تنقیدی مضمون یا نظم لکھ سکتا تھا، اس مجلس میں بار پا سکتا تھا۔ اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا اور اسے اجازت ہوتی تھی کہ وہ اس شام کو پڑھی جانے والی ہر ادبی کاوش پر تنقید کرے خواہ وہ کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو۔ تنقید کا معیار اتنا بلند رکھا جاتا تھا کہ اس میں اردو، فارسی اور عربی کے قدیم اصول تنقید کے علاوہ مغرب کا جدید انداز تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا۔

پروفیسر بخاری نے مجلس اردو کو بہت جلد ایک ایسی پرکشش جماعت بنا دیا کہ ہر ہونہار نوجوان جو لاہور کی ادبی مجالس کی روح رواں تھا۔ یہ محسوس کرنے لگا کہ اسے مجلس اردو یا اس کی حریف بزم فروغ اردو میں سے کسی ایک میں شامل ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ بزم فروغ اردو ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر جیسے مشہور شاعر اور فاضل کی نگرانی میں اپنی سرگرمیاں اسلامیہ کالج لاہور میں جاری کیے ہوئے تھی بالکل اسی طرح جس طرح پروفیسر بخاری گورنمنٹ کالج لاہور میں مجلس اردو چلا رہے تھے۔

جن احباب کو معلوم ہے کہ بخاری اور تاثیر نے اپنے نوجوان ادیب دوستوں کے لیے ان مجالس کے ذریعے کیا کچھ کیا، وہ یہ کہنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے کہ ان جماعتوں نے اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور کیا کہ ہمارے عہد اور خطے کی ادبی تربیت کی تاریخ میں ان دونوں عظیم استادوں کا نام محفوظ

کر دیا۔ جن پر ہم ہمیشہ فخر کریں گے۔

اور میں نے تو آرٹ اور ادب کے کئی پرستاروں کو ٹھنڈی آہیں بھر کر اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتے دیکھا ہے کہ اس نے ہمیں ان دونوں سے کیوں محروم کر دیا۔ اگر آپ ان کی ایماندارانہ رائے پوچھیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ پروفیسر بخاری ازلی و ابدی ادب اور آرٹ کی دنیا کے باسی تھے۔ وہ جتنی جلد اس دنیا میں لوٹ آئیں اتنا ہی بہتر ہے۔

وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ، ادیب، شاعر اور ناول نویس لاہور جیسے تمدنی صدر مقام میں دن رات ادب کی قابل ستائش خدمت کرنے کے باوجود پروفیسر بخاری کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جن کی وفات سے پیدا شدہ خلا کبھی پُر نہیں ہو گا۔

ختم کرنے سے پہلے مجھے ایک معمولی لیکن اہم بات کا ذکر کرنے کی اجازت دیجیے۔ آپ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت میں پروفیسر بخاری کا کارنامہ صرف انگریزی تک محدود تھا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ اردو اور فارسی ادب کے لیے بھی ان کا عشق اتنا ہی بڑھا ہوا تھا جتنا انگریزی ادب کے لیے۔

اگر کسی صاحب کو انھیں نیویارک میں ملنے کا اتفاق ہوا ہو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ان کے کتب خانے میں نور اللغات کی چار دو جلدوں کو وہی شرف حاصل تھا جو ملیکن کی امریکن انگلش کی پانچ جلدوں کو۔ اور یہ کہ انھیں دیوان حافظ اتنا ہی عزیز تھا جتنی شکسپیئر کی تصانیف۔ وہ پشتو، پنجابی اور اردو میں بھی اتنے ہی خوش گفتار تھے جتنے انگریزی میں۔ ان تمام زبانوں پر ان کا علم یکساں وسیع تھا۔

(ترجمہ)

اقوامِ متحدہ میں پروفیسر بخاری سے ملاقات

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

مغربی اور مشرقی فن میں اصولی فرق میرے نزدیک ایک یہ بھی ہے کہ مغربی فن کی تصویر کو دور سے دیکھنے سے جو اس کی خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ نزدیک سے دیکھنے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی اس کی صحیح نمائش دور سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مشرقی فن کی تصویر کے صحیح خط و خال اور خوبیاں اس کو جس قدر بھی قریب سے دیکھا جائے گا زیادہ نظر آئیں گی ورنہ دور سے ایک مدہم مدہم یکساں رنگ کی دھندلی سی سطح معلوم ہوگی۔ چنانچہ ہم مرحوم احمد شاہ بخاری کو جب کبھی دور سے دیکھتے تو صحیح معنوں میں کسی یورپی یونیورسٹی کے ایک سجے سجائے مکمل پروفیسر نظر آتے۔ مگر جب کبھی ان کے پاس بیٹھ کر گفتگو سننے کا موقع ملتا تو ان کے برجستہ مسکراہٹ لئے ہوئے مادری زبان میں بے ساختہ جملے ظاہر کرتے کہ ان کا نہایت مکمل ظاہری مغربی لباس ان کی مشرقیت پر ایک ملمع ہے۔ اور ان کی مشرقیت کے جوہر آہستہ آہستہ گفتگو کے مدارج طے کرتے کرتے واضح ہوتے چلے جاتے بلکہ ان کی تمام انگریزی اور انگریزیت ان کی مشرقیت کے طابع نظر آنے لگتی۔

میں مرحوم کو ایک طرح دور سے اسی زمانے سے جانتا تھا۔ جب کہ وہ ہنوز طالب علمی کے ابتدائی مدارج لاہور میں طے کر رہے تھے کیونکہ وہ ہمارے محلے کے قریب ہی تکیہ سادھواں میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کے بڑے لڑکے محمد امین مرحوم کے ہم زلف تھے جن کے ہاں وہ اکثر رہائش رکھتے اور محمد امین کے بھائی ڈاکٹر محمد سعید (سعدی) سے بخاری کی خاصی بے تکلفی تھی۔ ان کی اور مولوی بشیر الدین مرحوم (بن مولوی احمد دین وکیل مرحوم) کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی گفتگو میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملتا جس کے بعد وہ ایم اے کا امتحان انگریزی ادب کا پاس کر کے اپنی خاص طبع روشن اور بعض اچھوتی تحریروں کی وجہ سے لاہور کی زندگی میں نمایاں طور پر رچ مچ گئے۔ یوں کہئے کہ ہر علمی محفل میں وہ جزو لاینفک تصور ہونے لگے۔

میں نے ان کو اس وقت سے زیادہ دیکھا ہے جب وہ لاہور میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں مسٹر وائٹ پرنسپل کے ماتحت ایک معلّم، پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے معتمد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت استاد زبان انگریزی متعین تھے مگر ان کی شہرت آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے زیادہ وسیع ہوئی جہاں وہ کئی سال تک ناظم اعلےٰ رہے۔

ابھی پاکستان بننے کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مدظلہ العالی نے جامعہ ملیہ دہلی کی جوبلی رچائی۔ جس میں دور دور سے علمی حضرات نے شرکت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرکز میں ایک عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ راقم کو بھی دکن کالج پونہ سے اسی ضمن میں نمائش کی ترتیب کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت پُر رونق علمی میلہ تھا جس میں ہر طرح کے پڑھے لکھے حضرات نے حصہ لیا۔ جب میں نے بالکل غیر متوقع طور پر یہاں ڈاکٹر تاثیر اور بخاری کو دیکھا اور ان سے قریب دس سال بعد ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے فوراً اپنے الگ کیمپ میں لے گئے جس میں وہ

دونوں فرد کش تھے۔ اس وقت وہ دونوں حکومت ہند کے شعبہ نشر و اشاعت میں تھے۔ دونوں علوم جدیدہ اور قدیمہ سے سرشار نہایت روشن ضمیر اور بڑے پایئے کے ناقد تھے۔ مگر مجھے یہاں غیر معمولی بات یہ نظر آئی کہ یہ دونوں علمی دوست شمشیر برہنہ ایک ہی نیام میں سمٹے ہوئے تھے۔ ان کو ایک ہی کیمپ میں نہایت محبت و خلوص سے مل کر اپنے فرائض انجام دیتے دیکھ کر یقین ہوگیا کہ واقعی علوم کی غائت کمال یہی ہے خواہ جس قدر بھی متضاد عنصر ہو ایک جا پُر امن طریق پر جمع ہو سکتا ہے۔

مجھے وہ سماں ہرگز نہیں بھولتا جب ایک روز بعد دوپہر ایک ہی پلیٹ فارم پر محمد علی جناح قائدِ اعظم، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، لیاقت علیخان، راج گوپال اچاریہ، ولبھ بھائی پٹیل، راجہ غضنفر علی وغیرہ کو دیکھا۔ تاثیر اور بخاری اپنے رنگ میں مقررین کے بعض جملوں پر خوب ظریفانہ تبصرہ کرتے تھے۔ ایک روز یہاں مرحوم سر شیخ عبدالقادر نے کنووکیشن ایڈریس بھی دیا تھا۔ جو پہلے چھپ چکا تھا اس کی ان پنجابی فاضل دوستوں نے نہایت عمدگی سے بے لوث تعریف کی اور ڈاکٹر ذاکر صاحب کو داد دی کہ انہوں نے اس طرح پروگرام مرتب کیا۔ غرضیکہ اس جوبلی کی عملی کارروائی کو جس قدر بھی پریس میں اور ریڈیو پر نشر کیا گیا وہ تاثیر اور بخاری کا حصہ تھا جس کا لوگوں کو کم علم ہے۔

جب پاکستان قائم ہوا تو بخاری لاہور تشریف لائے اس کے ابتدائی دور میں بعض بکھری ہوئی لائبریریوں کو یکجا کیا، کچھ پریشان کن چشم دید حالات جو مہاجرین کے ساتھ پیش آئے بغیر نام کے لکھے مگر عوام کو زیادہ تر یہی علم ہے کہ وہ آتے ہی گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے ضمن میں لندن گئے جس کے بعد ۱۹۵۰ء میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ بنائے گئے جہاں اپنی ذاتی قابلیت سے انہوں نے دنیا کے قابل ترین حضرات کو اس قدر مرعوب اور مطمئن کیا کہ ان کو آخر وہیں ۱۹۵۴ء سے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا اس جگہ مرتے دم تک (۵ر دسمبر ۱۹۵۸ء) نہایت معزز طریق پر فائز رہے اور اسی ادارہ اقوام متحدہ میں راقم نے ۲۴ر اپریل ۱۹۵۷ء کو ان سے آخری ملاقات کی تھی۔ جس کی مختصر سی کیفیت جو مجھے یاد ہے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

اقوام متحدہ کا ادارہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے عظیم ترین شہر نیویارک کے مشرقی جانب دریائے ایسٹ کے کنارے ۴۲۔ ۴۸ سٹریٹ پر اوّل ایونیو میں واقع ہے۔ اس کے شمالی طرف سے داخل ہوتے ہی بہت بڑے ہال میں زائرین کو ایک با وجاہت خاتون سے سابقہ پڑتا ہے جس سے باقاعدہ تمام ہدایات حاصل ہو جاتی ہیں اور کوئی دیر نہیں لگتی۔ اسمبلی کے ہال پر گنبد ہے جس میں کل نشستیں ۲۱۵۰ ہیں جو مندوبین، ناظرین، اخباری نمائندوں اور پبلک پر مشتمل ہیں۔ اس کے جنوب کی طرف اصل سیکرٹریٹ ۳۹ منزلہ عمارت تمام آبی رنگ کی اینٹوں کی کھڑی ہے جس میں بخاری صاحب غالباً دسویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۰۲۷ میں بیٹھتے تھے اگر صحیح اندازہ لگایا جائے تو اس عظیم الشان ادارہ کی عمارات کا سلسلہ قریب قریب ۵۰۰ فٹ لمبائی سے کم نہیں ہے۔ زائرین اس پر شکوہ عمارت کے اوّل ہال ملاقات میں ایک بلند نمایاں چبوترے پر یونانی دیوتا غالباً جیوپٹر کا قد آدم مجسمہ سیاہ دھات کا بنا ہوا مادر زاد برہنہ کھڑا ہوا مشاہدہ کرتے ہیں جو بادی النظر میں کافی بے حیائی کا منظر پیش کرتا ہے۔

میں یہاں دو تین بار گیا۔ اسمبلی کی میٹنگ روم نمبر ۲ میں کچھ وقت بیٹھا اور کارروائی دیکھی۔ رسالے بھی خرید کئے اور سیکرٹریٹ کے ملاقات کے ہال میں آکر بخاری صاحب سے ملاقات کی کوشش کی مگر انہوں نے فون پر کارکن خاتون کے ذریعے ۲۴ر اپریل کی تاریخ ایک بجے کا وقت طے کیا۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں صبح صبح گھر سے نکلا اور گھومتے گھومتے ادارہ اقوام متحدہ پہنچا۔ بخاری صاحب سے ملنے کی خواہش کی تو خاتون نے ان سے فون پر اجازت حاصل کر کے مجھے ایک مطبوعہ چٹ پر وہاں کے دستور کے مطابق تاریخ، میرا نام، جس سے ملنا ہے اس کا نام (پروفیسر بخاری) اور کمرہ نمبر وغیرہ لکھ کر میرے حوالے کی اور اشارہ کیا کہ وہاں لفٹ کے آگے کھڑے ہو جائیے ابھی کمرہ کھلے گا اور آپ اوپر چلے جانا۔ چنانچہ جب میں اوپر پہونچا تو مجھے فوراً ان

تک ایک اور خاتون جوان کی مددگار تھی سے گئی۔ بخاری مجھے دیکھ کر کہنے لگے میں گیارہ بجے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کیونکہ یہی وقت میں نے دیا تھا محض اخلاقاً
انتظار کرتا رہا ورنہ چلا گیا ہوتا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے یہی وقت دیا گیا تھا مگر انہوں نے مجھے اپنی میز کی ڈائری دکھائی جس پر گیارہ بجے کا وقت لکھا تھا خیر
یہ مغالطہ تھا جو غالباً سمجھنے میں یا سننے میں ہوا۔ بہرحال میں نے بہت معذرت کے بعد خیریت پوچھی۔
آپ نے اول امریکہ میں آنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ میں نے کہا میں لیڈر پروگرام کے تحت یہاں آیا ہوں اور آپ سے ملے بغیر چلے جانا
کوئی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا جس پر آپ نے فرمایا کہ میں بھی اسی لئے گیارہ بجے سے اس وقت تک (ایک بجے) بیٹھا رہا کہ ملاقات ضرور کرنی ہے حالانکہ
مجھے اور اہم کام بھی اس وقت تھا۔ آپ نے لاہور کے احباب مولانا سالکؔ، مسٹر فیض اور بعض دیگر احباب کی خیریت دریافت فرمائی۔ میں نے کہا، کہ
لاہور سے نیا علمی رسالہ لیل و نہار فیض صاحب نے جاری کیا ہے جو ہفتہ میں ایک بار طبع ہوتا ہے آپ کے پاس ضرور آیا ہوگا۔ فرمانے لگے اگر آیا بھی
ہوگا تو کہیں نہر سویز پر آ کر اٹکا ہوگا (جو دراصل ۱۹۵۶ء کے واقعات سویز کی طرف ایک اشارہ تھا)۔ میں مسکرایا پھر میں نے کہا آپ لوگوں نے ہی تو لڑائی
بند کرائی تھی ورنہ دنیا میں کیا سے کیا ہو جاتا جس پر انہوں نے چند جملوں میں وہ تمام واقعہ سنایا کہ کس طرح مسٹر ڈاگ ہیمر شولڈ نے اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے
فوراً طے کیا کہ یہ ہنگامہ یکلخت بند ہونا چاہیئے اور کس طرح انہوں نے دنیا کے اخبار نویسوں کو نیچے پریس برانچ میں جمع کیا پھر یہاں سے لفٹ میں نیچے گئے
تمام کمرہ بھر چکا تھا اور ابھی تک کسی شخص کو علم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے جب انہوں نے ترک جنگ کا اعلان کیا تو دنیا حیران رہ گئی۔
اس کے بعد فرمایا کہ آج رات پاکستان ہاؤس میں ایک لیکچر اقبال پر ہے۔ میں نے کہا میں ضرور سننے آؤں گا۔ ویسے لیکچر تو آپ نے خوب
عمدگی سے لکھ لیا ہوگا فرمانے لگے کچھ کیا ہی ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ حال ہی میں میں نے یونیسکو کے مجلّہ کو زیر COURIER میں ایک مضمون بہ عنوان
"دنیا کے بہت زیادہ ترجمہ شدہ مصنفین ۱۹۴۸ء — ۱۹۵۵ء" فروری ۱۹۵۷ء کے شمارے میں دیکھا ہے جس میں اقبال کو بھی شامل ہونا چاہیئے تھا
کیونکہ اگر آج ہم صحیح جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کا کلام چین و جاپان کے سوا قریب قریب سب ملکوں نے اپنے ہاں ترجمہ کیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں بین الاقوامی
شہر نیویارک میں سامعین و حاضرین جلسہ کو بتانا چاہیئے اگر آپ کے مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ نہیں ہے تو ضرور آنا چاہیئے چنانچہ انہوں نے اس مشورہ کو
مفید خیال کیا اور کچھ نوٹ بھی کیا فرمانے لگے کہ لاہور کے ماجے ساجے یعنی لاہور کی زندگی کا کیا حال ہے؟ جس پر میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو لاہور کی اس قسم کی
گہما گہمی کا بڑا خیال رہتا ہے تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ یہی تو ایک شہر ہے جو ہماری تمام جدوجہد کا آئینہ ہے۔ میں نے کہا تو بہ قول آپ کے لاہور سب شہروں
سے افضل ہے۔ جس شہر میں علامہ اقبال دنیا کا بہترین شاعر و فلسفی، گاماں پہلوان رستمِ زماں، آغا حشر کاشمیری بہترین اردو ڈرامہ نویس، عبدالرحمن چغتائی
بہترین مشرقی مصوّر، حاجی دین محمد کاتب، مولانا ظفر علی خاں جیسا اخبار نویس اور پطرس جیسا مزاح نگار ہو اس کی خوش نصیبی کی تو قسم کھانی چاہیئے۔
دراصل میں نے ان کے کبھی کے کہے ہوئے ان جملوں کا اعادہ کیا ہے کہ یہ ان کا تصوّر ایمان کی حد تک تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ پنجاب کو زندگی کا آئینہ تصوّر
کرتے تھے۔ بات کاٹ کر فرمانے لگے کہ چغتائی کی تصویریں بھی یہاں دیکھی ہیں؟ میں نے کہا ہاں دیکھی ہیں۔
دراصل نچلے ہال میں ایک نمائش کا حصّہ ہے جس میں تین تصاویر عبدالرحمن چغتائی کی لگی ہوئی ہیں جن کو غالباً اسی سال پاکستان گورنمنٹ نے
اقوام متحدہ کو ہدیہ کیا تھا اور اس میں بھی بخاری صاحب کا انتخاب اور جدوجہد شامل ہے ورنہ یہ کام نہ ہوتا واقعی یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ کئی ہزار کی تعداد میں زائرین
روزانہ دیکھتے ہیں۔
میں نے تجویز کیا کہ بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ کسی قدیم مصوّر کی تصاویر ہیں اس کو رفع کرنے کے لئے ان پر مصوّر کے نام کے آگے محض
تاریخ پیدائش لکھ کر چھوڑ دینا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو کہ آرٹسٹ زندہ ہے اور آج کل یہ طرزِ مصوری اس ملک کی خصوصیت ہے جسے آپ نے قبول فرمایا۔

یہ علم نہیں کہ اس پر عمل ہوا یا نہیں۔ ابھی تک کسی دوسرے ملک کے آرٹسٹ کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔
پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ اس اداہ اقوام متحدہ کو کیسا پایا جس پر میں نے مسکرا کر بطور ظرافت جواب میں پنجابی کا محاورہ "گھر سے بھاگ بُوٹتے"
پیش کیا یعنے یہاں جو آدمی اول مرتبہ شمالی دروازے سے ملاقات کے ہال میں داخل ہوتا ہے تو اس کی نظر فوراً مشرقی جانب مادر زاد سیاہ فام ننگے یونانی دیوتا
جیوپٹر کے قدآدم بلند نشست مجسمہ پر پڑتی ہے تو وہ متحیر ہوتا ہے کہ ایسے شائستہ عالمی ادارہ میں اس طرح کی عریانی اس کے لئے ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔
خواہ اس مجسمہ میں بہت وسیع الخیال فلسفہ اور حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ نووارد اس تمام ادارے کی سیر کرتا ہے اور واپسی پر پھر ایک بار اس جیوپٹر
کے بت پر نظر کرتا ہے تو اس کا ذہن اس طرف ضرور منتقل ہوتا ہے کہ یہ مقام بطور تفریح گاہ تمام دنیا کی زندہ اقوام کے نمائندوں کا مختلف رنگوں اور لباسوں
میں ایک عجائب گھر یا چڑیا گھر ضرور ہے مگر اس ادارے سے اقوام کی داد رسی ہرگز متوقع نہیں کیونکہ یہ ننگا بت جو یہاں کا علامتی نشان SYMBOL
قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں کچھ نہیں رکھا: جامہ ندارم دامن از کجا آرم "بخاری صاحب نے اس مزاح کو سن کر حسب عادت ایک
قہقہہ لگایا اور اٹھ کر فرمایا کہ اب رات کو پاکستان ہاؤس میں اقبال کے لیکچر میں ملاقات ہوگی۔
چنانچہ ہم اپنے ہوٹل وڈسٹاک نیویارک ٹائمز چوک سے پروفیسر ابینی احمد جیوگرافی ڈھاکہ یونیورسٹی اور ایک اور صاحب جو کراچی سے تھے
مل کر نکلے اور قریب نو بجے وہاں پہنچ گئے لیکچر ہمارے جانے کے بعد شروع ہوا۔ تمام پاکستان ہاؤس بھرا ہوا تھا۔ یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ اس جلسہ کی صدارت
ڈاکٹر جلال عبدہ ایران کے مستقل نمائندہ اقوام متحدہ نے کی تھی ابتداء میں انہوں نے بخاری مرحوم کی علمی قابلیت کی نہایت تعریف کرتے ہوئے تعارف
کرایا اور اعزاز صدارت کا شکریہ ادا کیا۔ بخاری صاحب نے اپنا مقالہ قریب ۴۵ منٹ میں ختم کیا اور لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ موضوع یہ تھا کہ اقبال
نے شاعری کو اپنے افکار کے اظہار کے لئے ایک موزوں ذریعہ قرار دے کر کیا کیا علمی خدمات انجام دیں۔ بعد میں اس پر کوئی سوال جواب نہیں ہوئے
صدر ڈاکٹر جلال عبدہ نے فارسی شاعری میں اقبال کے مقام پر کچھ مزید روشنی ڈالی۔ جلسہ کے اختتام پر میں نے پروفیسر بخاری کی معرفت ڈاکٹر جلال عبدہ سے
تعارف حاصل کیا۔
دو روز بعد میں نے پھر ان کے دفتر ایمپائر بلڈنگ کی باسٹھویں منزل پر جا کر ان سے ایک تعارف نامہ بنام ڈاکٹر سید مصطفوی ناظم محکمہ
آثار قدیمہ ایران حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ تعارف نامہ انہوں نے بطیب خاطر فارسی زبان میں لکھ کر عنایت کیا۔ نیویارک میں ایمپائر بلڈنگ یکصد منزل
سے زیادہ کی ہے اور بلند ترین عمارت ہے حسن اتفاق سے جب میں ان کے کمرہ میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا تو ہوائی جہاز گزرا میں نے ظرافتہً
کہا کہ دیکھو ہوائی جہاز آپ سے نیچے اڑ رہا ہے یہ محض اس عمارت کی بلندی کی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ تھا۔
میں نے امریکہ سے روانہ ہوتے وقت جون کے نصف میں بخاری سے پھر ملنے کا ارادہ کیا مگر وہ ۴ تاریخ کو جینوا جا چکے تھے اس کا علم مجھے
ان کے مددگار آغا اشرف سے ہوا۔
میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ پروفیسر بخاری مرحوم کے علمی کارناموں پر کوئی تبصرہ کروں مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کا ایک خاص
انداز تھا یعنے روزانہ کے حالات اور تجربات زندگی ان کو موضوع بخشتے تھے اور وہ اپنی تحریر کو اس قدر نفسیاتی طور پر بلند لے جاتے تھے کہ ہر مطالعہ کرنے والا
اس پر خود گھومتا نظر آتا تھا اور اس سے اس قدر لطف اندوز ہوتا تھا کہ ختم کرنے کے بعد محسوس کرتا تھا کہ وہ واقعی اسی ماحول میں چلا گیا ہے چنانچہ ۱۹۵۷ء
میں جب میں طہران پہنچا اور ایک شب مسٹر رحمان پاکستان کے ادارہ سفارت کے ہاں دعوت پر ایک اور سیکرٹری مسٹر صدیقی سے مذاکرہ ہوا تو بخاری کا ذکر
آگیا پھر کیا تھا ان کے بعض خاص خاص موضوعات پر بھی گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کو بخاری کا مضمون "بائیسکل" ایک طرح زبانی یاد ہے انہوں نے اس
مضمون کے بعض حصے اس طرح سنائے کہ تمام محفل پُرلطف ہوگئی جو آج تک نہیں بھولتی۔

جنابِ پطرس

محمد طفیل

پطرس نے جب بھی لکھا لفظوں کے تاج محل بنائے۔

پطرس کو جب بھی کسی دوست نے پکارا، لبیک کی آواز آئی۔

پطرس جس بھی راہ سے گذرے۔ اپنے نقش چھوڑ گئے۔ اپنے جھنڈے گاڑ گئے۔

بخاری صاحب سے میری یاد اللہ، کوئی زیادہ پرانی نہیں۔ نئی بھی نہیں، اس لئے کہ مرحوم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا نہیں، سنا تو ہے۔ اگر ملنے ملانے کی حد تک، میں ان کی خدمت میں نو وارد ہوں تو سننے سنانے کی حد تک بیگانہ نہیں۔

جب یہ طالب علم تھے تو انہوں نے "پطرس کے مضامین" لکھی۔ (غالباً ۱۹۲۸ء) جب میں طالب علم تھا، تو میں نے یہ کتاب پڑھی۔ بظاہر ان کا لکھنا اور میرا پڑھنا زمانہ طالب علمی کی داستان ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ جب میں بچہ تھا۔ اُس وقت بھی میں نے اسے پڑھا۔ اب جبکہ بچوں کا باپ ہوں، تو بھی یہ چھوٹی سی کتاب میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہر وقت اُکساتی رہتی ہے۔ "مجھے پڑھو، مجھ سے سیکھو" پہلے جو فقرے مجھے ہنسنے ہنسانے پر آمادہ کرتے تھے۔ آج غور و فکر پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بوڑھا ہوں گا تو نہ جانے، یہ کتاب کیا کیا سلوک نہ کرے۔

پطرس کے بارے میں لکھنا، آسان نہیں اور اُس جیسا ایک فقرہ لکھنا، قیامت ہی قیامت، میرا خیال ہے جس نے پطرس جیسا ایک بھی فقرہ لکھ لیا وہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، وہ کم بخت ادیب ضرور ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں، جو کچھ بھی لکھا ہو۔ اُس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے لکھا ہو۔ اب کوئی اس کے بارے میں، بغیر غور کئے لکھ دے تو یہ زیادتی ہے یا نہیں۔ سچ جانئے، غور کرتا ہوں تو میرے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔ مجبوراً طے کرنا پڑا۔ لکھوں پہلے، غور بعد میں کروں۔

مرحوم کے جتنے بھی قریبی دوست تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب غور ہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی لیتے۔ اب جس سے عرض کرتا ہوں —— بھائی! اپنے یار پطرس پر کچھ لکھئے تو ان میں سے ہر ایک یہی جواب دیتا ہے۔ غور کر رہا ہوں —— کچھ عرصے کے بعد دوبارہ عرض کیا غور کر لیا ہو تو کچھ لکھ ڈالئے، پھر جواب ملا۔ جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

یہ جواب مرحوم کے ایک دوست کا نہیں۔ تقریباً سبھی کا ہے۔ نہ جانے یہ تصور، پطرس کے قابو میں نہ آنے والی شخصیت کا ہے یا مرحوم کے دوستوں کا، اس کا فیصلہ مجھ سے نہ کرائیے۔ اس لئے کہ مجھے آئندہ بھی پرچہ چھاپنا ہے۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً مجھی کو مرحوم کا قریبی دوست بننا پڑا ہے۔ حالانکہ اس بندۂ پُرتقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا

تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور تھی۔ وہ بھی مختصر، دو تین خط میرے نام آئے تھے۔ اور بس۔

میں نے پچھلے دنوں، رشید احمد صدیقی کا مضمون، مولانا ابوالکلام پر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ مولانا آزاد سے میری صرف چند منٹوں کی ایک ملاقات ہے۔ اور دو خط مولانا کے میرے نام آئے۔ —— یہ پڑھ کر میری ڈھارس بندھی۔ سوچا پطرس سے میرا رشتہ اس سے زیادہ کا ہے اس لئے میں کیوں چپ رہوں رضرور گھاس کاٹنی چاہیئے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم ایک ایک لفظ کو کئی کئی طرح سے سوچتے اور پرکھتے تھے۔ تب کہیں جا کر کوئی خوش قسمت لفظ، ان کے فقرے کی زینت بنتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا۔ امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری کی محفل جمی ہے۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ لطیفے تصنیف کئے جا رہے ہیں۔ مگر ان کے دماغ میں وہی لفظ گھوم رہا ہے۔ جس کے لئے یہ آج پریشان رہے تھے۔ رہا نہ گیا۔ سوال کر دیا۔ چنڈال چوکڑی یہ بتائے۔ فقرہ یوں ہے اور ماحول یہ، لہٰذا اس جگہ اس مفہوم میں کون سا لفظ سجے گا:

کسی نے کہا یہ، کسی نے کہا وہ، انہوں نے کہا۔ سب غلط، بھئی پورے فقرے کی ساخت پر غور کرو مضمون کے پس منظر پر نظر رکھو۔ کیریکٹر کے مزاج کو جانچو، پھر بتاؤ، میرے لفظ سے زیادہ موزوں، کوئی لفظ اور ہے؟

مرحوم انگریزی اتنی جانتے تھے جتنی سارے پاکستانی مل کر جانتے ہیں۔ اردو جتنی جانتے تھے۔ اتنی اردو کے سارے پروفیسر مل کر بھی نہیں جانتے۔ اگر کسی پروفیسر کو میرا یہ تبصرہ برا لگے تو وہ مرحوم جیسا ایک جملہ لکھ کے تو دیکھے۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس اہلِ پنجاب اور یو۔ پی والوں کے درمیان چلی اور خوب چلی۔ اُدھر سے بھی بڑے بڑے بقراط سامنے آئے۔ اِدھر سے بھی۔ اُدھر والوں کو میں نہیں چھیڑتا۔ اِدھر والوں کی بات کرتا ہوں۔

اُس وقت یو۔ پی کے کئی رسائل نے پنجابی اہلِ قلم کو معطون گردانا۔ مگر ان میں قابلِ ذکر علی گڑھ میگزین اور جامعہ تھے۔ اُدھر والوں کا سارا زور، زبان کی اغلاط پر تھا۔ اِدھر والوں میں صلاح مشورے کی حد تک، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر تاثیر، امتیاز علی تاج تھے۔ مگر جوابًا جو کچھ لکھا جاتا تھا۔ اسے لکھتے پطرس ہی تھے[۱] بڑے بڑے، تیز فقرے اُدھر سے بھی آئے۔ اِدھر سے بھی لوٹائے گئے۔ نیازمندانِ لاہور کے قلمی نام سے پطرس نے لکھا:—

"اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔ پی۔ حیدرآباد دکن اور لاہور۔ لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں کہ یو۔ پی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشو و نما محض خونِ عشاق کی رہینِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خودرو ہے۔ وہاں خودبین بھی ہے۔ جہاں اتالیقِ شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھچ کے رہتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضاء میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔"

---

[۱] ایک دو مضمون تاثیر نے بھی لکھے تھے۔ جو کہ از نیازمندانِ لاہور یا ادب آموز کے نام سے چھپے تھے۔

بلکہ اس سے بھی تیز نقرے :—

"یو۔ پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یو۔ پی میں اردو ادب ایک سسکتا ہوا سانپ ہے، جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس' اب یو۔ پی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑا پن اس کا مربیانہ انداز' اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔"

پطرس کے یہ فقرے تیکھے ضرور ہیں۔ مگر دلآزاری کا سلسلہ دونوں طرف تھا۔ بری بات تھی تو دونوں طرف' اچھی تھی تو دونوں طرف' مگر میں جو' بات یہاں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مرحوم کو زندگی کے ہر مرحلہ پر سرداری کا چسکا رہا۔ جب اہلِ پنجاب ہی کے لئے لئے جا رہے تھے تو یہ کیسے چپ رہتے وہ جس بزم میں بیٹھتے تھے۔ چاہتے تھے۔ میری باتیں' میرے جملے' حاصلِ بزم رہیں۔ بزم ادب میں بھی انہوں نے اونچی ہی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ بزمِ سیاست میں بھی آئے تو ساری دنیا نے ان کی طرف مڑ مڑ کے دیکھا۔ میرا ایمان ہے اگر وہ یوں سرفراز نہ رہتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے۔ اُن کے مذہب میں' کسی بھی مرحلہ پر پسپائی' موت کے مترادف تھی۔

مرحوم پر فقرے وار بھی ہوتے تھے۔ خود بھی جنتے تھے۔ مطالعہ بھی ان کا خوب تھا۔ حافظہ بھی خوب' جو اُن کے مطالعہ کی زد پر آگیا وہ چیت' جو ان کی ذہنی اپج کی زد پر آگیا وہ چیت' غالباً قدرت نے انہیں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی مسخر کریں' دماغوں کو بھی۔

حصولِ تعلیم کے لئے جب یہ لندن گئے تو انہوں نے تاج صاحب کو کیا عمدہ لکھا تھا :—

"حضرت یہ کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے۔ یہ وہ دارالعلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیو کرام ویل (CROM WELL) سٹرن (STERENE) کولرج سیموئیل بٹلر' بیکن' ٹینی سن' تھیکرے' میکالے' نیوٹن' بل ورلٹن' پیلے' لارڈ چسٹرفیلڈ مارلو' ولیم پٹ' گرے' اور ملٹن کسبِ فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں اس وقت انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ و بو پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا' ایک غلام قوم کا فرد' نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا' فسانۂ آزاد کا دلدادہ' طبلے اور سارنگی کا شوقین' زنیاں اور گردھشاں کا خریدار' ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا' مغنیہ عیش و عشرت کا خواہش مند اتحادِ اسلامی کے خواب دیکھنے والا' میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔"

بخاری صاحب جب کیمبرج پہونچے تو ان کے سامنے یونیورسٹی کا سارا ماضی تھا۔ چھوٹی بڑی کئی ادبی چٹانیں' انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے تاریخ کے صفحات پر موجود تھیں۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ مگر مرعوب نہ تھے۔ وہ سارے نام گنواتے ضرور ہیں مگر اس احساس کے ساتھ کہ کبھی میرا بھی نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جائے گا۔ مرعوب ہونا تو یہ شروع ہی سے جانتے نہ تھے۔ بلکہ مرعوب کرنا ان کا فن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غریب ماں باپ کے بچے نے

اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں بڑا زور مارا۔ بڑا ہی زور مارا۔ ریاضت وہ بھی اس حد تک، کس کے بس کی بات ہے —— آج کل (اور اُس وقت بھی) لوگ لندن اس لئے جاتے ہیں تاکہ ذرا عیش کر آئیں۔ پڑھنے کہاں جاتے ہیں۔ مگر پطرس نے وہاں جا کر نہ صرف پڑھا، بلکہ استادوں کو "پڑھایا" بھی۔ قدرت اگر پطرس کو لکھنے لکھانے کا موقع دیتی تو پھر ساری دنیا دیکھ لیتی کہ پطرس کا مقام، دنیا کے لکھنے والوں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

بخاری صاحب جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تھے تو وہ کامل سکون اور سکوت چاہتے تھے۔ بالکل الگ تھلگ اور تنہا، جب کچھ لکھ لیتے تو پھر نچلے نہ بیٹھتے، فوراً اپنی موٹر نکالتے اور بھاگتے اپنے کسی ذہنی دوست کے پاس، تاکہ اسے جا کر اپنا کارنامہ سنائیں۔ جب تک وہ اپنا لکھا ہوا مضمون، اپنے سارے دوستوں کو سنا نہیں دیتے تھے۔ انہیں چین نہیں آتا تھا۔ بے کل رہتے تھے۔

یہی حال، ان کا دوستوں کی تخلیقات کے بارے میں تھا۔ وہ ہر دوست سے پوچھا کرتے تھے۔ سناؤ بھئی کوئی چیز لکھی؟ کچھ لکھا ہو تو سناؤ۔ جب وہ بے چارہ سناتا تو یہ اس میں عیب ہی عیب نکالتے۔

امتیاز علی تاج نے مجھے بتایا: میں نے جب بھی پطرس کو کوئی چیز سنائی۔ اُس نے ہزار جگہ انگلی رکھ دی۔ چنانچہ میں مرحوم کی اس "حرکت" پر پریشان رہنے لگا اور یہ طے کر لیا کہ اب انہیں کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔ چنانچہ ایک دن، میں اپنے کسی دوست کو اپنا کوئی مضمون سنا رہا تھا تو یہ دھم سے آنکلے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مضمون تہ کر کے رکھ دیا۔ پطرس نے تاڑ لیا۔ کہنے لگے۔ "اب مضمون کیوں نہیں سناتے؟" تاج صاحب نے کہا: "آپ کو کوئی خاک سنائے۔ آپ تو ہر چیز میں سو سو کیڑے ڈالتے ہیں۔ اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ آپ کو کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔"

تاج صاحب کہتے ہیں۔ پطرس میرے اس جواب پر بڑے آزردہ ہوئے اور بڑے پیار سے کہا: "تاج تو نے مجھے بڑا غلط سمجھا ہے۔ میں جب بھی تمہاری کوئی چیز سنتا ہوں تو میرے پیشِ نظر دنیا کے تمام بڑے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے معیار پر پرکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارا کام اور نام ان کے ساتھ لیا جائے اور تم ہو کہ مجھ سے ناراض ہو۔"

یہ تھی پطرس کی نقادانہ شان اور دوستوں کے فن کے بارے میں خلوص، اب کوئی مانے یا نہ مانے۔ آج پنجاب کے جتنے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ تقریباً ان سب کے فن کے نکھار میں پطرس کا بڑا ہاتھ ہے۔ یقین نہ ہو تو میری بات کی تصدیق سالکؔ، تاجؔ، عابدؔ، صوفیؔ، راشدؔ اور فیضؔ سے کر لی جائے۔ ارے بھئی پطرس تو وہ بلا تھی جو علامہ اقبالؔ تک سے بھڑ جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اقبالؔ اور پطرس کی برگساں کے فلسفے پر بات چل نکلی۔ باتیں ہوئیں۔ دلیلیں دیں اور لیں۔ کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ بالآخر اقبالؔ چپ ہو گئے۔ جب پطرس چلے گئے۔ تو اقبالؔ نے ایک نظم پطرس کے بارے میں کہی جس کا عنوان "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" تھا۔ نظم یہ ہے:—

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟
کس طرح خودی ہو لازمانی؟
آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

تو سیدِ ہاشمی کی اولاد — مری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے بے خبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ
"دل در سخنِ محمدی بند — اے پور علیؓ ز بوعلیؓ چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری — قائدِ قرشی از بہ بخاری"

غور کیجئے اقبال پطرس کے بارے میں نظم کہتے ہیں۔ اقبال اُس وقت اپنے عروج کی آخری بلندیوں پر تھے اور پطرس بلندیوں کی طرف ٹُمک رہے تھے مگر حوصلہ دیکھئے، پہاڑ سے ٹکر لے لی۔

اب ذرا مضمون میں توازن پیدا کروں۔ ورنہ آپ کہیں گے کہ میں برابر نیاز مندی برتتا چلا جا رہا ہوں۔ مرحوم تو واقعی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی تعریف و توصیف نہ بھی کروں تو بھی ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میرا "پڑا" ہو جائے گا۔ اسی الزام سے بچنے کے لئے مرحوم کے چٹکی لے رہا ہوں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو پطرس بے چارے اوتاروں کے زمرے سے نکل جائیں گے۔ دوسرے پطرس کے بدخواہوں میں سے کوئی مجھے جان سے نہیں مارے گا — وہ تو مرحوم ہیں۔ میں مرحوم بننا نہیں چاہتا۔ موت برحق ضرور ہے مگر وہ پطرس کی وجہ سے کیوں آئے۔

پطرس کے ہاں فقروں، ترکیبوں اور خیالات کی تکرار بہت ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن خوب صورت الفاظ سے یاد کریں گے۔ انہی الفاظ اور انہی طرحدار ترکیبوں سے اپنے دوسرے دوست کو زیر کریں گے۔ مرحوم کو کیا پتہ تھا کہ میرے بعد یہ کم بخت میری اس کمزوری کو اچھالے گا۔ یہ نقص مرحوم کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہے۔ اُن میں ایک ہی طرح کے الفاظ کھلتے ہیں۔ ترکیبیں کھلتی ہیں مگر بعض جگہ تو پیرے کے پیرے لڑ گئے ہیں۔ مثالیں کیا دوں، خود پڑھ لیجئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

اسی ضمن میں، میں نے ایک لطیفہ سنا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ راوی اس کا معتبر ضرور ہے۔

دلّی میں جب عصمت چغتائی پطرس سے ملیں۔ تو یہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ عہدے کا بھی رعب تھا اور پھر پیچھے بھی پطرس۔ مقابل میں بھی عصمت تھیں۔ ایک ادیبوں کا امام، ایک "ادیبنیوں" کی امام۔

مرحوم نے تابڑ توڑ کئی خوب صورت فقرے کہہ ڈالے۔ عصمت چُپ، خاموشی سے سنتی رہیں۔ جب پطرس ذرا رکتے تو عصمت نے کہا "آپ کے یہ سارے فقرے میں پہلے بھی سُن چکی ہوں۔ کوئی نیا فقرہ کہئے۔"

معلوم نہیں یہ دو بڑے ذہنوں کی زور آزمائی تھی، چھیڑ چھاڑ تھی یا افسانہ، عصمت بہ فضلِ تعالےٰ زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے اس واقعہ کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں لکھ دیا تو میں وہ آپ کو بھی بتا دوں گا ویسے آپ اسی شمارے میں عصمت کا بھی مضمون پڑھ لیں یہ واقعہ ممکن تو ہے پطرس بھی بلا عصمت بھی بلا۔[1]

---

[1] : دونوں کی پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ ملنے میں پہل پطرس کی طرف سے ہوئی، مگر یہ واقعہ دلّی کا ہے۔

ویسے یہ واقعہ ہے کہ پطرس عصمت سے بہت متاثر تھے۔ مرحوم نے عصمت پر ایک بڑے زور کا مضمون لکھا تھا۔ پاکستان ٹائمز میں عصمت کے مضمون "ہیروئن" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ دوستوں میں بیٹھ کر عصمت کے فن کی تعریف کی۔

پطرس کے مزاج میں اپج ہی اپج تھی۔ زندگی کے عام چلن میں کبھی یہ یکسانیت ہی یکسانیت سے اکتا بھی جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کالج کے زمانہ میں، انہوں نے دیاسلائی کی ڈبیاں چرانے کی ایک سوسائٹی بنائی۔ دوستوں سے سگریٹ سلگانے کے لئے دیاسلائی مانگتے، سگریٹ سلگاتے، ماچس جیب میں ڈال لیتے۔ شام کو باقاعدہ حساب ہوتا۔ بخاری کی جیب میں باقی ممبروں سے زیادہ ڈبیاں برآمد ہوتیں۔ حتیٰ کہ یہ اپنے پروفیسروں تک کی ڈبیاں صاف کر دیا کرتے تھے۔ سالک صاحب راوی ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنے ایک پروفیسر سے ماچس مانگی۔ سگریٹ سلگانے کے بعد، جونہی انہوں نے ڈبیا جیب میں ڈالی۔ پروفیسر نے چلّا کر کہا۔ بخاری خدا کے لئے میری ماچس نہ چراؤ۔ بخاری نے ماچس واپس کر دی۔ اور اس دن سے یہ سوسائٹی بھی توڑ دی۔ آرٹ پر آنچ جو آ گئی تھی۔

کالج کے زمانے کی بعض شرارتوں کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون "ہوسٹل میں پڑھنا" میں کیا ہے۔ یہاں ان کا اعادہ اُن طبیعتوں پر بار ہو گا۔ جن "مظلوموں" نے وہ کتاب پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔

عابدہ صاحب نے بتایا۔ ایک رات میں، حسرت، تاثیر، صوفی، اور پطرس موٹر پر گھوم رہے تھے۔ رات اپنے شباب پر آ رہی تھی۔ کہ ہم میں سے کسی نے کہا، پیاس لگی ہے۔ لیمونیڈ پینا چاہئے۔ کچھ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ جن میں ایک سگریٹ والا بھی تھا۔ اس کے پاس لیمونیڈ تھی۔ بخاری صاحب نے ان "پیسے" والوں سے پوچھا "پیسے ہیں آپ حضرات کے پاس"؟ جیبیں ٹٹولی گئیں تو سب کی کل پونجی سوا چھ آنے نکلی۔

سب موٹر ہی میں بیٹھے رہے۔ پانچ لیمونیڈ کا آرڈر دیا گیا۔ جب سب پی کر ڈکارے چکے تو بخاری صاحب دکان دار سے کہنے لگے۔ بڑے میاں! یہ لوگ شریفانہ لباس میں ضرور ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب آوارہ اور "اُچکّے"، ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ ان لفنگوں کی دوستی میں، مجھ جیسے شریف آدمی کا بھی حال پتلا ہو گیا ہے۔ بہرحال ہم اس وقت آپ کے سوا روپے کے مقروض ہیں۔ اعتبار کر لیں تو یہ رقم کل تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ ہو تو میری ۳۵ ہزار کی گاڑی کل تک کے لئے گروی رکھ لیں۔ ہم آپ کا سوا روپیہ دے جائیں گے تو یہ اپنی موٹر لے جائیں گے۔

ابھی دکان دار فیصلہ ہی کر رہا تھا کہ موٹر گروی رکھ لوں یا اعتبار کروں۔ بخاری صاحب نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ دکان دار ہکّا بکّا رہ گیا۔ ضرور سوچتا ہو گا۔ پانچواں بھی اُچکّا ہی نکلا[1]۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب یہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے، انہوں نے ایک گٹار خریدا اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر دلّی کی نواحی بستیوں میں گھر گھر جا کر یہ صدا دی:-

"بابا اللہ کے نام پر کچھ ملے گا؟"

"ہم دونوں بھائی کل رات سے بھوکے ہیں۔"

"بھلا کر بھلا ہو گا۔"

"اپنے بچوں کے صدقے میں ہمیں کھانا کھلا دو۔"

---

[1] ویسے دوسرے دن یہ رقم مع سود کے ادا کر دی گئی تھی۔

معلوم ہے ان کا ساتھی کون تھا؟ سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد!

پطرس کے یہ مشغلے عجیب ضرور تھے۔ مگر ان میں زندگی سے پیار اور اس سے لطف اندوز ہونے ہی کے تو سارے رنگ روپ ہیں۔ مرحوم کو معلوم تھا، زندگی بڑی نعمت ہے۔ اسے ہر رنگ میں بسر کر دیکھو۔ میرا خیال ہے وہ دنیا سے، اپنی کوئی حسرت ساتھ لے کر نہیں گئے۔ کوئی بھی حسرت، سوائے لکھنے لکھانے کے۔

تاج صاحب نے مجھے بتایا۔ ایک بار حفیظ جالندھری، پطرس سے ناراض ہو گئے۔ دوستوں کی ناراضی پطرس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بے چین اور بے کل رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کہنے لگے۔ حفیظ مجھ سے ناراض ہے، چلو اسے چل کر منائیں۔ چنانچہ میں اور پطرس، حفیظ صاحب کے ہاں پہنچے۔

پطرس نے جاتے ہی کہا۔ حفیظ میری خطائیں معاف کر دو۔ میں آج معافی ہی مانگنے آیا ہوں۔ پطرس نے ہر ہر انداز سے چاہا، حفیظ کی ناراضی ختم ہو مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرحوم آزردہ ہو کر لوٹے۔

کوئی آٹھ دس دن ہوئے حفیظ صاحب میرے دفتر آنکلے۔ میں نے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ فرمانے لگے۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے، ٹھیک سنا ہے۔"

"آخر بات کیا تھی؟"

"تمہیں کیا بتاؤں طفیل، بخاری میرا دوست تھا، جگری دوست، اس جیسا آدمی پاکستان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ ذہانت اس پر ختم تھی۔ دوستانہ حقوق کی بجا آوری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔ مگر ——"

"مگر کیا؟"

"وہ کم بخت پاکستان کی بعض ایسی شخصیتوں کی صلاحیتوں کا منکر تھا۔ جو میرے نزدیک واجب الاحترام تھیں۔"

حفیظ صاحب کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ گئے۔ میں نے بھی سن لیا۔ مگر میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ کوئی بڑا آدمی، اگر دوسرے کی بھی بڑائی کا اقرار کرے تو اس کی اپنی بڑائی پر حرف آجاتا ہے یا وہ سمجھ لیتا ہے کہ حرف آگیا —— یہ بھی امکان ہے کہ اس معاملے میں، پطرس کی نظر ہی چوک گئی ہو اور انہوں نے ان بزرگوں کو سمجھنے میں کچھ غلطی کی ہو۔ مگر ان کی تحریروں، تقریروں، اور خطوں سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے پاکستان کی بقا کے لیے مرحوم کے کارنامے امٹ ہیں۔ دنیا میں ان کی حب الوطنی کا شہرہ رہا۔ یو۔ این۔ او کی ہر دو دیوار مرحوم کی پاکستان دوستی کی قسمیں کھانے کو تیار ہیں۔ میرے دعوے کی تصدیق میں، اس ناچیز کی پیش کش میں بھی بہت کچھ ملے گا۔ ایک جگہ نہیں، کئی جگہ۔

بخاری صاحب کو کوئی باتوں سے جیت لے۔ یہ ناممکن تھا۔ آغا اشرف بتاتے ہیں کہ لیک سکسس میں بخاری صاحب کا جب پہلی پریس کانفرنس سے واسطہ پڑا تو یہ چہرے سے نڈھال نظر آئے۔ بخاری صاحب کو بھی معلوم تھا۔ میری زندگی اور موت کا فیصلہ آج ہی ہونے والا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جگہ پورے چوکس تھے

ہندوستانی اخبار نویسوں کو سوجھی، بخاری کا جلوس آج ہی نکال دیا جائے۔ چنانچہ وہ سب بڑھ بڑھ کے سوال کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مگر ادھر قدرت نے بخاری کو قوت گویائی کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اکھڑتے تو کیسے اکھڑتے۔ یہ پے بہ پے اپنی لسانی اور مزاحی خوبیوں سے ہندوستانی اخبار نویسوں کو چت کرتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا —— پاکستان تو ہندوستان سے تعاون کرنا ہی چاہتا ہے۔ مگر ہندوستان ہی راہ راست پر نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ پاکستانی فوج کو منجملہ ذخیروں میں سے کئی ہزار جوتے دیے جائیں۔ جوتے دیے ضرور گئے،

• لیکن جب صندوق کھولے گئے تو سارے جوتے بائیں پاؤں کے نکلے۔ دایاں پاؤں ایک بھی نہ تھا۔

یہ اور اس کے قسم کے ہزاروں واقعات ہیں۔ جو بخاری صاحب کی غیر معمولی ذہانت وظرافت کے مظہر ہیں۔ کوئی ان کا کہاں تک ذکر کرے۔

صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم راوی ہیں کہ فسادات کے دنوں میں، امتیاز علی تاج بڑے ہی گھبرائے ہوئے تھے، ایک شام، سالک، بخاری اور میں اس کے گھر گئے تو تاج کو بے حد خوفزدہ پایا۔ وہ بخاری سے کہنے لگے۔ اب کیا ہوگا۔ بخاری صاحب نے کہا، کچھ بھی نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ یا تو پینک میں رہتے ہیں یا (PANIC) پینک میں، سب ہنس پڑے۔ تاج صاحب میں بھی زندگی کے آثار نظر آئے۔

بخاری صاحب غالب کے بڑے مداح تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ غالب کا خیال ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ لیکن غالب خود حیوانِ ظریف تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں، بخاری غالب کے ہم پلہ تھے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ ان کے سبھی دوستوں کو ان کے متعدد لطیفے اور قصے یاد ہیں

مجید ملک نے ایک دفعہ بخاری سے کہا کہ آپ اپنے مضامین کا ایک مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام صحیح بخاری رکھیں۔ بخاری نے بے ساختہ جواب دیا۔ عزیز من! آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام "کلام مجید" رکھیں۔

ایک بار ایک صاحب نے بخاری صاحب سے پوچھا: "بخاری صاحب آج کل آپ کچھ لکھ رہے ہیں؟"

بخاری صاحب نے جواب دیا: "یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی عورت سے پوچھا جائے۔ تو حاملہ ہے؟"

اگر کوئی بخاری صاحب کے لطیفے، چٹکلے لکھنے ہی پہ آجائے تو پھر وہ لکھتا ہی چلا جائے گا۔ ایک دو نہیں، ہزاروں لطیفے (واقعی ہزاروں لطیفے) اگر میں نے اس سلسلے کو یہیں ختم نہ کیا تو بہت ممکن ہے یہ حصہ بخاری صاحب کی شخصیت پر چھا جائے اور خود بخاری صاحب چھپ جائیں۔ اس لئے یہیں چپ ہوتا ہوں۔

بخاری صاحب کو ڈرامے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے فن سے بھی کما حقہٗ واقف تھے۔ جس کا ذکر اور کئی جگہوں پہ آئے گا۔ جب تک یہ گورنمنٹ کالج میں رہے۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب زوروں پر رہی۔ خوب خوب داد حاصل کی۔ ضرورت پڑتی تو خود بھی ڈرامے کا کردار بن جاتے اور لوگ بخاری کی ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ان کا ارادہ تھا، پختہ ارادہ کہ ڈرامہ کے فن پر، ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ یہ اس ضمن میں اور دوستوں کو پکارتے رہے کہ میرا ساتھ دو تاکہ ایک کام ہو جائے مگر یہ خواہش ان کے ساتھ اس لئے دفن ہوگئی کہ ان کا کوئی دوست آگے نہیں بڑھا تھا۔

اور بھی کئی تخلیقی کام کرنا چاہتے تھے۔ جن میں ایک بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھنے کا پروگرام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لئے ایسی درسی کتابیں لکھ جائیں کہ کچھ دنوں اُن کی یاد بھلائی نہ جاسکے۔ اسی ارادے سے انہوں نے ایک اسکیم بنائی۔ جو کسی وجہ سے بار آور نہ ہوئی۔

ایک کتاب ایڈٹ بھی کر رہے تھے۔ نام تھا اس کا A STUDY OF PAKISTAN کئی ابواب میں اسے تقسیم کیا۔ جو بھی جس موضوع پر کام کی چیز لکھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی تکمیل کے لئے پکارا۔ ادبی رجحانات پر خود لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔ غرض بہت کچھ کرنے کے ولولے تھے جو ساتھ لے گئے۔ اگر وہ آخری عمر میں پاکستان سے باہر نہ جاتے تو وہ کچھ نہ کچھ کر گذرتے۔ وہ اسی خوشی میں زندگی بسر کرتے رہے کہ کچھ کر گئے —— اگر انہیں یہ یقین ہوتا کہ کچھ نہیں کر پائیں گے اور چل دیں گے۔ تو یقیناً ان کا اس سے بھی پہلے انتقال ہو جاتا۔

اصل میں بخاری صاحب ادب ہی کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ مگر زندگی کی اڑان میں وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں جتنے بھی صاحب اختیار تھے۔ ان میں بھی کوئی ایسا دیدہ ور نہ ہوا۔ جو بخاری کی شخصیت کو پہچان لیتا اور ان سے ادب کے سنوارنے ہی کا کام لے سکتا۔

بخاری صاحب اپنی آخری عمر میں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لئے کوشاں رہے۔ مگر انہیں وہ بھی نہ ملی۔ یہ بخاری صاحب کے ساتھ

ظلم نہیں تھا تو کیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے تو باعثِ فخر نہ تھی کہ وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ بلکہ اس یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی جس کے وائس چانسلر بخاری صاحب ہوتے۔

ایک دو واقعات، جناب شورش کاشمیری نے بھی خوب سنائے۔ جیسے شورش صاحب ہیں۔ ویسے ہی یہ واقعات، یعنی ہمّت و شجاعت کے قصّے۔ مرحوم کی مردانگی کے ایسے واقعات پر اور کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

ایک زمانہ میں، ایک اخبار نویس کا کام یہ تھا کہ وہ بخاری صاحب کے خلاف لکھا کرتا اور جی بھر کے لکھا کرتا تھا۔ بخاری صاحب پہلے تو دل کو بہلاتے رہے کہ کسی دن یہ اللہ کا بندہ خود ہی راہِ راست پر آ جائے گا۔ جب مایوس ہو گئے تو ایک دن اس اخبار کے دفتر جا پہنچے۔

اخبار کے ایڈیٹر، کرسیٔ امارت پر براجمان تھے۔ انہوں نے اس کے کان میں کہا: "مجھے آپ سے علیحدگی میں ایک کام ہے۔"

وہ صاحب سمجھے کام بنا۔ آج ضرور اپنی کارگزاریوں کا معاوضہ ملے گا۔ خوش ہو کر اٹھے۔ من میں ہزاروں کی سوچ لی۔

جب بخاری صاحب اور جناب ایڈیٹر صاحب ایک الگ کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ بڑے اطمینان سے اس کے منہ پر زور سے چانٹا رسید کیا۔ ایک اِدھر، ایک اُدھر، اس کے بعد چٹخنی کھولی اور یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اُتر گئے۔ اب اطمینان سے بیٹھا لکھا کرو۔

متحدہ ہندوستان میں، جب انگریز ہی کا طوطی بولتا تھا۔ خلافِ حکومت سرگرمیوں کے سلسلے میں، حاکمانِ وقت کو ارونا آصف علی کی تلاش ہوئی۔ وہ روپوش ہو گئیں، یہ بھی انہی دنوں کا قصّہ ہے۔ جب بخاری صاحب ریڈیو کے ناخدا تھے۔

ریڈیو پر روز اعلان ہوتا۔ ارونا آصف علی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ جو صاحب ان کا اتہ پتہ بتائیں گے۔ انہیں انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان ایک دن نہیں ہوا کئی دن ہوتا رہا۔

جو محکمہ لوگوں سے یہ کہتا تھا کہ ارونا آصف علی کا اتہ پتہ بتانے والے کو انعام دیا جائے گا، اسی محکمہ کے ناخدا کے گھر ارونا آصف علی رہتی تھیں۔ آصف علی سے مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حقِ دوستی کی آخری حد ہے اور دوسری طرف جرأت و ہمّت کی ایک عجیب داستان!

بخاری صاحب نے زندگی بھر اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر ہی محبت کی اور نبھائی۔ برخلاف اس کے ان کے دوست اتنے عاشق ثابت نہ ہوئے۔ اپنے خطوں میں انہوں نے کیا کیا گلے نہیں کئے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرحوم کو چھوٹے چھوٹے کئی عارضے تھے۔ اس پر کینسر جیسی خوفناک بیماری، موت ان کے سامنے مدّتوں ناچتی رہی۔ مگر یہ آنکھیں چرائے، دل کو طرح طرح سے بہلاتے رہے۔ بالآخر اس جیالے، مخلص اور عالم کو موت نے آن ہی دبوچا، آج یہاں سوگ ہے۔ عرش پر جشن ہو گا۔

یہ مانگے تانگے کا مضمون ضرور ہے۔ مگر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی قسم بھی کون کھائے!

پطرس بحیثیت مزاح نگار

محمد احسن فاروقی

لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخل ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک دن لائبریری میں شفیق وصی رضا نے میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ایک ناول دیکھ کر کہا: "اگر سچ مچ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ جانا چاہتے ہو تو مضامین پطرس پڑھو۔" میں سن کر چپ ہو رہا۔ میں یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی علویت کا اور اردو ادب کی اتنی ہی پستی کا احساس لے کر داخل ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اگر صاحبِ ذوق تھا نہیں تو اس قدر بنتا ضرور تھا۔ کہ اعلیٰ ترین تصانیف کے علاوہ ہر معمولی تصنیف سے نفرت کا اظہار کرنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر اس وقت میری ایک اور بھی بڑی خاص رائے تھی۔ جو میرے جاننے والوں میں کچھ مقبول سی ہو چکی تھی۔ وہ یہ کہ جسمانی امراض بھی ادبی تاثرات سے دور کئے جا سکتے ہیں۔ اور کیونکہ پیٹ کی خرابی اس وقت ایک عام مرض تھا جس میں میں بھی مبتلا تھا اس لئے اپنے نظریہ کی مثال میں یہ کہا کرتا تھا۔ کہ پیٹ خراب ہو تو ڈکنس کی ناولیں پڑھو پیٹ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ناول دیکھ کر وصی رضا نے یہی تصور کیا تھا کہ جیسے میں دوا کی شیشی لئے جا رہا ہوں۔ اور جیسے لوگ انگریزی دوا کی شیشی ہاتھ میں دیکھ کر ڈاکٹر کا نام پوچھ کر اکثر کہتے ہیں "بھئی کیا ڈاکٹری دوا لئے پھرتے ہو، حکیم کا علاج کراؤ، جلد فائدہ ہوگا۔" اسی طرح وصی رضا نے بھی ڈکنس کی بجائے پطرس کے علاج کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے جدید لوگ حکیم کے علاج کا نام آتے ہی صاف ٹال دیتے ہیں اور مشورہ دینے والے کو نیچی نگاہ سے دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ویسے ہی میں نے وصی رضا کو دیکھا اور اپنا راستہ لیا۔

پطرس نام عجیب تھا! کوئی عیسائی ہے؟ نہیں عیسائی عبرانی نام سے عربی نام پر اتر آنے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی لونڈا لاڑی ہوگا جس نے یہ تخلص رکھ لیا اور پھکڑ بازی کرتا ہوگا۔ وصی رضا اردو کے لکھنے والوں کو اچھالا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو بہت زیادہ جانتے تھے مگر انگریزی میں پھکورے اس لئے پطرس کو ڈکنس کی بجائے پیش کر کے ہم کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ پطرس کوئی لونڈا لاڑی نہیں۔ جس استاد نے ہمیں انگریزی ہیومر کو سمجھنا سکھایا تھا۔ وہ اور پطرس کیمبرج میں ساتھی تھے۔ پطرس اصل میں پروفیسر بخاری تھے۔ جو ہندوستان کے سب سے بہتر تعلیمی ادارے یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھاتے تھے فوراً ہمیں یقین آگیا کہ وہ ضرور جانتے ہونگے کہ ہیومر کیا چیز ہے مگر ان کا ہیومرسٹ ہونا ابھی تک شبہ میں تھا

مگر جادو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے۔ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم مانیں چاہے نہ مانیں وہ سر پر چڑھ ہی بیٹھے گا۔ اور پھر ہم کو اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک جادو اقبال تھا۔ "شکوہ" و "جواب شکوہ" پڑھتے ہی ہمارے سر پر ایسا سوار ہوا کہ قیامت کے دن بھی سوار ہی نظر آئے گا۔ دوسرا جادو پطرس، اس کے سر پر سوار ہونے کا قصہ سنئے۔

کوئی نصاب کی کتاب تھی۔ اس میں کتے "نظر آیا کتے" ہمارے لئے بھی عجیب ہی جانور تھے۔ ہمیں ان سے اس قدر ڈر لگا کرتا تھا کہ جس گلی میں داخل ہوتے تو پہلے دیکھ لیتے کہ دور دور تک کوئی کتا تو نظر نہیں آرہا ہے۔ اور اگر نظر آتا تو اس گلی میں کبھی قدم آگے نہ بڑھاتے۔ ہمارے دوست اس بات پر ہمارا مذاق اڑایا کرتے۔ ہمارے بزرگ ڈانٹا کرتے۔ کتے سے ڈر ہمارے اندر فطری تھا۔

پھر ہم نے اسٹیونسن کی کتاب "ٹریولز وِد اے ڈنکی" پڑھی اس نے ایک جگہ کتوں سے خوف کا پر لطف ذکر کیا ہے۔ ہمیں بڑی تقویت ہوئی کہ ایک تو ساتھی ملا۔

اس پس منظر کو ساتھ لئے ہوئے جب میری نظر "کتے" اور اس کے نیچے پطرس پر پڑی۔ تو کیا بتائیں کیا ہوا۔ فوراً کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنے لگا —

پہلے ہی جملے نے جادو مارا "علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے۔" اچھل کر دل بول اٹھا "قسم استاد کی ہیومر یہ ہے" کہیں کوئی غلط نہ سمجھ لے ہیومر جگتوں اور فقروں کی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک نقطۂ نظر، مزاج کے حقائق سے تصادم، زندگی میں ایک مخصوص کیفیت کے احساس کا نام ہے۔ اس جملے میں ہیومر نہیں، اس سے ہیومر شروع ہو رہا ہے یہ جملہ ایک نئی نظر ایک نئی ہستی، ایک نئی ادا ایک نئے عالم خیال ایک نئی بے ڈھنگی دنیا کی طرف اشارہ کر رہا ہے یہ کتوں کے ایک نئے عجائب خانے کا رستہ بتا رہا ہے۔

دیکھئے یہ نئے "کتے" آگئے۔ "یہ کتے کیا کرتے ہیں؟" وفادار جانور؟ "واہ کیا وفاداری ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔" یعنی یہ کتوں کا مشاعرہ گرم ہے "کم بخت بعض تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ کر لائے ہیں" ہنگامہ گرم ہے۔ پطرس آرڈر آرڈر پکار رہا ہے کچھ اثر نہیں مجبور ہو کر کہتا ہے "اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔"

دیکھئے اور "کتے" "قومیت کے دلدادہ کتے، پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں" کیسے قوم پرست ہیں!

انگریزوں کے کتے "ان کی شائستگی دیکھئے، ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں بخ بخ کر رہے ہیں۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔

اور ہمارے کتے، بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کئے جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ پطرس سے ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر پطرس، با اخلاق انسان ہیں طبعی شرافت ان پر غالب آ ہی جاتی ہے۔ ہم انہیں بزدل ہرگز نہ سمجھیں گے۔ ہاں ان کے حال سے بے حال ہو جانے پر ہماری نظر ہے۔ آیۃ الکرسی کی جگہ دعائے قنوت پڑھنے لگے ہیں۔ رات کے وقت تھیٹر سے واپس آرہے ہیں....... "اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو، آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔" بہت ہی کتا۔ بہت ہی کتا۔ با۔ با۔ با۔ "بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی، سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی، لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز سے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔" بابابابابا۔ اف۔ اف۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے مگر اب اس پر ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے ہیں۔ پطرس سچ مچ ہیومرسٹ ہے۔ پیدائشی ہیومرسٹ ہے۔

مگر وہ طبعاً محتاط ہے ورنہ کسی کتے نے اسے کاٹ لیا ہوتا اور آج اس کا مرثیہ چھپ رہا ہوتا مگر...... "جب تک کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں"..... "بھونکنا عجیب چیز ہے۔ اس کے اصول نرالے ہیں۔ متعدی مرض ہے۔ ہر بستی کے کتے کو لاحق"۔ "دو دو تین تین تولے کے کتے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے"۔ "اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے"...... بھونکنا عجیب چیز ہے۔ پطرس کے تمام تولے کو معطل کر دیتا ہے۔ لیجئے بھونکنے کا ایک اور منظر۔ پہلا منظر مشاعرہ ہو چکا۔ اب ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر رہا ہے پطرس سڑک پر ہے۔ "آپ کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟"..... "بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے"..... پطرس کو غصہ آگیا "پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی گئے۔ آخر حد ہوتی ہے۔ مگر کسی کتے کی دل شکنی اسے منظور نہیں..... "یہ مقطع دل کسی عزیز و محترم کتے کی موجودگی میں باآواز بلند نہ پڑھا جائے"۔

خیر۔ ذلیل کتوں کو چھوڑیئے۔ خدا ترس کتے دیکھئے۔ مسکینی و عجز ملاحظہ ہو۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹا ہوا ہے۔ گاڑی کے بگل کوئی اثر نہیں کرتے۔ کسی نے چابک مارا تو ایک گز پرے جا لیٹا۔ بالکل ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتا ہے...... "رات کے وقت اپنی دم کو تابحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے"..... "اگر ان کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا تو راتوں خواب میں بے شمار کتے پاؤں سے لپٹے نظر آئے"۔

پطرس کے دل میں ان سے انتقام لینے کی آگ ہے اگر خدا اسے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا کر دے تو سب کتوں کو کسوٹی پہونچا دے۔ "کاٹنا اور بھونکنا..... یہی دو طاقتیں ہیں"..... "انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے"۔ واہ۔ واہ۔ کیا بات کہی ہے اس کے بعد مضمون کو آگے نہ جانا چاہیے۔

یہ سب کیا ہوا۔ ایک مخصوص اپنے پر ہنسانے والی ہستی دکھائی دی۔ اس نے اپنے تئیں دکھایا۔ واللہ کیا آدمی ہے۔ ہمیں جیسا ہے بالکل ہمارا ساتھی ہمنوا۔ اور اس نے کتے دکھائے۔ عجیب حالات کے کتے...... دیکھئے وہ دروازے پر گلی میں کتے بھونک رہے ہیں۔ آس۔ آس۔ یہ کیا ہوا۔ یہ سب پطرس کے کتے ہو گئے۔ جو کتا دکھائی دیتا ہے وہ پطرس کا کتا ہے ہم پطرس ہیں وہ ہمارا کتا ہے۔ یہ جادو ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔ اسے ہیومر کہتے ہیں اردو کا کوئی لفظ اس لفظ کے معنی نہیں ادا کر سکتا۔

اب سنئے کہ اس مضمون کو پڑھ کر ہمارا کیا حال ہوا...... ہمارے اندر سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم پر کتابوں کا جنون سوار ہوا کرتا ہے اس کی شدت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر کسی رات کو کسی کتاب کا جنون ہم پر سوار ہو تو ہم بازار جا کر کتابوں کی دوکان کے تالے توڑ کر کتاب نکال کر گھر لے آئیں گے اور بغیر اس کو ختم کئے دم نہ لیں گے...... تو بس صاحب مضامین پطرس کا جنون ہم پر سوار ہوا فوراً بازار پہونچے اور ایسی جلدی کتاب لے کر واپس آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب چرا کر بھاگے ہیں۔

اب پطرس میری نگاہ میں پکا ہیومرسٹ تھا۔ اردو کا واحد ہیومرسٹ۔ بلکہ وحدہٗ لاشریک ہیومرسٹ، اور پھر ایک ہی جلوے میں ہم سودائی ہو چکے تھے۔ کتابوں کا سودا بہت اچھی چیز ہے ادھر سودا ہوا اور ادھر وصل میسر ہو گیا۔ اتنی آسانی کسی اور عشق میں نہیں ہوتی۔ غرض ہم اور پطرس من تو شدم تو من شدی ہو گئے۔

دیباچہ شروع کیا۔ یہ کتاب ہمیں کیسے ملی؟ ایک مضمون تو مفت ملا۔ اتنا پطرس پر احسان ہوا۔ ۱۱۷ احسان پطرس پر۔ باقی کتاب ہم نے

چرائی؟ جس بے تابی کے ساتھ اس کو لے کر ہم گھر آرہے تھے۔ وہ محکمہ پولیس کے لحاظ سے چوری کے زمرے میں آتی ہے۔ چوری اور کھا گنا لازم و ملزوم ہیں تو ہم نے اگر پوری چوری نہیں تو ½ چوری ضرور کی۔ ہمارا یہ ذوق داد کے قابل ضرور ٹھیرتا ہے۔ مگر یہ کتاب تو ہم خرید کر لائے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا ضروری ہے۔

ہماری حماقت حق بجانب ہے۔ ہم حماقت کو حق بجانب یعنی حقیقت سے ملا جلا دیکھ رہے تو اس کتاب پر عاشق ہوئے اسی کو تو ہیومر کہا جاتا ہے ہمارے نزدیک ہیومر کی سب سے بہتر تعریف اتفاقاً ایک بڑے ہیومرسٹ کے قلم سے نکل گئی۔ یہ ہیومرسٹ ٹھیکرے ہے۔ اور اس نے اپنی کتاب "انگلش ہیومرسٹز" میں سوفٹ "SWIFT" پر لکھتے لکھتے یہ فقرہ چھوڑ دیا۔ TRUTH TORSY- TURVY, AT ONCE TRUE AND ABSURD. یہ بات وہی ہے حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا، حق بجانب کو حماقت ثابت کرنا۔ پطرس پر اتفاق سے وہی کچھ کہہ گیا جو ٹھیکرے اتفاق ہی سے کہہ گیا ہمیں یقین ہے کہ کوئی سچا مصنف خود نہیں لکھا کرتا۔ قلم تو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر چلاتی اس کو کوئی روحانی چیز ہے۔ اور یہ روحانی چیز اپنی موج خرام سے ایسے گل کتر جاتی ہے جن کا احساس مصنف کے شعور کو بھی بعد میں ہی شاید کبھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیومر کی روح جب پطرس کا قلم چلا رہی تھی تو اس نے حقیقت کو حق بجانب ثابت کرنے والا فقرہ کر دیا۔ یہ روح جسے یونانی علم اصنام میں موس MOMUS کہتے ہیں یہی کرتی ہے۔ حقیقت اور حماقت کو اس طرح گڈمڈ کرتی چلی جاتی ہے کہ نہ حقیقت کھلے اور نہ حماقت ثابت ہو یہ روح ہمارے پھکڑ نگاروں سے کبھی چھو کر نہیں گزری ان کی حماقتوں کو پڑھئے ہنسی کی ایک لہر دوڑے گی۔ مگر ذرا غور کیجئے تو ان کی حماقت حماقت ہی رہ جائے گی۔ بالکل ناممکن، غلط بات۔ من گھڑت۔ لونڈوں کو ہنسانے کے لئے ٹھیک ہے۔ اس پر ہنسنا بد مذاقی ہے مگر پطرس تو موس سے ہم کنار ہے اس کے خامے کی آواز نوائے موس ہے۔

اب بتائیے کہ پطرس کیا ہے؟ اتنا پتہ مل گیا۔ اس کے کتے دیکھے اس کو کتے بناتے دیکھا۔ اسے خود ہنستے دیکھا اس کا دیباچہ پڑھا اب اس پہیلی کو بوجھنے میں کیا کسر ہے۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ یہ کہ پطرس جو کچھ بھی ہے مگر ہے دیکھنے کی چیز اور برتنے کی چیز۔ شکسپیر کا پک PUCK اس کے کان میں کہہ رہا ہے اس کی روح کے کان میں کہہ رہا ہے۔ O LORD WHAT FOOLS THESE MORTALS BE! اور اس کا قلم چل رہا ہے وہ مارٹل ہے اس کے چاروں طرف سب مارٹلز ہیں وہ فول ہے اور اس کے چاروں طرف سب فول ہیں۔ یہی دنیا ابھرتی آرہی ہے۔

"ہاسٹل میں پڑھنا" وہ طالب علم ہے اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہاسٹل میں پڑھے۔ اس کے گھر والوں کو دیکھئے۔ کھاتے پیتے مسلمان لوگ۔ لڑکے کو تعلیم دلاتے ہیں مگر تعلیم کے مقصد اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ صاحبزادے کے لئے تعلیم گاہ تفریح گاہ کے ہم معنے ہے۔ سب سے زیادہ تفریح ہاسٹل میں پڑھ کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی کوشش ہے کہ کوئی سال ایسا آجائے کہ ہوسٹل میں داخل ہو سکے۔ اس لئے متواتر فیل ہی ہوتے رہنے میں ان کو دلچسپی ہے۔ ادھر ان کے سرپرستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہاسٹل کوئی بری جگہ ہے والدین کی نگاہ میں ہاسٹل کو علم اور اخلاق کا اعلےٰ ترین مرکز ثابت کرنے کی کوشش بار بار مضحکہ خیز ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جس جس طرح فیل ہوا ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسے بالکل ایسے کتنے لڑکے ہمارے ذہن میں ہیں ان سب کا وہ دو اضعاف قلی مشترک ہے وہ ہمارے مشاہدے کی زبردست مضحکہ خیز حقیقت ہے۔

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" وہی طالب علم ہے پڑھنے سے اس کی دلچسپی کا حال دیکھئے۔ پڑھنا امتحان کے لئے ہے تیاری کے لئے سویرے اٹھنا ہے۔ لالہ جی اس کے پڑوسی مضحک حد تک مستعد اور منہمک ہیں۔ اس کو صبح جگانے کے سین اور اس کے جاگ کر سو جانے کے حالات وغیرہ کسی طالب علم نے نہیں دیکھے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ پطرس اس میں فرد ہے۔

ہماری مضحک تعلیمی جدوجہد کی تصویر پوری ہوگئی۔ پطرس نے اپنے تئیں الٹ پلٹ کر اور اپنے چاروں طرف کی دنیا کو الٹ پلٹ کر سب کچھ دکھادیا اور خوب خوب ہنسایا۔

لیجئے خانگی زندگی کے حالات دیکھئے۔ "اردو کی آخری کتاب ماں کی مصیبت"۔ یہ ایک عام بے ڈھنگا گھر ہے "میں ایک میاں ہوں" میاں بیوی کے درمیان تعلقات۔ میاں کے دوستوں پر بیوی کے اعتراضات۔ بیوی بھی عام سی چیز ہے اس کا جدید تعلیم یافتہ فرماں بردار میاں ہے۔ بیوی کے میکے جانے پر خوش ہے کہ ہر قسم کی آزادی ملی۔ لیکن پھر بھی بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے گھبرا کر اسے تار دیتا ہے۔ کیا مرقعے سے بیوی گھر پہونچتی ہے۔ کمال ہے!

اب سیاسی زندگی کا کھیل دیکھئے "مرید پور کا پیر" لیڈر کیسے بنتا ہے اور کیسے بنایا جاتا ہے۔ شروع میں ایک طرح بنایا جاتا۔ اب اسے لیڈر بنتے ہی بن پڑتی ہے۔ آخر میں تقریر کرتے میں اسے کیسا بنایا جاتا ہے اسے بھاگتے ہی بن پڑتی ہے واہ رے لیڈر تم لیڈری کی حقیقت ہو۔

کالجوں کو دیکھئے انکسار کے مجسمے علم کے مرقع پروفیسر پطرس کو دیکھئے اور ان کے شاگردان رشید کے اٹھنی فی کس نذرانہ پیش کرنے پر غور کیجئے اور پھر ملک معظم وغیرہم کے تحائف پر ان کی نشہارت دیکھئے۔ "لگے ہاتھوں کیمبرج یونیورسٹی میں" "میبل اور میں" کے فن سے بھی آگاہ ہو جائیے ....." رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا اس سے جذبات کو آسودگی نصیب ہوئی" واللہ کیا بات کہی ہے۔ کیمبرج سے لوگ یہی فن سیکھ کر آتے ہیں کیمبرج کی تعلیم کا شاید یہی نچوڑ ہے۔

ادب زندگی پر تنقید ہے؟ میتھو آرنالڈ نے اس بات کو کچھ ضرورت سے زیادہ انسپکٹر مدارس کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ جس سے کچھ بات ٹھیک نہیں بنتی دکھائی دیتی۔ ورنہ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا زندگی کی وہ چیز جو فنکار ہمیں دیتے آئے ہیں اسے پطرس نے بھی ہمیں دے دیا ہے اب اگر نظریۂ حیات، نصب العین، پول کھولنا، مفکرانہ سنجیدگی وغیرہ قسم کے حماقت زدہ الفاظ کا ذکر کیجئے تو جواب یہی ملتا ہے کہ اگر زندگی کے مکمل نقش میں کوئی نظریہ ہے، نصب العین ہے، کسی چیز کے پول کھولنے کی ضرورت ہے کوئی اخلاقی سیاسی وغیرہ قدر یا قدریں ہیں تو وہ پطرس کے یہاں بھی ہیں ورنہ ان کے ذکر پر بک کا جملہ یاد کیجئے اور خاموش ہو جائیے "شیکسپیئر والا ہیومر ہے۔ صاف خالص ہیومر طنز وغیرہ کی گندگی سے پاک ع

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہست

اب دیکھئے پطرس کیا ہے۔ سب مضامین کو ملا لیجئے اور دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ الف لیلے میں ایک قصہ ہے جس میں ایک لڑکا سمندر کے کنارے ایک بوتل پڑی پاتا ہے اس بوتل کو کھولتا ہے تو اس میں سے ایک جن نکلتا ہے جو لڑکے کو کھا جانے کو تیار ہوتا ہے۔ پطرس بھی ویسا ہی ایک جن ہے، مگر یہ جن آدم خور نہیں ہے آدم خوردہ ہے۔ یہ ہمیں نہیں کھاتا اپنے تئیں ہم کو کھلاتا ہے۔ اس کو پھر شیشے میں نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ الف لیلے والا احمق جن تو ہے نہیں کہ ایک لڑکے کے کہنے پر پھر بوتل میں واپس ہو جائے۔ اور ہم اسے بوتل میں واپس جانے کو کہیں ہی کیوں۔ وہ تو ہماری خوراک ہے۔ بڑے مزے کی خوراک ہے۔

یہی بہادر جن سروانٹیز کے دماغ سے ڈان کوئکزٹ کی صورت میں روزنیناٹ پر بیٹھ کر سانکو پانزا کو ساتھ لے کر ڈلسینہ کے عشق میں سرد آہیں بھرتا ہوا دنیا کو فتح کرنے نکلا ہے۔ یہی اب پطرس کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ جدید دور کے سب ہتھیار اس کے پاس ہیں۔ جدید تعلیم، کیمبرج کی ڈگری پروفیسری کا عہدہ۔ اس کی ڈلسینہ روشن آرا ہے جس کو وہ آہ سرد کا تار بھیجتا ہے اس کا بھی ایک سانکو پانزا ہے یعنی کبوتر باز مرزا صاحب جو

روشن آثار کے نقشوں، کبوتر بازی اور ناؤ بازی کے منظروں سے نمایاں ہوتا ہے۔ "سینما کا عشق" میں کمال کے ساتھ ابھرتا ہے یاد رکھئے پطرس ایسا جن ہے جو اپنے تئیں ہلکان کرتا ہے چنانچہ اس کا ساتھی اس کو پریشان کرنے میں کمال دکھاتا ہے۔ سینما جانا فرض۔ بغیر مرزا صاحب کو ساتھ لئے بن نہیں پڑتی۔ تماشا شروع ہو جانے کے بعد پہونچنا لازمی ٹھہرا۔ اب اندھیرے کی مہم شروع ہوتی ہے۔ ٹخنوں، کہنیوں کی ٹکروں، جھڑکیوں والی مہم! اُف۔ اُف۔ واہ مرزا خوب پہچانتے ہو مگر مرزا کا پچھانسنا بڑی مفید چیز ہے۔ پھانس پھانس کر ہی سہی مگر مرزا ہی نے تو پطرس کو شہسوار بنایا ہے مرزا ہی نے تو اسے وہ سواری دی جس کو دیکھ کر روز نیا ینت بجلک کرتی ان کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے اور ایسی بھاگتی ہے کہ پھر نہیں نظر آتی۔ وہی مرحوم جس کی یاد اردو زبان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے بلکہ اردو زبان کے ثبات کی ضامن ہے۔

کیا سواری ہے؟ مشین بنانے والے انسان کی قابلیت کا معجزہ! جدید دور کی سب سے زیادہ تعجب انگیز سواری، اگر ڈان کوئزٹ آج کل تشریف لائیں تو انہیں آج کل کی سب سے زیادہ تعجب میں ڈال دینے والی سواری بائیسکل کے سوا اور کوئی نہ دکھائی دے گی یہ ہوا پر اڑنے والی پٹڑیوں پر چلنے والی پٹرول کی غلام سواریاں کیا رقم ہیں!

پطرس اس معجزہ نما سواری کو دنیائے ادب کی مضحک ترین سواری بنا کر پیش کرتا ہے یہ مرزا صاحب کا تحفہ ہے نہیں موسس دیوتا کا عطیہ ہے۔ رات ہی میں آ گئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پرزے کسنے کا اوزار بھی لائی ہے یہ اوزار ہی اس کا علاج درد دل بلکہ اس کی روح ہے۔ کیا شکل پائی ہے "دیکھنے سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔" ہل اور رہٹ اور چرخہ اس کے مقابلے میں جدید ایجادات ہیں۔

اور اس کی چال بھی کیا کمال ہے پطرس آخر کار اس پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ بائیسکل اپنی آوازوں میں گم ہے۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چرچرخ۔ چرچرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔

جوڑ و بند کی حرکات ملاحظہ ہوں۔ زنجیر! "میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی۔ جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔"

پہیہ! "پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا ہے یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔"

مڈگارڈ! "مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔"

"اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔"

اس کی چال میں ارتقاء بھی ہے "جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے .... اف۔ اف۔ ایک نظموں کے گھوڑے کیا اڑیں گے۔ یہ سائیکل بالکل آسمان سے اتری ہے ...... موسس نے زمین کے لئے یہ براق بھیجا ہے!

کیا قیامت کی بائیسکل ہے۔ اس کے سامنے مستریوں کی پسپائی کے سین اور خریداروں کی ہار مان لینے کی بات چیت! یہ عہد الزبتھ کا انگلینڈ ہے ہارلڈن کونٹرٹ بائیسکل کے دو حصے ہاتھوں میں لئے ہوئے آفاق پر چلا آرہا ہے۔ پک، سرجان فالسٹاف کیا کہتا ہے، KNIGHT OF THE BROKEN BICYCLE MASTER SHALLOW.

ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ پروفیسر بخاری کہاں پیدا ہوئے کہاں کہاں رہے اور کہاں مرے۔ ہم چاہتے تو ان سے ملتے مگر اس کا موقع نہ ملا۔ اچھا ہی ہوا ہمیں ان سے کیا مطلب تھا ہمیں پطرس سے غرض ہے اور رہے گی یہ شخص رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔ عہد الزبتھ کا ایک فرد ہے اس کا لاہور سرجان فالسٹاف کا لنڈن ہے یہ لاہور لاہور ہی ہے آگے کچھ نہیں اس کے پاس ایک دریا لیٹا رہتا ہے بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ حملہ آوروں کی آماجگاہ ہے۔ یوپی کے حملہ آور دلی کے رستے سے یہاں آتے ہیں اور اہل زبان کہلاتے ہیں۔ اس کے حدود اربعہ منسوخ ہو چکے۔ آب و ہوا کا سوال نہیں اٹھتا آب کی جگہ پائپوں میں ہائڈروجن اور آکسیجن اور ہوا کی جگہ گرد اور خاص حالات میں دھواں ملتا ہے عہد الزبتھ کی سڑکیں ہیں پھسلا دینے والے ٹانگے ملتے ہیں۔ مکانوں پر اشتہارات کے پلستر پر پلستر لگائے جاتے ہیں یہاں کی صنعت وحرفت اسی حد تک رسالہ بازی ہے جیسی الزبتھ کے زمانہ میں ڈرامہ بازی تھی۔ ہر برانچ پر یہاں بھی اسی طرح ایک انجمن موجود ہے جیسے شکسپیر کے لنڈن میں تھیٹر موجود تھے۔ یہاں کی بہترین پیداوار طلبا ہیں اور قسم قسم کے ہیں اور پروفیسر ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ "دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں" یہاں کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔ پک کے پرستار ہیں اور پک کا اوتار پطرس ہے۔

پطرس کا کام کھیل دکھانا ہے۔ لفظوں کا کھیل۔ فقروں کا کھیل۔ چست جملوں کا کھیل۔ وٹ (WIT) کا کھیل کھیلتا ہے۔ مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں۔ اس کا کھیل پک کا کھیل ہے۔ موقعوں کا کھیل۔ ڈرامائی حالات کا کھیل۔ ہر مضمون یہی کھیل دکھاتا ہے

ہاسٹل میں پڑھنے والا والدین کو شخصیت کا مطلب سمجھا رہا ہے!

سویرے آنکھ کھولنے والا پلنگ پر لیٹا لالہ جی کی دروازے پر کھٹ کھٹ سن رہا ہے۔ جاگنے کی کوشش ہائے۔ ہائے

"یعنی بہت ہی کتا"!

"باپ انگوٹھا چوس رہا ہے"

فرمانبردار میاں چور بنا ہوا ہے ...... برقعہ پوش ...... منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آرا

مرید پور کا پیر تقریر کر رہا ہے۔ پیارے ہم وطنو ......!

پروفیسر پطرس پر عقیدت کی انگلیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔

سینما کے اندھیارے میں آب حیات کی تلاش ہو رہی ہے۔

ایک کتب ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کی مشق کر رہا ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ تماشا لمبا ہے۔ سین نمبر ایک۔ مرزا سے گفتگو۔ سین نمبر دو۔ سائیکل کا معائنہ۔ سین نمبر تین۔ رفتار کا ایک منظر نمبر چار۔ مرمت کی دکان۔ نمبر ۵ فروخت۔ نمبر چھ ٹوٹی بائیسکل والا ہیرو۔ نمبر سات۔ ہوئے کیوں نہ غرق دریا۔

لاہور لاہور ہی ہے

کھیل ختم

ختم؟

یہ کھیل ختم نہیں ہوتا۔ "پطرس کا تماشا دیکھ۔ پطرس کا تماشا دیکھ!" ہم گلوب تھیٹر سے بول رہے ہیں۔ اب آپ پک لافانی کا تماشہ دیکھیں گے جو پطرس نے پیش کیا ہے...... یہ پروگرام ہر میٹر بینڈ پر ہر وقت سنا جا سکتا ہے اور سننے سے زیادہ دیکھا جا سکتا ہے۔

• • •

اس کھیل کے سلسلے میں ایک نیا اعلان سن لیں۔ اردو ادب میں منتیان تنقید یا تنقید بالبر برساتی مینڈکوں کی طرح کھیل رہے ہیں پطرس کے کھیل کو یہ ہرگز نہ دیکھیں ورنہ...... پک نے ان کے لئے اب تک کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

ان میں سے ایک بڑے بابو کو پکڑا گیا ہے وہ عرصہ ہوا اپنے ابا کو فرسٹ کلاس کا اور اقبال کو انٹر کلاس کا ٹکٹ دے گئے تھے۔ اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا۔ مگر اب ان کی جرائم پیشہ گی پختہ ہو گئی اور نظر موٹی ہو گئی۔ انہوں نے اردو کی مزاحیہ نگاری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور پطرس پر جو کچھ کہا ہے۔ اس کی سزا ان کو اچھی طرح دی جائے گی۔

مضامینِ پطرس کا مطالعہ

تمکین کاظمی

پطرس ایک ذہین اور ذکی ادیب اور فن کار تھے۔ ان کا مطالعہ نہایت ہی گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں حاوی تھے۔ ساٹھ سال کی عمر تک انہیں ساٹھ نہ سہی سات آٹھ کتابیں تو لکھنی چاہئے تھیں۔ مگر وہ "پیشہ ور انشا پرداز" نہ تھے۔ جب جی چاہتا لکھتے اور جب تک جی نہ چاہتا تھا نہیں لکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی ابتدا سے یہی روش رہی۔ ابتداً ان کے مضامین طبع ہونے لگے تو مجھے بہت پسند آئے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں خط و کتابت بھی ہونے لگی۔ اور میں پطرس سے بے تکلف ہوتا گیا ـــ ان ہی کی خواہش اور تحریک پر میں نے بعض شخصی خاکے بھی لکھے تھے

اس زمانے میں ملا رموزی، امتیاز علی تاج، پطرس اور میں لکھا کرتے تھے۔ مزاح نگاری میرا اپنا رنگ نہ تھا۔ احباب کے تقاضوں پر بعض دفعہ لکھ دیا کرتا تھا چنانچہ جب میرا مجموعہ "غنچۂ تبسم" شائع ہوا تو "نیاز مندان لاہور" نے میرے خلاف محاذ بنایا مگر پطرس شخصی طور پر میرے موافق اور اس محاذ سے الگ رہے اور اسی زمانہ سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے لکھنا کم ہی نہیں کیا بلکہ چھوڑ دیا اور میں بھی "خوش مذاقی" چھوڑ کر ادب اور تاریخ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مضامین پطرس تو بعد کو مجموعہ کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ میں نے ان مضامین کو طبع ہوتے ہی پرچوں سے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا تھا اور تقریباً ہر ایک مضمون سے متعلق ان سے میری مراسلت ہو چکی تھی۔ ملک کے آزاد ہونے سے پہلے میں نے مینا جاری کیا تو پطرس سے بھی مضمون کی خواہش کی تھی۔ اور انہوں نے بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے اور مینا بند ہو گیا۔ جن دنوں ریڈیو پطرس سے متعلق تھا، میری مراسلت ان سے نہ ہوئی مگر اس کے بعد نہ تو میں نے انہیں خط لکھا اور نہ انہوں نے مجھے، کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے دور ہو گئے۔ امریکہ سے لکھے ہوئے چند خطوط جو بعض رسائل میں طبع ہوئے ہیں ان کی اردو انشا پردازی کے آخری نمونے ہیں جو لافانی ہیں۔

زیادہ لکھنا کوئی خوبی نہیں ہے ہم بعض ایسے "پُرنویسوں" سے واقف ہیں جو بہت لکھنے والے تھے اور جن کی بیسیوں کتابیں چھپیں، مگر بارہ پندرہ سال بھی ان کی کتابوں نے زندگی نہیں پائی۔ آج کتابیں تو کیا نظر آئیں گی نام بھی سننے میں نہیں آتے۔ ان کے مقابلے میں بعض ایسے "کم نویس" بھی نظر آتے ہیں جن کی کتابیں گنی چنی ہیں۔ مگر لوگ انہیں سر آنکھوں پر لئے پھرتے ہیں انہیں آخر الذکر لوگوں میں پطرس کا شمار بھی ہے۔ چند مضامین، چند ترجمے، چند ناول صرف یہی کائنات پطرس کی ہے۔ مگر یہ "بہ قامت کہتر" چیزیں قدر و قیمت میں بہتر سے بہتر ہیں اور آئندہ ان کی قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

آئیے اب ذرا پطرس کے مضامین کا مطالعہ کریں۔ پطرس نے اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ جو شائع کیا ہے اس میں شاید گیارہ مضامین

نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ کم ہی بعد کے ایڈیشنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

سب سے پہلے پطرس نے اپنے استاد پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی سے "اظہارِ عقیدت" کیا ہے کہ انہوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا پھر اس بات پر فخر بھی کیا ہے کہ "مجھے اب بھی ان سے فیضِ تلمذ حاصل ہے۔"

پطرس کی طبیعت کا سلجھاؤ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں لغزشوں کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کر لیا ہے۔ اور پھر اس بات پر اظہارِ افتخار بھی کیا ہے کہ انہیں اب بھی پروفیسر مرزا محمد سعید سے تلمذ حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ادبی دنیا یہ معلوم کر کے کہ پروفیسر محمد سعید پطرس کے استاد ہیں، بہت زیادہ احترام کرنے لگے گی۔ مگر اس اعتراف سے علمی طبقے میں پطرس کا احترام بہت زیادہ بڑھ گیا کہ وہ برخود غلط اور "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کہنے والے ادیب نہیں بلکہ حقیقی معنی میں عالم ہیں۔ جو اپنے آپ کو طالب علم سمجھتے ہیں میں تو ان کی اس ادا سے بہت متاثر تھا۔

دیباچے میں تو پطرس نے غضب ہی کر دیا ہے:۔

"اگر

یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے

اگر

آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد

سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لئے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔

آپ!

تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔"

یہ دیباچہ پوری کتاب سے زیادہ دلچسپ اور پطرس کے سارے مضامین سے زیادہ دل فریب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قلم برداشتہ بلا فکر و تردد بیک گردشِ قلم لکھا گیا ہے اس لئے اس میں اختصار، حقیقت، طنز سبھی موجود ہے۔ خصوصاً آخری چوٹ تو ایسی بھرپور ہے کہ ہر مترجم قسم کا ادیب یا انشا پرداز تڑپ اٹھتا ہے۔ غور فرمائیے سینکڑوں کتابیں ایسی ترجمہ ہوتی ہیں جو لٹریچر کے سر پر ایک بوجھ ہیں۔ کاش یہ مترجمین ترجمہ کرنے سے پہلے اہلِ ملک سے مشورہ کر لیتے۔ نام بتاؤں تو آپ خفا ہوں گے اس لئے ذرا اردو میں جو ترجمے سامنے سامنے ہیں انہیں دیکھ لیجئے پھر غور فرمائیے کہ پطرس نے کتنی زہریلی گولی شکر میں لپیٹ دی ہے۔

"ہاسٹل میں پڑھنا" آپ اس فکر میں اپنے تئیں مبتلا نہ کریں کہ یہ پطرس کی آپ بیتی ہے یا پر بیتی یا سنی سنائی؟ آپ صرف یہ ملاحظہ فرمایئے کہ پطرس نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے یا نہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر سے غور فرمائیں تو آپ کو پورا مضمون صحیح اور بالکل صحیح معلوم ہوگا۔ پرانے گھرانوں اور محتاط بزرگوں کا یہی رویہ رہا ہے جو اس مضمون میں پطرس نے اپنے والدین کا بتایا ہے۔ اور یہ مصیبتیں بیشتر طالب علموں پر پڑ چکی ہیں۔ بلکہ اس روشن زمانے میں بھی بعض لڑکے اس میں مبتلا ہیں۔ یہ اچھی ہے یا بری؟ اس کا فیصلہ نہ آپ کر سکتے ہیں نہ میں اور نہ کوئی اور۔ انسانی طبائع مختلف ہوتی ہیں اور ہر طبیعت الگ الگ باتوں سے متاثر ہوتی ہے اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ ہاسٹل میں پڑھنا مفید ہے کبھی غلط اور ہاسٹل میں رہنا مضر ہے کبھی غیر صحیح۔ میں سینکڑوں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جنہوں نے ہاسٹل میں رہ کر سگریٹ نہیں پیا، چائے نہیں پی، سینما نہیں دیکھا، نمازیں پڑھیں اور رٹ رٹ کر پاس ہوتے گئے۔ اور سینکڑوں ایسے برخورداروں سے بھی واقف ہوں جو گھر پر کڑی نگرانی میں رکھے گئے تھے۔ مگر سگریٹ کے عادی، چائے کے رسیا، سینما کے شوقین اور دوسری لغویات کے پورے پورے پابند ہو گئے۔ بعضوں نے نہ چھٹنے والی کافرہ سے بھی منہ لگا لیا۔ اور بعض خمیازہ کش روگوں میں مبتلا ہو گئے۔ پڑھے لکھے خاک نہیں و دولت شادی، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "عصمت زن اور تربیت فرزند من جانب اللہ ہے" بالکل صحیح بات ہے اس کیلئے کوئی اصول مقرر ہی نہیں کئے جا سکتے۔

پطرس نے اپنے اس مضمون میں جس عمدگی سے طالب علموں کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور جو خاکہ کھینچا ہے وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بڑی ہی تفصیل سے لکھا ہے۔ اور پھر بڑا کمال یہ ہے کہ ایک دیہاتی اور قصباتی طالب علم کی پوری پوری نمائندگی کی ہے اور بڑی ہی معصومیت سے یہ تک ظاہر کر دیا ہے کہ لندن اور لاہور میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس کی معراج یہ ہے کہ برخوردار طالب علم اپنے والد بزرگوار سے بحث فرمانے لگتے ہیں اور شخصیت کی تشریح میں نیاز مند ہو جاتے ہیں تو سیرت میں پناہ لیتے ہیں۔ اور اس کے معنی یا مطلب چال چلن قرار دے کر جب وضاحت کرنا چاہتے ہیں تو پرنسپل صاحب کی جلسہ تقسیم انعامات والی تقریر کا خیال آتا ہے مگر وہ تو حافظہ میں محفوظ ہی نہیں ہوتی کیونکہ اسے توجہ سے سننے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ یہ سارا مضمون اسی معصومانہ ذہنیت کا مظہر اور طالب علمانہ کش مکش ذہنی کا آئینہ ہے جو اپنی طرز کا بہترین مضمون ہے۔

اس مضمون میں جگہ جگہ ایسی "پچی کاری" کی ہے کہ اس کی جوت سے آنکھیں منور ہو جاتی ہیں چنانچہ آخری فقرہ تو لافانی ہے۔

"یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔"

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" بھی بڑا ہی نفیس مضمون ہے۔ اس سے تقریباً نوے فیصدی قارئین متفق ہوں گے۔ کیونکہ سو میں دس آدمی بھی بہ مشکل سحر خیز ہوتے ہیں۔ خصوصاً طالب علمی میں تو سحر خیزی بڑی تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ پطرس کی شامت جو آتی ہے تو اپنے ایک پڑوسی سے صبح جگا دینے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور یہ پڑوسی بھی ایسے مستعد ہوتے ہیں کہ سحر کاذب ہی میں پطرس کے کمرے پر دھاوا بول دیتے ہیں اور بم باری شروع کر دیتے ہیں ان کی اس بم باری سے متاثر ہو کر پطرس کے قلم سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔

"یہ سوتوں کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔"

یہ مضمون ہاسٹل والے مضمون کے بعد ہی لکھا گیا ہے اور لکھا اس نے ہے جسے ہاسٹل میں رہنے کا ارمان تھا۔ وہ ارمان اس نے اس طرح نکالے کہ:—

حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے بارہ بجے ہاتھ منہ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہاسٹل میں وارد ہوئے، جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں (زور آپ پر) میں نے کہا اجی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمائیے!

بولے ..... وہ میں ..... ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

اس خرابی کے بعد پطرس دوسرے پڑوسی کو گھیرتے اور اس سے چھ بجے جگانے کی فرمائش کرتے ہیں اور وہ غریب چھ بجے انہیں جگا بھی دیتا ہے اس کے بعد کی واردات خود پطرس سے سنئے۔

"اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں، میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا، پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچہ کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر پتہ نہیں شاید لحاف اوپر سے اتار دیا شاید سر اس میں لپیٹ دیا، یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے، نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرا دن بھی یوں ہی آتا ہے جس کے متعلق پطرس لکھتے ہیں:—

"یہ معمہ مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا، اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے اس میں نہ معلوم کیا بھید

ہے۔

کاریج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے جواب نہ دیا؟

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو! لالہ جی یاد نہیں رہا میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔

بولے وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں ...... اس کے بعد ... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی آپ بولے نہیں۔

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنائے، ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے پھر یکایک ایک مجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں اس وقت ...... اے ..... اے .... نماز پڑھ رہا تھا

صبح دس بجے سو کر اٹھنے والے نمازی کی داد دیجئے۔ یہ حرکت سبھی کرتے ہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ دنیا دار پطرس نے طالب علمی میں اس قسم کی دروغ بیانی کی ہے یہ ان کی ایک معصومانہ حرکت تھی۔ مگر اس دروغ بافی کو بڑے بڑے جبّہ و عمامہ ریش و گیسو والے عمداً کام میں لاتے ہیں۔ پطرس کی اس معصومیت کا گواہ یہ فقرہ بھی ہے۔

"اب یہی ہمارا معمول ہو گیا ہے جاگنا نمبر ایک چھ بجے جاگنا نمبر دو دس بجے اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔"

آپ یہ سمجھ لیں کہ پطرس صرف خوش مذاقی کے دلدادہ تھے اور طنز و مزاح اور پیروڈی ہی لکھتے تھے بلکہ یہ بھی جان لیجئے کہ پطرس ایک ادیب اور انشا پرداز بھی تھے اور انشائے لطیف پر بھی انہیں خاصا عبور تھا ذیل کا انشائیہ اسی منقولہ بالا مضمون کا ٹکڑا ہے پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔

"جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کم خواب ہو، اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو

تم جاگو موہن پیارے

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور

کبھی درخشندہ کردے اور گیت

سانوری صورت توری من کو بھائی

کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔"

یہ تھی آرزوئے لطیف مگر اس کے بجائے غریب کو کیا حاصل ہوا، اسی کی زبان سے سنیئے:۔

"پہلے مسٹر مسٹر! کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصے میں گڑ دیوں کے گر پڑنے.... دیگچیوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے۔"

پطرس کا یہ مضمون ان مضامین میں سے ہے جو انہیں زندہ رکھیں گے۔ اس میں خوش مذاقی، انشائے لطیف، طنز اور روانی بلا کی ہے اور ایک طالب علم کی ہاسٹل کی زندگی کا پورا پورا نقشہ اس میں موجود ہے۔ مجموعہ کے یہ دونوں مضمون (پہلا اور دوسرا) ہاسٹل کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ہوسٹل کی زندگی اس سے زیادہ عمدگی اور نفاست سے پیش کی جا سکتی ہے اور نہ یہ تفصیل کہیں مل سکتی ہے۔

کُتّے! یہ شاہ کار ہے پطرس کا! بعض جانوروں سے بعضوں کو نفرت یا خوف ہوتا ہے چنانچہ اس کی تفصیل اکثروں نے لکھی ہے میرا حافظہ جہاں تک کام دے رہا ہے سب سے پہلے "ڈلاؤں کا مارا آغا" مضمون نصیر حسین خاں خیالؔ نے لکھا تھا جو ایک آغائے ایران کے بلی سے ڈرنے بگڑنے اور نفرت کرنے کی تفصیل سے پُر ہے یہ بڑا دلچسپ مضمون ہے مگر اس میں وہ لطافت نہیں جو پطرس کے مضمون میں ہے کیونکہ ایک آغا صاحب واقعی بلی سے ڈرتے تھے ان کی حرکات کو دیکھ کر خیالؔ نے یہ مضمون لکھا ہے اس لئے واقعیت زیادہ اور اپچ کم ہے بخلاف اس کے پطرس نے اپچ ہی اپچ پیش کی ہے جو واقعات کے ساتھ مل کر اتنی لطیف ہو گئی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

کتے سے نفرت کرنے والے کا کردار افسانوی صورت میں سمرسٹ ماہم نے بھی پیش کیا ہے (جو بدنصیبی سے بصورت ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے اصل میرے دیکھنے میں نہیں آیا) اس میں ایک کتوں سے نفرت کرنے والے کا کردار بڑی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے مگر یہ کوئی مضمون نہیں افسانہ ہے اس لئے میں افسانے کو اس اچھی مضمون پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

اس موضوع پر اچھی اور واقعاتی مضمون صرف پطرس ہی نے لکھا ہے کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں، پھر ان کا بھونکنا کسے نہیں کھلتا؟ مگر اس بھونکنے اور ایک دوسرے کے سُر ملانے کو مشاعرے سے تشبیہ دینا اور اس نفرت خیز حرکت کو اس نفاست سے بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ دیکھئے یہ کتوں کا مشاعرہ کس عمدگی سے شروع ہوتا ہے۔

"...... رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی

> کے چولھے میں سے باہر نکلے اور جنا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی، اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔"

یہ تو تھی کتوں کے مشاعرے کی روئداد جو دیسی کتوں نے منعقد کیا تھا ان دیسی کتوں کی صرف ایک ادا پطرس کو پسند تھی وہ ان کی قوم پرستانہ ذہنیت تھی۔ کیونکہ

> "اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ تپلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔"

مگر یہی کتا جب ولایتی ہوتا اور صاحب کے بنگلے پر ہوتا ہے تو پطرس اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

> "ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا، خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کردی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی ہمارے کتے ہیں نہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر، تان پر تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔"

کتے سے ڈرنے والے کا حال آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔ مگر اس کی تصویر اس عمدگی سے آپ نہ کھینچ سکیں گے جس چابک دستی سے پطرس نے کھینچی ہے ملاحظہ ہو کتنی سیدھی سادھی واقعی تصویر ہے جس میں مبالغہ یا رنگ آمیزی ذری بھی نہیں۔

> "کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پہ اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم "بزدل" ہیں شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے مواقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے مواقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی اس کی جگہ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ الفاظ یاد نہیں اور نوشتی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے، کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ فرمائیے آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویئے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں، بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔"

یہ خیال نہ کیجئے کہ پطرس کو کبھی کتے نے یا پطرس نے کبھی کتے کو کاٹا ہے جس کی وجہ سے ایسا تنفر، خوف، ڈر یا اختلاف ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا چنانچہ اس غلط فہمی کو خود پطرس نے رفع کر دیا ہے۔

"چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا

کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

لیکن

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا!

کتے کی آواز یا اس کا بھونکنا پطرس کے لئے قہر سے کم نہیں جس طرح چوہے بلی کی میاؤں سے ادھ موا ہو جاتے ہیں اسی طرح پطرس بھی کتے کے بھونکنے سے اپنے آپ کو ملک الموت کے قریب پاتے ہیں اس بھونکنے کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں انہیں سے سنیئے۔

"جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیئے)

لیکن یہ کم بخت دوروزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کرے گا۔

کتّوں کے بھونکنے پر مجھے بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطّل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر 'تبلیغ' کا کام شروع کر دیتا ہے تو آپ ہی کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا، بہرحال کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔"

اس طرح پطرس کتوں سے نالاں اور متنفر رہے ہیں مگر نیک کتوں کو انہوں نے سراہا بھی ہے یہ نیک کتے کیسے ہوتے ہیں انہیں سے سنئے:۔

"خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں کتّے اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہو گا عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے، سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے، کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصّوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا، صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹ گیا تھا، وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا انہوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی" بچا!

فقیروں کو چھیڑتا ہے؟ نظر نہیں آتا، ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشا شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہیں اور جانے نہیں دیتے، آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چار پائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔"

یہ تو سب معمولی باتیں تھیں مگر اصل حقیقت آخر میں ظاہر ہوتی ہے کہ خود پطرس کو جوشِ انتقام میں یہ آرزو تھی کہ کتا بنیں اور سارے کتوں پر بھونکیں ہی نہیں انہیں کاٹ بھی کھائیں چنانچہ اس آرزو کو انہوں نے ظاہر بھی کر دیا ہے۔

"اگر خدا مجھے کچھ عرصہ کے لئے اعلےٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں موجود ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔"

جب یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو جھنجھلا کر ان اشعار کی طرف توجہ کی جن میں کتوں کا ذکر آیا ہو چنانچہ سب سے پہلے عرفی کا ایک شعر ذہن میں آگیا بس پھر کیا تھا بے چارے عرفی کی شامت آگئی۔ لگے برسنے

"ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے انگریزی میں ایک مثل ہے کہ:—

بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے

یہ بجا سہی مگر کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے"

انشا پردازی یہی ہے کہ انشا پرداز کو اتنی قوت حاصل ہو کر ہر موضوع کر بے تکلف لکھ سکے اور شروع سے آخر تک اپنا رنگ بھی برقرار رکھے یہ بات پطرس میں پوری طرح موجود تھی۔ کتے جیسے حقیر، پامال اور پیش پا افتادہ موضوع پر اتنا جامع، شگفتہ اور رواں دواں مضمون لکھنا ان کا اور صرف ان کا ہی کام تھا، ہر شخص اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اردو کی آخری کتاب، یہ پیروڈی ہے اور اردو زبان کی سب سے پہلی پیروڈی ہے۔ آپ فرمائیں گے پہلی کس طرح ہوئی۔ پطرس سے پہلے بھی لوگوں نے پیروڈی لکھی ہے اس اس کے متعلق میرا یہ جواب ہے کہ پیروڈی کو پیروڈی سمجھ کر اور پیروڈی کے طور پر سب سے پہلے پطرس نے لکھا ہے۔ ورنہ یوں تو رتن ناتھ سرشار نے جو "خدائی فوجدار" ترجمہ کیا ہے وہ بھی پیروڈی ہے مگر سرشار نے اسے محض ایک مزاحیہ کتاب سمجھ کر ترجمہ کیا ہے، پیروڈی کی حیثیت سے انہوں نے بھی نہیں پیش کیا اور اگر پیش بھی کیا تو غیر کا مال تھا جسے صرف ترجمہ کیا گیا، خود سرشار نے کوئی پیروڈی نہیں لکھی اس کے بعد سجاد حسین نے حاجی بغلول میں مولویوں کا مذاق اڑایا اور مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد میں حاجی لغلول یا بلیغ العلانام سے دو تین بزرگوں نے اسی طرح مولویوں کا مذاق اڑایا جسے آخر میں ملا رموزی نے گلابی اردو بنا کر اپنا مستقل رنگ ہی بنا لیا تھا مگر یہ پیروڈی نہ تھی یہ مولویوں کا منہ چڑھاتے چڑھاتے خود ان لوگوں

نے اپنا منہ ٹیڑھا کر لیا تھا اور خود انہیں خبر نہ تھی کہ ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

بہرحال ان بزرگوں (حاجی بلیغ، اعلا اور طارموزی) نے پیروڈی کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا اور انہوں نے جو کچھ لکھا وہ پیروڈی سمجھ کر لکھا اور نہ حقیقت میں وہ پیروڈی تھی۔

پیروڈی کو سب سے پہلے پطرس نے اپنایا اور اردو میں پہلی کوشش پیروڈی کی جو کی وہ "اردو کی آخری کتاب" ہے۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مولانا محمد حسین آزاد سے ایک سلسلہ اردو نصاب کا مرتب کرایا تھا جو سارے ہندوستان میں لاگو کر دیا گیا اس کی پہلی کتاب ہی میں "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے" تھا اس لئے بچہ اسے "ماں بچوں کی کتاب" کہتے تھے اور یہ نام ایسا پڑ گیا تھا کہ اس سلسلے ہی کو "ماں بچوں" کے نام سے مشہور کر دیا گیا۔ اور ماں بچوں کی پہلی، ماں بچوں کی دوسری، ماں بچوں کی تیسری کتاب کہلانے لگی۔ ہمارے بچپن میں یہی سلسلہ شریک نصاب تھا اور پطرس نے بھی ابتدا "اسی کو پڑھا ہے معلوم نہیں وہ کب سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے آخر رہ نہ سکے اور انہوں نے یہ پیروڈی لکھ دی۔

اس پیروڈی کو لکھتے وقت پطرس کے آگے اصلاحی پروگرام تھا نہ ہی تخریبی صرف تفریحی مقصد پیش نظر تھا جو بڑی عمدگی سے پورا ہوا یہ نہایت ہی مختصر تقریباً چالیس سطر کی پیروڈی ہے مگر پطرس نے جان ڈال دی ہے۔

ماں بچے کے سبق کا خاکہ انہوں نے اس طرح اڑایا ہے:-

"ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے:-

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دلہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باتی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے تو یہ بے چین ہو جاتی ہے سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک

پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے، کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری ماماتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک اور اُبال دیتی ہے جب صبح بچہ کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے دن چڑھے منہ دھلاتی ہے آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ وا۔"

یہ تھا پہلا شہپارہ، اب دوسرا شہپارہ ملاحظہ فرمائیے یہ اس سبق کی پیروڈی ہے جو "کھانا پک رہا ہے" نام سے ہے۔

"کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکار رہی ہے ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے، ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا کسی میں چوہے کھیلنے اور پانی کا لوٹا پاس ہے۔ تاکہ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے غرض کہ سب کام ہو چکا ہے لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے، ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹروں سے علاج کروانا پڑے۔"

یہ تھا دوسرا شہپارہ، تیسرا شہپارہ جس کا عنوان "دھوبی کپڑے دھو رہا ہے" تھا یوں خرادپر چڑھتا ہے۔

"دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے کبھی نلکے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑے والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے دوپہر ہونے کو آئی اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا، درخت کے نیچے بیل بندھا ہے جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے، دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا، کپڑا پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا، کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے اب دھوبن گانا گائے گی دھوبی دریا سے نکلے گا دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب! کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں، کیا مجال کوئی پاس تو آجائے۔ لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں۔ پھر واپس نہیں لے سکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو ننگا پھرتے ہو۔"

اس پیروڈی کا پورا لطف اس وقت آئے گا جب آپ" ماں بچوں کی کتاب" سامنے رکھ لیں اور پھر ہر سبق کا اس سے مقابلہ کریں افسوس ہے کہ یہ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے ورنہ میں دونوں نقل کرتا۔

اس (اردو کی پہلی کتاب) کو دیکھے زمانہ ہوگیا مگر پھر بھی بعض جملے ابھی تک ذہن میں ہیں۔ بڑی ہی نفیس پیروڈی لکھی ہے یہ اردو میں پیروڈی نگاری کی پہلی کوشش تھی جو سو فیصدی کامیاب رہی ہے۔ دوسری کوشش بھی پطرس ہی نے" لاہور کا جغرافیہ" کے عنوان سے کی ہے جو مضامین پطرس کا آخری مضمون ہے۔" اردو کی آخری کتاب" سے زیادہ لمبی اور بڑی ہی نفیس ہے۔ پہلے آپ لاہور کا کوئی ایسا جغرافیہ لیجئے جو آج سے بیس سال پہلے وسطانی جماعتوں کے لئے لکھا گیا ہو پھر اس کو سامنے رکھ کر پطرس کی پیروڈی کا مطالعہ کیجئے۔

ایک بڑی ہی بے ساختہ تمہید کے بعد لکھا ہے

"لاہور لاہور ہی ہے مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔"

محل وقوع بتاتے ہوئے دو بڑی غلط فہمیاں رفع کی ہیں ایک یہ کہ:

"لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں، ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے بہنے کا شغل عرصہ سے بند ہے اس لئے اب یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے، یا بائیں کنارے پر۔"

دوسری غلط فہمی اس طرح رفع کی ہے۔

"لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو پی کے حملہ آور دلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"

حدود اربعہ جغرافیہ میں بڑی چیز ہے پطرس نے بڑی خوبی سے لاہور کے حدود اربعہ بیان کئے ہیں:—

"کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبار کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے، اور روز بروز واقع تر ہوتا جا رہا ہے ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔"

آب وہوا میں پطرس نے جو ندرت پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے سنئے :

"لاہور کی آب وہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے، کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب وہوا دی جائے میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے، اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی، کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دیئے ہیں جہاں یہ مرکب مفت تقسیم ہوتا ہے۔"

آب رسانی کی جو تفصیل لکھی ہے وہ تو بس غضب کی ہے۔

"پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لئے نل ضروری ہیں چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جابجا نل لگوا دیئے ہیں فی الحال ان میں آکسیجن اور ہائیڈروجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ

عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں مناتے ہیں۔"

ذرائع آمد و رفت جس عمدگی سے ظاہر کئے گئے ہیں وہ قابلِ دید ہیں :—

جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گذرتی ہے تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردو بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیئے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ڈنڈے لگا کر اس میں ایک گھوڑا اٹانک دیتے ہیں اصطلاح میں اس کو تانگا کہتے ہیں شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو، اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں قصابوں کی دکانوں پر ان ہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے تانگوں میں ان کی بجائے نباسپتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں نباسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے۔ اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔"

قابلِ دید مقامات بھی بڑے ہی لطیف ہیں یوں تو یہ سارا مضمون طنز ہی طنز ہے مگر یہ پارہ تو بڑا ہی گہرا طنز ہے سنئے :—

"لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا ہی جاتا ہے، شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں مثلاً "اہلِ لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً گریجویٹ درزی ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کیلئے

نادر موقع یا کھیتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا، رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے، دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے، بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام ہے، اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں، عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوار کھے ہیں، یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی اتبلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے دیوار پر خود نقش کر دئے جاتے ہیں یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے ان دوامی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے چنانچہ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحرف جلی" محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ انقلاب کا دفتر ہے جہاں" بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں" خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب کا مکان ہے "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور" کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔"

صنعت و حرفت میں تو پطرس نے کمال کر دیا ہے لکھا ہے:۔

"اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے ہر رسالہ کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں' عام نمبر' میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے، اور فنِ تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چونکہ ان انجمنوں کے اغراض

ومقاصد مختلف ہیں اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے، سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شریک ہوتا ہے اس سے ان کا مطمع نظر وسیع ہوتا ہے تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔"

پیداوار میں تو پطرس نے طنز کے پورے تیر و نشتر بڑے ہی زور شور سے چلائے ہیں، لکھتے ہیں :—

"لاہور کی سب سے بڑی پیداوار یہاں کے طلبار ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے. اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ طلبار کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں، قسم اوّل جمالی کہلاتی ہے یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے، غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں

ع

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک خط لکھتے رہتے ہیں، دوسری قسم جلالی طلبار کی ہے، ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے ہوئے پھرتے ہیں، کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی اس لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبار کی ہے یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ آفرنیش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریئے پیش کرتے ہیں۔ جسمانی صحت کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڈ پیلتے ہیں۔ اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں چوتھی قسم خالی طلبار کی ہے یہ طلبار کی خالص ترین قسم ہے ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے حسب معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں

دیتے۔ اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبار کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اناکے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کرسکتے ہیں ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کردی ہے کہ آئندہ سے صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔"

طبعی حالات میں کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی صرف یہ لکھا گیا ہے کہ

" لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں۔"

البتہ سوالات بڑے ہی لطیف ہیں بسم اللہ آپ بھی ان کے جواب دیجئے :

" (۱) لاہور تمہیں کیوں پسند ہے ؟ مفصل لکھو

۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں ؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔

۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔"

لیجئے اس شان سے یہ طنزیہ شاہ کار ختم ہوتا ہے اس میں پیروڈی کا کمال طنز کی انتہا اور مزاح کا لطیف ترین پہلو موجود ہے پڑھتے اور مزے لیتے جایئے کاش پطرس ایسے ہی دوچار مضامین اور لکھتے جو اردو ادب کی جان ہوتے۔ یہ دونوں مضامین ان کی جوانی کی امنگوں کے زمانہ کے ہیں بعد میں وہ اس قسم کے مضامین اگرچاہتے بھی تو لکھ نہ سکتے۔

ابتدا طنز و مزاح مجھے بھی پسند تھا اور میں نے بھی چند مضامین لکھے جن میں سے دو ایک مضمون پطرس نے بہت پسند کئے تھے مگر وہ مضامین بھی میں نے اسی عمر میں لکھے تھے جس عمر میں پطرس نے یہ مضامین لکھے ہیں۔ اس عمر کے بعد یعنی چہل سال عمر عزیز گذار کر میں نے پھر ویسے ہی مضامین لکھنے کی کوشش کی تو کامیابی نہ ہوسکی۔

مزاح نگاری اور طنز نویسی کا تعلق اپچ سے ہے جس شخص میں جتنی اپچ ہوگی وہ اتنا ہی بہترین مزاح نگار اور طنز نویس ہوگا مگر یہ اپچ عنفوان شباب سے شروع ہوکر تیس پینتیس برس کی عمر میں ختم ہوجاتی ہے اس کے بعد اس میں شک نہیں کہ خیالات میں پختگی طرز تحریر میں لوچ اور اپنا ایک اسلوب اور ڈھنگ الگ ضرور بن جاتا ہے مگر وہ چیز جو اپچ کہلاتی ہے باقی نہیں رہتی اب کہنے کو یوں کہہ لیجئے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا

مگر حقیقت یہ ہے، کہ لطافت تحریر اور قلمی البیلا پن مفقود ہوجاتا ہے۔

" میں ایک میاں ہوں " یہ سو فیصدی مزاحیہ مضمون ہے ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت حقیقت بھی ہو یا پھر بالکل ہی فرضی ہو مگر ہے بڑا ہی لطیف مضمون، اس میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو ایک شادی شدہ اور نئے شادی شدہ نوجوان کو پیش آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ان سب دوستوں سے جلنے لگتی ہے جو زیادہ بے تکلف اور چہیتے ہوں کیونکہ اسے ایک قسم کی رقابت محسوس ہوتی ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ ہر طرح صرف وہی اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بنی رہے کوئی اور شخص یا اشخاص اس میں حصہ دار نہ ہوں یہ عورت کی فطرت ہے اس لئے یہ مطالبہ بالکل فطری ہے اس سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عورت پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ دوستوں سے آپ کو محبت ہے یا آپ کے دوست آپ سے محبت کرتے ہیں چنانچہ اسی چپقلش کو پطرس نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں بیان کر دیا ہے چونکہ سے

ذکر روشن آرا کا اور پھر بیاں اپنا

ہے اسی لئے شوخی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

مجرد شخص کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے ابتداً اپنی زندگی میں تبدیلی دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور پھر وہ وہی تنہائی اور بے لگامی پسند کرنے لگتا ہے چنانچہ اس متاہلانہ زندگی میں کوئی وقفہ بیوی سے تھوڑی بہت عارضی دوری کا مل جائے تو فوراً خوش ہو جاتا اور بڑی مسرت کا اظہار کرنے لگتا ہے مگر صرف چند گھنٹوں تک، اس کے بعد پھر ردِ عمل شروع ہوتا ہے اور تنہائی بری طرح ستانے لگتی ہے چنانچہ پطرس نے بھی اسی تجربے کو بڑی ہی سادگی سے لکھ دیا ہے۔ وہ بیوی کے جانے کے بعد جتنے خوش تھے ایک رات گزرتے ہی اتنے ہی مغموم ہو گئے اور نہ صرف مغموم ہوئے بلکہ بیوی کو تار تک دے دیا کہ "فوراً آجاؤ"

گھر خالی ہو اور بے تکلف احباب جمع ہو جائیں تو جوانی میں بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے جو تاش کھیلنے میں پطرس کی ہوئی چنانچہ چور بنے ہوئے چلم بدست، کلاہ کاغذی بر سر روسیاہی کے عالم میں بیوی نے دیکھ لیا۔ اس کے بعد کی کیفیت پطرس ہی سے سنئے:۔

"روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی
اور پھر کہنے لگی .... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک
جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔"

اس کے بعد پطرس نے صفائی پیش کی ہے مگر یہ حصہ وہ نہ لکھتے ہی تو بہتر تھا اس خاتمے پر ہی قاری سب کچھ سمجھ لیتا دیکھ لیتا پا لیتا سوچ لیتا اور محسوس کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون بڑا ہی نفیس ہے یہ کلاہ کاغذی جس کے سر پر رکھ دیجئے بقول بن جاتا ہے صاحب ذوق جوانوں میں اسی فیصدی ایسے نظر آئیں گے جن پر اس قسم کے حادثات گذر چکے ہیں مگر دس فیصدی بھی اتنے صاحب کردار نظر نہ آئیں گے جو ڈنکے کی چوٹ ان حادثات کا ذکر کر سکیں اور اگر دو ایک ہمت کر بھی لیں تو انہیں اسلوب نگارش نصیب نہ ہو سکے گا۔

بظاہر ایک سیدھا سادہ سا واقعہ بیان کر دینا کوئی بات نہیں مگر اس عمدگی اس تسلسل اس ہم آہنگی اس روانی اس ڈھٹائی اس صفائی اس شوخی اس شستگی اس خوب صورتی اس نفاست اس ندرت اور اس ہمت سے لکھنا کمال ہے اور یہ کمال پطرس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔

"مریدپور کا پیر" یہ مضمون پطرس نے معلوم نہیں کسی ایک شخص کو سامنے رکھ کر لکھا ہے یا کئی ایک اشخاص کو کیونکہ یہ بعض خاص خاص لوگوں کی چغلی کھاتا ہے ممکن ہے محض قیاسی اور فرضی ہو مگر ہے بڑی اچھی چیز، بیشتر حضرات اس قسم سے بن چکے ہیں۔ چنانچہ میں بھی ذاتی طور پر مریدپور کے کئی ایک پیروں سے واقف ہوں جو لیڈر بنتے بنتے رہ گئے اور رہے بھی تو ایسے کہ کہیں کے نہ رہے، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ایسے ہی ایک بزرگ کا واقعہ اس میں موجود ہے چونکہ کسی اور کا نام لینا اپنی عافیت میں خلل ڈال لینا تھا اس لئے پطرس نے اپنے آپ ہی کو
مرید پور کا پیر بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر آپ باور کیجئے کہ پطرس میں لیڈر پن کا کوئی حوصلہ نہ تھا۔ اور نہ وہ اتنے بدذوق تھے کہ یکمشت لیڈر بننے کو تیار ہو جاتے۔ ان
کے بے تکلف دوست بتا سکتے ہیں کہ اس خاکے میں کس کی مٹی پلید کی گئی ہے، کاش سالک صاحب اس پر روشنی ڈالیں اور مرید پور کے پیر کو بے نقاب
کریں۔

ایک جاہل اور سیاسیات سے ناواقف شخص لیڈر بننے کے لئے کس طرح کوشاں رہتا ہے اور لیڈری کی تیاری کس طرح کرتا ہے یہ مضمون آپ
کو ساری تفصیل سمجھا دے گا اب اگر اسے پڑھ کر آپ بھی لیڈری فرمانے لگیں تو بسم اللہ!

"انجام بخیر" یہ مال کچھ غیر کا معلوم ہوتا ہے مگر پطرس نے اس عمدگی سے اپنایا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اسے آپ چاہے مکالمہ کہیں یا
ایک ایکٹ کا ڈرامہ یا فکاہیہ جو کچھ ہے بڑی ہی عمدہ چیز ہے۔

"سینما کا عشق" بقول پطرس اس مضمون کا عنوان ہوس خیز ہے مگر اس کے پڑھنے کے بعد "تمام توقعات مجروح" ہو جاتی ہیں کیوں کہ
اس میں پطرس نے کچھ دل کے داغ دکھلائے ہیں۔

دراصل یہ ہجو نامہ ہے پطرس کے دوست مرزا کا اور ان کا کردار پیش کر کے پطرس نے اپنا غصہ فرو کیا ہے ایسے دوست اکثر ہوتے ہیں اور
ان سے نباہنا ہی پڑتا ہے اس لئے یہ سب کٹھنائیاں اس دوستی میں جھیلنی پڑتی ہیں شریف لوگ اپنے دوست احباب کو تفریح کے وقت ساتھ لیجاتے
ہیں چنانچہ پطرس نے بھی ایسی ہی طبیعت پائی ہے وہ جب کبھی سینما دیکھنا چاہتے ہیں مرزا کو ساتھ لے جاتے ہیں اور مرزا اپنی کاہلی کی وجہ سے وقت پر چلتے
ہی نہیں اور پھر سینما دیر سے پہنچنے کے بعد جو اذیتیں ہوتی ہیں ان کی بعینہٖ تفصیل پطرس نے لکھی ہے یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ بولتے فلم شروع نہیں
ہوئے تھے ساکت فلم تھے۔ ایسے فلموں میں درمیان میں یعنی فلم شروع ہونے کے بعد پہنچنا ہی فضول ہوتا تھا کیونکہ ان کا سمجھنا اور کڑیاں ملانا مشکل ہو
جاتا تھا۔ صرف اس قدر سمجھ سکتے تھے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے ظاہر ہے کہ وقت اور
روپیہ خراب کر کے صرف اتنی سی بات معلوم کرنے سینما پہنچنا تو نہایت ہی دیوانہ پن ہے اسی بات پر پطرس کو غصہ آتا ہے اور وہ دل کی بھڑاس
اس مضمون میں نکال لیتے ہیں۔

یہ مضمون اپنی روانی، تسلسل اور زور کے لحاظ سے بڑا ہی یکساں، تیکھا اور مزے دار ہے اس میں انسانی جھنجلاہٹ کے سارے پہلو
نمایاں کئے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے
جسے لوگ صرف واقعات کا اظہار سمجھ کر بھی پڑھ لیتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت اس سے عبرت بھی حاصل کرتے ہیں اور اہلِ دل اس کے طنز سے
لطف اٹھاتے ہیں۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں کسی واقعی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی
ایک سادہ لوحی کا نقش جمیل ہے قصہ یہ ہے کہ ایک روز پطرس کو اپنی "پیدل زندگی" پر کوفت ہونے لگی۔ اور انہوں نے مرزا سے گفتگو کی تو مرزا نے
عجیب و غریب رویّہ کا اظہار کیا اس پر جب کہ انہوں نے موٹر کی خریداری کا ارادہ ظاہر کیا اور مرزا نے سنجیدگی سے موٹر کی قیمت کی ادائیگی کے متعلق گفتگو
شروع کر دی بالآخر موٹر کی بجائے سیکل کی خریداری طے ہوئی تو مرزا نے اپنی سائیکل پیش کی کہ بلاقیمت لے لو، مگر پطرس کو بلاقیمت سیکل قبول کرنے
سے انکار رہا اور انہوں نے مبلغ چالیس روپے سیکل کی قیمت کے طور پر مرزا کی جیب میں ڈال دیئے، اور رات ہی میں مرزا نے سائیکل بھجوا دی جسے

صبح پطرس نے دیکھا تو خوشی خوشی اس پر سوار ہو کر سیر کو چلے۔ یہ سائکل ادبی تخلیقات میں سے تھی۔ جواز کار رفتہ ہو گئی تھی اب اس پر چڑھ کر کیا حال ہوا اس کی تفصیل پطرس نے جس چابک دستی سے لکھی ہے وہ انہیں کا اور صرف انہیں کا حصہ تھا۔ اسی طرح کا ایک مضمون یا مضمون میں اسی طرح کا ایک پارہ سجاد حیدر یلدرم نے بھی آج سے پچاس سال پہلے لکھا ہے اور اس کے پورے پچیس سال بعد پطرس نے لکھا ہے مگر جو بات پطرس نے پیدا کی ہے وہ سجاد حیدر کو نصیب نہ ہو سکی تھی۔

اس مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو بے ہودہ ہو، کوئی عبارت ایسی نہیں ہے جو مضحکہ خیز ہو، صرف سائیکل پر سواری کرنے کی تفصیل بڑے ہی معصومانہ اور سیدھے سادھے الفاظ میں ہے جو کمال ہے پطرس کی انشاپردازی کا، ناممکن ہے کہ کوئی شخص پڑھے اور مارے ہنسی کے بے چین نہ ہو جائے پطرس کے مزاحیہ مضامین میں یہ شاہ کار ہے جو نہ صرف بے ساختہ ہے بلکہ بڑی ہی فن کاری سے لکھا گیا ہے کیونکہ اس سیکل سے گر کر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے لے جا کر دریا میں ڈال آتے ہیں اس لئے اسے مرحوم فرض کیا ہے اور اس قصہ کو مرحوم کی یاد سے تعبیر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی لطیف طنز و مزاح کا آمیزہ ہے۔

اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب، تمدن، روزمرہ زندگی اور فطرت انسانی کے بڑے بڑے نکتے حل کر دئے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔" دیکھئے نفسیات کا کتنا پیچیدہ مسئلہ اس نکتے نے حل کر دیا۔ اس کے بعد ہی کیونٹ ذہنیت کا نقشہ کس لطافت سے کھینچا ہے۔

"میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے۔ کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔"

فرمائیے اس سے بہتر تشریح کمیونسٹ ذہنیت کی کوئی کر سکتا ہے۔ اور اس پر اس سے بہتر طنز کہیں آپ نے سنی ہے؟ پیدل روی اور انسانی پیدل زندگی سے متعلق پطرس کی ہیں جب مرزا پر اثر نہیں کرتی تو پطرس ان سے یوں انتقام لیتے ہیں:-

"میں نے اپنے دانت بھینچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔"

آپ جانتے ہیں پطرس نے مرزا سے کیا کہا صرف اتنا کہ "مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں" اور پھر اس کی توضیح و تشریح بھی الفاظ و اشارات سے کی مگر مرزا بھی ایسا خرانٹ تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے "ہوں" پر ٹرخا دیا اور مسلسل "ہوں" کی رٹ لگا دی جس سے پطرس بگڑ گئے اور :-

"میں نے کہا مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو دو تین تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے پھر بھی اس وقت تمہارا کلام 'ہوں' سے آگے نہیں بڑھتا، تم جلتے ہو مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مگر مرزا نے بڑی دکھتی رگ پکڑی پوچھا

"تم نے کہا تھا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

اس کے بعد پطرس نے اپنی قیمتی اشیا بیچ کر موٹر کی قیمت جمع کرنی چاہی مثلاً سگریٹ کیس وغیرہ مگر یہ قیمتی اشیا بہت ہی کم قیمت ثابت ہونے لگیں مجبوراً اس خیال کو ترک کر دینا پڑا اگر مرزا نے حق دوستی ادا کر دیا اور اپنی سیکل مفت دینے کی پیش کش کی اس پیش کش سے پطرس کو کتنی مسرت ہوئی ان الفاظ سے ظاہر ہے:—

"ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ واپس نہ آئیں۔"

اس کے بعد بڑی دیر تک رد و قدح ہوتی رہی پطرس مفت لینے کو تیار نہ تھے اور مرزا مفت دینے کے خواہشمند تھے بالآخر طے ہوا کہ پطرس رقم مرزا کی جیب میں ڈال دیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا تو چالیس روپے ملے جن میں سے چالیس روپے انہوں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور مرزا چلتے بنے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ مرزا نے رات ہی کو سائیکل بھجوا دی تھی۔ اور ایک اوزار بھی ساتھ ہی بھجوا دیا تھا یہ سائیکل کیسی تھی پطرس ہی سے سنئے:—

"رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیئے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔"

اس آلۂ ناکارہ پر جسے مرزا نے سائیکل بتایا تھا اور پطرس بھی سائیکل ہی سمجھ رہے تھے پطرس سوار ہوئے اور تماشا بنے ہوئے گھومتے رہے بالآخر تنگ ہو کر ایک مستری کی دکان پہنچے تو اس نے درستی کی اجرت چالیس روپے مانگی مگر انہوں نے پوری مشین درست نہیں کرائی صرف ہینڈل اور سیٹ (گدی) اونچی کر کے کسا دی اور دو آنے پیسے دے کر جانے لگے تو مستری نے کہا۔

"میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

اس پر پطرس نے ڈانٹا

"بدتمیز کہیں کا، تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

مستری بند کیوں ہوتا اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا

"جناب! آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ . . . . بلکہ یہ وہی بائیسکل ہے، جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تم نے؟ کبھی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

یہ سن کر پطرس بگڑے کہ

"واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مگر مستری نے ترٹ سے جواب دیا

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔"

اس بات چیت سے اندازہ کر لیجئے کہ سودا نے گھوڑے کی ہجو میں جو یہ کہا تھا کہ آدم اسی پر سوار ہو کر جنت سے نکل آئے تھے اسی طرح یہ بائیسکل بھی وہی تھی جو موجد نے پہلے پہل تخلیق کی تھی۔

اس طرح مستری سے نپٹ کر پطرس نے اس مشین کو فروخت کر دینا ہی مناسب سمجھا چنانچہ ایک دکان دار کو دکھایا تو اس نے بڑی رد و قدح کے بعد تین روپے قیمت لگائی یہ سن کر پطرس کا خون کھول اٹھا اور انہوں نے غصہ سے کہا۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اس بے جان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔"

اسی غصے میں وہ اچک کر سیکل پر سوار ہو گئے اور لگے اندھا دھند پاؤں چلانے مگر بہ مشکل بیس قدم گئے ہوں گے کہ ایک پہیہ ہی الگ ہو گیا اور حضرت گرے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سائیکل کا باقی ماندہ حصہ اور علیحدہ شدہ پہیہ ہاتھ میں لئے وہاں سے رفو چکر ہو جاتے چنانچہ ایسا ہی کیا مگر راستہ والوں کے فقرے، پھبتیاں، جب برداشت نہ ہو سکے تو یہ بوجھ اٹھائے ہوئے سیدھے دریا پر پہنچے اور پل پر کھڑے ہو کر یہ کھڑاک غرق کر دیا اور پھر مرزا کے گھر پہنچ کر اس اوزار کو جسے مرزا نے سائیکل کے ساتھ بھجوایا تھا یہ کہہ کر نذر کر دیا کہ

"مرزا صاحب! آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

پھر وہاں سے گھر آ کر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جو ایف اے میں پڑھی تھی۔ معلوم نہیں اس مطالعے سے بم بنانے کا نسخہ معلوم کرنا تھا یا خودکشی کے لئے زہر کا انتخاب مقصود تھا۔ بہر حال صرف اتنی سرگذشت سیکل کی تھی۔

"میبل اور میں" یہ ایک افسانہ اور طنزیہ افسانہ ہے مرد عام طور پر نیک اور سادہ لوح واقع ہوا ہے وہ ہمیشہ عورت کو نیک اور معصوم سمجھتا ہے اور پھر اگر تعلیم یافتہ مرد ہوا اور عورت یورپ کی ہو تو اس کی نیک نیتی اور سادہ لوحی اور بڑھ جاتی ہے چنانچہ ایسا ہی معاملہ میبل سے ہوا ہے عورت ہمیشہ مرد کو دھوکہ دیتی ہے اور شرماتی نہیں مگر مرد کسی عورت کو کبھی دھوکا دیتا ہے تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے چنانچہ یہی اس افسانے کا ماحصل ہے شکر کہ یہ عقیدہ پطرس پر میبل کی وجہ سے عنفوانِ شباب ہی میں حل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ آئندہ زندگی میں خصوصاً آخری زندگی میں محفوظ اور مطمئن رہ سکے ورنہ بڑے پریشان ہوتے۔

بس یہ کائنات ہے پطرس کے مضامین کی اتنے ہی مضامین ان کے مجموعہ میں ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ان کی طالب علمی کے زمانے کے چند اور مضامین بھی ہیں جو راوی میں طبع ہوتے رہے۔ پطرس نے گالزوردی، شا اور اسٹی ونسن کے ترجمے بھی کئے ہیں مگر افسوس کہ وہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہیں۔

پطرس نے اس ساٹھ سالہ مدت میں بہت کم لکھا ہے ان کی نگارش کی ابتدا تقریباً بیس سالہ عمر سے ہوتی ہے اس طرح وہ چالیس سال لکھتے رہے مگر اس چالیس سال کی قلم کاری اگر اکٹھی کی جائے تو بمشکل نقوش کے تین سو صفحات پر محیط ہو سکے گی مگر یہ کمی دوسرے انشا پردازوں کی زیادتی سے متاثر نہیں ہوتی انشا میں اصل چیز ندرت اور نفاست ہے بہتات نہیں ورنہ بعض کم سوادوں نے آٹھ دس سال میں ہزاروں صفحات سیاہ کرڈالے ہیں مگر ان کی نگارش میں کوئی بات نہیں۔ پطرس نے انگریزی ادب کی روح کو ہندوستانی مزاج دے کر اپنی نگارش میں ایک خاص لطف، نکھار اور رکھ رکھاؤ پیدا کر لیا تھا جو اپنی وضع کی ایک ہی چیز ہے۔

پطرس کی موت نے علم و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ ان کا پورا کام اکٹھا کر کے شائع کیا جائے اور لوگ ان کی پیروی کی کوشش کریں، کاش طفیل صاحب اس پطرس نمبر میں پطرس کا پورا کام شریک کر دیں یہ بہترین خراج عقیدت ہوگا پطرس کی روح کو۔

افسوس ہے کہ طفیل صاحب نے مجھ سے ایسے وقت میں مضمون کی خواہش کی ہے جبکہ میں دمہ اور خون کے دباؤ سے علیل ہوں اس پر ان کا تقاضا بھی ہو رہا ہے مجبوراً اس مضمون کو میں نے بڑے ہی نامساعد حالات میں ختم کیا ہے اگر پطرس کا حق مجھ پر نہ ہوتا تو یقیناً یہ نہ لکھ سکتا مگر مرحوم کا حق مجھ پر ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ انہیں خراج عقیدت ادا کروں، رہا مضمون کی ناہمواری اور بے ترتیبی اس کے لئے مجبور ہوں کیوں کہ علالت کی وجہ سے دل قابو میں ہے نہ دماغ نہ قلم۔

پطرسؔ کی تحریف نگاری

وزیر آغا

پطرسؔ کی تحریف نگاری کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل تحریف یا پیروڈی کے مزاج کے بارے میں بعض باتوں کا اظہار ضروری ہے۔
پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی
عنصر "نقل" ہے لیکن نقل بذاتہ کوئی مضحک پہلو پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً فیشن ایک خاص انداز یا اندازِ نظر کی نقل ہی تو ہے لیکن یہ سارا عمل سنجیدگی
سے مملو ہے۔ اور ہنسی کو تحریک نہیں دیتا۔ اسی طرح بچے غیر ارادی طور پر اپنے بڑوں کے اعمال کی نقل کرتے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی
کرتے ہیں۔ اور دراصل یہ نقل فطرت کا وہ طریقِ کار ہے جو تجربے کے عمل کو قطع کر کے تہذیبی ارتقاء کی دوڑ میں انسان کو سرگرم عمل کرتا اور اسے جلد
از جلد گزرے ہوئے تہذیبی مراحل سے آشنا کرتا ہے لیکن جب یہی نقل اس مقصد کے ساتھ عالمِ وجود میں آئے کہ اصل کی تضحیک سے سامان
انبساط بہم پہنچا سکے، تو تحریف یا پیروڈی کی صنف میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ تحریف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تحریف اعمال، اشیاء یا تخلیقات کی "عظمت"
کو زندگی کے غیر اہم مظاہر سے مربوط کر کے "عظمت" کے سحر کا پردہ چاک کرتی اور ناظر کو کھلکھلا کے ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دراصل تحریف کی کامیابی
کا راز ہی اس بات میں ہے کہ یہ عقیدت، جذباتی وارفتگی اور اندھا دھند تقلید کے عمل اور اس عمل کی بیزار کن یک رنگی کا ناظر کو احساس دلائے اور
اسے "عادت" کے حصار سے لحظہ بھر کے لئے رہائی دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ چنانچہ جتنی جذباتی کوئی کیفیت ہوگی اور جتنے انہماک، خود سپردگی
اور والہانہ پن کا یہ مظاہرہ کرے گی، اتنا ہی تحریف کی زد میں بھی آجائے گی۔ شاید اسی لئے کامیاب ترین تحریف ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو مقبولِ عام
نظریات کی جذباتی نوعیت کو طشت از بام کرتی۔ اور ایک خاص ڈگر پر چلتی ہوئی زندگی کا رخ موڑ دیتی ہے چنانچہ قابلِ تحریف نگارشات یا نظریات
کے لئے پہلے زبان زدِ خاص و عام ہونا ضروری ہے ورنہ تحریف کا وہ نوکیلا نقطہ ابھر کر سامنے نہیں آسکے گا جو بلند کو پست کے ساتھ مربوط کر کے ایک
مضحکہ خیز صورتِ حال کو جنم دیتا اور جذباتی ابال میں شگاف پیدا کر کے زندگی کو اپنی نارمل سطح حاصل کرنے میں مدد بہم پہنچاتا ہے۔
تحریف کا مقصد کیا ہے؟۔۔۔ مقصد کے تعین کے سلسلے میں تمام اہلِ نظر متفق نہیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ تحریف کا
مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ یعنی سنجیدگی، کام کاج، جذباتی انہماک اور خود سپردگی کے ایک طویل وقفے کے بعد اعمال اور کیفیات
کی دقعت کو کم کر کے تفریح مہیا کرنا ہی تحریف کا سب سے بڑا مقصد ہے لیکن بعض اہلِ نظر اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تحریف
ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہی اہم ترین مقصد ہے۔
اصل بات ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے یعنی تحریف کا مقصد نہ صرف تفریح بہم پہنچانا ہے۔ اور نہ اس کے پیشِ نظر محض اصلاح کا نظریہ ہوتا

چاہئے۔ چنانچہ تحریف یا پیروڈی ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی RELIEF کے حصول میں مدد لیتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر معاشرے کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بناتا ہے۔ چنانچہ تحریف کے ضمن میں اصل بات کسی مقصد کا تعین نہیں بلکہ یہ ہے کہ تحریف نگار اصل کی ایسی لفظی نقالی کا نمونہ پیش کرے کہ اصل کی تضحیک ہو سکے۔ تضحیک کے بنیادی عناصر مزاح تک بھی محدود ہو سکتے ہیں۔ اور پھیل کر طنز کا احاطہ بھی کر سکتے ہیں۔ اور یہ چیز موضوع اور ماحول کے تابع ہے چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریف کا قیمتی عنصر اس کی اپنی ہئیت ہے۔ جتنی کامیاب اس کی ہئیت ہوگی اور جتنی کامیابی سے یہ اصل اور نقل میں ہم آہنگی اور تضاد کو نمایاں کر سکے گی۔ اتنا ہی یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگی چاہے یہ مقصد محض آسودگی کی تحصیل ہو یا جذبۂ افتخار کی تسکین۔

پطرس کے ہاں تحریف کے یہ دونوں رُخ ملتے ہیں۔ یعنی ان کی ایک تحریف نے تو آسودگی کے احساس کو جنم دیا ہے اور دوسری نے بعض ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ ہئیت کے لحاظ سے بھی ان دونوں تحریفوں میں ایک نمایاں فرق ہے۔ ایک تحریف قطعاً لفظی ہے اور اس میں محض الفاظ کی معمولی تبدیلی سے اصل کا حلیہ اس طور بگاڑ دیا جاتا ہے۔ کہ اصل سے ناظر کا جذباتی تعلق بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے اور ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے دوسری تحریف لفظی نہیں بلکہ صرف ایک مخصوص طریق کار اور ایک خاص اندازِ نظر کی نقل تک محدود ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی تحریف براہِ راست اصل سے متعلق ہے لیکن دوسری نے اصل کا سہارا لے کر ایک بالکل مختلف میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں" پہلی تحریف " اردو کی پہلی کتاب" پر پطرس کی مشہور پیروڈی ہے۔ اور دوسری میں انہوں نے جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کا تو ایک خاص حد تک لیکن بعض سماجی بے اعتدالیوں کا ایک بڑی حد تک مذاق اڑایا ہے۔ تاہم ان دونوں تحریفوں میں تحریف کے بعض بنیادی عناصر کو اس درجہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہم ان کو اردو زبان کی بہترین تحریفات میں شمار کرنے پر مجبور ہیں۔ پطرس کی پہلی تحریف " اردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھئے:

"دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکار رہی ہے ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے کسی میں آٹا اور کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلالے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے پنکھا نہیں رکھتی۔ رکھا چکھتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔"

——— کھانا خود بخود پک رہا ہے

"بڑی محنت کرتا ہے شام کو کھیتی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ جا سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ . . . ."

"میاں دھوبی یہ کتا کیوں پال رکھا ہے۔ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں کیا مجال کوئی پاس تو آجائے جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے سکتے۔ میاں دھوبی تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو، ننگا پھراتے ہو۔"

ــــــــ دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے۔

تحریف کے مندرجہ بالا نمونے جو پطرس کی پیروڈی "اردو کی آخری کتاب" سے لیے گئے ہیں اس بات پر دال ہیں کہ پطرس نے اپنی اس تحریف میں تحریف نگاری کے مقتضیات کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے مثلاً ان کی یہ تحریف لفظی ہے اور اصل کی جذباتیت کا بے رحم تجزیہ پیش کرتی ہے۔ دوسرے یہ تحریف ایک ایسی تحریر کی پیروڈی ہے جو زبان زدِ خاص و عام ہو چکی ہے اردو کی پہلی کتاب کے یہ مضامین کسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھے تھے۔ اور پھر اپنی رواں دواں کیفیت، ڈرامائی انداز اور اظہار و بیان کی سادگی کے باعث اس درجے مقبول ہوئے کہ ایک عرصۂ دراز تک ان کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی چنانچہ ان کے بار بار مطالعہ سے ایک ایسی بیزار کن یک رنگی پیدا ہوگئی اور تکرار نے ان کے نوکیلے کنارے اس حد تک کند کردیئے کہ تحریف کی مدد سے ایک لحظہ کے لئے رکنے اور تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا رجحان از خود پیدا ہوگیا۔ پطرس کو سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا اور انہوں نے ایک خوبصورت تحریف سپردِ قلم کرکے اصل کے جذباتی مزاج کا مضحکہ اڑانے میں کامیابی حاصل کی۔

پطرس کی اس تحریف کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے پیشِ نظر کوئی سنجیدہ مقصد نہیں اور نہ یہ طنز کی جراحت سے قوت اور استحکام حاصل کرتی ہے۔ اس کی ساری کامیابی اس آسودگی کے احساس میں ہے جو ہلکے پھلکے مزاحیہ نکتوں کی مدد سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ناظر کی جذباتی وارفتگی میں بھی ایک بچت (ECONOMY) پیدا کردیتا ہے۔ چنانچہ تصویر کا دوسرا رخ دکھانے، کرداروں کا مذاق اڑانے اور بات کی بلند سطح کو حقائق کی پست سطح سے ملانے میں پطرس نے ایک ایسا ہمدردانہ اندازِ نظر اختیار کیا ہے کہ ناظر کے دل میں اصل سے نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اصل سے محظوظ ہونے لگتا ہے۔

پطرس کی دوسری تحریف کا عنوان ہے ــــ "لاہور کا جغرافیہ" ــــ اس تحریف سے یہ چند نمونے قابلِ غور ہیں:۔

"تمہید ــــ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجوہ کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

محل وقوع: لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں "راوی ضعیف" کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔

لاہور تک پہونچنے کے کئی رستے ہیں، وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی

کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔

آب وہوا : لاہور کی آب وہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب وہوا دی جائے۔ — لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دیئے ہیں۔

صنعت و حرفت : اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔

پیداوار : لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پلائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔

طبعی حالات: لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں۔"

پطرس کی مندرجہ بالا تحریف کے دو پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یہ تحریف لفظی نہیں بلکہ ایک خاص اندازِ تحریر کی نقل پیش کرتی ہے جغرافیہ لکھنے کا ایک خاص انداز اب اس قدر رائج ہے کہ اس انداز کی سنگلاخی کیفیت میں لچک کی اس قدر کمی ہے کہ تحریف نگار کی تگ و تاز کے لئے ایک وسیع میدان عالمِ وجود میں آگیا ہے چنانچہ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں جغرافیہ کی کسی خاص کتاب کو نہیں بلکہ جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تاہم اگرچہ یہ تحریف نقل تو جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کی پیش کرتی ہے۔ اس کا روئے سخن ایک بالکل مختلف صورتِ حال کی طرف ہے۔ اور یہ اس تحریف کا دوسرا قابلِ ذکر پہلو ہے۔ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں آب وہوا، پیداوار، صنعت و حرفت، طبعی حالات اور بعض دوسرے عنوانات کے تحت لاہور کا جغرافیہ بیان کرنے کی سعی کی ہے لیکن ان عنوانات کے تحت غیر متعلق باتوں کا ذکر کر کے نہ صرف جغرافیائی معلومات کے بارے میں ناظر کی توقعات کو نسخ کیا ہے بلکہ لاہور اور اہلِ لاہور کی بعض ناہمواریوں کو بھی ہدفِ طنز بنایا ہے لیکن شاید اس لئے کہ پطرس بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں ان کی اس تحریف میں طنز کی نشتریت بہت کم پیدا ہوئی ہے اور ہمدردانہ اندازِ نظر اور محظوظ ہونے کے رجحان نے اندازِ نظر کی تلخی کو قطعاً ابھرنے نہیں دیا ہے۔ اس کا ایک ادنےٰ ثبوت یہ ہے کہ حملہ آوروں کے تذکرے میں پطرس نے ازراہِ مذاق یوپی کے حملہ آوروں کا ذکر کیا ہے لیکن بات کو اس سے آگے نہیں بڑھایا کہ یہ لوگ اہلِ زبان ہیں اور تخلص کرتے ہیں اور اقلیمِ سخن کی وسعت کے لئے قریبی علاقوں

پر حملہ بھی کرتے ہیں۔ اتنی سی بات نے کسی ناگوار ردِعمل کو تحریک نہیں دی۔ اور دوسرا فریق جوابی حملے پر مائل نہیں ہوا۔ لیکن بعد ازاں جب کنہیا لال کپور نے اسی ایک نکتے کو لے کر ایک پورا مضمون اہلِ زبان کے بارے میں لکھ ڈالا اور اس ضمن میں تیز تیز نشتر بھی استعمال کئے تو نہ صرف ایک مکمل طنزیہ صورتِ حال معرضِ وجود میں آئی بلکہ بعض مقامات پر اندازِ نظر کی تلخی نے ردِعمل کو بھی تحریک دی اور تلخ ترش تبادلۂ افکار کا آغاز شروع ہو گیا۔ چنانچہ غائر نظر سے دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ اگرچہ اپنی اس تحریف میں پطرس نے طنز کا استعمال بھی کیا ہے تاہم ان کا فطری ہمدردانہ اندازِ نظر اور خوش مزاجی کا رجحان پورے مضمون پر غالب ہے اور جذبۂ افتخار کو تحریک دینے کی بجائے نفسی انبساط کا سامان مہیا کرتا ہے۔

خاتمے سے قبل اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اردو نثر میں تحریف نگاری کے سلسلے میں پطرس کو ایک مقامِ امتیاز حاصل ہے یہ اس لئے کہ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلےٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں اور اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ کے بہت سے معاونین کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اوّل تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں چنانچہ بعض دوسرے اوصاف کے علاوہ پطرس کی تحریف نگاری کو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ اور طنز و ظرافت کے طالب علم کے لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ؛

پطرس کے مضامین

کا سرسری جائزہ

اثر لکھنوی

پطرس کے مضامین میں ظرافت عام جادے سے ہٹ کر ہے۔ اور اس کا آغاز مختصر دیباچے ہی سے ہوتا ہے :۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے (یعنی آپ کی حماقت سے ہمدردی ہے) اب مصلحت یہی ہے (کہ آپ اپنی حماقت کو نباہیں) اور اسے حق بجانب ثابت کریں۔"

نہ معلوم یہ حقیقت ہے یا میری شک بھری طبیعت کہ پطرس کے اظہارِ حقیقت کے تہ میں بھی ظرافت کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے کیوں کہ اپنے استاد کی خدمت میں اعترافِ ممنونیت ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا" جس کا مفہوم میرے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جہاں کوئی بات ہوش مندی کی دیکھی اسے حماقت میں بدل دیا۔

کتاب میں گیارہ مضامین ہیں جو بہ ظاہر "ہولا خبطاپن" کے شاہکار ہیں مگر فی الحقیقت سوسائٹی اور تمدن کی دکھتی رگوں کو چھوتا ہے — اور خام کاریوں اور سفیہانہ رواسم و توہمات کا پردہ فاش کیا ہے۔ پطرس نے اپنا مطلب زیادہ تر مزاح میں طنز کی پُٹ دے کر نکالا ہے، بخلاف دیگر ظرافت نگاروں کے جو تمسخر کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں باوجود اس احساس کے کہ ہم کو (اور معاف کیجئے گا آپ کو) بے دال کا بودم بنایا جا رہا ہے جھنجلاہٹ کے بجائے گدگدانے کی ادا نکلتی ہے اور اسی کے ساتھ غور و تعمق کی دعوت ہوتی ہے۔

ان مضامین کے کاتب کو بھی ظرافت سے کافی بہرہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاوہ دیگر مخترعات کے "ہاسٹل میں پڑھنا" کے عنوان کو ہر جگہ "ہاسٹل میں پڑنا" بنا دیا ہے۔

مضمون میں ظرافت کی چاشنی پہلے ہی فقرے سے شروع ہو جاتی ہے :۔

"ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا۔" 'رفتہ رفتہ' اور 'بھی' کی معنویت دعوتِ نظر دیتی ہے۔ آگے چل کر بی اے کے خلانے اس خوبی سے گنوائے ہیں کہ باید و شاید۔

مضمون میں ایسے خاندان کی ذہنیت کا خاکہ ہے جو مہذب اور اخلاق پسندیدہ کا مالک ہونے کے باوصف قدامت پسند ہے اور حال کو

ماضی کے آئینہ میں مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ لڑکے نے انٹرنس کا امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا ہے تاہم خوشیاں منائی جا رہی ہیں دعوتیں ہو رہی ہیں۔ مٹھائی تقسیم کی جا رہی ہے۔ خاندان خوش حال ہے مگر باوجود استطاعت کے لڑکے کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت نہ بھیجنے کی معقول ترین وجہ یہ ہے کہ "گرد و نواح سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔"

بڑی ہمت کی تو لڑکے کو لاہور بھیج دیا مگر ہاسٹل کے بجائے ایک ایسے اجنبی عزیز کے یہاں قیام کا فیصلہ کیا جاتا ہے جس سے رشتہ داری کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے خاندانی شجرے کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے تاہم ہوسٹل پر اس کے گھر کو یہ کہہ کر ترجیح دی جاتی ہے کہ "گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا دوزخ ہے۔" ضمناً نفسیات کے اس پہلو پر روشنی پڑتی کہ جذبات کو دبا کر تحت الشعور میں ڈھکیل دینا ان کو دُند مچانے کے لئے آزاد چھوڑ دینا اور ارتفاع میں مشکلیں حائل کرنا یا ارتفاع سے محروم کر دینا ہے۔ پطرس کے الفاظ میں:—

"اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ (ماموں قسم کے لوگ؟) اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قوے کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔"

بعد ازاں اس "وہی ہوا" کی شرح ہے۔ امتحانات میں پے در پے فیل ہونا، صلاحیتوں کی بے راہ روی اختیار کرنا۔ صاف گوئی اور راست بازی کا کج مج راستے اختیار کرنا۔ غسل خانے میں چھپ چھپ کر سگرٹ پینا۔ "المختصر وہ آزادی و فراخی دوارفتگی نصیب نہ ہوئی جو تعلیم کا اصل مقصد ہے۔"

پطرس نے مسئلے کے اس پہلو کی ظریفانہ انداز میں اس حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے کہ طبیعت عش عش کرتی ہے۔ تفصیل میں جانا مضمون کی لذتیت کو فنا کر دینا ہے۔ پڑھیے اور لطف اندوز ہوجیے۔

کتاب کا مقصد بھی غالباً فوت ہو جائے گا اگر اس کے مضامین کی چیر پھاڑ کی گئی۔ کتاب انگریزی کے اس مقولے کی بہترین ترجمان ہے کہ مذاق کے پردے میں بہت سی سنجیدہ باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ (Many a serious Thing is said in joke)

نقشِ گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرام جاں آرام جاں گم شد
حدیثِ نام تو تا بر زباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آواز جرس ہر سُو دوید و ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آں آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہارِ سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہیٔ خود ہم ز راہ گمرہاں گم شد

مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

غزل

ہم آں داغے کہ بر دل از تو دارم حرزِ جانم شد
ہم آں چشمے کہ نا مندش سخنگو رازدارم شد

دلے بودہ در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سر گزشت و آسمانم شد

بپرس اے داورِ محشر، چہ مے پرسی چہ می پرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

نگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں رازِ جاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فصلِ داستانم شد

دگر قدحِ جنوں در دہ کہ ہم در منزلِ اوّل
خیالِ وحشتم واماند و گردِ کاروانم شد

ہزار داستان۔ ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمودۂ پطرس

اے حسن تو زیادہ نمائش کنم ترا
عمرم دراز باد تمنا کنم ترا
برہم نظند مکن من ناکردہ کار را
گر التجائے بوسۂ بے جا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلی بہ نگاہے چہ قرار
لشکر آرزوئے از لبم انگیختہ
بر سرِ خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

(کاروان)

دوراہہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی در میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہرِ احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لغزشِ خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبح زیست بھی ہے۔ موت کی گھڑی بھی ہے

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

میں خم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریب مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر منارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا)

دو شعر

اُڑ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی چخ
یہ چمن یونہی رہے گا اور ـــــ الخ

یہ دو شعر پطرس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کوچ کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔
جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن الخ کا قافیہ یوں اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا
کہ اس جا کے لڑکے   ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے   ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی   ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی   ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں   ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس   ہیں بیس اور بیس
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پھول)

مارخائیم

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن

(ترجمہ)

پطرس

دوکاندار بولا۔ حضرت ہماری کمائی کا کیا پوچھتے ہو۔ طرح طرح کے ڈھنگ ہیں۔ کوئی جاہل گاہک آجائے تو میں اپنے علم و فراست سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کوئی اُچکا آجائے (اور یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے شمع کو اتنا اوپر اٹھایا کہ روشنی اچھی طرح اجنبی کے چہرے پر پڑنے لگی) تو اپنی نیکی اور دیانت سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مارخائیم ابھی ابھی دکان میں داخل ہوا تھا۔ باہر کھلے بازاروں میں سورج کی روشنی اچھی خاصی تھی اور دکان کے اندر کی تاریکی سے جس میں جھلکتی ہوئی چیزوں کی روشنی ملی تھی۔ آنکھیں ابھی مانوس نہ ہوئی تھیں۔ کچھ ان پُرمعنی الفاظ کو سن کر اور کچھ شمع کی لَو کو اس قدر اپنے قریب پا کر اس انداز میں آنکھیں جھپکنے لگا جیسے درد ہو رہا ہو اور نگاہیں ایک طرف کو پھیر لیں۔

دکاندار ہنس دیا اور کہنے لگا۔ تم آج کرسمس کے دن میرے پاس آئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اکیلا ہوں۔ شٹر چڑھا رکھے ہیں اور کاروبار قطعی بند کر رکھا ہے۔ تو حضرت اس کی آپ کو قیمت ادا کرنی ہوگی۔ میں اس وقت اپنا حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ میرے وقت کا جو حرج ہوا۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور پھر اس خاص رویے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو میں آج نمایاں طور پر آپ میں پاتا ہوں۔ رازداروں کا رازدار ہوں۔ اور کبھی کسی سے آڑے ٹیڑھے سوال نہیں کرتا۔ لیکن جب کسی گاہک کا انداز اس قدر مجرمانہ ہو کہ مجھ سے نظریں چار نہ کر سکے تو پھر اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دکاندار دوبارہ ہنس دیا اور پھر حسب معمول اپنے کاروباری لہجے میں (جس میں پھر بھی کچھ کچھ طنز پایا جاتا تھا) کہنے لگا۔ تو تم اب کے پھر اس بات کا اطمینان کراؤ گے کہ یہ چیز تمہارے قبضہ میں کہاں سے آئی؟ پھر وہی اپنے چچا کی الماری میں سے؟ حضرت یہ آپ کے چچا جان نے بھی دنیا جہان کے عجائبات جمع کر رکھے ہوں گے!

دکاندار کوتاہ قد، زرد رو، خمیدہ پشت پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ عینک کے سنہری فریم کے اوپر سے نظریں ڈالنے لگا۔ اور سر کو یوں ہلانے لگا کہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ مارخائیم کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ مارخائیم نے دکاندار کی آنکھ سے آنکھ ملائی تو نظر سے انتہا درجے کا رحم اور تھوڑی سی ہیبت ٹپک رہی تھی۔

بولا۔ اب کے تم غلطی پر ہو۔ میں بیچنے نہیں کچھ خریدنے آیا ہوں۔ میرے پاس اب کوئی عجائبات نہیں۔ جن کے دام وصول کروں۔ چچا کی الماری دیوار تک خالی ہو چکی ہے اور نہ ہوتی جب بھی میں سٹہ بازی میں اس قدر روپیہ کما چکا ہوں کہ اس الماری میں تخفیف

کی بجائے کچھ اضافہ ہی کر سکتا ہوں۔ آج جس کام کو آیا ہوں وہ تو بہت معمولی سا کام ہے۔ مجھے ایک خاتون کے لئے کرسمس کا تحفہ مطلوب ہے (اس تقریر کے دوران میں جو وہ پہلے ہی تیار کر کے لایا تھا۔ اُس کے فقروں کی روانی بڑھتی چلی گئی) اور میں جانتا ہوں کہ اتنی سی بات کے لئے میں نے تمہارا جو حرج کیا۔ اُس کے لئے مجھے ہر طرح کی معذرت کرنی چاہئے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے کل یہ کام کرنا بھول گیا۔ آج ہی کھانے کے وقت مجھے اپنا یہ حقیر سا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اور تم خود جانتے ہو جس شادی سے بہت سا روپیہ ملنے کی اُمید ہو اُسے پکا کرنے میں غفلت نہیں کرنی چاہئے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکاندار اس وقفہ میں اجنبی کی بات کو تول رہا ہے۔ لیکن اُسے کچھ یقین نہیں آتا۔ اس خاموشی کے دوران میں دکان کے عجیب و غریب سامان میں جو بہت سی گھڑیاں پڑی تھیں۔ اُن کے ٹک ٹک کرنے کی آواز اور ساتھ ہی بازار میں جو گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اُن کے پہیوں کے مدھم شور کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

دکاندار بولا۔ اچھا حضرت یونہی سہی۔ آخر تم پرانے گاہک ہو اور اگر تمہیں ایک اچھی جگہ شادی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو بھلا میں اس میں کیوں روڑا اٹکاؤں۔ یہ لو تمہیں عورتوں کے پسند کی چیز دیئے دیتے ہیں۔ یہ دستی آئینہ پندرھویں صدی کا جھوٹ ہو تو میرا ذمہ۔ اور یہ ملا بھی ہمیں ایک ایسے گھر سے جہاں بڑے بڑے کمال کے عجائبات جمع تھے۔ نام تمہیں اُس شخص کا نہ بتاؤنگا۔ اپنے گاہک کی رازداری واجب ہے اور حضرت وہ بھی تمہاری ہی طرح ایک ایسے شخص کا بھتیجا اور واحد وارث تھا۔ جیسے عجائبات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔"

دکاندار کرخت اور تیز آواز میں باتیں کرتے کرتے جب آئینے کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو مارخائیم کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی گزر گئی۔ ہاتھ پاؤں یک لخت تھرا اُٹھے اور ہزار ہا طوفانی جذبات دفعتہً لپک کر چہرے پر چھا گئے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مارخائیم سنبھل بھی گیا۔ اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ جب آئینہ ہاتھ میں لیا تو ہاتھ ذرا کانپ رہا تھا۔

بیٹھی ہوئی آواز میں بولا آئینہ؟ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر صاف آواز میں دوبارہ بولا "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے؟" دکاندار بولا "ہو کیوں نہیں سکتا؟ آئینے میں کیا حرج ہے؟"

مارخائیم اس کی طرف ایک ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ بولا "تم مجھ سے پوچھتے ہو اس میں حرج کیا ہے؟ یہ دیکھو! اپنا چہرہ دیکھو! تمہیں دیکھنا گوارا ہے؟ ہرگز نہیں! تمہیں۔ مجھے۔ کسی آدمی کو گوارا نہیں!"

مارخائیم نے جب یوں دفعتہً آئینہ اُس کے سامنے کر دیا۔ تو دکاندار یک لخت پیچھے کو ہٹ گیا تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہنس دیا اور کہنے لگا "تو جناب آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ بہت ہی کم رو ہوں گی؟"

مارخائیم بولا "میں نے تم سے کرسمس کے لئے تحفہ مانگا۔ اور تم مجھے یہ لا کر دے رہے ہو۔ یہ مکروہ ملعون چیز۔ جو ہر وقت بڑھاپے کی آمد اور گناہوں اور حماقتوں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ دستی ضمیر! کیا تمہارا واقعی یہ مطلب تھا کہ میں یہ خرید لوں؟ تم نے کچھ سوچا بھی تھا؟ مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ کہ تم مجھے بتا دو۔ لو آؤ مجھے اپنا حال سناؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم پوشیدہ طور پر بہت ہی خیرات کرتے ہو؟"

دکاندار نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ عجیب بات ہے کہ مارخائیم ہنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چہرے میں خواہش اور امید کی جھلک تو ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن ہنسی کا نام و نشان تک نہیں۔

مارخائیم مغموم لہجے میں بولا "نیک نہیں۔ دیندار نہیں۔ دیانتدار نہیں۔ نہ کسی سے محبت رکھتے ہو۔ نہ کسی کے محبوب ہو۔ ایک ہاتھ ہے جس سے روپیہ وصول کرتے ہو۔ ایک تجوری ہے جس میں سنبھال رکھتے ہو۔ بس تمہاری ہست و بود یہی ہے؟ خدایا! ارے بس یہی کچھ ہے"۔

دکاندار کچھ ڈانٹ کے بولا "میں تمہیں بتاتا ہوں" اور پھر ہنس دیا اور کہنے لگا "میں سمجھا۔ تمہاری یہ شادی معاشقے کی شادی ہے اور تم اسی خاتون کے صحت کے جام پیتے رہے ہو"۔

مارخائیم کو ایک عجیب قسم کی دلچسپی سی ہوگئی۔ بولا "اخاہ! تم بھی عشق کر چکے ہو؟ مجھے اس کا حال سناؤ"۔

دکاندار بولا "میں اور عشق! مجھے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی۔ اور نہ آج ہی مجھے اتنی فرصت ہے کہ میں اس بے معنی گفتگو میں یوں اپنا وقت گنواؤں۔ آئینہ خریدتے ہو یا نہیں؟"

مارخائیم نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے؟ یہاں کھڑے باتیں کرنے میں بھی مزا ہے۔ اور زندگی اتنی مختصر اور ناپائدار ہے کہ میں تو باتیں کبھی کسی لطف سے منہ موڑنے میں جلدی نہ کروں۔ خواہ وہ اس لطف کی طرح معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔ جو لطف تھوڑا بہت نصیب ہو۔ اس کے ساتھ چمٹ جانا چاہیئے۔ جیسے کوئی گرتا ہوا آدمی پہاڑ کی چٹان سے چمٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی کا ہر لمحہ ایک چٹان ہے۔ میل بھر اونچی چٹان اتنی اونچی کہ وہاں سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر انسانیت کا تمام حلیہ مسخ ہو جائے۔ اسی لئے مزے مزے کی باتیں کرتے رہنا ہی بہتر ہے۔ چلو تم مجھے اپنا حال سناؤ۔ میں تمہیں اپنا حال سناتا ہوں۔ حجاب ہم میں کیوں حائل رہے؟ آؤ راز کی باتیں کریں۔ کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے دوست ہی بن جائیں؟"

دکاندار بولا "مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ سودا خریدنا ہے تو خریدو ورنہ دکان سے باہر نکل جاؤ!"

مارخائیم نے کہا "سچ ہے سچ ہے۔ کافی دل لگی ہو چکی۔ اب کام کی بات کرنی چاہیئے۔ اچھا کوئی اور چیز دکھاؤ؟"

آئینے کو نچلے طاق پر رکھنے کے لئے دکاندار پھر نیچے جھکا تو اس کے تھوڑے سے سنہری رنگ کے بال اس کی آنکھوں پر آگرے۔ مارخائیم ذرا اور بھی قریب کو سرک آیا۔ ایک ہاتھ اوور کوٹ کی جیب میں تھا۔ تن کے کھڑا ہو گیا اور ایک لمبا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔ ڈر بھی تھا۔ ہیبت بھی تھی۔ کچھ تہیہ بھی کر چکا ہے مسحور بھی ہے اور کچھ متنفر بھی۔ بالائی ہونٹ جیسے ناتوانی کے انداز میں اوپر کو اٹھا ہوا اور دانت جیسے باہر کو جھانک رہے تھے۔

دکاندار بولا "یہ شاید پسند آجائے"۔ یہ کہہ کر سر اوپر اٹھانے لگا کہ مارخائیم پیچھے سے اس پر جا پڑا۔ سیخ کی شکل کا ایک لمبا سا خنجر چمکا اور پھر نیچے کو اترا۔ دکاندار مرغ بسمل کی طرح تڑپا۔ کنپٹی طاق پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو کر فرش پر جا گرا۔

دکان میں رقت کی کئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض اپنی عمر کے شایانِ شان آہستہ آہستہ اور وقار کے ساتھ بول رہی تھیں۔ بعض جلدی جلدی گڑبڑا رہی تھیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ پیچ در پیچ ملی ہوئی آوازیں ٹک ٹک کر کے ثانئے گن رہی تھیں۔ باہر سڑک کے فرش پر کوئی لڑکا کھٹ کھٹ دوڑتا ہوا گزرا جس کے پاؤں کی آہٹ نے ان چھوٹی چھوٹی آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ مارخائیم چونکا اور اسے یک لخت اپنے گردوپیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شمع دکان کے تختے پر جل رہی تھی۔ اور شعلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ شعلے کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز سا ہنگامہ بپا تھا۔ اور کمرہ سمندر کی مانند لہریں مار رہا تھا۔ لمبے لمبے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے تھے۔ اور سکڑ جاتے تھے جیسے ہانپ

رہے ہوں۔ تصویروں کے چہرے اور چینی کے بُت پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیر تھے۔ اندر کا دروازہ ذرا کھلا تھا۔ اور اس میں سے روشنی کی ایک لکیر سایوں کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی اُنگلی اشارہ کر رہی ہو۔

اس کی سہمی ہوئی نظریں ان چیزوں سے گزرنے کے بعد پھر لاش پر جا کر رک گئیں۔ جو فرش پر کچھ کُبڑی کچھ چت پڑی تھیں۔ بہت ہی چھوٹی اور زندگی میں جس قدر حقیر، مفلسوں اور مسکینوں کا سا لباس اور پھر نہایت بدنما انداز معلوم ہوتا تھا۔ لکڑی کے بُرادے کا ڈھیر پڑا ہے۔ مارخائیم کا خیال تھا۔ میں اس کے دیکھنے سے ہیبت کھا جاؤں گا۔ مگر لو وہ تو کچھ بھی نہ نکلی۔ لیکن پھر بھی اس کے دیکھتے دیکھتے اس پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور اس خون کے تالاب میں عجیب معنی پیدا ہونے شروع ہوئے۔ تو یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اب کوئی نہیں جو اس کے پُرکار پرزوں سے پھر کام لے سکے۔ یا حرکت کے اس معجزے کو پھر زندہ کر دکھائے۔ جب تک کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اور جب کسی کو معلوم ہو جائے گا! ہاں تو پھر؟ تو پھر یہ مردہ جسم ایک چیخ مارے گا جو انگلستان بھر میں تھرائے گی۔ اور تمام دنیا کو تعاقب کی گونجوں سے بھر دے گی۔ مر کر بھی پیچھے پڑا رہے گا۔ اس نے سوچا ایک وقت ایسا بھی تھا جب انسان کا بھیجا پاش پاش ہو جاتا تھا تو، پہلے ہی الفاظ نے اسے چونکا کر دیا۔ وقت! اب کہ کام تمام ہو چکا۔ وقت جو مردہ شخص کے لئے ہمیشہ کو ختم ہو گیا۔ وہ قاتل کے لئے دفعتہً اہم بن گیا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو ابھی اور اسی وقت . . . . . .

یہ خیال ابھی اُس کے دل ہی میں تھا، کہ گھڑیوں نے یکے بعد دیگرے ہر رفتار اور ہر قسم کی آواز کے ساتھ۔ کوئی مینار کلیسا کے گھنٹے کی طرح گھمبیر، کوئی باریک آواز میں والز کے ابتدائی سُر بجاتے ہوئے۔ سہ پہر کے تین بجانے شروع کر دیئے۔

اس خموش دنیا میں یک لخت اتنی زبانوں کے بول اُٹھنے سے مارخائیم لڑکھڑا گیا۔ اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے شمع ہاتھ میں لئے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ متحرک سائے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اتفاقیہ کہیں روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا تو روح تک کانپ اٹھتی۔ اُسے اپنا چہرہ طرح طرح کے بیش بہا ـــــ بعض ولایتی بعض وینس یا امسٹرڈم کے بنے ہوئے آئینوں میں عکس در عکس دکھائی دیا۔ جیسے جاسوسوں کی فوج اُسے دیکھ رہی ہو۔ اُس کی نظریں اپنی ہی نظروں سے چار ہوتیں۔ اور اُس کے جرم کو پا لیتیں۔ اُس کے قدموں کی آہٹ گو اس کے قدم بہت ہی ہلکے ہلکے پڑ رہے تھے۔ اردگرد کی خاموشی کو برہم کئے دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جیبیں بھرے چلا جاتا تھا۔ دل نے اُس کے منصوبے کی ہزارہا خامیاں اُسے بار بار سمجھائیں۔ یہاں تک کہ وہ اس تکرار سے تنگ آ گیا۔ تمہیں یہ کام کسی اور وقت کرنا تھا۔ جبکہ کسی کے سُن پانے یا آ جانے کی بالکل ہی توقع نہ ہوتی۔ اس بات کا انتظام کر رکھنا تھا کہ ضرورت پڑے تو ثابت کیا جا سکے۔ میں اس وقت یہاں نہیں کسی اور مقام پر تھا۔ تمہیں بہت محتاط ہونا چاہئے تھا۔ دکاندار کی صرف مشکیں کس لیتے اور منہ بند کر دیتے۔ جان سے نہ مارتے۔ تمہیں اور بھی جرأت کر کے خدمتگار کا کام بھی تمام کر دینا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور طرح کرنا تھا۔ طرح طرح کے افسوس اس کے دل کو مجروح کئے دیتے تھے۔ ذہن مسلسل اس تھکا دینے والی کشمکش میں مصروف تھا۔ کہ ان باتوں کو کس طرح بدل ڈالے۔ جن کا بدلنا اب ناممکن تھا۔ وہ تجویزیں سوچ رہا تھا۔ جن کا سوچنا اب بالکل بیکار تھا۔ گویا نہ مٹنے والے ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اور اس تمام ذہنی مصروفیت کی تہہ میں قسم قسم کے حیوانی خوف اس کے دماغ کے نہاں خانوں میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ جیسے کسی ویران اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چوہے دوڑ رہے ہوں۔ سپاہی کا ہاتھ زور سے کندھے پر پڑے گا۔ تو تمام اعصاب یوں جھٹکا کھائیں گے۔ جیسے مچھلی کانٹے میں لگ کر جھٹکا کھاتی ہے۔ عدالت کا کٹہرہ اور قید خانہ اور پھانسی کا تختہ اور سیاہ رنگ کا تابوت۔ سب ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

راہگیروں کا خوف اس کے دل کے سامنے محاصرہ فوج کی طرح جم کے بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا اس کشمکش کی کوئی نہ کوئی آواز ضرور ان کے

کانوں تک پہنچی ہوگی۔ اور وہ ضرور معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ اب وہ پڑوس کے گھروں میں کان لگائے بے حس و حرکت بیٹھے ہوں گے۔ تنہا زندگی بسر کرنے والے لوگ جن کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ کرسمس کے دن اکیلے بیٹھے زمانۂ ماضی کی خوشگوار یاد کو دہراتے رہیں۔ اُن کے شفقت آمیز خیالات یک لخت برہم ہو گئے ہوں گے۔ جو لوگ گھروں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ وہ میز کے گرد باتیں کرتے کرتے یک لخت رک گئے ہوں گے۔ اور ماں اپنی انگلی اٹھا کر دم بخود ہو گئی ہو گی۔ ہر درجے، ہر عمر اور ہر طبیعت کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے۔ گوش برآواز ہوں گے۔ گویا پھانسی کا رسہ تیار کر رہے ہوں گے۔ بعض اوقات اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ میرے حرکت کرنے سے جو بھی آواز پیدا ہوتی ہے وہ ضرورت سے زیادہ بلند ہے۔ بوہیمیا کے بنے ہوئے جام آپس میں یوں ٹکرائے جیسے گھڑیال بجتا ہے۔ اور ٹک ٹک کے شور سے وہ اس قدر گھبرایا کہ دل چاہتا تھا کہ سب گھڑیال بند کر دوں۔ طرح طرح کے خوف پیاپے اس سرعت کے ساتھ رنگ بدل رہے تھے کہ بعض اوقات سکوت بھی خطرے کا موجب معلوم ہوتا تھا۔ گویا یہ خاموشی بھی رہگیر کو زور سے جا کر لگے گی۔ اور وہ یک لخت ٹھہر جائے گا۔ یہ سوچتا تو قدم ہلکے اٹھانے کا خیال کر دیتا اسباب کے بیچ میں اندر چلتا پھرتا اور ارادتاً جھوٹ موٹ کی جسارت کے ساتھ اس طرح اٹھتا بیٹھتا جیسے گھر کا مالک ہو اور اپنے کسی کام میں لگا ہو۔

لیکن ان مختلف خطرات نے اس کا اِتنا بُرا حال کر دیا کہ اگرچہ اُس کے دماغ کا ایک حصہ اب بھی چوکنا اور ہوشیار تھا۔ لیکن دوسرا حصہ دیوانگی کے کنارے پر کانپ رہا تھا۔ ٹھہرو ایک وہم نے تو اُس کے دل پر بُری طرح تسلط جما لیا۔ کوئی سہما ہوا پڑوسی جو اپنی کھڑکی کے پاس کان لگائے سُن رہا ہو یا کوئی رہرو جو چلتے چلتے کچھ شبہ کر کے یک لخت رُک جائے۔ اس طرح کے لوگ زیادہ سے زیادہ شک ہی کر سکتے ہیں۔ انھیں کسی بات کا علم اور یقین تو ہو نہیں سکتا۔ اینٹوں کی دیوار اور بند کھڑکیوں میں سے تو صرف آوازیں ہی باہر جا سکتی ہیں۔ لیکن خود گھر کے اندر ——— کیا میں اکیلا ہوں؟ وہ جانتا تھا کہ میں اکیلا ہوں۔ اُس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گھر کی خادمہ اپنے بہترین کپڑے (بُرے بھلے جیسے بھی تھے) پہن کر کسی چاہنے والے سے ملنے باہر گئی ہے۔ اور اُس کے لباس کے ہر نگینے اور اُس کے چہرے کی ہر مسکراہٹ سے مترشح تھا کہ دن بھر کے لئے باہر گئی ہے ——— تو پھر میں اکیلا ہی تو ہوں۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ مکان کی بالائی منزل سے جو بالکل ہی خالی پڑی تھی۔ قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی دے رہی ہے نہ معلوم کیوں؟ لیکن کسی ہستی کے موجود ہونے کا احساس بہت زبردست تھا جس کے تعاقب میں اُس کا تخیل مکان کے کمرے کمرے اور کونے کونے میں پھر گیا۔ کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس موہوم ہستی کا چہرہ ہی نہیں لیکن پھر بھی دیکھنے کو آنکھیں موجود ہیں۔ کبھی اسے خود اپنی ہی پرچھائیں معلوم ہوتیں کبھی مرے ہوئے دکاندار کی شکل دکھائی دیتی۔ جسے مکاری اور نفرت کی رُوح نے پھر زندہ کر دیا ہو۔

بعض اوقات دل کو کڑا کر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا تو نظریں اس سے متنفر واپس آتیں۔ مکان کی چھت اونچی تھی۔ روشندان چھوٹا سا اور میلا تھا۔ موسم کا یہ حال تھا کہ کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جو روشنی چھن چھن کر نچلی منزل تک پہنچی وہ بہت ہی کم تھی۔ اور دکان کی دہلیز پر مدھم سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ شبہ ہوتا تھا کہ اس خفیف سی روشنی کے ٹکڑے میں کوئی سایہ معلق و لرزاں ہے۔

دفعتہً باہر بازار سے کسی خوش طبع آدمی نے اپنی چھڑی کے ساتھ دکان کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ساتھ ہی ٹلّے بھی مارتا جاتا تھا۔ اور بلند آواز سے ہنس ہنس کر کوئی ایسی مذاق کی باتیں کرتا جاتا تھا جس میں کئی دفعہ اُس نے دکاندار کا نام لے کر بھی پکارا۔ مارخائیم کا خون جم گیا۔ اور اس نے مُردے کی طرف دیکھا لیکن نہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکا ہے۔ جہاں آوازوں کی رسائی نہیں۔ وہ سکوت کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ اور اُس کا نام جیسے کبھی وہ طوفان کے شور میں بھی سُن لیتا۔ اب ایک بے معنی سی آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس خوش طبع آدمی نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔

یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو کچھ کرنا باقی ہے بہت جلد کرنا چاہیئے۔ اس مخدوش علاقہ سے باہر نکل کر لندن کے اژدہام کے تالاب میں کود پڑنا چاہیئے اور دن ڈھل چکنے پر مخلصی اور بظاہر معصومیت کی جائے پناہ یعنی اپنے بستر پر پہنچ جانا چاہیئے۔ ابھی ایک ملنے والا آیا تھا۔ ابھی کوئی دوسرا آجائے اور وہ شاید اس آسانی سے نہ ٹلے۔ ارتکاب جرم کے بعد جو کچھ وصول ہونا تھا اُس سے محروم رہ جانا یہ تو ایسی ناکامی ہے کہ طبیعت اُسے قبول نہیں کرتی۔ اب اسے فکر تھی تو روپے کی اور تلاش تھی تو چابیوں کی جن کے ذریعے روپیہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔

سر پھیر کر کھلے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھا جہاں نہ سایہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ مقتول کے قریب آیا۔ کسی ذہنی کراہیت کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی معدے کی نسوں میں جھٹکا سا لگا۔ لاش کی انسانی وضع مفقود ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں بکھرے پڑے تھے۔ اور دھڑ دُہرا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کپڑوں کے اندر انسانی جسم نہیں۔ بھدّا سا بھوسہ بھرا ہے۔ لیکن پھر بھی طبیعت اس سے متنفر تھی۔ دیکھنے کو تو حقیر اور بے حیثیت تھی لیکن ڈرتا تھا کہ ہاتھ سے چھوؤں تو شاید اتنی حقیر معلوم نہ ہو۔ لاش کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور چت لٹا دیا۔ کچھ عجیب ہلکی ہلکی اور ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی عجیب عجیب ہیئتیں بن جاتیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے ہوں۔ چہرے پر جذبات کی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ موم کی طرح بے رنگ تھا۔ ایک کنپٹی خون آلود تھی۔ جس کے دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مارخائیم کو بھی یہی ایک بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے فوراً ہی ایک خاص میلے کا دن یاد آجاتا۔ جو اس نے مچھیروں کے ایک گاؤں میں گزارا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پیتل کے باجوں کی بلند آواز اور ڈھول کی دنادن سنائی دے رہی تھی۔ ایک داستان گو گویا ناک میں گا رہا تھا۔ ایک لڑکا جسے کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ شوق بھی تھا، بھیڑ میں ادھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آخر کار سب سے زیادہ رونق کے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں ایک چبوترہ سا بنا تھا۔ اور ایک لمبے چوڑے پردے پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر براؤن رگ اور اس کے شاگرد کی تھی۔ ایک مسٹر اور مسز ٹیننگ اور اُن کے مقتول مہمان کی تھی ——— ایک تصویر میں وئیرا اپنے قاتل ہتھرٹل کے خونی پنجے میں گرفتار نظر آرہا تھا اس کے علاوہ اور بیسیوں جرائم کی تصاویر پیش نظر تھیں۔ یہ تمام نظارہ اُسے اس وضاحت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ جیسے کسی شعبدہ باز نے ماضی کو پھر زندہ کر دیا ہو۔ اپنے آپ کو پھر از سرِ نو وہی لڑکا سمجھنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ میں پھر وہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ان مکروہ تصاویر کو دیکھ کر پھر میرا دل کراہیت سے بھر گیا ہے۔ اور اس ڈھول کی آواز سے میں پھر جیسے سُن سا ہو گیا ہوں۔ اس موسیقی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُسے یاد آگیا۔ اور اس کی وجہ سے پہلی دفعہ اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اسے متلی سی ہوئی، جوڑوں میں ایک لخت ایک ضعف سا محسوس ہونے لگا۔ جس پر قابو پانا ضروری تھا۔

عقلمندی اسی میں سمجھی کہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی بجائے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ لاش کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔ اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر اپنے جرم کی ماہیت اور سفاکی کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہی چہرہ مختلف جذبات کے زیر اثر تیور بدل رہا تھا۔ یہ ہونٹ بول رہے تھے۔ اس جسم میں فرمان پذیر قوتوں کی آگ بھری تھی۔ اور اب میرے ایک ہی فعل سے کارخانۂ حیات کا پرزہ یک لخت تھم گیا۔ جیسے ساز اپنی خمیدہ انگلی سے کسی گھڑی کی حرکت کو روک دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو ہزار سمجھا رہا لیکن بے سود۔ کسی تاسف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ وہی دل جو جرم کی نقلی تصویروں کے سامنے کانپ اٹھتا تھا۔ اب حقیقت کو دیکھ کر بھی نہ پسیجتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے دکاندار پر تھوڑا سا رحم آتا۔ کہ اُسے بھی خدا نے وہ تمام قوتیں عطا کی تھیں۔ جن سے دنیا کو ایک عجیب و غریب طلسماتی بہشت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اُن سے اُس نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا۔ بس اس بات پر اُسے کچھ ترس آتا تھا۔ لیکن تاسف یا ندامت کا شائبہ تک اُس کے دل میں موجود نہ تھا۔

چنانچہ اُس نے ان خیالات کو دماغ سے نکال دیا اور چابیاں تلاش کر کے دکان کے کھُلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر زور کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور مینہ کی پٹاپڑ سے خاموشی مفقود ہو چکی تھی۔ کسی رِستے ہوئے خار کی مانند مکان کے کمروں میں طرح طرح کی گونجوں سے جو لمحہ بھر کو بھی نہ تھمتی تھیں۔ اور جو گھڑیوں کی ٹک ٹک کے ساتھ مل کر کانوں میں ایک شور سا پیدا کر رہی تھیں۔ ایک ہیبت سی چھا گئی تھی۔ اور جب مارخائیم دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُس کے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ پا کر کوئی شخص دبے پاؤں سیڑھیوں پر واپس چلا گیا ہے۔ وہ سایہ ابھی تک دہلیز پر کانپ رہا تھا۔ اُس نے طبیعت کو کڑا کر کے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھول دیا۔

کُہر چھایا ہوا تھا۔ اور ان کی مدھم سی روشنی اس زرہ بکتر پر جو سیڑھیوں کے موڑ پر ہاتھ میں نیزہ لئے استادہ تھی۔ اور ترشی ہوئی سیاہ چوبی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں اور چوکھٹوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ مینہ کا شور تمام گھر میں اس زور سے سنائی دیتا تھا کہ مارخائیم کو اس میں کئی مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پانووں کی آہٹ اور آہیں اور کہیں دور مارچ کرتی ہوئی پلٹنوں کے قدموں کی کھٹا کھٹ اور روپیہ گننے کی جھنکار اور دروازوں کے ہلکے ہلکے احتیاط کے ساتھ کھلنے کی چیں چیں۔ یہ سب آوازیں گنبد پر مینہ کی پڑاپڑ اور پرنالوں میں آب باراں کے شور کے ساتھ ملی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ احساس کہ میں اکیلا نہیں اس قدر تیز ہوتا گیا کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اُسے کچھ جنون سا ہو گیا کہ پُراسرار ہستیاں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ بلکہ اُوپر کے کمروں میں چلتی پھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ تو یہ معلوم ہوا جیسے اوپر کوئی دبے پاؤں پیچھے کو بھاگ گیا ہے اور کوئی ہلکے ہلکے اُس کے پیچھے چڑھ رہا ہے۔ سوچا اگر میں بہرا ہوتا تو اس وقت روح کو کتنا اطمینان ہوتا۔ لیکن پھر سوچا کہ یہ بیدار حواس ہی تو ہیں۔ جو اس وقت میری زندگی کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس خیال سے اُسے کچھ اطمینان ہوا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ کان لگائے رہا۔ سر کو بار بار پیچھے موڑتا۔ اُس کی آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں۔ اور ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن ہر طرف کامیاب ہوتے ہوتے رہ جاتیں۔ کیونکہ جدھر دیکھتیں اُدھر ہی کسی نامعلوم بھاگتی ہوئی چیز کا پچھلا حصہ غائب ہوتا نظر آتا۔ پہلی چھت تک چوبیس سیڑھیاں تھیں اور ہر ایک سیڑھی ایک قیامت معلوم ہوتی تھی۔

اوپر کی چھت پر تینوں دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور تین کمینگاہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مارخائیم یوں کانپا۔ جیسے توپوں کے دہانے نظر آ رہے ہوں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اب گویا لوگوں کی تیز نظروں سے پوری طرح کبھی نہ بچ سکوں گا۔ یہی دل چاہا کہ کسی طرح اپنے گھر کے اندر پہنچ جاؤں۔ جہاں چاروں طرف دیواریں کھڑی ہوں گی۔ اپنے بستر میں جا کر چھپ جاؤں گا۔ اور سوائے خدا کے اور کسی کی آنکھیں مجھے نہ دیکھ سکیں گی۔ اس خیال پر اُسے کچھ تعجب سا ہوا۔ اسے اور قاتلوں کے قصے یاد آئے جو کہا جاتا ہے انتقامِ خداوندی سے خوف کھاتے تھے۔ کم از کم مارخائیم کے دل میں اس بات کا خوف نہ تھا۔ خدا سے تو نہیں البتہ قوانین قدرت سے ضرور ڈرتا تھا کہ ممکن ہے میری موجودگی کے بعض ایسے آثار باقی رہ جائیں۔ جو اثباتِ جرم میں مدد دیں۔ ان آثار کو تو قوانین قدرت کی بے رحم اور اٹل کارفرمائی کبھی محو نہ کرے گی۔ اس سے بھی دس گنا زیادہ وہ اس بات سے خوف کھاتا تھا۔ وہم پرست ضعیف الاعتقاد لوگوں کا سا خوف کہ کیا معلوم کوئی ایسی بات ظہور میں آ جائے جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ کیا معلوم قدرت خود اپنے قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ میں ایک ایسا کھیل کھیل رہا ہوں۔ جس میں ذہانت اور فراست کی ضرورت ہے۔ جس میں کامیابی خاص قواعد و ضوابط پر مبنی ہے۔ جس میں اقلیدس کی طرح خاص اسباب و علل سے خاص نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر قدرت اُس جابر و مطلق العنان بادشاہ کی طرح جو کھیلتے کھیلتے شطرنج کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ یک لخت علت و معلول کا یہ سلسلہ برہم کر دے تو کیا ہو گا؟ مورخ کہتے ہیں جب موسم نے اپنی آمد کا وقت بدل ڈالا تھا۔ تو نپولین کا یہی حال ہوا تھا۔ کیا معلوم مارخائیم کا بھی یہی حال ہو؟ کیسے

معلوم ان چوڑی دیواروں میں شیشے کی سی خاصیت پیدا ہو جائے اور میری تمام حرکات باہر سے صاف صاف نظر آنے لگیں۔ جیسے کسی شیشے کے بکس میں شہد کی مکھیوں کی حرکات نظر آتی ہیں۔ فرش کے یہ مضبوط تختے سمندر کی ریت کی طرح نیچے بیٹھ جائیں اور دلدل کی طرح مجھے اپنی گرفت میں پھنسا لیں، یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم یہ مکان ہی گر پڑے اور میں اس لاش کے ساتھ یہیں محبوس ہو جاؤں۔ یا سارے گھر میں آگ لگ جائے اور آگ بجھانے والے لوگ سب طرف سے اندر آ گھسیں؟ ان چیزوں سے وہ ضرور خوف کھاتا تھا۔ ان کو چاہو تو گناہ کا خداوندی انتقام سمجھ لو۔ لیکن خود خدا کی ذات سے وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ دل سے کہتا میرا یہ فعل تجاوز سہی۔ لیکن اس کی وجوہ بھی تو خاص ہیں اور خدا کو اُن کا پورا پورا علم ہے۔ یہی نہیں بلکہ انصاف کا یقین بھی خدا ہی پر تھا۔ انسانوں پر نہ تھا۔

جب صحیح سلامت ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا اور دروازہ بند کر لیا تو اُسے محسوس ہوا۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ کمرہ بالکل بے آرائش تھا۔ فرش پر قالین تک نہ تھا۔ جا بجا خالی بکس اور اٹکل بے جوڑ سا فرنیچر پڑا تھا۔ کئی لمبے لمبے آئینے تھے جن میں مختلف زاویوں سے اُسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ہو۔ کئی تصاویر بعض چوکھٹوں میں لگی ہوئی، بعض بغیر چوکھٹوں کے۔ دیوار کے ساتھ الٹی کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کی ڈیسرٹ الماری۔ ایک اور الماری جس میں لکڑی کی پچی کاری کی ہوئی تھی اور ایک بہت بڑا پرانی وضع کا پلنگ تھا۔ جس پر دبیز قیمتی کپڑے کے پردے لگے تھے۔ کھڑکیوں کی چوکھٹ فرش تک پہنچی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا نچلا حصہ بند تھا۔ اس لیے پڑوس کے لوگوں کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ مارخائیم نے ایک بکس کو الماری کے سامنے کھینچ لیا اور کنجیوں کے گچھے میں سے ایسی کنجی تلاش کرنے لگا جس سے الماری کا قفل کھل سکے۔ کنجیاں بے شمار تھیں۔ اس لیے یہ کام لمبا تھا۔ اور طبیعت گھبرانے لگی تھی۔ اس خیال سے اور بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کہ ممکن ہے الماری میں کچھ بھی نہ نکلے۔ اور وقت کہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس پوشیدہ مصروفیت سے اُس کے حواس پھر درست ہو گئے۔ دروازہ کو کنکھیوں سے بلکہ بعض اوقات نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا جیسے کوئی محصور سپہ سالار اپنی حفاظت کے انتظامات کو مستحکم پا کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بالکل مطمئن تھا۔ باہر بازار میں مینہ برس رہا تھا۔ اور بارش کا شور طبعی اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد دوسری طرف سے حمد و مناجات کے گیت کے ساتھ پیانو بجنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بہت سے بچے مل کر گیت گا رہے تھے۔ گیت کی موسیقی خوش آئند تھی۔ اور اس کے سروں سے ایک خاص ترانہ ٹپکتا تھا۔ بچوں کی آوازیں پیاری اور بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ مارخائیم مسکراتا ہوا سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کنجیاں گھما گھما کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ دل میں اسی قسم کے تصورات اور خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ کبھی گرجا جاتے ہوئے بچوں اور آرگن کے بجنے کا خیال آتا۔ کبھی کھیلتے کودتے بچوں کا تصور بندھ جاتا کہ ندی کے کنارے نہانے کو جمع ہیں۔ یا کھلے میدان میں گھوم رہے ہیں۔ یا جب آسمان پر ہوا بادلوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی ہے۔ تو پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سر کے کسی اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ پھر گرجے کا خیال آ جاتا گرمیوں کا موسم ہے۔ اتوار کا خواب آور دن۔ پادری بلند آواز اور شائستہ لہجے میں وعظ کر رہا ہے (اس پر ذرا مسکرا دیتا) روغنی جیکوبین مقبرے اور کلیسا کے مشرقی حصے میں مدھم سے حروف میں لکھے ہوئے دس احکام آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔

ایسی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یک لخت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً برف کی سی خنکی، خون کا ابلتا ہوا فوارہ، آگ کا ایک شعلہ اُس کے جسم میں دوڑ گیا پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ اور جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ کسی شخص کے سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی ہاتھ نے دروازے کے دستے کو گھمایا۔ قفل سرکتا ہوا سنائی دیا اور دروازہ کھلا۔

خوف نے جیسے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اب کیا ظہور میں آئے گا۔ خود مقتول ہی اپنے پاؤں چل کر آ گیا ہے۔ یا عدالت

کا کوئی کارندہ ہے یا اتفاقیہ ہی کوئی شخص ایسا آ گھسا ہے جس کی شہادت اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گی؟ لیکن جب دروازہ کھلا تو ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا جس نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی، مارخائیم کو دیکھا، سر ہلا کر مسکرایا جیسے کسی دوست کو دیکھ کر پہچان لیا ہو اور پھر پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ مارخائیم کو خوف کے مارے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ منہ سے بے اختیار ایک ہلکی سی چیخ نکلی جسے سن کر اجنبی پھر واپس آ گیا۔ خندہ پیشانی سے پوچھنے لگا۔

"تم نے مجھے بلایا تھا؟" یہ کہنے کے ساتھ ہی اندر آ گیا اور دروازہ بھیڑ لیا۔

مارخائیم کھڑا تھا اور ہمہ چشم بن کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید آنکھوں پر پردہ پڑا تھا کیونکہ اجنبی کا قد و قامت اور شکل و صورت متغیر لرزاں نظر آتی تھی جیسے شمع کی کانپتی ہوئی روشنی میں بیٹھی کے بت متغیر و لرزاں نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کوئی شناسا سا ہے۔ پھر خیال آتا مجھ سے شکل ملتی ہے۔ دل پر انتہا درجے کی ہیبت چھائی ہوئی تھی اور کم از کم اس بات کا یقین تھا کہ یہ شخص اس دنیا کا مکین نہیں۔ نہ خدا کی مخلوق میں سے ہے۔

لیکن عجیب بات تھی کہ پھر بھی یہ اجنبی جو کھڑا مارخائیم کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ معمولی سا انسان معلوم ہوتا تھا اور جب اس نے یہ پوچھا کہ روپے کی تلاش میں ہو؟ تو لہجے میں وہی سلیقہ تھا جو روزمرہ کی عام گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مارخائیم نے کچھ جواب نہ دیا۔

اجنبی بولا "میں تمھیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ ماما آج اپنے چاہنے والے سے جلدی رخصت ہو گئی ہے اور اب یہاں پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اگر مسٹر مارخائیم اس گھر میں پکڑے جائیں تو نتیجہ جو ہو گا وہ تم جانتے ہی ہو۔"

قاتل نے پوچھا "تم مجھے جانتے ہو؟"

اجنبی مسکرا دیا اور بولا "تم مدت سے میرے منظور نظر ہو۔ عرصے سے تمھیں دیکھ رہا ہوں اور بارہا میں نے چاہا ہے کہ تمھاری مدد کروں۔"

مارخائیم بولا "تم کون ہو؟ کیا تم شیطان ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا "میں تمھاری جو خدمت کرنا چاہتا ہوں اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ میں کون ہوں۔"

مارخائیم بولا "ضرور پڑ سکتا ہے! میں تم سے مدد چاہوں؟ تم سے؟ یہ ہرگز نہ ہو گا۔ تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔ خدا کا شکر ہے تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔"

اجنبی نے ایک مشفقانہ درشتی بلکہ تحکم کے ساتھ جواب دیا "میں تمھیں جانتا ہوں۔ میں تمھاری روح تک سے واقف ہوں۔"

مارخائیم بولا "مجھے جانتے ہو! مجھے کون جان سکتا ہے؟ میری زندگی خود میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود مجھ پر ایک تہمت ہے۔ میں نے عمر بھر اپنی فطرت کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس ملمع سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جو وہ اپنے اوپر چڑھاتا رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہر انسان کشاں کشاں جدھر زندگی لے جائے اُدھر ہی کھنچا چلا جاتا ہے، جیسے رہزن کسی کو پکڑ کر اس پر کمبل ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار ہو، اگر کبھی وہ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دے جائیں تو تم انھیں اس سے کہیں مختلف پاؤ گے اور ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں بہت سوں سے بُرا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی پوست موٹی تہ جمی ہے اور میرا عذر مجھے اور میرے خدا کو معلوم ہے۔ لیکن اگر مجھے مہلت ہو

تو میں اپنی اصل حقیقت آشکار کر سکتا ہوں۔"

اجنبی نے پوچھا: "مجھ پر؟"

قاتل نے جواب دیا: "سب سے پہلے تم ہو۔ میں تمھیں عقلمند سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب تم آہی گئے ہو تو کم از کم میرے دل کا حال بخوبی جان لو گے لیکن افسوس پھر بھی تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! ذرا سوچو تو! میرے افعال سے! دیوؤں کے ملک میں پیدا ہوا اور میں نے دیوؤں کے ملک میں زندگی بسر کی۔ جب سے میں نے جنم لیا ہے حالات و واقعات کے دیو مجھے کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے پھرے ہیں اور تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! تمھیں میرا باطن نظر نہیں آتا؟ تم یہ نہیں سمجھتے کہ مجھے بدی سے نفرت ہے؟ تمھیں میرے سینے کے اندر ضمیر کے احکام صاف صاف لکھے ہوئے نظر نہیں آتے؟ میں نے اکثر ان کی تعمیل سے گریز کیا ہے لیکن دیدہ و دانستہ کبھی ان کی غلط تاویل نہیں کی۔ اپنی مرضی کے خلاف گناہ کرنے والوں کی مثالیں تو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوں گی۔ کیا میں تمھیں ویسا ہی انسان معلوم نہیں ہوتا؟"

جواب ملا: "تم نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے لیکن اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ بدی سے نفرت کرنے کے باوجود بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ تمھیں کون سے واقعات کس طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ غرض تو اس سے ہے کہ جس رستے پر چلو وہ رستہ ٹھیک ہو لیکن وقت نکلا جا رہا ہے۔ بھیڑ کا تماشا کرتے کرتے اور اشتہاروں کی تصویریں دیکھتے ماما کو دیر ہو گئی ہے۔ تاہم وہ آ رہی ہے جیسے پھانسی کا تختہ۔ بازاروں میں کرسمس کا ہجوم دوڑتا ہوا تمھاری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ کہو تو میں تمھاری مدد کر دوں۔ میں جو سب کچھ جانتا ہوں تمھیں بتاؤں۔ روپیہ کہاں رکھا ہے؟"

مارخائیم نے پوچھا: "مجھے قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں یہ خدمت کرسمس کے تحفے کے طور پر کرنے کو تیار ہوں۔"

مارخائیم سے نہ رہا گیا۔ ایک تلخ سے احساسِ تسخیر کے ساتھ مسکرا دیا اور بولا: "نہیں۔ میں تمھارا احسان کبھی نہ لوں گا۔ اگر پیاس کے مارے میری جان نکل رہی ہو اور پانی کا پیالہ تمھارے ہاتھ میں ہو جب بھی مجھ میں اتنی ہمت ضرور ہو گی کہ میں انکار کر دوں۔ یہ میری سادہ لوحی سہی لیکن میں اپنے آپ کو بدی کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتا۔"

اجنبی نے کہا: "مرتے وقت توبہ کر لینا۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔"

مارخائیم نے زور سے جواب دیا: "تمھیں اسی لیے عذر نہیں کہ تم جانتے ہو مرتے وقت توبہ کرنا بے سود ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا: "میرا یہ خیال نہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں ان باتوں کو اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ جب زندگی ختم ہو جائے تو پھر مجھے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایک انسان عمر بھر میرے حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ دینداری کے بھیس میں سیہ کاری پھیلاتا رہتا ہے یا اپنی کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر گندم کے کھیت میں حنظل بوتا ہے۔ جب اس کی مخلصی کا وقت قریب آتا ہے تو میں اس سے صرف ایک اور خدمت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ گناہوں سے توبہ کر لے اور اس جہان سے مسکراتا ہوا رخصت ہو۔ یعنی میرے باقیماندہ پیروؤں میں سے جو لوگ ذرا کم حوصلہ ہیں انھیں ہمت دلائے، انھیں آس لگی رہے کہ عفوِ خداوندی مرتے وقت بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کچھ ایسا جابر آقا تو نہیں۔ مجھے آزماؤ۔ میری مدد قبول کرو۔ اب تک تم نے جو دل چاہا کیا، اب بھی جو دل چاہے کرو بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عیش اور

اطمینان کی زندگی بسر کرو اور جب رات پڑنے لگے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے جائیں اس وقت میں تمھاری تسلی کے لیے تم سے کہے دیتا ہوں۔ اس وقت ضمیر کے ساتھ صلح کر لینا اور خدا کی آغوشِ شفقت میں جگہ پانا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ میں اب جہاں سے آیا ہوں وہاں اسی طرح کا ایک تائب انسان بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ کمرہ ماتم داروں سے بھرا ہوا تھا جو اس کے آخری الفاظ کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ زندگی میں اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ استغفار کی جھلک تک اس کے چہرے پر کبھی نہ آئی تھی لیکن مرتے وقت اسی چہرے پر امید کا تبسم درخشاں نظر آتا تھا۔"

مارخائیم نے پوچھا: "تو تم مجھے بھی اسی قسم کا مردود انسان سمجھتے ہو؟ تم سمجھتے ہو میری تمنا کی پرواز بس یہی ہے کہ عمر بھر سیہ کاری میں گزار دوں اور آخری وقت خدا کو دھوکہ دے کر چوری چھپے جنت میں داخل ہو جاؤں۔ میرا دل یہ سوچتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ کیا تم نے بنی نوعِ انسان کو ایسا ہی پایا ہے؟ یا تمھیں میرے ہاتھ خون آلودہ دیکھ کر مجھ پر اس دناءت کا گمان ہوا ہے؟ کیا قتل کا گناہ اتنا ناپاک ہے کہ نیکی کا احساس بالکل ہی مر جاتا ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا: "قتل کو میں کسی خاص قسم کا گناہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح تمام زندگی ایک جنگ ہے اسی طرح ہر گناہ ایک قتل ہے۔ میرے نزدیک تو تمام بنی نوعِ انسان کی مثال ان ملاحوں کی سی ہے جو اپنے ڈوبے ہوئے جہاز کے تختوں پر تیر رہے ہوں۔ کھانے کو ان کے پاس کچھ نہ ہو، فاقے کے ہاتھ سے نوالے چھین چھین کر کھا رہے ہوں۔ یہاں تک کہ مردم خوری پر اتر آئے ہوں۔ میری نگاہ عین اس لمحے سے کہیں پرے نکل جاتی ہے جس میں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کا انجام موت ہے۔ میری آنکھوں کو وہ حسین لڑکی جو ناچ پر جانے کے لیے ہزار اداؤں سے اپنی ماں کو بے بس کر دیتی ہے اور تم جیسا قاتل دونوں یکساں خون میں لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں بدی کے نتائج کو سوچتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ میں نیکی کے مسئلے پر بھی غور کرتا ہوں۔ مجھے دونوں میں سرمو فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دونوں کی دونوں درانتیاں ہیں جن سے موت کا فرشتہ فصل کاٹ کر لے جاتا ہے۔ جس بدی کے لیے میری زندگی وقف ہے وہ افعال کی بدی نہیں سیرت کی بدی ہے۔ مجھے گنہگار انسان محبوب ہے۔ گناہ کے فعل سے محبت نہیں۔ برے کاموں کا ثمرہ شاید بڑی بڑی نیکیوں کے پھل سے بھی زیادہ شیریں نکلے۔ لیکن یہ ہمت کس میں ہے کہ قرنوں اور صدیوں کے دندناتے ہوئے آبشار کی تہ تک پہنچ کر بدی کے نتائج کا مطالعہ کر سکے۔ میں جواب تمھاری دستگیری پر آمادہ ہوں تو وہ اس لیے نہیں کہ تم نے ایک دکاندار کو قتل کر ڈالا ہے بلکہ اس لیے کہ تم مارخائیم ہو۔"

مارخائیم نے جواب دیا: "میں تم سے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کرتا ہوں۔ یہ جرم میرا آخری جرم ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا مجھے کئی سبق مل گئے۔ یہ خود ایک سبق تھا، بہت بڑا سبق، اب تک جو کچھ میں نے کیا وہ میری مرضی کے خلاف تھا لیکن سرکشی نے مجھ سے سب کچھ کرا دیا۔ میں افلاس کا مظلوم اور مجبور غلام تھا۔ بعض اوقات انسان کسی نیک کام کے لیے روپے کا لالچ کرتا ہے۔ مجھے صرف عیش پسندی کی ہوس تھی لیکن آج مجھے اس جرم سے دولت اور عبرت دونوں چیزیں حاصل ہوئیں گویا پھر اپنے اصلی روپ میں عود کر آنے کے لیے ارادہ اور سامان دونوں مہیا ہو گئے ہیں۔ اب میں اپنے افعال کا پورا پورا مختار ہوں اب میں بالکل بدل جاؤں گا۔ ان ہاتھوں سے نیکی کروں گا اور اس دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔ میری گذشتہ زندگی کے بعض جذبات پھر میری طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اتوار کی شام کو جب گرجا کا آرگن بج رہا ہوتا یا جب کسی مقدس کتاب کی تلاوت سے میری

آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے یا جب میں معصومیت کے زمانے میں اپنی ماں سے باتیں کیا کرتا تھا تو اس وقت اپنی آئندہ زندگی کا جو تصور میرے سامنے تھا وہ اب سچ ہو کے رہے گا۔ میں چند سال بھٹکتا پھرا ہوں لیکن اب مجھے منزلِ مقصود پھر نظر آ رہی ہے۔"

اجنبی نے پوچھا "یہ روپیہ تم سٹہ بازی میں لگاؤ گے؟ جہاں میں سمجھتا ہوں تم پہلے بھی کئی ہزار ہار چکے ہو۔"

مارخائیم نے کہا "ہاں لیکن اب کے میرا جیتنا یقینی ہے۔"

اجنبی بولا "اب کے تم پھر ہار و گے۔"

مارخائیم نے کہا "ہاں! مگر میں آدھا روپیہ اپنے پاس رکھوں گا۔"

اجنبی بولا "وہ بھی ہار دو گے۔"

مارخائیم کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا "اچھا! کیا مضائقہ ہے؟ فرض کرو میں سب روپیہ ہار دوں اور فرض کرو میں پھر مفلس اور قلاش ہو جاؤں تو کیا میرا نفس ایک حصہ اور بھی اسفل، یوں ہی آخر تک اسفل رہے گا اور رفتہ رفتہ نیکی کی قوت کو سلب کر دے گا؟ نیکی اور بدی دونوں زبردست ہیں اور اپنی اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں بڑے بڑے کارنامے سوچ سکتا ہوں، اپنے نفس کو مار سکتا ہوں، نیکی کے رستے میں جان تک قربان کر سکتا ہوں اور گو میں اتنا ذلیل ہوں کہ قتل تک سے دریغ نہ کیا لیکن رحم سے بالکل نا آشنا نہیں۔ میں غریبوں پر رحم کھاتا ہوں (مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی مصیبتوں کو کون جانتا ہے؟) میں محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں وہ ہنسی اور خوش دلی چاہتا ہوں جو اطمینانِ قلب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی سچی یا کوئی اچھی بات ایسی نہیں جس سے مجھے دلی محبت نہ ہو، تو کیا صرف بدیاں ہی میری رہنمائی کریں گی؟ اور کیا میری خوبیاں کوڑے کرکٹ کی طرح بے کار پڑی رہیں گی؟ ہرگز نہیں۔ نیکی بھی افعال کی رہبر ہو سکتی ہے۔"

لیکن اجنبی نے اپنی انگلی اوپر کو اٹھائی اور بولا "تمھیں اس دنیا میں آئے چھتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں تمھاری قسمت نے کئی دفعہ پلٹا کھایا اور تمھاری طبیعت نے کئی رنگ بدلے لیکن میں چھتیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ تم برابر قعرِ مذلت کی طرف جا رہے ہو۔ آج سے پندرہ سال پیشتر تم چوری کے خیال سے بھی کانپ اٹھتے۔ آج سے تین سال پیشتر قاتل کا نام سن کر تمھارا رنگ فق ہو جاتا لیکن اب کیا کوئی بھی جرم، کوئی بھی سفاکی، کوئی بھی ذلت ایسی ہے جس سے تمھاری طبیعت متنفر ہو اور پانچ سال میں تم ان سب کے مرتکب ہو چکے ہو گے۔ تم دن بدن پستی کی طرف جا رہے ہو اور بجز موت کے اور کوئی چیز تمھیں نہیں روک سکتی۔"

مارخائیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ سچ ہے۔ میں نے ایک حد تک بدی کے احکام کی تعمیل کی ہے لیکن سب کا یہی حال ہے۔ محض اس جہان میں بسر کرنے کی وجہ سے پاکیزہ ترین انسان بھی دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔"

جواب ملا "میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال پوچھتا ہوں۔ جواب پانے پر میں تمھاری آئندہ اخلاقی زندگی کا حال تمھیں بتاؤں گا۔ بہت سی باتوں میں تم نیک و بد کی چنداں پروا نہیں کرتے اور ممکن ہے تم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔ بہر حال ہر انسان کا یہی حال ہے لیکن کوئی ذرا سی بات بھی ایسی ہے جس میں تم اپنے افعال کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہو؟ یا ہر بات میں بے عنانی سے کام لیتے ہو؟"

مارخائیم کو جیسے جواب سوچنے میں بے حد تکلیف ہو رہی ہو۔ بولا "کوئی ذرا سی بات ایسی ہے؟ نہیں کوئی نہیں میں

ہر طرح ذلیل ہوں۔"

اجنبی بولا "تو پھر اسی پر مطمئن رہو کیونکہ تمھارا بدلنا ناممکن ہے۔ دنیا کے اسٹیج پر جو پارٹ تمھیں ادا کرنا ہے اس کے الفاظ مقرر ہیں اور ان میں ردّ و بدل کا کوئی امکان نہیں۔"

مارخائیم بہت دیر تک چُپ کھڑا رہا بلکہ دوبارہ بھی پھر اجنبی ہی نے بولنا شروع کیا۔ "تو پھر تمھیں بتاؤ کہ روپیہ کہاں رکھا ہے ———؟"

مارخائیم نے پوچھا "اور عفوِ خداوندی؟"

جواب ملا "وہ تم آزما چکے ہو۔ دو تین سال ہوئے تم ہی تو تھے جسے میں نے مذہبی جلسوں کے پلیٹ فارم پر سب سے بلند آواز میں حمد و مناجات کے گیت گاتے سُنا تھا۔"

مارخائیم بولا "یہ سچ ہے۔ مجھے اپنا فرض صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس سبق کے لیے دل و جان سے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میری حقیقت اب مجھ پر آشکارا ہو چکی ہے۔"

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی کے بجنے کی تیز آواز تمام گھر میں سُنائی دی۔ اجنبی کا رویّہ یوں بدلا جیسے گھنٹی کا بجنا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا اور وہ بس اسی کے انتظار میں تھا۔

بولا "وہ ماما آ گئی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ واپس آ جائے گی۔ اب تمھارے لیے فقط ایک مشکل کام انجام دینا باقی رہ گیا ہے۔ اس سے کہنا تمھارا آقا بیمار ہے۔ خود جا کے دروازہ کھولنا۔ تمھارے چہرے سے گھبراہٹ نہیں بلکہ سنجیدگی مترشح ہونی چاہیے۔ مسکرانا مت۔ بہت زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہ کرنا۔ میرے کہے پر عمل کرو گے تو یقین مانو تمھارا راز کبھی فاش نہ ہوگا۔ بس لڑکی اندر آ جائے اور دروازہ بند ہو جائے تو جس ہوشیاری سے تم نے آقا کو ٹھکانے لگایا ہے اسی طرح اس آخری کانٹے کو بھی اپنے رستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر تو ساری شام اور اگر ضرورت ہو تو ساری رات پڑی ہے۔ گھر کے سب مال و اسباب کی اچھی طرح تلاشی لے لینا اور پھر مزے سے نکل جانا۔ ماما کے آ جانے میں بھی ایک عجیب حکمت ہے۔ اٹھو! میرے دوست اٹھو! تمھاری زندگی اس وقت ایک کچے دھاگے سے بندھی ہے۔ اٹھو! کچھ کر لو۔"

مارخائیم اپنے صلاح کار کو غور سے دیکھتا رہا اور بولا "اگر میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میری ہر حرکت بدی اور گناہ ہی کے لیے وقف ہے تو نجات کا ایک دروازہ تو اب بھی کھلا ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلانا ہی کیوں نہ بند کر دوں؟ اگر میری زندگی ناپاک ہے تو میں اس زندگی سے دستکش ہی کیوں نہ ہو جاؤں؟ تم سچ کہتے ہو میں ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا غلام ہوں لیکن اب بھی میں ایک ہی فیصلہ کُن جنبش کے ساتھ ان سب خواہشات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ نیکی کی تمنّا کبھی پوری نہ ہو تو اچھا یونہی سہی لیکن بدی سے نفرت تو اب بھی باقی ہے اور تمھیں یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہو گی کہ میں اسی نفرت سے طاقت اور جرأت دونوں چیزیں حاصل کر سکتا ہوں۔"

اجنبی کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔ اس کے خد و خال حسین و جمیل ہوتے گئے اور ایک شفقت آمیز احساسِ تسخیر کے ساتھ چمکنے لگے اور پھر فوراً ہی مدھم ہو کر غائب ہو گئے لیکن مارخائیم اس تغیّر کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ اس نے

دروازہ کھولا اور کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کی گذشتہ زندگی کا صاف اور صحیح نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ خواب کی طرح بدنما اور تکلیف دہ بے ترتیب اور بے جوڑ۔ گویا شکست کا ایک منظر پھیلا ہوا ہے۔ جب اپنی زندگی یوں نظر آئی تو جینے کی ہوس باقی نہ رہی لیکن زندگی کے اس پار اسے اپنی کشتی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان کے دروازے کے پاس پہنچا تو رک گیا۔ دروازے میں سے جھانکا۔ شمع ابھی تک لاش کے پاس جل رہی تھی اور ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ نظریں مبہوت تھیں اور دل میں دکاندار کے متعلق خیالات کا ایک ہجوم برپا تھا۔ گھنٹی جیسے بے صبری کے ساتھ دوبارہ بجی۔

دہلیز کے پاس ماما کے روبرو کھڑا ہوا تو چہرے پر مسکراہٹ سی تھی۔ بولا "پولیس کو بلا لو تو بہتر ہو۔ میں نے تمہارے آقا کو قتل کر دیا۔"

(علی گڑھ میگزین)

گونگی جورو

یہ ترجمہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ اس دوگانہ دستبرد سے اصل کامیڈی کی سب لطافتیں فنا ہوگئی ہیں صرف کہانی باقی رہ گئی ہے لیکن صرف کہانی ہی کا منتقل کرنا مقصود بھی تھا۔۔۔ اناطول فرانس نے اس قصے کو مشہور فرانسیسی مصنف رابیلے سے اخذ کیا ہے۔ رابیلے نے رومن تھیٹر سے مستعار لیا تھا۔ گویا کہانی دراصل بہت پرانی ہے اناطول فرانس نے اسے نیا رنگ دے کر کامیڈی کی شکل میں پیش کیا۔

جو خاکہ اب آپ کے سامنے ہے اس میں خوبیاں اساتذہ کی ہیں خامیاں میری ہیں

(پطرس)

پہلا ایکٹ

بوتال نامی پیرس کے ایک جج کا کمرہ

(ماسٹر آدم ایک بیرسٹر اس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔)

آدم۔ (جھک کر آداب بجالاتا ہے) زہے قسمت کہ آپ سے پھر ملاقات ہوئی۔

بوتال۔ واہ خوش قسمتی تو اسے میری کہیے۔ فرمائیے پیرس میں کس طرح آنا ہوا؟

آدم۔ (کرسی پر بیٹھ کر) شاہ ترسے سے آیا ہوں۔ ایک سفارش کرنے کے لئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ جس کے سر پر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس کا سرپرست اس کی سب جائداد ہضم کر گیا ہے بس اس مقدمے پر ہی اس کی قسمت کا دارومدار ہے۔ اگر جیت گئی تو جو کچھ ہو سکا آپ کی نذر کر دے گی ورنہ۔۔۔۔

بوتال۔ اچھا، اچھا ہم غور کریں گے۔

آدم۔ اب کچھ اپنی کہیے۔ تنہائی میں دن مشکل سے گذرتے ہوں گے۔ شادی کا ارادہ نہیں کیا؟

بوتال۔ تم نے نہیں سنا؟ پچھلے ہی مہینے تو میں نے شادی کی ہے۔ ایک مجسٹریٹ کی بیٹی سے۔ کیتھرین نام ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔

آدم۔ تو شادی سے پہلے تمہیں اس کا علم نہ تھا؟

بوتال۔ معلوم تو تھا۔ بھلا یہ بات بھی کب تک چھپی رہ سکتی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ ایک تو خوب صورت دوسرے بہت سا جہیز۔ میں نے سوچا چلو ہوا کیا۔ طبیعت بھی بہلے گی روپیہ بھی ہاتھ آئے گا۔ پر اب پچھتاتا ہوں۔ کچھ بات چیت کر سکتی۔ مقدمے والوں کی خاطر مدارات کرتی تو وہ بھی ہماری تواضع کرتے۔ کوئی مرغیاں لاتا؛ کوئی شراب کا پیپہ دے جاتا۔ لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ گذارہ مشکل سے ہوتا ہے اور میں خود بھی پژمردہ اور اداس رہتا ہوں۔ بیوی کیا ہے۔ ایک مشین ہے۔

آدم۔ بہری تو نہیں؟

بوتال۔ نہ۔ خیر سنتی تو تم ہم سے بھی زیادہ ہے۔

آدم۔ تو پھر کچھ مشکل نہیں۔ اگر کوئی گونگا شخص ساتھ ہی بہرہ نہ ہو تو اس کا علاج سہل ہے۔ آپ کے گھر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ اس کا آپریشن اس بارے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

بوتال۔ میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔

آدم۔ تمہاری مرضی۔ لیکن اس کو بلانے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لو۔ گونگی جورو کے جہاں کئی نقصان ہیں۔ وہاں کئی فائدے بھی ہیں۔

(آدم چلا جاتا ہے۔ جج اپنے ملازم کو ڈاکٹر کے گھر بھیجتا ہے۔ اس کے بعد جج کی بیوی کیتھرین داخل ہوتی ہے)

بوتال۔ (کام کرتا کرتا رک جاتا ہے) آہا۔ میری جان۔ تم آگئیں۔ مجھے تمہاری آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ تم پریوں کی طرح خاموشی کے ساتھ گذر جاتی ہو۔ تم ایک خوشگوار خواب کی مانند ہو۔ تم قدرت کا ایک معجزہ ہو۔ تم میں سوائے ایک گویائی کے باقی تمام صفات موجود ہیں۔ اگر تمہیں گویائی کی قوت بھی عطا ہو جائے تو کیا تم خوش نہ ہوگی؛ جو جذبات اب مجھے تمہاری آنکھوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں وہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہوں گے۔ تمہاری روح بے نقاب ہو جائے گی۔ تم اپنے منہ سے محبت کا اظہار کرو گی۔ اپنے شوہر کو اپنی زبان سے پکارو گی۔ میری جان میں تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر ابھی آکر تمہاری زبان کھول دے گا۔ تھوڑی دیر میں تم چہچہانے لگ جاؤ گی۔

(کیتھرائن اشاروں سے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتی ہے اس کے بعد ڈاکٹر آتا ہے۔ اور سب کے سب آپریشن کی تیاری کے لئے ساتھ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(جج کا کمرہ ـــــــ شام کا وقت)

آدم۔ آپ نے میرے موکل کے مقدمے پر غور کیا؟

بوتال ۔ ابھی نہیں ۔ تم جو کاغذات چھوڑ گئے تھے، انہیں چھونے تک کی فرصت نہ ملی ۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ تمہارے مشورے پر عمل کیا ۔ اب جان عذاب میں ہے ۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور میری بیوی بولنے لگی ۔

آدم ۔ خدا کا شکر ہے ۔ کہا کیا اس نے ؟

بوتال ۔ کہنے لگی ۔ ذرا آئینہ دکھانا مجھے ! اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی ۔ میری جان ! میری سالگرہ کے دن مجھے ساٹن کا ایک گون لا دو گے نا ؟ ــــ ساٹن کا گون اور ایک ٹوپی جس کے اندر مخمل کا استر لگا ہو ۔

آدم ۔ اس کے بعد اس کی زبان بند تو نہیں ہوئی ؟

بوتال ۔ نہیں بلکہ وہ متواتر لگاتار ، بغیر رُکنے کے ، بغیر کسی وقفے کے بولتی رہی ۔

آدم ۔ شروع شروع میں تو یونہی ہوگا ۔ برسوں کی رُکی ہوئی باتیں سب یک لخت نکلیں گی ۔ بعد میں بولنا ذرا کم ہو جائے گا ۔ میرے مقدمے کا خیال رکھئے اس خاتون کا نام لیڈی آرمیلین ہے ۔ خدا حافظ !

(آدم چلا جاتا ہے ۔)

بوتال ۔ (کاغذات پڑھنے لگ جاتا ہے) دعوائے منجانب لیڈی آرمیلین ...

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین ۔ کیا کر رہے ہو میری جان ؟ تم مصروف معلوم ہوتے ہو ! تم ہمیشہ مصروف رہتے ہو ۔ تم بہت کام کرتے ہو ۔ دشمنوں کو کچھ ہو نہ جائے ۔ میں کہتی ہوں کبھی آرام بھی تو کیا کرو ، اور بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کر کیا رہے ہو ؟

بوتال ۔ میری جان ......

کیتھرین ۔ کیا کوئی راز کی بات ہے جس کے پوچھنے کا مجھے حق نہیں ؟

بوتال ۔ میری جان ....

کیتھرین ۔ کوئی راز کی بات ہے تو میں نہیں پوچھتی ۔

بوتال ۔ مجھے بات تو کرنے دو ۔ میں ایک مقدمے کا فیصلہ لکھنے لگا ہوں ۔

کیتھرین ۔ تو بڑا ضروری کام ہوا نا ؟

بوتال ۔ بہت ضروری !

کیتھرین ۔ تو میری جان تم اپنا فیصلہ لکھو میں کچھ نہ بولوں گی ۔

بوتال ۔ مقدمے کے واقعات یہ ہیں .... لیڈی آرمیلین ....

کیتھرین ۔ میری جان تمہاری رائے میں مجھے ریشم کا گون اچھا لگے گا ، یا ترکی مخمل کا ؟

بوتال ۔ مجھے کیا معلوم ، مجھے تو .....

کیتھرین ۔ میرا خیال ہے میری عمر کی عورت کو ساٹن اچھی لگے گی ۔ بشرطیکہ ہلکے رنگ کی ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے پھول ہوں ۔

بوتال ۔ ممکن ہے مگر ......

کیتھرین۔ اور دیکھو میری جان! تمہارے خیال میں گون کا گھیر بہت ہی زیادہ رکھنا بری بات نہیں۔ گھیر ہونا تو زیادہ چاہیئے ورنہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا پہن رکھا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی فضول ہے۔ تم دیکھنا یہ فیشن بھی اڑ جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟

بوتال۔ بے شک مگر.....

کیتھرین۔ اور جوتے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ عورت کا اندازہ ہی اس کا پاؤں دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ وضعدار عورتیں جوتوں کا خیال سب سے زیادہ رکھتی ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟

بوتال۔ ٹھیک ہے مگر....

کیتھرین۔ اچھا تم اپنا فیصلہ لکھو۔ میں نہ بولوں گی۔

بوتال۔ بہت اچھا (کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے) "مذکورہ بالا خاتون کے سرپرست نے خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہو کر...."

کیتھرین۔ کل ہی مجھ سے ایک سہیلی کہہ رہی تھی کہ دنیا کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی بڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں میں دیانتداری اور شرافت نام کو نہیں۔ کیا یہ سچ ہے یا میری سہیلی یوں ہی مبالغہ کرتی تھی؟ بولو میری جان!

بوتال۔ مہربانی کر کے یا تو تھوڑی دیر کو چپ ہو جاؤ یا کہیں اور جا کر بولتی رہو۔ میرے کام میں ہرج ہوتا ہے۔

کیتھرین۔ میری جان! تم اطمینان رکھو میں بالکل کچھ نہ کہوں گی۔

بوتال۔ اچھی بات (لکھنے لگتا ہے) "مذکورہ بالا سرپرست نے اس خاتون سے بہت سا روپیہ..."

کیتھرین میں کبھی کبھی سوچتی ہوں چیزیں مہنگی کتنی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی تو ہم لوگ کفایت شعاری نہیں کرتے۔ دسترخوان پر جب تک دس دس کھانے نہ ہوں چین نہیں آتا۔ میں تو سمجھتی ہوں تھوڑی سی یخنی، تھوڑا سا گوشت، اور ایک میٹھی چیز بس یہ کافی ہونا چاہیئے۔ لیکن لوگ پیٹو بھی تو بہت ہوتے جاتے ہیں۔ میری جان! تم کو ایسے لوگوں سے نفرت نہیں ہوتی؟ اور یوں کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کھانے کے بغیر گزارہ کس طرح ہو؟ لیکن ذرا سوچو تو۔ لوگ کیسی کیسی بدمزہ اور غلیظ چیزیں کھاتے ہیں۔

بوتال۔ میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

کیتھرین۔ میری جان! میں اب اور کچھ نہ کہونگی۔ ممکن ہے تمہارا ہرج ہوتا ہو۔ میں زبان تک نہ ہلاؤں گی۔

بوتال۔ تمہاری بڑی مہربانی۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ دیکھا میری جان! میں اب کچھ کہتی ہوں؟ بالکل چپ بیٹھی ہوں۔

بوتال۔ ٹھیک۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ اب تو تمہارا ہرج نہیں ہوتا؟

بوتال۔ بالکل نہیں۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ اب اطمینان سے اپنا فیصلہ لکھو۔ کیا ختم نہیں ہوا ابھی؟

بوتال۔ اگر تم نے بولنا بند نہ کیا تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ (لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

کیتھرین۔ (یک لخت کھڑی ہو جاتی ہے) سنو! معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے۔ لوگوں کا شور سنائی دے رہا ہے (بوتال کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ خدا کا شکر ہے آگ نہیں لگی۔ توبہ توبہ جب کہیں آگ لگتی ہے تو کیسی مصیبت ہوتی ہے۔ گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے لوگ۔ اپنا اسباب دریا میں پھینک دیتے ہیں اور کھڑکیوں میں سے کود کود کر باہر نکل آتے ہیں۔ خوف اور ڈر کے مارے لوگ دیوانے ہی ہو جاتے ہیں۔

بوتال۔ بس اب اس سے زیادہ برداشت کرنا ناممکن ہے اگر یہی حالت رہی تو مجھ سے کوئی شدید جرم سرزد ہو جائے گا۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) دیکھو جا کر ڈاکٹر صاحب کو ابھی بلا لاؤ۔ کہو کہ بہت ضروری کام ہے۔ فوراً آجائے۔

کیتھرین۔ کیا ہے میری جان! تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ موسم کی خرابی ہے یا کھانے میں کچھ نقص تھا؟

بوتال۔ اے کاش! میں نے تمہاری زبان نہ کھلوائی ہوتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں ابھی ڈاکٹر آکر اپنی مسیحائی سے تمہاری زبان پھر بند کر دے گا

(کاغذ اٹھا کر کیتھرین کے منہ پر مارتا ہے۔ کیتھرین چیخیں مارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ــــــــــ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

بوتال۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بیوی کے علاج کے لئے بلایا ہے۔

ڈاکٹر۔ کیا انہیں کوئی تکلیف ہے؟

بوتال۔ اسے؟ اسے کیا تکلیف ہوتی۔ بدقسمت ستم رسیدہ مظلوم تو میں ہوں۔

ڈاکٹر۔ تکلیف آپ کو ہے علاج آپ اپنی بیوی کا کرانا چاہتے ہیں!

بوتال۔ ڈاکٹر صاحب اسے گویائی کی طاقت آپ نے بخشی تھی تو اس قدر فیاضی سے کیوں کام لیا تھا۔ کیا اس کی زبان کسی طرح بند ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر۔ بالکل ناممکن! بولتے ہوئے آدمی کو گونگا بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔

بوتال۔ آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے میں اجڑ گیا اب تو میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے گلے میں ایک بھاری سا پتھر باندھ کر دریا میں کود پڑوں۔

ڈاکٹر۔ تمہاری بیوی کا تو کوئی علاج نہیں البتہ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔

بوتال۔ وہ کیسے؟

ڈاکٹر۔ بہت بولنے والی بیوی کا دفعیہ تو صرف یہی ہے کہ شوہر کو بہرا بنا دیا جائے۔ میرے پاس ایک سفید سفوف ہے جسے کان میں ڈالتے ہی انسان ہمیشہ کے لئے بہرہ ہو جاتا ہے

بوتال۔ ہمیشہ کے لئے!

ڈاکٹر۔ ہمیشہ کے لئے!

بوتال۔ نہیں مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔ میں بہرا بننا نہیں چاہتا۔

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین۔ ایلو! یہاں تو ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ بیگم آپ کو اب بولنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟

کیتھرین۔ ڈاکٹر صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ شروع شروع میں تو صرف چند فقرے ہی بول سکتی تھی۔ لیکن اب روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہوں تاہم میں ضرورت سے زیادہ نہیں بولتی۔ ابھی ابھی میرا شوہر کام کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ پاس بیٹھی تھی لیکن پھر بھی میرے شوہر کو شکایت ہے کہ تمہارے بولنے سے میرے کام میں ہرج ہوتا ہے (شوہر سے مخاطب ہوکر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ناراض کس بات پر ہو؟ آخر وجہ کیا ہے؟ کوئی بات تو ایسی ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتاتے! للّٰہ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری آسائش کا خیال رکھوں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو میں آئندہ کے لئے احتیاط کروں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اماں جان کو خدا بہشت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی بات نہ چھپانی چاہیئے۔ بے چاری سچ کہتی تھیں۔ دل میں کبھی کوئی بات نہ رکھنی چاہیئے۔ جو ہو صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ میرا خدا جانتا ہے میں نے کوئی قصور نہیں کیا اگر پھر بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں گنہگار ہوں تو بے شک ڈاکٹر کے سامنے سب حال بیان کر دو۔

بوتال۔ (بے بس ہوکر) ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے وہ سفید سفوف میرے کان میں ڈال دیجئے۔ (ڈاکٹر بوتال کے کان میں سفوف ڈال دیتا ہے)

کیتھرین۔ میری جان۔ میرے سرتاج! آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا میں ایسی ہی بے رحم ہوں کہ تمہیں ستاؤں؟ میں نے تم سے کبھی کوئی دغا کی ہے؟ کبھی تمہیں دھوکا دیا ہے؟

بوتال۔ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) آہا! زندگی کس قدر شیریں ہوگئی ہے! مجھے اب ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔

کیتھرین۔ بوتال! میری بات سنو! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے دل کا حال سناتی ہوں۔ میرا دل بچپن ہی سے نرم تھا۔ جب میں سات سال کی تھی۔ تو میرے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا.... سن رہے ہو؟ میری جان! میری روح! میرے شوہر! (بوتال کو جھنجھوڑتی ہے)

بوتال۔ زندگی اب ایک جنت ہے۔

(تازیانہ)

صید و صیاد

۱۲ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیم پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اور جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتا جاتا، اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیوین تھا) جب پل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر ہاتھ رکھے دریا کے سیاہ پانی کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ذرا کانپا، اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور غافلانہ انداز میں اپنا اوور کوٹ اتارنے لگا۔

اوور کوٹ کو تہہ کر کے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دریا میں کودنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت!"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکا دے کر ہٹا دیا اور پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی "حضرت! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لئے ٹھہر جائیے! کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا اجنبی درمیانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک۔ حسن پرنیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیوین کو غصہ سا آگیا اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا اس کا یوں رائگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔۔۔

وہ جھلا کر بولا "آپ ہوتے کون ہیں؟"

اجنبی نے کہا "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کرسکتا۔ ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا سا ہے لیکن میں کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیئے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا "تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہ (اس نے دریا کی

طرف ہاتھ پھیلا دیا۔) عورت کی جنس کو میں یہاں جان کا خراج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اجنبی بولا "قصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجئے میں آپ کے منہ سے "نہ"، "نہیں" سن سکتا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ تک ملتوی کر دیجئے۔ محض ایک گھنٹہ تک، کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے لے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیوین نے جو باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا، پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اجنبی نے کہا "یہ دیکھئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں یہاں سردی ہے آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنا اوور کوٹ پہن لیجئے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلے چلئے۔ وہ جہاں سرخ روشنی نظر آ رہی ہے جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سن لیجئے۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آ جائیے اس میں ہے ہی کیا؟"

سیوین نے دریا کو ایک نظر دیکھا اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے اور ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بدتمیز کہیں کے۔ میری سنی ہی نہیں میں کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں۔ لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں ـــــ یہ لیجئے ہم پہنچ گئے یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے..... پہلے آپ صاحب۔"

دونوں کمرے میں ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیکھنے میں برا نہ تھا۔ موسیو سیوین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا کیا مقصد ہے؟"

اجنبی نے کہا "مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے "شیر شکاری" کھیلئے۔ "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟"

"نہیں"

"افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے پول کہتے ہیں۔"

سیوین نے کہا "کہتے جاؤ، میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا۔"

پول مایوسی کے لہجے میں بولا "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنئے۔ جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لئے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ جس پر انہیں کسی طرح کی ملامت نہ ہو سکے اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیوین نے کہا "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو، آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

یولَ نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھئے نا، آخر ایک موحد بھی سینے میں دل رکھتا ہے اس کے بھی حسیات کو صدمہ پہنچ سکتا ہے تو صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے چند فرائض ایسے بھی ہیں، جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا انتقاضا یہی ہے۔ کیا آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ کو تشریف لے جانے میں مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ تیار کیا؟ خواہش مند ہیں۔ جن کی مدد سے آپ کے وداع آخری کو نہ صرف زیادہ پُرلطف بلکہ زیادہ خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس حسن آفرینی کے لئے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلےٰ درجہ کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے اور شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دئے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی کی جاتی ہے پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں فائر کرتا ہے ایک دفعہ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں اگر شیر زخمی ہو گیا ہو تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی کی ہیں، مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پرلطف موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سیتوین نے پوچھا "لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنے اس قبیح فعل کے لئے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملی، میں واپس پل پر جا رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمہارا ممنون ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

یولَ نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا "خدا کے لئے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آجائے گا۔ آپ چل کر ڈیوک کی جگہ لے لیجئے۔ اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنائیے اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے۔ تو آپ اس پر احسان کر کے واپس یہاں تشریف لے آئیے۔"

سیوین نے گھبرا کے پوچھا "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں۔"

یولَ نے کہا "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے

چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مرجانا یا ایک دریا میں پڑے سڑتے رہنا، جہاں اس بات کا بھی خطرہ ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آکے آپ کو نہ بچالے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کو کم از کم یہ خیال تو ہوگا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

سیوین نے کہا "ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو، جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت ماردیا ہے۔"

موجد بولا "حضرت آپ بہت سطحی نگاہی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے ذرا آپ غور تو فرمائیے۔ میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مرجاؤ، میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں جنہوں نے مرجانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا؟ یہ سنئے (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہوچکی ہیں جن میں سے ۵۲ مردوں کی تھیں۔ اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جاچکی ہیں۔ نتیجہ؟ بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مربی اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی ہے نہیں؟ جناب عالی! میں تو مصلح بنی نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کرلیتے ہیں۔"

"حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے۔ حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی کے چلنے کا ڈر ایک مختصر مگر شدید انتظار مرگ ـــ مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کرلیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر میں جاکر طبعی موت ہی مریں گے ــــ حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کریں۔ اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے۔"

سیوین نے کہا "خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟"

یُول بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے سلجھے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوین نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا "بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔"

شراب خانے سے نکلے تو یُول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آویزاں لمپ کی ناکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کردیتی تھی۔ یُول نہایت لسانی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہوجانے کا ارادہ نہ کرلے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹرس نے بہت بری طرح ایکٹ کیا۔ اور گلتے وقت بے سری ہوگئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہوچکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کردی۔ سیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ یُول نے

ایک گھنٹی کی رسی کو پکڑ کر کھینچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر کو جھانکا اور آواز آئی۔ "کون ہے ؟"

یوآں نے کہا "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یوآں نے پوچھا "وہ خاتون ابھی یہیں ہیں ؟" جواب ملا "ہاں صاحب۔" "ڈیک آئی ہیں ؟" جواب ملا "نہیں صاحب۔"

یوآں نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا "آیئے۔"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میز پر ایک رباب رکھا تھا۔ اور کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی بشکل حسین تھی۔

سیوین نے مایوس ہو کر پوچھا "کیا یہی وہ خاتون ہیں ؟"

یوآں نے کہا۔ "نہیں صاحب! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے۔ اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی پورا کر دیجئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے۔ گمنامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے ـــ ٹھیک۔ ادھر کو تشریف لایئے۔"

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا۔ مگر جس قدر بھی تھا اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی "اب آ بھی چکو۔ اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

یوآں نے کہا "بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے کچھ مشکلات پیش آگئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں، یہ ان بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجئے۔ یا دنیا کے لئے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیے۔"

عورت نے اٹھ کر کہا "نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

سیوین نے کہا "سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر ہوئی میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ یوآں کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جایئے۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریائی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سیوسے تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا "جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی۔"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیوین اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوب صورتی جو بالوں کے گھنگھریالے جال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لئے کافی تھیں کہ سیوین نقاب پوش حصے کے متعلق غور کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہرحال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی " جناب ! اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخری لمحے اکٹھے ہی گذارنے ہیں تو ہنس کھیل کے ہی گزار دیں ۔ دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں ۔ ذرا میرے دل کو بہلنے دیجئے ۔ خدا کے لئے بات ہی کیجئے ۔"

سیون نے کہا " بیگم ! بسر و چشم ۔ کیا بات کروں ۔ اچھا استعارے میں بات کرتا ہوں ۔ جب میں ادھر کو آرہا تھا تو رستے میں پول ستاروں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا ۔ ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی ۔ پول نے مجھ سے پوچھا تھا " یہ زہرہ یہاں کیسے آگئی ؟ " اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے ۔ زہرہ یہاں کیسے آگئی ۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے ۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے ۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں ۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے ۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آگئی ہے ؟"

خاتون نے جواب دیا " جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے ۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی بیہودہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی ۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا ۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے ۔ جس کی ظاہرا شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی ۔ لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا ۔"

سیون نے کہا " اس کے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجئے ۔"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا " میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں ۔ میں راز کے بدلے راز کا اظہار کر سکتی ہوں ۔ گمنام صاحب ! آپ بتائیے ۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں ؟ " (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی ۔)

" بیگم صاحبہ ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے ۔ اور کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا ۔ لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا ۔ اب وہ ایک سیاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے ۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لئے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں ۔"

" تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا ؟ "

" کبھی نہیں ۔ اسی لئے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا ۔"

" آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کے لئے جان یوں قربان کر دی جائے ۔"

" کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے ؟ "

خاتون نے جوش میں آکر کہا " ہرگز نہیں ۔ قطعاً نہیں ۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت کو دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلب گار ہوں آپ کا شاید یہ خیال ہو ۔ لیکن میں تو صرف اس لئے مرنا چاہتی ہوں ۔ کہ مبادا دربار شاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں ۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے ۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو ! مرد جھوٹے اور بے وفا ہیں ۔"

" بیگم صاحبہ ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں ۔"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے ۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیون نے کہا " بیگم صاحبہ ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں ۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے ۔"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا: "کیوں ؟"

"میری آرزو ہے کہ میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں۔ جو ابھی مجھے دوسری دنیا میں بھیج دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی۔"

جواب ملا: "فضول تمنا ہے آپ کو چاہیئے کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ و ارفع خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیوین نے کہا: "بیگم صاحبہ! یہ نہ کہیئے۔ ابھی ابھی مجھ سے یوآں نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ ہم ایک طول طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہوں۔ تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ کو میرا شرمندۂ احسان ہونا چاہیئے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا اور پھر آپ کی گولی کا نشانہ بننا یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ ـــــ مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے۔"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "جناب فی الحقیقت، بقول آپ کے میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے۔"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دئے۔ اور دونوں غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ سیوین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے حسن حسن کو آشکار کر دیا تھا سیوین کی توقع سے بالا تھا۔ باریک نفیس ابرو، جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلمطرازی، نیلی نیلی خوب صورت آنکھیں، لمبی لمبی محجوب پلکیں، آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں۔ سیوین کا دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا: "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آئی ہے۔ جس کی وجہ سے دو مرد مجھ سے یوں منہ پھیر لیں۔"

سیوین نے کہا: "جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو اس کی وجہ اس موہنی صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی؟"

"ایک بے وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا تموّل بھی رخصت ہو گیا اور ناداری نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چھبیلا ایک دن مجھے ملنے آیا۔ عشق و محبت کی داستان رُک رُک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا۔ انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے ـــــ حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ دور اندیش واقع ہوئے تھے۔"

سیوین نے جیسے ایک درد محسوس کر کے کہا: "اے خدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دور اندیش رہنا۔ اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ۔ آپ کا عطارد۔ وہ بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مر جانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے سورما کا دل اور شمشیر چھ مہینے تک میری قدمبوسی کرتے رہے۔ لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جوانمرد سپاہی ایسے نہیں ہوا کیا کرتے۔ یکایک انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عذر ملاحظہ فرمائیے۔ میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے۔ مجھ کو آپ لکھتے ہیں "رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔" اب تک وہ اندھا تھا ایک نئی نویلی نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیوین نے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے۔ اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں

سے پیارا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا۔"

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن، سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کے گئے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اور مجھے شہر سے نفرت تھی اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا۔"

نفرت آمیز جواب ملا۔ "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لمحہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لئے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور بہ مشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لئے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔"

سیوین نے کہا "میں نیلے رنگ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی ـــــ

"جناب آپ یقین مانیے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیوین نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آکر کہا۔ "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی۔"

شاعر نے کہا "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دوراندیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی۔ آپ بہت بے رحم ہیں۔ لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شعریت سے بالکل مبرا تھا آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر اس پر بادل گھر کر آجاتے ہیں پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخِ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔ جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ لطفِ افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پُرفضا گلگشتوں میں مسرت ہو کہ اے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

"سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھپانا بھی گوارا کرتا ہے؟"

شاعر نے فخر و غرور سے کہا "بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیوین ہے۔"

"کون سیوین؟ مانٹو کا رہنے والا؟"

"شاعر نے کہا" میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کون سی پسند ہے 'حسن شیریں'، 'عشق لیلیٰ'؟"

"نظمیں؟ میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر سیوین کا نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس کھجوری آنکھوں والی کا نام ڈروبائے ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں؟"

"میرا کپتان، میرا سوربا، میرا عطارد مانٹو میں اسے اپنا دل دے چکا ہے۔ مجھے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنوں شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگ جو، بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا عطارد مشہور خطوط باز ہے۔ خط بہت مفصل لکھا کرتا ہے۔"

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار بولا۔

"تو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں، جنہوں نے بے دردی کے ساتھ میری خوشی، میری راحت مجھ سے چھنوا دی ہے اگر آپ اپنے اس سوربا کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لئے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لیٹرا آکر لوٹ لے جائے گا۔"

اس نے اتنا کہا اور ٹہل کر کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرمیٔ تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش رُبا تھا۔

رعبِ حسن اور اس پر شاعر کی نگاہ، سیوین کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا ـــــ وہ ایک پیکرِ التجا ہو کر بولا ـــــ

"بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سوربا کو بھلا دیں میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں اور ـــــ"

"اور کیا؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیوین توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی

"شاعر صاحب! مجھ سے آپ کے عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا البتہ میں آپ کی جدتِ طبع کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانش مندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی۔ جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے ـــــ اس لئے ـــــ"

اتنے میں دروازہ کھلا اور لوئی اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا "یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ از راہ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے۔"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ یوآن! تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں۔ آپ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں۔"

یوآن نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجیے، جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے تیر بننا پڑے گا۔"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ نکال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا ڈال لیا۔ سیوین نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا ـــ

خاتون پکار اٹھی "میں شکاری ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور میں شیر ہوں۔ بیگم صاحبہ! گولی بالکل سیدھی چلائیے۔ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے گا۔"

یوآن نے کہا "یہ دیکھئے۔ یہ گھنٹی ہے۔ اسے اپنے گلے میں ٹکا لیجئے اور ہلا کے دیکھئے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیئے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو تین قدم چلئے اور گھنٹی کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجئے آداب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوش گوار و دل پذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے؟"

سیوین نے کہا "کوئی دردناک سا شعر بجاؤ۔ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو۔ جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ! لیجئے جو انتقام آپ کو مردوں کی جنس سے لینا ہے، وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجئے۔"

یوآن نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بے تابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ یوآن لمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

یوآن نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا "گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں وہ دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجئے۔ اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔"

یوآن کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا ـــ

"بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہو گی۔"

خاتون نے کہا "شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے۔"

یوآن نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیئے؟"

جواب ملا "کوئی بے پرواسی چیز بجا دو۔ دردناک سُر مجھے نہیں بھاتے۔"

دروازہ بند ہوگیا۔ اور ایک ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا سُر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہوگیا۔

ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صید نے آواز دی "شاعر صاحب، پستول ذرا نیچے کر کے چلایئے۔"

صیاد نے کہا "نیلے نیناں والی۔ خدا حافظ۔"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا "بے وفا شاعر، خدا حافظ" اور پھر گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی کوئی زمین پر جیسے گرا۔

یول روشنی لے کر اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرے شاعر، میرے پیارے شاعر، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا۔ اور میں نے یونہی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوب صورت شاعر تو کیوں مر گیا؟"

یول نے شبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا "لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے؟ کارتوس تو خالی کارتوس تھا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان دیوار پر موجود ہے اس لئے دوسرا کارتوس بھی خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں؟ صرف بے ہوش ہوگئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں!"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے انداز میں نیاز مند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں۔"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں! کیا لغویات ہے؟" سیوین اٹھ کر بیٹھ گیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے۔"

یول بولا "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے۔"

خاتون نے کہا "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے۔"

یول نے کہا "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے دیکھئے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو

جائے گا۔ یہ پی لیجئے۔"

"صاحب! آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟"

پوَل مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیوین آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے پوچھا "میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا۔"

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا "یہ آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی: "میرا نام ون سینیز ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر —"

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی ستاروں کی باتیں کریں گے۔"

شاعر نے پوچھا "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا "یونہی سہی۔"

"پطرس"

(ماخوذ از فرانسہ) (مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء)

عشق کی خودکشی

منصلہ ذیل تحریر کے پرزے جیل خانے کی اس کوٹھری میں پائے گئے جہاں میرا دوست قاسم پھانسی پانے سے پہلے محبوس تھا اور مجھے سعادت علی خاں داروغہ جیل کی مہربانی سے دستیاب ہوئے تھے۔ قاسم جس کی زندگی شوق اور کیف کے سر جھکا دینے والے جذبات سے معمور تھی آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی رضیہ کو بھیج چکا تھا خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا فرمائے۔ (ارشد)

(۱) شاید مجھے داروغۂ جیل کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے جب سحر کی پھیکی روشنی اور تھکان کا خواب آلود سکون مشاغلِ شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے میرا دل ایک کھنڈر ہے جس میں زندگی نہیں آثار ہیں، جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے، جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو نوائے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں۔ ایک خندۂ بے مسرت، ایک فریاد بے درد ہے۔

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ ہر شخص اس کے لئے تیار رہتا ہے۔ موت کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت اسی لئے موت ہے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی موت ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بے موقع آئے۔ اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے۔

(۲) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو جس میں عشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتماد ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لئے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں۔ مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی، میری آرزوؤں کے محل، میری توقعات کے قصر، میرے ارادے کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے۔ لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا، تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا ارشد بھی مجھے بے گناہ سمجھتا تھا، حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا تھا۔ ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے ان کو گمان تھا کہ رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے لیکن مجھے حقیر جانتے تھے۔

یہ دونوں غلطی پر تھے۔ میرے اعتراف جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے اسی دائیں ہاتھ نے جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے میرے انکار جرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی جس نے مجھ سے بعد میں اعتراف کروایا۔ میں ایک نہیں، دو ہوں۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہو رہا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو چاہنے والا بھی انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے مانوں؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں —— کہ میں نے رضیہ کو اس لئے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی لغویات معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے۔ میں ایک کمزور ہوں سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

(۲) دو سال ہوئے میں اور رضیہ بیاہے گئے۔ اس کے سنگدل والدین نے اب تک اسے معاف نہیں کیا۔ میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلے میں حسن اس قدر کمیاب نہ ہوتا تو شاید چند اور والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مامون رہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے۔ کیا شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصائلی پر فخر کرتے ہیں۔ اس صفت پر فخر کرتے ہیں۔ جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو جو مجھ سے بچ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں میری عالی نگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کر سکتی تھی۔ یہ نقادانِ اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ اوہ! جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی۔ محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لئے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کئے۔ ٹھیک وقت پر میرے لئے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ اسے یہ نہ کہو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔

عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ فطرت نے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لئے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لئے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں

یا ہم ان کے لئے رو دیں۔ عورت کو خراج نگاہ چاہیئے یا خراجِ اشک۔ اسی دولت سے وہ کشورِ دل پر حکمرانی کرتی ہے ان کا عہد ایک دورِ ظلم ہوتا ہے اور ایک عہدِ ستم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ برف تھی۔ میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں۔ وہ بے روح تھی میں چاہتا تھا حرارت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کی خاموشی میں بارہا گھنٹوں تک متواتر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے لمبے لمبے درد بھرے فقروں میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ اسے دیوی سمجھ کر پجاریوں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بت کی طرح بیٹھی رہا کرتی۔ میں اس سے کہتا "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادنےٰ غلام ہوں۔ تیری خدمت کرنا میرے لئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی۔ کیونکہ اس پر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہو گے شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں "نسوانیت" کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مرد ہو، تم میں مردانگی نہیں۔ تمہاری تمناؤں میں بلندی کی قابلیت نہیں، تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں۔ او کم ظرف انسانو! تم مجھے کچھ نہ کہو۔"

ہم، کئی دفعہ میں رات کو دیر میں گھر آیا۔ اس نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا "رضیہ! میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی" تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے لئے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو، تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ رضیہ جب تم میری ہو، تو پھر کیا ہے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ میں نے اس کے کپڑے جلائے وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی۔ ان کتابوں اور کپڑوں کے لئے روتی رہی۔ جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا لیکن جلد غائب ہو گیا۔ اور میں مٹھیوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہو گے، ڈرتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں؟

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جیسے پروانے کو شمع کے جلتے ہوتے مرجانا چاہیئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں۔ دنیا میں، میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عاید ہوتا ہے۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک رات کے لئے بدرِ منیر ہوتیں اور بس ان کو چند لمحوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاقِ سلیم کا خون کرنا تھا اس پر اگر اہلِ دنیا مجھے قصوروار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ مجھے کل مار ڈالیں گے۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔ افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھتا جس کو توڑتے ہوئے میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا۔ میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے چپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے۔ اسی

شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے تھک کر لیٹی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بے قراری کو کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے فقروں میں بیان کر رہا ہے۔ "رضیہ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونک دیا ہے کہ میرے جسم میں کوئی روح ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی، میری راحت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں، رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں۔ آرزوؤں کا ایک طلاطم بپا ہوتا ہے۔ تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا سازِ ہستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گذر گیا میرے دل میں نغمے گونجتے ہیں کہ تو ان کو سنے۔ کیا تو سنتی ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا "رضیہ سنتی ہے۔" کہنے لگی "سنتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسار سے کہا۔ "رضیہ کچھ تو کہو۔" اس نے کچھ نہ کہا یا شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے سکون کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آتے گئے۔ میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے فولاد بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی نظروں میں وحشت نظر آئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہو گیا۔ میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی ہو گئی اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھر گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلاّ چلاّ کر پوچھتا رہا کہ "رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے۔" وہ کچھ نہ بولی ——

(۶) وہ بےچاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل مر جاؤں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لئے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریقِ احسن ہو، وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے۔ راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی۔ اندھا کر دیتی ہے۔ اپنے قریب آنے کا رستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو گے؟

قاسم

"پطرس"

(مخزن جون ۱۹۲۱ء)

تائیس

رومان از اناطول فرانس

اوپیرا از موسیو گیلے

اناطول فرانس کی "تائیس" بہت مشہور کتاب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ناول کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ جس میں تھیبس اور سکندریا کے رومانی مناظر اور راہب پفنوتوس کے کرب و اضطراب کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر "تائیس" موسیو گیلے کے اوپرا کا ترجمہ ہے جو اناطول فرانس کے ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں ڈرامہ کی مخصوص قیود کی وجہ سے واقعات، اور مناظر محدود کر دیئے گئے ہیں اور چند کرداروں کے نام بھی بدل دئے گئے ہیں۔

اوپرا ڈرامہ کی ایک ایسی قسم ہے۔ جس میں ڈرامائی واقعات تو موسیقی کے ذریعے سے اور مناظر و جذبات الفاظ کے علاوہ اسٹیج کی آرائش، اور اداکاری سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو خیالی اسٹیج اور خیالی اداکار وضع کرنے پڑتے ہیں اس کے بغیر اوپرا سے محظوظ ہونا ممکن نہیں۔

پطرس کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام ہلکا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے تخیلی گرفت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی الفاظ کی پر وقار موسیقی، فقروں کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ڈرامائی مترنم حرکت سے نہ صرف کرداروں میں جان، آگئی ہے بلکہ تھیبس اور سکندریہ کی دھندلی اور دور دراز فضا رات کے کسی دلفریب خواب کا جز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسلوب یکساں، ہموار اور ہم آہنگ ہے اور ترجمہ کے بعض حصوں میں نثر کے ڈانڈے نظم بلکہ نغمہ سے جا ملتے ہیں —————— (ادارہ)

افراد

تائیس —————— سکندریہ کی ایک حسین رقاصہ

اتانیئل —————— ایک راہب

پالیموں —————— ایک بوڑھا راہب

نیس —————— سکندریہ کا رئیس

مرتال }
کروبیل } —————— نیس کی خواصیں

البین —————— راہبہ عورتوں کی سردار

چند اور راہب

باب اوّل

پہلا منظر

(صحرائے تھیبس۔ دریائے نیل کے کنارے سینو بیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔

ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا۔

بارہ راہب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ان کے بیچ میں بوڑھا پالیموں اس غریبانہ طعام کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے جو میز پر چنا ہے۔

ایک جگہ خالی ہے جہاں آتانئیل کو بیٹھنا ہے۔)

ایک راہب۔ یہ روٹی رکھی ہے۔

دوسرا۔ اور یہ نمک ہے۔

تیسرا۔ اور یہ پودینہ ہے۔

چوتھا۔ اور یہ شہد ہے۔

پانچواں۔ اور یہ پانی ہے۔

پالیموں۔ (کھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ) آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح میرے باغیچے پر برکات کا نزول ہوتا ہے۔ آؤ اس خدا کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے آؤ اس کے حضور میں دعا مانگیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔

راہب۔ (بہت نرم آواز سے) اے خدا! جہنم کے شیاطین ہمارے راستے سے دور ہو جائیں۔

(راہب چپ چاپ کھانا کھاتے ہیں)

ایک راہب۔ (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند! ہمارے بھائی آتانئیل پر اپنے بازوئے قوت پھیلائے رکھ۔

بہت سے راہب۔ (افسوسناک لہجے میں) آتانئیل!

چند اور راہب۔ (اسی لہجے میں) کتنا عرصہ گذر چکا اور وہ ابھی واپس نہیں لوٹا!

دوسرے راہب۔ مگر وہ کب واپس آئے گا؟

پالیموں۔ (جیسے کسی راز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں نے کل رات اسے خواب میں دیکھا۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔

راہب۔ (جوش کے ساتھ) آتانئیل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے (تقدس کے لہجے میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

(آتانئیل[1] داخل ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے جیسے غم اور تھکن سے چور چور ہے)

---

[1] ناول میں اس کیرکٹر کا نام پفنوتس ہے اوپیرا والوں نے پفنوتس کے نام کو بھدا سمجھ کر اسے بدل دیا۔

راہب۔ (ادب کے ساتھ) وہ آگیا۔ وہ آگیا!

آنانیئل۔ (درمیان میں کھڑا ہو کر مغموم آواز میں) تم پر سلام ہو!

پالیموں اور راہب۔ بھائی تم پر سلام ہو! (سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) تم بہت ماندہ ہو، تمہارا چہرہ غبار آلود ہے۔ آرام کرو۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھاؤ۔ کچھ پی لو۔

(آنانیئل غم زدہ انداز میں بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ سے کھانے کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے)

آنانیئل۔ نہیں میرا دل ناکامی سے لبریز ہے۔ میں الم زدہ اور دل شکستہ ہوں۔ تمام شہر معصیت کے چنگل میں ہے۔ ایک عورت تائیس نے سیاہ کاری اور حیاسوزی کا جال پھیلا رکھا ہے اور اس کے ہاتھ سے جہنم بنی نوع انسان پر حکومت کر رہا ہے۔

راہب۔ (معصومیت اور سادگی کے انداز میں) یہ تائیس کون ہے؟

آنانیئل۔ (تھوڑی دیر کے لئے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے) معبد وینس کی ایک آبرو باختہ پجارن! (عجز کے لہجے میں اور نرم آواز سے جیسے کسی گئے گذرے زمانے کے واقعات دہرا رہا ہو) افسوس اس وقت جب میں کم عمر تھا۔ اس سے پیشتر کہ میری روح پر رحمت خداوندی کا نزول ہوا، میں اسے جانتا تھا (گھبراہٹ کے عالم میں) ایک دن۔۔۔۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں اور نادم ہوں ——— میں اس کے لعنتی دروازے کے آگے ٹھہر گیا لیکن خدا نے مجھے اس تجربہ سے بچا لیا۔ اور صحرا میں مجھے اطمینان قلب عطا فرمایا۔ جہاں میں نے اس گناہ سے کنارہ کشی اختیار کی جو شاید مجھ سے سرزد ہو جاتا۔ آہ! میری روح میں ایک تلاطم ہے۔ تائیس کی حیاسوزی اور تباہ کاری سے میرا دل خون ہے۔ تمنا ہے کہ میں اس عورت کی روح کو خدا کے نام پر مفتوح کروں۔

پالیموں۔ (نرمی کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو۔ عقل ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے ——— رات ہو رہی ہے آؤ دعائیں مانگیں اور سو جائیں۔

(راہب پراسرار ہیبت اور تقدس کے انداز میں دست بستہ سر جھکائے ہوئے ایک ایک کر کے دعا مانگتے ہوئے اپنی اپنی جھونپڑیوں کو چلے جاتے ہیں)

پالیموں۔ اے خدا! جہنم کے سیاہ شیاطین ہمارے رستے سے دور ہٹ جائیں! اے خدا! ہمارے رزق اور پانی کو برکت دے۔ اے خدا! ہمارے باغیچوں کے پھولوں پر اپنی رحمت نازل کر، ہمیں وہ نیند نصیب کر جسے بدخوابی برہم نہ کرے اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی کھٹکا نہ ہو!

(اندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بعد تاریکی کے درمیان ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تھیٹر کا اندرونی حصہ دکھائی دیتا ہے۔ بنچوں پر ہزارہا لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر تائیس نیم برہنہ لیکن نقاب پوش افروڈائٹی کے عشقیہ جذبات کو حرکات رقص سے ادا کر رہی ہے۔ تماشائی بلند آہنگی کے ساتھ دیر تک داد دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام آوازیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بہت دور سے آ رہی ہوں۔ تائیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن کانوں تک بہت مدہم ہو کر پہنچتا ہے۔ شور و ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے اور تائیس کی حرکات اور

بھی پر مسعی ہوتی جاتی ہیں پھر یہ تمام منظر دفعتہً غائب ہو جاتا ہے ——— دن نکل آتا ہے)

اتانئیل۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر ایک تحت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز غصّے اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قہر! ابدی تاریکی! خداوند میری مدد کر! (سجدے میں گر جاتا ہے) اے خداوند! اے خدائے ذوالجلال! جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا، تعریف تجھی کو ہے، میں اس خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (جوش سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس عورت کو گناہ سے نجات دلواؤں گا۔ میں اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کراؤں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے ماتم زدہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے خدا کیا وہ تیرے ہی مبارک دھن کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جس قدر تاریک ہو، اتنا ہی رحم کا سزاوار ہے لیکن میں اسے بچاؤں گا۔ اسے میرے حوالے کر دے اور اے خداوند پھر میں اسے تیری نذر کر دوں گا تاکہ اسے حیاتِ ابدی نصیب ہو (راہبوں کو بلاتا ہے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) اے بھائیو! سب کے سب اٹھ کھڑے ہو۔ آؤ۔ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے۔ مجھے پھر اس ملعون شہر کی طرف لوٹنا ہے۔ خدا نہ کرے کہ گناہ کے سمندر میں اور بھی ڈوب جائے۔ خدا نے مجھے منتخب کیا ہے کہ میں تائیس کو اس کے پاس لے آؤں۔

(اتانئیل پالیموں کے سامنے سر جھکاتا ہے)

پالیموں۔ (نہایت پرسکون لہجے میں نرمی کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے ——— عقل ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔

(راہب اتانئیل کے ساتھ ساتھ سڑک تک جاتے ہیں اور پھر گھٹنوں کے بل
کھڑے ہو کر اتانئیل کی دعاؤں کو دہراتے ہیں۔ جس کی آواز صحرائے
تھیبس کی تنہائیوں میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔)

اتانئیل کی آواز۔ (دور سے) نور اور رحمت کی مقدس روح۔ میرے دل کو تقویت دے۔

راہب۔ اس کے دل کو تقویت دے۔

اتانئیل کی آواز۔ (بہت دور سے) اور مجھے معلم الملکوت کی سی طاقت دے تاکہ میں بدی کی چالوں کا مقابلہ کروں۔

راہب۔ اور اسے معلم الملکوت کی سی طاقت دے۔ تاکہ وہ بدی کی چالوں کا مقابلہ کرے۔

(مکمل خاموشی۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

دوسرا منظر

(سکندریہ۔
نسیس کے گھر کے باہر کا چبوترہ۔ آس پاس بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں۔
چبوترے پر سے شہر اور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دائیں طرف بھاری بھاری
پردے لٹک رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک عالیشان ایوان ہے جو ضیافت کے لئے آراستہ

ہے۔

اتانئیل آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے اور پیچھے کو ٹھہر جاتا ہے۔

ایک غلام اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے۔)

غلام۔ اے فقیر! یہاں سے دور ہو جا اور کہیں اور جا کر بھیک مانگ۔ میرا آقا تم جیسے کتوں کو پاس نہیں آنے دیتا۔

اتانئیل۔ (نرمی کے ساتھ) میرے بیٹے اگر تیری ناراضگی کا موجب نہ ہو تو میرا کہا مان۔ میں تیرے آقا کا دوست ہوں۔ اور اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔

غلام۔ بھکاری یہاں سے دور ہو جا (اتانئیل پر اپنا عصا اٹھاتا ہے)

اتانئیل۔ (نرم لہجے میں مگر رعب کے ساتھ) مارنا ہو تو مار لو لیکن اپنے آقا کو میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ جاؤ۔

(اتانئیل کی پر وقار نگاہ کی تاب نہ لا کر غلام پیچھے ہٹ جاتا ہے
جھک کر سلام کرتا ہے اور پھر گھر میں غائب ہو جاتا ہے ـــ
اتانئیل تنہائی میں تھوڑی دیر کے لئے چبوترے پر سے سامنے
پھیلے ہوئے منظر کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔)

اتانئیل۔ بدکار شہر! ـــ خدا کی پناہ! سکندریہ! جہاں میں گناہ میں پیدا ہوا۔ وہ رنگیلی فضا جہاں میں نے عشرت کی بے پناہ خوشبو میں سانس لیا ہوس انگیز سمندر جہاں میں نے زریں چشم بحری نازنین کا ترنم سنا۔ ہاں یہی میرے سفلی نفس کا گہوارہ تھا! سکندریہ میرا گہوارہ! میرا وطن! سکندریہ میں نے تیرے عشق سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ مجھے تیرے زر و دولت سے، تیرے علم و فن سے، تیرے حسن سے نفرت ہے میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں ـــ اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تجھے میں اس عبادت گاہ کی طرح ملعون سمجھتا ہوں جہاں ناپاک ارواح نے اپنا بسیرا بنا لیا ہو۔ آسمانی ہوا کے جھونکو، جنت کے فرشتو، آؤ اور اپنے پروں کی جنبش سے اس زہر آلود فضا کو جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے گی، معطر بنا دو!

(آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نسیس، کروبیل اور مرتال دو حسین لونڈیوں
کے کندھوں پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے۔ اتانئیل کو دیکھ کر رک جاتا ہے، اور لونڈیوں کو
چھوڑ کر اپنے دونو بازو پھیلائے تپاک کے ساتھ اتانئیل کی طرف بڑھتا ہے۔)

نسیس۔ (گرمجوشی کے ساتھ) اتانئیل! تم ہو؟ میرے مکتب کے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی۔ ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ گو تمہاری صورت اب انسانوں کی بہ نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ آؤ۔ آؤ۔ مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ۔ تم صحرا کو خیر باد کہہ آئے ہو؟ تم پھر ہم میں شامل ہونے آرہے ہو؟

اتانئیل۔ نسیس، تم اس رقاصہ تائیس کو جانتے ہو؟

نسیس۔ (ہنس کر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں۔ صرف جانتا نہیں بلکہ وہ میری ہے صرف ایک اور ایک دن کے لئے۔ میں نے اپنے تاکستان اس کی خاطر بیچ ڈالے۔ اپنے تاکستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں اور اس کی خاطر میں نے قصیدوں کے تین دیوان مرتب کئے، لیکن یہ سب کچھ بے سود

تھا۔ اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے میری انتہائی کوششیں بھی لاحاصل ہیں۔ اس کا عشق خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے۔ اتانئیل! تم کو اس سے کیا کام ہے؟

اتانئیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔

نسیس۔ (کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے) میرے سادہ لوح دوست! وہ ونیس کی پجارن ہے۔ ونیس کے قہر کو مت جگاؤ۔

اتانئیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔ جا نسیس! میں تائیس کو اس ناپاک محبت سے چھڑا کرلے جاؤں گا۔ میں اسے یسوع مسیح کی دلہن بناؤں گا اور وہ اپنی زندگی راہب خانے میں بسر کرے گی۔ تائیس آج میرے ساتھ جائے گی۔

نسیس۔ (اتانئیل کے کان میں ہنس کر) ونیس کے قہر کو مت جگاؤ، وہ انتقام لے گی۔

اتانئیل۔ خدا میرا نگہبان ہوگا۔ (ایک لمحے کے بعد) اس عورت سے میں کہاں مل سکتا ہوں؟

نسیس۔ یہیں پر، آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ، وہ اس نشاط پرست محفل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے اور وہاں سے سیدھی یہاں آئے گی۔

اتانئیل۔ اے دوست مجھے ایشیائی لباس پہننے کو دو تاکہ میں اس ضیافت کے شایاں نظر آؤں۔

نسیس۔ اے نازنینو! کروبیل اور مرتال! جلدی کرو اتانئیل کو لباس پہنا دو۔

(نسیس اور اتانئیل رفیقانہ گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مرتال تالی بجاتی ہے۔ ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے اور مرتال کا حکم پا کر چلا جاتا ہے تھوڑی دیر بعد غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ جس میں سے کروبیل اور مرتال اتانئیل کے لئے سنگھار کا سامان نکالتی ہیں ایک چمکدار نقرئی آئینہ اتانئیل کو دکھاتی ہیں اور ہنس دیتی ہیں۔ اتانئیل اسی طرح بیٹھا نسیس سے باتیں کرتا رہتا ہے لونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبودار تیل لگاتی ہیں۔ اور اس کے سر اور داڑھی کو کنگی کرتی ہیں۔ نسیس مسکراتا ہوا ان کو دیکھتا رہتا ہے۔)

نسیس۔ اب میں ایک بار پھر تمہیں ویسا ہی دیکھوں گا جیسے کبھی پہلے دیکھا کرتا تھا۔

اتانئیل۔ ہاں میں جہنم کا مقابلہ کرنے کے لئے جہنم ہی کے ہتھیاروں سے سجوں گا۔

نسیس۔ مغرور فلسفی! انسان کا دل کمزور ہے۔

اتانئیل۔ جب خداوند میرا رہبر ہے تو میں غرور سے خوف نہیں کھاتا۔

کروبیل۔ (مرتال سے) جوان ہے!

مرتال۔ (کروبیل سے) خوب صورت ہے!

کروبیل۔ اس کی داڑھی کے بال الجھے ہوئے ہیں۔

مرتال۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

کروبیل۔ اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

مرتال ۔ یہ انگشتری پہن لو۔

کروبیل ۔ اپنے بازو آگے کو پھیلاؤ۔

مرتال ۔ اور اپنی انگلیاں۔

مرتال اور کروبیل ۔ جوان ہے اور خوب صورت ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

مرتال ۔ (سنگھار کو جاری رکھتے ہوئے) اب لباس پہن لو۔

کروبیل ۔ (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتہ اتار ڈالو۔

آنائیل ۔ (ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے) ہٹ جاؤ، یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔

(کروبیل اور مرتال پہلے تو آنائیل کے درشت انکار سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی ہیں)

کروبیل اور مرتال ۔ (سیاہ پشم کے کرتے پر لباس فاخرہ پہنا کر) یہ لو اپنے زہد و تقویٰ کو اس نرم نفیس ملبوس سے ڈھانپ لو۔

نسیس ۔ (آنائیل سے) ان کی ہنسی مذاق سے رنجیدہ نہ ہو اور ان کے سامنے اپنی نظروں کو نیچا نہ کرو بلکہ آنکھیں اٹھا کر ان کے حسن کی داد دو۔

آنائیل ۔ (اپنے آپ سے) اے نور کی روح! آ اور میرے دل کو اس جنگ کے لئے مضبوط بنا دے کہ مجھے بدی کی قوتوں سے لڑنا ہے۔

کروبیل ۔ اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے اگر نسیبی اسے دیکھ پائے تو اس خشک زاہد کے سینے میں پھر انسانوں کا سا دل دھڑکنے لگ جائے۔

مرتال ۔ (آنائیل سے) آؤ ہم تمہیں کفش زریں پہنا دیں۔

کروبیل ۔ (آنائیل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر چھڑک دیں۔

کروبیل اور مرتال ۔ (ایک دوسری سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔

(بہت دور سے تحسین کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے نسیس چبوترے پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے پھر واپس آکر مسکراتا ہوا آنائیل سے مخاطب ہوتا ہے)

نسیس ۔ اپنے آپ کو سنبھال لو۔ غنیم بڑھا چلا آرہا ہے۔

(رقاصوں اور ایکٹروں کے گروہ جن کے ساتھ نسیس کے فلسفی دوست بھی شامل ہیں۔ تائیس کے آگے آگے چبوترے پر داخل ہوتے ہیں۔)

ایکٹر اور فلسفی ۔ (تائیس کے گرد جمع ہو کر اور اس کے سامنے جھک کر) تائیس! خواہر کریتز! اسکندریہ کا پھول! تائیس! محبوب ترین دولت! تائیس! تائیس! تائیس!

(نسیس اپنے مہمانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد نوکروں کو ضیافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پردے اٹھا دیتے ہیں۔)

نسیس ۔ تائیس! پیاری تائیس! ہرماورے! رستوبولے! کیلی کریٹی! ڈورین! میرے مہمانو! میرے دوستو! مقدس دیوتا تمہارے ساتھ رہیں۔

(سب ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ تائیس بھی اور مہمانوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے کو ہے لیکن نیسیس اسے ٹھہرا لیتا ہے اور اس کے پاس ہی ایک نشست پر بیٹھ جاتا ہے وہ کھڑی رہتی ہے ہونٹوں پہ ایک طنز آمیز تبسم ہے نیسیس اس کو محبت بھری حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے)

تائیس۔ ہاں یہ تائیس ہے وہ نازک صنم جو آج آخری مرتبہ تیرے پھولوں سے آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

نیسیس۔ ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا۔ اکٹھے سات دن تک بے وفائی نہ کرنا بہت بڑی وفا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ اب تم میرے بازوؤں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی۔

تائیس۔ نیسیس! آج کی رات خوش ہو لو، مسرت کے لمحوں کو نشاط کی دولت بکھیرنے دو اور اس آخری رات سے بجز ایک مختصر ہنگامۂ عشرت اور خود فراموشی کے اور کچھ نہ مانگو۔ کل۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

(کئی فلسفی جن میں اتانئیل بھی شامل ہے مباحثۂ علمی میں مشغول ایوان کی طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چبوترے تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اتانئیل باقی لوگوں سے علیحدہ ہو کر بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے اور تائیس کو غصے کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے)

تائیس۔ (نیسیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے میں نے اسے کبھی ضیافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کون ہے؟

نیسیس۔ (جیسے نہایت معمولی سی بات ہو) ایک سیدھا سادا فلسفی، صحرا کا رہنے والا راہب (طنز کے ساتھ) تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ!

تائیس۔ ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق؟

نیسیس۔ کوئی انسانی کمزوری اس کے دل کو نہیں جا سکتی۔ وہ تمہیں اپنے مقدس عقیدے پر لانا چاہتا ہے۔

تائیس۔ اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اتانئیل۔ (آگے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت، دکھ اور رنج سے محبت کرو۔ نفس کو کچل ڈالو اور گناہوں کی تلافی کرو۔

تائیس۔ (تھوڑی دیر تک اس کو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے) جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، میں صرف عشق پر ایمان لائی ہوں۔ کوئی اور طاقت مجھ پر قابو نہیں پا سکتی۔

اتانئیل۔ (غصے کی حالت میں اس کے کلام کو سنتا رہتا ہے اور آگے بڑھ کر درشتی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے) کفر مت بک!

(ان الفاظ کو سن کر فلسفی اپنی باتیں چھوڑ تائیس کے قریب آتے ہیں۔ خدام سب مہمانوں کو اس —— واقعے کی اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ مہمان ایوان ضیافت سے باہر نکل آتے ہیں اور آہستہ آہستہ استعجاب اور حیرت کے عالم میں تائیس اور نیسیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں)

تائیس۔ (اتانئیل سے ایسے لہجے سے جس میں طنز اور خوشامد دونوں کی آمیزش ہے) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں سے جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ —— وہ کون سی منحوس حماقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ —— انسان عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکہ کھا رہے ہو —— انسان علم و فن کے لئے بنا ہے تمہاری آنکھیں کیوں اندھی ہو رہی ہیں؟ —— تمہارے ہونٹ زندگی کی شراب سے ناآشنا ہیں —— تم عشق کی پختہ کاری کو نہیں جانتے —— آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور پھولوں کا تاج پہن

لو ـــ عشق کے سوا باقی سب جھوٹ ہے ـــ اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

اتانئیل۔ (بہت جوش کے ساتھ) کبھی نہیں! میں تمہاری بے حقیقت کاریوں سے نفرت کرتا ہوں ـــ کبھی نہیں! میں اب ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگاؤں گا۔ لیکن اے سیاہ کار عورت! میں تیرے محل میں آکر تجھے نجات دلواؤں گا ـــ اور تجھ پر فتح پاکر جہنم پر فتح پاؤں گا۔

تائیس، نسیس اور باقی لوگ۔ پھولوں کا تاج پہن لو ـــ عشق کے سوا باقی سب جھوٹ ہے اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

اتانئیل۔ (پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے اور رخصت ہوتے ہوئے رعب و وقار سے مخاطب ہوتا ہے) میں تیرے محل میں آکر تجھ کو نجات دلواؤں گا۔

نسیس اور باقی لوگ۔ (اتانئیل کو غصہ دلا کر) وینس سے سرکشی کرنے والے! ہمت ہو تو آجانا۔

تائیس۔ (افروڈائٹی کے عشقیہ جذبات کو حرکاتِ رقص سے ادا کرنے کے لئے اپنا آپ سنبھالتے ہوئے اور اتانئیل کو غصہ دلا کر) وینس سے سرکشی کرنے والے ہمت ہو تو آجانا۔

(غلام تائیس کا لباس اتارنا شروع کر دیتے ہیں ـــ اتانئیل
انتہائی غصہ سے پیچ و تاب کھا کر وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔)

باب دوم

پہلا منظر

(تائیس کا محل۔
سورج کی روشنی صحن اور تالاب کے اس پار سے ایوان تک پہنچ رہی ہے۔ اس نے قوس قزح کے الوان مختلف سے رنگین ہے اور آنکھوں کو تسکین بخشتی ہے!
سامنے وینس کا بت استادہ ہے اور اس کے پائے کے بالمقابل ایک اونچے مجمر میں سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا ہے۔ فرش پر بیش بہا قالین اور ان پر کامدار گدیلے اور صحرائے لیبا کے شیروں کی کھالیں بچھی ہیں۔ جا بجا پھولدان میں موسم بہار کے پھول سجے ہیں۔
تائیس مغنیوں اور رقاصہ لڑکیوں کو ساتھ لئے داخل ہوتی ہے۔
تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے جانے کا حکم ہوتا ہے)

تائیس۔ (نہایت مایوسی اور رنج کے لہجے میں) آہ! تھکن اور اداسی سے میری زندگی بھاری ہو رہی ہے ـــ مرد سب کے سب بے پروا اور ہوس کار ہیں۔ عورتیں حاسد اور بدخواہ ہیں ـــ اور زندگی کی گھڑیاں بوجھل ہو رہی ہیں ـــ میرے دل میں ہوکیں اٹھتی ہیں ـــ مجھے آرام کہاں نصیب ہوگا اور مسرت کہاں حاصل ہوگی؟ ـــ (سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اٹھا لیتی ہے) اے میرے وفا کار آئینے ـــ مجھے ڈھارس دے ـــ مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں۔ مجھ سے کہہ کہ میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ـــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ـــ (سنبھل کر اور غور

سے کان لگا کر سنتی ہے گویا کسی غیب معلوم مقام سے کوئی آواز کچھ کہہ رہی ہے) آہ! اے بے رحم آواز خاموش ہو جا۔ وہ آواز جو مجھ سے کہہ رہی ہے "تائیس تمہارا حسن ڈھل جائے گا" ——— تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب تائیس تائیس نہ رہے گی؟ نہیں! نہیں! مجھے یقین نہیں آتا ——— اگر کوئی مخفی ترکیب، کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو حسن کو برقرار رکھ سکے! تو اے وینس، تو ہی مجھے اس کے ابدی ہونے کا یقین دلا۔ (وینس کے بت سے مخاطب ہو کر زیر لب دعا مانگتے ہوئے) وینس! ——— جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے وینس! مجھے جواب دے، مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے، اور میرے بالوں کی سنہری چمک مدھم نہ ہوگی ——— مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے!

(اس کی نظر اتانئیل پر پڑتی ہے جو چپ چاپ اندر آ کر دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے۔)

تائیس۔ (اخلاق کے ساتھ) اجنبی تم اپنے کہنے کے مطابق آ ہی گئے۔

اتانئیل۔ (زیر لب دعا مانگتے ہوئے) اے خداوند! اس عورت کا درخشاں چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس کی دلاویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بے کار رہ جائے۔

تائیس۔ (مسکرا کر) کہو کیا کہنا ہے؟

اتانئیل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو، اس لئے میں تم سے ملنے کا آرزومند تھا اور اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم پر قابو پانا میرے لئے کس قدر فخر کا باعث ہوگا۔

تائیس۔ (مسکرا کر) تمہارا عجز بلند مرتبہ ہے تمہارا غرور اس سے بھی زیادہ سرکش ہے۔ خود سر اجنبی! ہشیار رہو، کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ۔

اتانئیل۔ (جذبے کے ساتھ) تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا ہوں۔ لیکن ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ میں مقدس روح کے نام پر، حق اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں وہ تمہاری پھولوں سے آراستہ عشرت گاہیں اور ایک مختصر شب وصال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو رحمت میں آج تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا کوئی انجام نہیں۔

تائیس۔ (طنز آمیز لہجے میں) اچھا تو مجھے اس عجیب و غریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ سچا عشق تو صرف بوسوں کی زبان سے بولتا ہے۔

اتانئیل۔ تائیس! میری ہنسی مت اڑاؤ۔ جو عشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

تائیس۔ (بے پروائی سے) دوست! تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہر لذت سے واقف ہوں۔

اتانئیل۔ جس عشق سے تم واقف ہو وہ شرم اور حیا سوزی سے ہم کنار ہے۔ جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں۔ صرف وہی ایک عشق بلند پایہ ہے۔

تائیس۔ احمق ہو کہ جس کے ہاں مہمان ہو، اس کی توہین کرتے ہو!

اتانئیل۔ توہین! ——— میں تو صرف تمہیں راہ حق پر لانا چاہتا ہوں۔ (اس کا جوش بڑھتا جاتا ہے) آہ کون ہے کہ جو میرے الفاظ کو شعلوں کی طرح بھڑکا دے تاکہ میرے ایک سانس سے اے رقاصہ! تیرا دل موم کی طرح پگھل جائے۔ کون ہے جو تجھے میرے حوالے کر دے۔ کون ہے جو میری گفتار میں سمندر کا سا طوفان پیدا کر دے کہ اس کی چڑھتی ہوئی لہریں تیری روح کو حیات ابدی کے لئے پاکیزہ بنا دیں۔

تائیس۔ (کچھ بے قرار سی ہو کر اتانئیل کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے) حیات ابدی کے لئے!

اتانئیل۔ ہاں حیات ابدی کے لئے!

تائیس۔ (اپنے دل سے فیصلہ کرچکی ہے لیکن ابھی اظہار میں تامل باقی ہے) مجھے سب حال بتاؤ۔ اس پُر اسرار عشق کا حال! ـــــ میں سب کچھ مانوں گی۔ میں سن رہی ہوں۔

(تائیس ایک سونے کے چمچے سے خوشبودار مصالحہ آگ میں ڈالتی ہے)

اتانئیل۔ (گھبرا کر اپنے آپ سے) خوف کے طوفان میرے خیالات کو برہم کر رہے ہیں۔ اے خداوند! اس عورت کا درخشندہ چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے

(دھوئیں کا بادل تائیس اور وینس کے بت دونوں کے ارد گرد چھا جاتا ہے۔ اتانئیل تائیس پر نظریں جمائے رہتا ہے۔ اور تائیس مسکراتی ہوئی پُر اسرار الفاظ دہراتی ہے۔)

تائیس۔ اے وینس۔ جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے!

اتانئیل۔ اے خداوند! اس کی دلاویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بیکار رہ جائے۔

تائیس۔ اے وینس! اپنی بلندی سے نیچے اتر آ۔ اور حکومت کر! وینس جو آسمان کی درخشانی اور برف کی سفیدی ہے! وینس جو درخشندگی ہے راحت ہے اور شیرینی ہے۔

اتانئیل۔ (اپنے دل کو کڑا کر کے اپنا لباس فاخرہ جو سیاہ پشم کے کرتے کے اوپر پہنے ہوئے ہے پھاڑ کر اتار ڈالتا ہے) میں انیتونوئے کا راہب اتانئیل ہوں میں مقدس صحرا سے آیا ہوں۔ اور میں نفس امارہ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور اس موت پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے پنجے میں تو گرفتار ہے، اور اے عورت! میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں گویا کسی قبر کے سامنے کھڑا ہوں اور تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تائیس! خدا کے حکم سے زندہ ہو جا!

(تائیس کا رنگ خوف کے مارے فق ہے ـــــ وہ ہاتھ جوڑے روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی اتانئیل کے قدموں میں گر پڑتی ہے)

تائیس۔ مجھے ملامت نہ دو، کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ صحرائے مقدس کے لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں جو عشرت کا کھلونا بن جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے نہ تقدیر پر نہ فطرت پر اختیار تھا اور میرا کیا قصور کہ میں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مت مارو آہ میں موت سے خوف کھاتی ہوں۔

اتانئیل۔ (جوش کے ساتھ) نہیں تم ابد تک زندہ رہو گی اور ہمیشہ کے لئے یسوع مسیح کی محبوبہ اور دلہن بنی رہو گی۔ وہ یسوع مسیح جس کی تم دشمن تھیں۔

تائیس۔ (جوش مسرت کے ساتھ) میری روح مسرت اور تازگی سے بھر رہی ہے میں تھرتھرا رہی ہوں۔ لیکن مسحور ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے۔

(نسیس کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے، اور آہستہ آہستہ قریب تر ہوتی جاتی ہے)

نسیس کی آواز۔ اے تائیس! نازک اندام حسینہ! میں آخری مرتبہ تیرے پھول سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں۔

تائیس۔ (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہے) آہ نسیس! (گھبراہٹ کے عالم میں اپنے آپ سے) میری روح اب میرے بس میں نہیں۔ مجھے محبت

کرو۔ (یکایک نفرت کے ساتھ) اس نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اسے صرف عشق ہے۔

آتانئیل۔ تم اس کی آواز سن رہی ہو؟

تائیس۔ (آتانئیل سے) ہاں جاؤ! اس سے کہہ دو کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

آتانئیل۔ (تحکم کے لہجے میں) تمہاری دہلیز پر طلوع آفتاب تک میں تمہارا انتظار کروں گا۔

تائیس۔ (سرکشی کی آخری کوشش کرتے ہوئے) نہیں میں رقاصہ تائیس ہوں اور رقاصہ تائیس ہی رہوں گی۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں۔ اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں۔ نہ اس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی۔

(دیوانہ وار ہنستی ہے اور پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ اور گدیلوں پر منہ کے بل گر کر رونے لگتی ہے آتانئیل تقدیس اور اعتماد کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے۔

دوسرا منظر

(صبح کاذب۔

تائیس کے محل کے سامنے کا چوک۔

محل کی ڈیوڑھی کے پاس ایروس کا ایک چھوٹا سا بت ایستادہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے ابھی چاند کی روشنی پھیکی نہیں پڑی۔

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے سامنے آتانئیل فرش کے پتھروں پر سر رکھے سو رہا ہے۔

دور دائیں طرف کو ایک مکان ہے جس میں نسیس اور اس کے ہمراہی جمع ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی موسیقی مدھم سی سنائی دے رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے محل کا دروازہ کھلتا ہے اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے۔ جب اس کی نظر آتانئیل پر پڑتی ہے تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ پھر آتانئیل کی طرف واپس آتی ہے۔)

تائیس۔ (آتانئیل کی طرف جھک کر، نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) اے مقدس باپ! میں نے خدا کا پیغام تیری زبان سے سنا۔ میں حاضر ہوں۔

آتانئیل۔ (اٹھ کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس! خدا تمہاری راہ تک رہا تھا۔

تائیس۔ (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دعا مانگتی رہی ہوں میں آنسو بہاتی رہی ہوں۔ میری روح کے اندر نور کے چشمے ابل رہے ہیں ــــ میں نے ہوس اور نفسانیت کی بے مائیگی کو دیکھ لیا ہے۔ تم نے آنے کا

حکم دیا تھا۔ میں آگئی ہوں۔

اتانئیل۔ اے میری بہن! ہمت کر کہ مسرت کی فجر ہو رہی ہے۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مجھے کیا حکم ہے؟

اتانئیل۔ یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہب خانہ ہے۔ جہاں برگزیدہ عورتیں فرشتوں کی مانند وصال دائمی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ مفلس ہیں تاکہ یسوع مسیح ان سے محبت کرے۔ حیادار ہیں تاکہ یسوع مسیح ان کی طرف نظر اٹھائے۔ باعصمت ہیں تاکہ وہ انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور تجھے مادرِ مقدس البین کے حوالے کر دوں گا۔

تائیس۔ البین۔ دودمانِ سیزر کی دختر!

اتانئیل۔ (سادگی سے) اور یسوع کی پاکیزہ ترین لونڈی۔ (پر اسرار لہجے میں) وہاں میں تمہیں ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دوں گا۔ اور پھر ایک دن یسوع مسیح آکر تمہیں نجات دلائے گا (اس کا جوش بڑھ رہا ہے) مجھ پر یقین رکھو اور خوف مت کھاؤ۔ وہ خود آئے گا اور تمہاری روح کی گہرائیاں تھرتھرا اٹھیں گی۔ جب وہ اپنی نور کی انگلیوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے تمہاری آنکھوں کو چھوئے گا۔

تائیس۔ (مسرت سے) آہ مقدس باپ مجھے البین کے گھر لے چل۔

اتانئیل۔ ہاں۔ مگر پہلے ان سب چیزوں کو فنا کر دو جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں۔ اپنے محل کو، اپنی زر و دولت کو، اس مال و منال کو جو تمہاری سیاہ کاری کا شاہد ہے سب کو پھونک دو سب کو فنا کر دو۔

تائیس۔ (مقابلے کی تاب نہ لاکر) مقدس باپ ایسا ہی ہوگا (گھر کی طرف جاتی ہے لیکن مسکراتی ہوئی ایروس کے بت کے سامنے بیٹھ جاتی ہے) میں اپنے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی بجز اس کے (بت کو اٹھا لیتی ہے اور اتانئیل کے پاس جاکر اسے دکھاتی ہے) بجز اس ہاتھی دانت کے بت کے جو قدیم زمانے کی ہنرمندی اور دستکاری کی تخلیق ہے۔ یہ ایروس کا بت۔ ایروس جو عشق کا دیوتا ہے (نرم لہجے اور پاکیزہ گفتاری سے) اے مقدس باپ! ہم اس پر بے رحمی کیسے کر سکتے ہیں۔ عشق ایک نادر دولت ہے میری تر دامنی عشق نہیں۔ عشق کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ آہ مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے عشق کو اپنا آقا تسلیم کیا بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے اس کے احکام کو غلط سمجھا۔ عشق کا حکم ہے کہ جو "مرد میرا نام لئے بغیر اپنی آغوش پھیلائے اس کی آغوش سے کنارہ کرو" اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام واجب ہے۔ اسے لے کر کسی راہب خانے میں رکھ دینا کہ جن کی نظر اس پر پڑے وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ عشق ہی نردبانِ حقیقت ہے (ایک لمحے بعد) جب نسیس مجھے چاہتا تھا تو اس نے مجھے یہ بت تحفے کے طور پر دیا تھا۔

اتانئیل۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) نسیس! آہ ان مردود ہاتھوں پر لعنت ہو جن سے یہ تحفہ تجھے ملا۔ اس کا نشان بھی باقی مت رہنے دو۔ (بت کو چھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے اتانئیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے) اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو۔ یا کسی گہری غار میں دھکیل دو۔ تائیس! اپنی گذشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی یاد دل سے محو کر دو۔

تائیس۔ (سر جھکائے کانپ رہی ہے) سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائے گا۔ آؤ!

انانئیل۔ چلو۔

(انانئیل اور تائیس کے چلے جانے کے بعد نسیس اور سین نمبر ۲ کے تمام اشخاص داخل ہوتے ہیں شور مچاتے ہوئے اور ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے ہیں نسیس سب سے پیش پیش سرخوشی کے عالم میں ذرا لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے)

نسیس اور اس کے ہمراہی۔ دوستو! میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ قسمت نے تائیس کی قسمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن میں بھر دی ہے اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ۔

مشرق کی رقاصہ لڑکیوں کو بلاؤ۔ رقاصہ لڑکیوں کو سپیروں کو اور مسخروں کو اور رقص کا ہنگامہ صبح تک نہ تھمنے دو۔

میخانوں کے دروازے کھٹکھٹاؤ مشعلیں روشن کر دو۔ سورج کو شرمادو۔ برف میں لگی ہوئی شراب ٹھنڈا دو۔ نرم نرم قالین یہیں پر بچھا دو اور کروبیل اور مرتال تم بھی میری آغوش میں آجاؤ۔

زندگی کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے

(نسیس کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کے احکام بجا لاتے ہیں وہ خود عیش پرست انداز میں گدیلوں پر گر پڑتا ہے اس کے اردگرد کروبیل، مرتال، بہت سی لونڈیاں اور رقاصہ لڑکیاں جمع ہو جاتی ہیں۔)

(ہنگامہ رقص)

(کئی قسم کے رقص ہو چکنے کے بعد ساحرہ، داخل ہوتی ہے)

نسیس۔ آہ وہ حسینۂ بے مثال آگئی ـــ کروبیل اپنا رباب اٹھالو۔ مرتال اپنی سارنگی سنبھال لو اور دونوں مل کر حسن کا گیت گاؤ۔

(کروبیل اور مرتال دونوں ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں، ساحرہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اور آہستہ آہستہ اپنے جسم کو لچکاتی ہوئی رقص کرتی ہے اور نرم آواز میں کروبیل اور مرتال کے ساتھ مل کر گاتی ہے)

کروبیل اور مرتال۔ (۱) وہ حسینہ آگئی جس کا حسن ملکہ صبا سے بھی زیادہ دلاویز ہے جو آئینوں پر رقص کرتی تھی!

(۲) اور اس کے نقاب کے اندر سے اس کی سریلی آواز آگ کے تیروں کی طرح نکل رہی ہے۔

(۳) اس کا رنگ کہربا کی مانند ہلکا سنہری ہے اس کے ہونٹ لہو کی مانند سرخ ہیں۔ اس کی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں۔

(۴) اس کی حرکات سرکنڈے کی جنبش کی مانند نازک اور کسی پرندے کی پرواز کی مانند لطیف ہیں۔

(۵) اُس کی نظروں کے دام میں کئی دل گرفتار ہیں۔ اُس کی نگاہیں بے پناہ ہیں!
(۶) وہ دل چھین لیتی ہے اور وصل کی لذت لٹاتی ہے اس کے سفاک حسن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔
(۷) وہ سنگ دل صنم کی مانند ہے جسے علم نہیں کہ وہ جب چاہے تباہ کر سکتی ہے۔

(رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے)

(عین اس وقت آنائیل ایک روشن مشعل ہاتھ میں اٹھائے جلدی جلدی محل سے باہر نکلتا ہے)

نسیس۔ (طنز آمیز لہجے میں) ارے یہ تو وہ ہے۔ یہ تو آنائیل ہے۔

ہمراہی۔ آنائیل! دانش مندوں کے دانش مند! تم پر سلام ہو! تائیس نے تمہاری عقل کو اندھا کر دیا نا؟ (ہنس کر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس راہب کے درخشاں چہرے کی طرف دیکھو!

آنائیل۔ (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان روک لو! تائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں رہی ناپاک تائیس ہمیشہ کے لئے مر چکی۔ اور اب ایک دوسری تائیس ـــــ وہ دیکھو آ رہی ہے!

(تائیس داخل ہوتی ہے۔

اس کے بال کھلے ہیں۔ اور اس نے موٹا اونی لباس پہن رکھا ہے لونڈیاں حسرت زدہ اس کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔ اور بار بار مڑ کر محل کی طرف دیکھتی ہیں۔
محل سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا ہے تھوڑی دیر میں آگ کے شعلے نکلنے لگیں گے اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی جائے گی۔
شور و غوغا اور قہقہوں کی آواز سن کر آہستہ آہستہ چوک میں ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے)

آنائیل۔ (تائیس سے) مقدس بہن! آؤ اس شہر سے ہمیشہ کے لئے بھاگ جائیں۔

لوگوں کا ایک گروہ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔

ہجوم اور نسیس کے ہمراہی۔ (مائل ہو کر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے؟

تائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔

نسیس۔ تائیس! تم ہم سے چلی جاؤ گی کیا یہ ممکن ہے؟ (تائیس کو بازو سے پکڑ لیتا ہے)

آنائیل۔ (تائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! ہاتھ لگایا تو جان سے مار دیا جائے گا۔ اس کا جسم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ (تائیس کو اپنے قریب لا کر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے) آگے سے ہٹ جاؤ۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (آنائیل کو دھمکا کر) بن مانس! یہاں سے دور ہو جاؤ!

ہجوم۔ یہ تائیس کو ہم سے لے جائے گا اچھا؟ ہم زندہ کیسے رہیں گے؟ میرے ملبوسات! میرے ہار! میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہمیں ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟ کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کر سکتا؟ یہ تائیس کو ہم سے چھین رہا ہے۔

خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کرکے) شعلے، آگ، محل جل رہا ہے۔
ہجوم۔ (شور مچاتے ہوئے) تائیس یہیں رہے گی۔ اس شخص کو جان سے مار دو، اسے کسی گڑھے میں دھکیل دو، اسے پھانسی پر لٹکا دو، اسے چیلوں کے آگے ڈال دو۔
ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اٹھا کر اتانیئل کے مارتا ہے جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا ہے) مردود! یہ لے!
اتانیئل اور تائیس۔ (ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑے بغیر کسی خوف و اضطراب کے ہجوم کو دیکھ رہے ہیں شعلے بلند تر ہوتے جاتے ہیں) آہ! اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خریدیں۔
ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) اسے جان سے مار ڈالو!
نسیس۔ (ہجوم کے رستے میں حائل ہو کر) تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ ہے ٹھہر جاؤ۔ یہ لو۔ اس سے اپنے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ (تھیلی میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اشرفیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ہجوم کے سامنے بکھیر دیتا ہے)
ہجوم۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اٹھانے لگ جاتے ہیں) اشرفیاں! سونا!
نسیس۔ (اتانیئل اور تائیس سے) جاؤ! خدا حافظ! تائیس تم مجھے بھلا دو گی! لیکن اس سے کیا حاصل؟ تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہے گی۔

(نسیس اور بھی سونا بکھیرتا ہے۔ ہجوم پھر شور مچاتا ہے۔ اتانیئل اور تائیس بھاگ جاتے ہیں —
محل جل رہا ہے)

باب سوئم

پہلا منظر

(خیابان —
کھجور کے درختوں کے سایے میں ایک کنواں۔
دور درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لئے ایک جھونپڑی ہے اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے البین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے۔
سورج بہت بلند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کنوئیں تک جاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آکر واپس چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اتانیئل اور تائیس داخل ہوتے ہیں۔ تائیس تکان کے مارے کھڑی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے)
تائیس۔ میں گرمی کی شدت سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں۔

اتانیئل۔ نہیں آگے بڑھی چلو، اپنے جسم کو کچل ڈالو، اپنے نفس کو ذلیل و خوار کر دو۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مقدس باپ! تم سچ کہتے ہو میں اپنا دکھ شفیع خداوندی کی نذر کرتی ہوں۔

اتانیئل۔ صرف توبہ ہی سے گناہ دھلتے ہیں۔ اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ بڑھی چلو! یہ دلفریب جسم جسے تو نے کافروں، مشرکوں (جوش سے) نسیس کے حوالے کیا تھا۔ آہ! یہ پھر بھی خدا کا بخشا ہوا جسم ہے۔ خدا نے اسے اپنے مقدس نام کی عبادت گاہ بنایا تھا اور اب کہ تمہیں حقیقت کی ایک جھلک دکھائی دے گئی ہے۔ جب کبھی تمہارا ہونٹ سے ہونٹ یا ہاتھ سے ہاتھ لے گا۔ تمہارا دل نفرت اور گھن سے بھر جائے گا۔

تائیس۔ مقدس باپ تم سچ کہتے ہو۔

اتانیئل۔ آگے بڑھو، گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔

تائیس۔ (خوف زدہ) کیا ہم ابھی خانۂ خدا سے دور ہیں؟

اتانیئل۔ (درشتی سے) یہ پوچھنا بے سود ہے آگے بڑھو!

تائیس۔ (لڑکھڑاتی ہوئی) میں نہیں چل سکتی! —— محترم باپ! مجھے معاف کر دو۔

(غش کھا کر گرنے کو ہے کہ اتانیئل اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیتا ہے اور سایے میں بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دیر چپ چاپ اس کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت اس کے چہرے سے رحم ٹپکنے لگتا ہے)

اتانیئل۔ آہ تمہارے سفید سفید تلووں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔ میرا دل ترس کھا رہا ہے۔ بدنصیب عورت، سیاہ بخت دختر! اے مقدس تائیس اے میری بہن! میں نے اس آزمائش کو حد سے زیادہ سخت بنا دیا۔ مجھے معاف کر دو (سر بسجود ہو کر روتا ہے اور احترام کے جذبات کے ساتھ تائیس کے خون آلودہ پاؤں چومتا ہے) مقدس تائیس! محترم تائیس!

تائیس۔ (دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے) تمہارے الفاظ میں صبح کی سی تازگی ہے۔ چلو اب آگے چلیں۔

اتانیئل۔ (نرمی کے ساتھ روک کر) ابھی نہیں! تازہ پانی اور پھلوں سے تمہارے جسم میں طاقت آجائے گی۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس مسافر خانے کے پاس کنوئیں تک جا کر پانی لے آؤں۔ وہ پرے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ البین کا راہب خانہ ہے۔ منزل قریب ہے۔ ہمت نہ ہارو اور خدا سے دعا مانگو۔

(آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے۔ وہاں سے، ٹوکری میں کچھ پھل لے کر باہر آتا ہے اور پھر لکڑی کا ایک پیالہ لئے کنوئیں کی طرف جاتا ہے)

تائیس۔ (تنہا) اے خدا کے پیغامبر! جس کی سختی بھی نیکی ہے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور میری روح مسرت سے بھر رہی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے تپتے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ تمہارا شیریں اور رقت افزا تصور چشمے کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے۔ میری روح علائق سفلی سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے۔ محترم باپ! تم پر خدا کی رحمت ہو!

(اتانیئل پانی اور پھل لئے واپس آتا ہے)

اتانئیل۔ اپنے ہاتھ دھولو، اپنے ہونٹ تر کرلو، یہ پھل کھالو، اور اس تپش کو ٹھنڈا کرو جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں۔ تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے۔ یہ میری ہے، خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے۔

(تائیس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلاتا ہے تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اس کی طرف بڑھاتی ہے۔)

تائیس۔ اب تم پیو!

اتانئیل۔ نہیں! تمہیں تازہ دم دیکھ کر میری پیاس بجھ گئی ہے۔ تمہارے دکھ کو دور کرنا ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ تائیس! اے جان کی راحت۔

تائیس۔ اے نیکی کے فرشتے۔

(اسے پھل کھانے کو دیتا ہے اور خود پھر کنوئیں سے پانی بھر لاتا ہے اس کے بعد مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔

دور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدہم سی سنائی دیتی ہے اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے اور البین اور راہب لڑکیوں کا گروہ داخل ہوتا ہے۔)

آوازیں۔ (دور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کر رہا ہے ـــــ ہمیں آج کے دن رزق عطا فرما!

تائیس۔ کون آرہا ہے؟

اتانئیل۔ محترم البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی روئی ٹلا رہی ہیں۔ وہ ہماری طرف آرہی ہیں اور خدا کی حمد گا رہی ہیں۔

آوازیں۔ (بہت ہی قریب) خداوند ہمیں آزمائش میں نہ ڈال اور ہمیں بدی سے بچائے رکھ!

(البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہے)

اتانئیل۔ آمین!

(اتانئیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی ہیں اور بہت ادب اور احترام کے انداز میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تائیس بھی اٹھ کر اتانئیل کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے)

اتانئیل۔ (البین سے) محترم البین! تم پر خدا کی برکت نازل ہو میں تمہارے آسمانی چھتے میں ایک ایسی شہد کی مکھی لایا ہوں۔ جسے میں نے فضلِ خداوندی کی مدد سے ایک بے برگ و گل رستے پر بھٹکتا پایا میں نے اس کمزور و نحیف جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی اور اب میں اسے خدا کی نذر کرنے کے لئے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

البین۔ میری بیٹی میرے قریب آؤ۔

(تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے لگا لیتی ہے)

اتانئیل۔ میں اس سے آگے نہ جاؤں گا۔ میرا فرض پورا ہو چکا۔ پیاری تائیس! خدا حافظ! اب تم تنگ کوٹھری میں تنہا زندگی بسر کرو اپنے گناہوں سے توبہ کرو، اور ہر وقت میرے لئے دعا مانگتی رہو!

تائیس۔ (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے دستگیر ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں۔ تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچا دیا۔ تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے۔

آتانئیل۔ رقت انگیز الفاظ، قابلِ پرستش آنسو! وہ عاصی خوش قسمت ہے جسے عشقِ ابدی نے اپنا بنا لیا ہو (جوش کے ساتھ) اس کا چہرہ کس قدر دلفریب ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمک رہا ہے۔

تائیس۔ خدا حافظ محترم باپ خدا حافظ! . . . . ہمیشہ کے لئے!

آتانئیل۔ (جیسے اس پر بجلی گری) ہمیشہ کے لئے!

تائیس۔ (دوبارہ ملاقات آسمان پر ہو گی!

البین اور راہب عورتیں۔ آمین!

(عورتیں تائیس کو ساتھ لے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ آتانئیل
ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خواب کے عالم میں ہو)

آتانئیل۔ (تنہا) اس کے قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ درخت اپنی شاخیں جھکا دیتے ہیں گویا اس کے ماتھے کو خنکی پہنچانا چاہتے ہوں۔ اور کئی دن اور پھر کئی سال گذر جائیں گے، اور مجھے اس کا چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا۔

(عصا کا سہارا لئے مبہوت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(صحرائے تھیبس ـــ
دریائے نیل کے کنارے سینوبیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔ مغرب کی طرف آسمان کا رنگ سرخ ہے اور معلوم ہوتا ہے آندھی آنے والی ہے۔
راہب اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
دور بادِ سموم چلنے لگتی ہے۔
صحرا کی گہرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شیروں کی دہاڑ سنائی دیتی ہے۔)

راہب۔ آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جاندار اور بے جان اشیاء پر بے ہوشی سی طاری ہو رہی ہے۔ دور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں تھوڑی دیر میں ہوائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ قہر کے دروازے کھول دیں گی۔

پالیموں۔ اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ! اور اپنا غلہ اور پھل سنبھال لو ورنہ آندھی ان کو صحرا میں دور تک بکھیر دے گی۔ (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں)

ایک راہب۔ (چلتے ہوئے) آتانئیل! ـــ کیا کسی نے اس کو دیکھا؟

پالیموں۔ اسے واپس لوٹے بیس دن ہو چکے ہیں لیکن اسے کھایئو! جس دن سے وہ واپس آیا ہے نہ اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ اسے جہنم پر جبر

فتح نصیب ہوئی ہے اس نے اس کے جسم و روح کو چور چور کر دیا ہے۔

(اتانئیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم خمیدہ ہے چہرہ تنا ہوا ہے نظریں مبہوت ہیں۔)

راہب۔ (ادب کے ساتھ) وہ آگیا!

(اتانئیل ان کے بیچ میں سے ان کو دیکھے بغیر گزر جاتا ہے۔)

چند راہب۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہے ـــــ

چند اور راہب۔ وہ خدا میں محو ہے۔

راہب۔ (چلتے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کرو، اور اسے مت چھیڑو۔

اتانئیل۔ (پالیموں سے عاجزی کے ساتھ) محترم باپ! مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تم سے اپنے درد و کرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالیموں! تم جانتے ہو کہ میں نے سیہ کار تائیس کی روح پر فتح پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا۔ اور میں شاداں تھا اور پھر میں اس پر سکون صحرا میں واپس آیا۔ لیکن اب اطمینانِ قلب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ میں نے اپنے نفس کو بے رحمی سے کچلا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس عورت کے حسن کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے تائیس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور اس ایک ہستی میں مجھے جسم کی ہر لذت اور دنیائے حسن کا ہر جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

(شرم کے مارے پانی پانی ہو کر پالیموں کے قدموں میں گر پڑتا ہے)

پالیموں۔ (نرمی کے ساتھ) میں نے تم سے نہ کہا تھا "میرے بیٹے ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو؟" تو پھر تم کیوں جانے پر تلے ہوئے تھے؟ آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو ـــــ خدا حافظ!

(اتانئیل کھڑا ہو جاتا ہے پالیموں اسے گلے لگا کر چلا جاتا ہے۔ اتانئیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ پھر ہاتھ باندھے بیٹھ کر سو جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

تائیس۔ (اتانئیل سے دلفریب اور زہد شکن انداز میں) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟

اتانئیل۔ (عالم خواب میں) تائیس.....

تائیس۔ وہ کون سی منحوس حماقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے۔ انسان عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو!

اتانئیل۔ (گھبرا کر جاگ اٹھتا ہے) ملعون شیطان! میرے سامنے سے ہٹ جا.... آہ! میرا جسم پھنک رہا ہے۔

تائیس۔ (غصہ دلا کر) وینس سے سرکشی کرنے والے، ہمت ہو تو آجانا!

اتانئیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس میرے پاس آؤ!

(تائیس کا بلند قہقہہ سنائی دیتا ہے اور اس کی شکل دفعتہً غائب ہو جاتی ہے۔)

(پھر ایک اور خواب صورت پذیر ہوتا ہے۔ آسمان نکھرا ہوا ہے اور سامنے البین کا گھر نظر آ رہا ہے ایک انجیر کے درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اس کے ارد گرد راہب عورتیں گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں)

اتانئیل۔ (اس خواب کو دیکھ کر دہشت کے مارے چیخ مارتا ہے) آہ!

آوازیں۔ ایک مقدس ہستی اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔ سکندریہ کی تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے!

اتانئیل۔ (دیوانہ وار) تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) تو پھر یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑتا؟ سینوں میں دم کیوں باقی ہے روشنی میں چمک کیوں ہے، کون و مکان فنا کیوں نہیں ہو جاتے؟ تائیس مرنے کو ہے۔ آہ ایک دفعہ پھر اس کو دیکھ لوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں ـــ اسے گلے سے لگا لوں، اسے اپنے پاس رکھ لوں ـــ میں اس کو چاہتا ہوں۔ میری عقل اندھی تھی جو اس سے پہلے میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہی میرا سب کچھ ہے۔ اس کا ایک بوسہ جنت سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کے سب چاہنے والوں کو ایک ایک کرکے قتل کر دیتا۔ نہیں، تائیس ابھی نہ مرو، نہیں، نہیں، میں تمہیں سینے سے لگا لوں گا۔ میری ہو جاؤ، میری ہو جاؤ!

(بھاگ اٹھتا ہے اور رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔

اندھیرا، سیاہ بادل، بجلی اور گرج۔ موسیقی اگلے سین تک جاری رہتی ہے)

تیسرا منظر

(البین کے گھر کا باغیچہ ـــ
ایک درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے گویا مردہ ہے۔
راہب عورتیں اور البین اس کے گرد جمع ہیں)

راہب عورتیں۔ (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں اور زیر لب دعا مانگ رہی ہیں) اے خداوند! مجھ پر رحم کر، اے خداوند اپنی محبت کے صدقے اپنی رحمانیت کے طفیل میرے گناہوں کو دھو ڈال۔

البین۔ (تائیس کو دیکھ کر) خدا بلا رہا ہے اور آج رات یہ پاکیزہ چہرہ کفن کی سفیدی میں چھپ جائے گا۔ تین مہینے تک یہ راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں مانگتی رہی ہے اور آنسو بہاتی رہی ہے اس کا جسم نحیف و نزار ہے لیکن اس کے گناہ سب دھل چکے ہیں۔

راہب عورتیں۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا اپنی محبت کے صدقے۔

(اتانئیل زرد رو اور راز حد مغموم باغ میں داخل ہوتا ہے البین کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے، اور عاجزی کے انداز میں ٹھہر جاتا ہے۔ البین آگے بڑھتی ہے اور راہب عورتیں اتانئیل اور تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں)

البین۔ (اتانئیل سے) محترم باپ! تمہارا آنا مبارک ہو، یقیناً تم اس مقدس ہستی کو برکت دینے کے لئے آئے ہو!

اتانئیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پاکر) ہاں . . . تائیس!

البین۔ تمہارے احکام کی پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے مشرف ہونے والی ہے۔

(راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اتانئیل کی نظر تائیس پر پڑتی ہے)

اتانئیل۔ (جیسے درد سے بے قرار ہو) تائیس! تائیس!

(بے تاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ البین اور راہب عورتیں پرے ہٹ جاتی ہیں اور دعا میں مشغول ہو جاتی ہیں اتانئیل بصد مشکل گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلاتا ہے)

اتانئیل۔ (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس! ــــ

تائیس۔ (آنکھیں کھول دیتی ہے اور حسرت زدہ نظروں سے اتانئیل کے چہرے کو دیکھتی ہے) محترم باپ! تم ہو! (اتانئیل کا جواب اسے بالکل سنائی نہیں دیتا) تمہیں وہ شاندار سفر یاد ہے جب تم مجھے یہاں لے کر آئے تھے؟

اتانئیل۔ میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں۔

تائیس۔ تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں، اس خیابان کی ٹھنڈی ہوائیں؟

اتانئیل۔ (والہانہ) مجھے صرف وہ پیاس یاد ہے جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

تائیس۔ اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں وہ جب تمہاری زبان سے میں نے سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا۔

اتانئیل۔ (بے قرار ہو کر) میں تمہیں دھوکہ دے رہا تھا!

تائیس۔ اور وہ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو!

اتانئیل۔ نہیں، نہیں۔ آسمان بے حقیقت ہے سب کچھ ہیچ ہے زندگی اور انسانی محبت کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ میں تم پر مرچکا ہوں۔

تائیس۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسول آپہنچے، وہ مسکراتے ہوئے، ہاتھوں میں پھول اٹھائے آ رہے ہیں۔

اتانئیل۔ میری راحت، میری زندگی، میری بات سنو!

تائیس۔ (اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے) دو سفید سفید پروں والے فرشتے آسمان میں اڑ رہے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا، شفیع خداوندی اپنی نور کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لئے پونچھ رہا ہے۔

اتانئیل۔ کہو میں زندہ رہوں گی، کہو میں ابھی نہ مروں گی!

تائیس۔ سنہری ساز کا ترنم مجھے مسحور کر رہا ہے، معطر ہوائیں مجھے مست کر رہی ہیں۔ میری مصیبتوں پر آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ آہ۔ خداوند آہ۔ مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔ (مر جاتی ہے)

(اتانئیل چیخ کر گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے)

ترجمہ:۔ پطرس

سیب کا درخت

جان گالزوردی

اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹورکی کے مقام پر گذاریں۔ جہاں ان دونوں کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سٹیلا ایشرسٹ کی تھی۔ جس کی فطرت میں جذبہ پرستی کی ایک جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ سٹیلا میں اب وہ پہلے کا سا حسن تو نہ تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں۔ نہ وہ پھول کی سی لطافت۔ نہ وہ چہرے اور اعضا کی نازک پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگوفے کی سی رنگت جس نے آج سے چھبیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو ایک ہی جھلک میں موہ لیا تھا۔ لیکن تینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک بھر پری سی آ گئی تھی۔

سٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ ساخطہ جس میں زیادہ ترینچ اور لارچ اور کہیں کہیں چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ جو سڑک سے لے کر بھرے جنگل کی پہلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دونوں بیٹھ کر لنچ کھائیں (ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش نہ تھی)۔ ادھر ادھر چاروں طرف فرز کے سنہری پھول اگ رہے تھے۔ لارچ کے ہرے بھرے ہلکے پھلکے پتوں پر اواخر اپریل کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے لیموؤں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹیلا کو آبی رنگوں سے تصویر کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر ارمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیا اور موٹر سے نیچے اتری۔

”کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے؟“

ایشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شلر سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے داڑھی تھی۔ شلر کے داڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں جو پُر معنی ہوتیں تو چہرہ پر ایک حسن سا آجاتا ناک ذرا ایک طرف کو۔ داڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں ہونٹ ذرا کھلے ہوئے۔ اڑتالیس برس کی عمر۔ چپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اترا۔

"دیکھو فرینک! قبر!"

مرغزار کی اونچان سے ایک پگڈنڈی نیچے کو اترتی تھی۔ جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ پگڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے مٹی کی ایک ڈھیری سی تھی۔ چھ فٹ لمبی فٹ بھر چوڑی۔ اوپر گھاس اگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا۔ الیشرسٹ نے قبر کو دیکھا تو شاعرانہ دل امڈ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اس شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو۔ اللہ اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے توہمات پر تکیہ کرتا ہے! لیکن جو بھی یہاں دفن ہے۔ سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ قبر کے سرہانے ایک ناہموار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا سائبان ہے۔ اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ طبعی موت مرتا تو کسی قبرستان میں سیلا ہوا مقبرہ ہوتا۔ اور چاروں طرف بدوضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے لاحاصل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ نہ بولا جانتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بے سود ہے۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھنے کو کمبل بچھایا۔ (کیونکہ جب اسے بھوک لگے گی تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آئے گی) اور جیب سے مرے کا ہپالٹس کا ترجمہ نکالا۔ تھوڑی دیر میں سیریئن اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر بگلا سے بادلوں کو دیکھ کر الیشرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لئے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو۔ پھر بھی اندر ہی اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے اور زندگی خالی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؟ یہ کون جانے؟ انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور مستانہ وار نت نئے جھگڑوں میں پڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کی تسکین ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی۔ وہاں اب ایک سیری آ جاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں۔ انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ حسن کو فن کے کسی نمونہ میں قید کر کے ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے۔ ہمیشہ اسی قابل قدر علیٰ اسی تسکین بخش نشے کا احساس ہو۔ لیکن اسے یہ قدرت نہیں کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے۔ جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کو اس کے "سیب کا درخت ہو۔ موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں۔" جب انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں جن میں ایک سریع بےخودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے سامنے سے گزر جاتا ہے اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں جس طرح فن حسن کو قید کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ ان لمحوں کی طرح گریز پا ہیں جس میں انسان کو اس روح فطرت کے درخشاں یا جھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو انسانوں سے دور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جبکہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ تھارن کے درخت پر کوئل بول رہا ہے۔ گورس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ فرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہریاول ہے۔ اور سفید براق بادل پہاڑیوں اور پرکیف وادیوں کے اوپر آسمان پر ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ الیشرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوہ

پنہاں بے نقاب ہے۔ لیکن چشم زدن میں یہ جلوہ غائب ہو جائے گا جیسے ہرن کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونہ پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے ـــ ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ اسے یکلخت اس بات کا احساس ہوا کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک۔ یہ پرانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار تھے تو اس نے حسب عادت اس طرف توجہ ہی نہ کی تھی لیکن اب تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں سے وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں ٹور کی روانہ ہوا تھا اور یوں سمجھئے کہ وہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ گزشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا۔ جس کی دلفریبی اور بے خودی ہاتھ میں آکر نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتہً ایک ایسے زمانہ کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیرینی اور شباب سے لبریز تھا۔ لیکن یکلخت منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھا اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور نوخاستہ سبزے کو جس کے بیچ میں ملک ورٹ کے ننھے ننھے پھول اُگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا...... اور جو کچھ اسے یاد آیا وہ یہ تھا۔

(۱)

فرنیک ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانۂ تعلیم کا آخری سال گذار چکنے کے بعد یہ دونوں سیاحت کی غرض سے پاپیادہ سفر کر رہے تھے۔ برمینٹ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا کہ چیگ فورڈ پہنچ کر دم لیں گے۔ لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دفعہ فٹ بال کھیلنے میں چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشہ کو دیکھا تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا اور جسم چھریرا۔ ایشرسٹ کا رنگ ذرا پیلا تھا۔ تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی۔ جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا بینکا جیسے زمانۂ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور لہروں والے تھے۔ اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انھیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور از حد بے ترتیب۔ دونوں دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن راستہ میں اپنے سوا کوئی اور رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہہ رہا تھا۔ تم میری بات مانو۔ رحم صرف شعورِ نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا۔ جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے۔

ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ بہر حال میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں رحم کا وہی رتبہ ہے جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ برخوردار موجودہ زمانہ کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے۔ جانوروں کو دیکھو۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انھیں صرف اپنے اپنے دکھ کا احساس ہے اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن ہمیں دیکھو کہ کسی دوسرے کی ڈاڑھ میں بھی درد ہو تو ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس کھانے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں کہ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات

حاصل کرو اور اطمینان سے رہو۔

ایشرسٹ نے کہا کہ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم اس پر کبھی عمل نہ کرو گے۔

گارٹن نور دنگر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشوونما نہیں پا سکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہوتا ہے کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔"

"اور اگر کوئی جذبہ تو تیر لنسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟"

"تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبہ کا ذکر کرو تو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جسمانی لذت ہے۔ اور وہ جذبہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھاران کے ایک درخت پر کوئل نے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے جہاں پھول اگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں۔ رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔

ایشرسٹ بولا۔

"چلو اب چلیں کسی فارم میں جگہ مل جائے تو رات وہیں گذاریں۔"

جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل (جو ایشرسٹ کو لڑکی کے خمیدہ بازو میں سے دکھائی دے رہا تھا) اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔ ایشرسٹ نے جو حسن کا نظارہ کیا کرتا تھا بغیر یہ سوچے کہ اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ دل میں کہا "بہت خوب!" لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے کپڑے کا سایہ پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہا تھا اور اس کی پھٹی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اوپر اٹھ گئی تھی۔ بھورے رنگ کا بلاؤز پرانا اور گھسا ہوا تھا۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور کھردرے تھے۔ گردن کا رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کے فراخ ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ لمبانہ تھا۔ اوپر کا ہونٹ چھوٹا سا تھا اور دانت چمک رہے تھے۔ بھویں کالی اور سیدھی تھیں۔ پلکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک ستواں اور اس کی بھوری آنکھیں تو غضب ہی ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ گویا ابھی ابھی نہا ہوئی ہیں۔ اس نے ایشرسٹ کی طرف دیکھا۔ شاید اسے لنگڑاتا ہوا آدمی (سر سے ننگا بال پیچھے کو جھٹکے ہوئے) جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ ایشرسٹ کے سر پر ٹوپی تو تھی نہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔

"یہاں پاس ہی کوئی ایسا فارم نہیں جہاں ہم رات گذار سکیں۔ میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے۔"

لڑکی بغیر شرمائے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

"جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔"

"کہاں؟"

"اس طرف نیچے کو۔"

"ہم یہاں رات گزار سکتے ہیں؟"

"میرا خیال تو ہے۔"

"تو ہمیں راستہ بتا دو۔"

"آیئے۔"

الیشرسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا جب وہ چپ ہوا تو گارٹن نے جرح شروع کر دی۔

"تم ڈیون شائر کی رہنے والی ہو؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر؟"

"میرا وطن ویلز میں ہے۔"

"ٹھیک۔ میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تو تم کیلٹ معلوم ہوتی ہو ـــــ تو یہ فارم تمہارا نہیں؟"

"نہیں۔ میری خالہ کا ہے۔"

"اور تمہارا خالو؟"

"وہ زندہ نہیں۔"

"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟"

"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے"

"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے؟"

"سات سال۔"

"ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی؟"

"معلوم نہیں جناب۔"

"شاید تمہیں ویلز اب یاد نہ رہا ہو۔"

"اچھی طرح یاد ہے وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی۔"

"مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔"

الیشرسٹ یکلخت بولا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"جناب سترہ سال۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میگن ڈیوڈ۔"

"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرنیک الیشرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں۔ لیکن ــ"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے۔"

الیشرسٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔

ادنچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی کھڑکیوں میں سیٹ لگے تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا جس میں سؤر اور مرغیاں اور ایک بوڑھی گھوڑی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر اسکاچ فر کے چند درخت اُگ رہے تھے۔ سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سؤر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ جو انھیں دیکھ کر آگے بڑھی۔ لڑکی نے کہا۔

"یہ میری خالہ مسز نیرد کومب ہیں۔"

خالہ مسز نیرد کومب کی آنکھ بچوں والی جنگلی بطخ کی مانند سیاہ اور تیز تھی۔ گردن میں بھی وہی سانپ کی سی اٹھان تھی۔

الیشرسٹ نے کہا۔ "ہمیں آپ کی بھانجی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائے گا۔"

"ہو تو جائے گا لیکن آپ دونوں کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔ میگن بیٹی جاؤ وہ خالی کمرہ ان کے لئے صاف کر دو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پئیں گے۔"

یُو کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گذر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ گلابی رنگ کے پھولوں اور یُو کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے۔"

مسز نیرد کومب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔

پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی ہوئی صاف کرسیاں اور سوفا پڑا ہوا تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا الیشرسٹ فوراً سوفے پر جا بیٹھا۔ اور دکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ مسز نیرد کومب اسے بغور دیکھتی رہی۔ الیشرسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں امیرانہ تکبر نظر آتا تھا۔ گو الیشرسٹ کو اپنی

عالی نگاہی کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

"یہاں کوئی ندی ہے جہاں ہم نہا سکیں؟"

"باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیٹھ کر بھی سر تک پانی نہیں پہنچتا۔"

"کتنی گہری ہے؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ فٹ۔"

"اوہ تو بہت ٹھیک ہے۔ ہے کس طرف کو؟"

"پگ ڈنڈی کے ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئے گا۔ اس میں سے گذر کر سامنے ایک بڑا سا سیب کا درخت ہے۔ سب سے الگ۔ اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں۔"

مسز نیرو کومب مسکرا دی اور بولی۔ "جب آپ واپس آئیں گے تو چائے تیار ہوگی۔"

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بندھ لگا ہوا تھا۔ جس سے پانی رک گیا تھا اور ایک تالاب سا بن گیا تھا جس کی تہہ ریتلی تھی۔ وہ بڑا سا سیب کا درخت سب درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا۔ کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی تھیں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں، شگوفے کھلنے کو تھے اور قرمزی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشرسٹ کنارے پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا۔ اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا جس میں چٹانوں کے درمیان تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اُگ رہے تھے۔ پرے ایک اونچے مگر ہموار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا ہر شاخ ہوا میں جھوم رہی تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچھی شعاؤں سے گھاس پر دھوپ چھاؤں کی شطرنج سی بچھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں۔ تھیوکرٹس اور دریائے چرول۔ چاندنی اور دوشیزہ۔ جس کی آنکھوں میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ اتنی باتیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی بات کا خیال نہیں۔ اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

(۳)

چائے دیر سے پی گئی۔ لیکن تھی پر تکلف۔ کھانے کو ساتھ انڈے۔ کریم۔ مربّہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دیئے ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارٹن کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارٹن خود بھی کیلٹ تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کنبے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے تو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا سگریٹ اس کے خمدار ہونٹوں کے کنج میں جیسے لٹک رہا تھا۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی تمسخر بھری آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہل ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آ جانا ایسا ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے! ـــ فرینک آخر پھر انگریز ہے۔ اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس درجہ شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور بالوضاحت یہ ثابت کیا کہ یہ لڑکی عین ان نظموں کے مطابق ہے۔ جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارھویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ چت لیٹا گہرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قد آور اس لئے ٹانگیں سوفے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے گارٹن کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا جب لڑکی دوبارہ کیک لے کر اندر آئی تھی۔ اس وقت سے اس کی شکل (جسے دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا) آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں نیچے ڈال لی تھیں۔ اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارٹن نے کہا۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچی خانہ کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ چھت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے جن میں بھنی ہوئی سؤر کی رانیں لٹک رہی تھیں۔ کھڑکی میں پھولوں کے گملے پڑے تھے۔ دیوار پر بندوقیں، چینی اور جست کے عجیب و غریب آبخورے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بچھی تھی۔ جس پر پیالے اور چمچے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر چھت سے پیاز کی گھٹیلوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی۔ آتشدان خاصا گہرا تھا۔ جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تمیز کے ساتھ نچلے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھا سن کے پھوسڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان پھوسڑوں جیسی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگچے میں اسٹو پک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سامنے مسز نیرو کو مب کسی سوچ میں بیٹھی چمچہ ہلا رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی۔ ڈاڑھی مونچھ منڈھی ہوئی کارڈورائی کی برجیس پہنے کھڑکی میں بیٹھا ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صرف میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور پیپے میں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں۔ چنانچہ گارٹن بولا۔

"اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آ جائیں۔"

اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں پھر پارلر میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچی خانہ کی اس رونق۔ اس گرماہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کمرہ پہلے سے بھی کچھ اجاڑ معلوم ہونے لگا۔ دونوں دوست پژمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"لڑکے شکل سے بالکل جپسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکسن تھا۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ اور وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دقیق مطالعہ کی چیز ہے۔"

ایشرسٹ کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔ گارٹن اسے اس وقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا۔ دقیق مطالعہ کی چیز! کیا بکواس ہے۔ وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا۔

"جذباتی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ صرف اس کے بیدار ہونے کی کسر ہے۔"

"تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟"

گارٹن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا خم دار تبسم کہہ رہا تھا۔ "کیا بدمذاقی کی بات ہے! بالکل انگریزوں کی سی!"
ایشرسٹ پائپ کے کش لگاتا رہا۔ بیدار ہونے کی کسر ہے۔ اس بے وقوف گارٹن کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔!
ایشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ گاڑی خانہ اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی نیلی اور سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا ہوا میں ان لکڑیوں کے دھوئیں کی بو بھی تھی جو باورچی خانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا بے دلی سے چہچہایا۔ گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی جو گھر دا دانہ کھا رہا تھا شیر دی اور جھولنے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس سے پرے مجوب ستارے تھے جو ابھی پوری طرح عریاں نہ ہوئے تھے۔ اور جن کی سفید شعاعوں نے گہرے نیلے آسمان کو چھلنی کر دیا تھا۔
ایک اُلو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی رات میں باہر آزاد پھرنا کتنا پر لطف ہو گا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور تین ٹٹو اس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سائے سے گزرتے ہوئے دکھائی دیئے جن کی کالی ایالی دار گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا اور اس میں سے شراروں کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ تو جانور بدک کر بھاگ نکلے۔ ایک چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنا بازو پھیلایا۔ ہتھیلی پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یک لخت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے تھپ تھپ فرش پر گرے۔ اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی ــــ لڑکی کی آواز ــــ جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی ــــ تو الفاظ صاف اور واضح طور پر کان میں پڑے! "نہیں رک! میں بلی ساتھ نہ سلانے دوں گی!" پھر ننھے بچوں کے قہقہوں کی آواز آئی۔ کسی نے ہلکے سے ان کے ایک تھپڑ مارا۔ اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی ہنسا کہ ایشرسٹ کانپ سا گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو۔ موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ بجھ گئی اور خاموشی چھا گئی۔ ایشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی روح ملول تھی۔
گارٹن نے کہا۔ "تمہیں باورچی خانہ میں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تو سونے چلا ہوں۔"

(۳)

ایشرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا۔ لیکن جب گارٹن سونے کے کمرے میں آیا تو گو ایشرسٹ بظاہر گہری نیند میں تھا لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی چھت نیچی تھی۔ گارٹن بستر میں چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ لیکن ایشرسٹ کو اُلوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے تفکرات رات کے وقت ایشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ ذاتی آمدنی چار سو پونڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا؟ جہاں چاہے جائے۔ جو چاہے کرے جب چاہے کرے۔ اس کا بستر سخت تھا۔ اس لئے اسے بخار نہ ہونے پایا۔ سرہانے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی

جس میں سے رات کی خوشبو کمرہ میں پھیل رہی تھی۔ اور ایشرسٹ بستر میں لیٹا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا گارٹن سے کھچا ہوا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تین دن تک پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کھچ جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصورات سے تو اس کے دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچی خانہ میں بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچی خانہ میں داخل ہوئے تھے تو اس نے یکلخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا جگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بے دلی۔ تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اس وقت ایشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ جس طرح اس لڑکی کا تر و تازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ۔ نیلی آنکھیں ہلکے رنگ کی پلکیں اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی۔ اور ایک نیم خوابیدہ کوے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جس کی آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لئے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن کو اگلے دن لندن پہنچنا تھا وہ دوپہر کے وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز تبسم دیکھ کر ایشرسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہنچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا تو ایشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ یُو کے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ایشرسٹ وہیں دن بھر ایک سبز رنگ کی چوکی پر بیٹھا رہا۔ سورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ اور پھولدار جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی کبھی پائپ سلگا لیتا۔ کبھی منظر کا لطف اٹھاتا۔ اور کبھی کسی سوچ میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں بیشمار ہستیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں فارم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستیوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ ایشرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ ایک مادہ بطس اپنے چھ بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور پیٹھ بھورے رنگ کی تھی۔ ساتھ لئے مٹکتی مٹکاتی قریب آ پہنچی اور بچے ایشرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چونچیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز برد کومب یا میگن آن کر پوچھ جاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ایشرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھینک یو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلٹس ایک پیالے میں ڈال اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ سوجے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں۔ اور پلٹس اس پر باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو ایشرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آواز میں "اوئی" کہنا۔ وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا۔ وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا کہ گارٹن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کرتا تھا تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑ ہو گئی۔ اس نے یہ ذرا نہ سوچا کہ آخر اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔ جب لڑکی چائے لائی۔ تو

ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ یہ تو کہو۔ میرا دوست بھی تمہیں پسند آیا؟"

میگن نے منہ سکیڑ لیا۔ گویا ڈرتی تھی۔ کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی۔

"بڑے ہنسوڑ تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے۔ وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے"۔

"کیا ایسی بات کہی انھوں نے، جو تم سب کو ہنسا دیا؟"

"وہ مجھ سے کہتے تھے۔ تم بارڈون کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں؟"

"بارڈ ان شاعروں کو کہتے ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے ویلز میں رہتے تھے"۔

"تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟"

"میرے دوست کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے"۔

میگن نے اپنی بھنویں سکیڑ کر کہا۔ "انھیں مذاق سوجھا ہو گا کیا میں دیسی لڑکی ہوں؟"

"میری بات پر یقین کر لو گی؟"

"کیوں نہیں؟"

"میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا"۔

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا۔ "واقعی تم خوبصورت ہو"

"وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو شکل وصورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

"جو کون ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟"

"ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجہ ہے"۔

"اچھا؟ تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں؟"

"نہ"

"ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آ کر قابض ہو گئے تھے"۔

"اچھا ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ کیا جو واقعی سیکسن ہے؟"

"گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ کچھ ملتا ضرور ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا۔ لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش اسلوبی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

"وہ کہتے تھے کہ باقی لڑکے تو سب نرے حبشی ہیں یہ بھلا کیوں کہا؟ خالہ ہنس تو دیں لیکن یہ بات انھیں ناگوار ضرور گذری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا۔ خالو تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی حبشی ہوتے ہیں؟ یوں لوگوں کا دل دکھانا بری بات ہے"

ایلشرسٹ کے دل میں آیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھینچے۔ لیکن منھ سے صرف اتنا کہا "میگن تم سچ کہتی ہو۔۔۔ اور ہاں کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سلا رہی تھیں نا؟ مجھے نچلی منزل میں آواز آ رہی تھی۔"

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "آپ چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کہیں تو میں اور چائے لا دوں۔"

"تمہیں کبھی اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے۔"

"واہ ملتی کیوں نہیں؟"

"آخر میرے بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔"

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے۔ جسے سلجھا نہیں سکتی۔ چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ جب وہ چلی گئی تو ایلشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایلشرسٹ کی وہ عمر تھی جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول سمجھتے ہیں۔ اور اس نظارے سے ان کے دل میں عورت کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایلشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ احساس دیر کے بعد ہوا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے سیکسن معلوم ہوتا ہے اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ بادامی رنگ کی میلی سی برجیس کیچڑ سے بھرے ہوئے گیتر اور نیلے رنگ کی قمیض میں وہ ایک رونق کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سرخ تھے۔ سر پر دھوپ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ ایلشرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے تو احاطہ میں سے گذر کر باورچی خانہ کے دروازہ کی طرف چل دیا۔ اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی۔ دہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بھاری بھاری قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایلشرسٹ پر اداسی سی پڑ گئی۔ اکھڑ لوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالتے۔ ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے؟ شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو۔ لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے۔ اسے تو قدرت ہی نے نجیب و اصیل پیدا کیا ہے۔

وہ داڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ آدمی جسے کل رات باورچی خانہ میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لے کر احاطے میں داخل ہوا گایوں کو دودھ دہینے کے جا رہا تھا۔ ایلشرسٹ کو اب معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

"اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو۔"

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی نظریں اوپر کو اٹھی رہتی تھیں (مدتوں دکھ سہنے سے آنکھ میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔)

"ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں۔"

"ان کی شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔"

"آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے؟"

"تھینک یو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے۔"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں صاحب: گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے۔"

ایشرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردانہ آواز نکالنا مرفہ الحال لوگوں کے لئے بہت سہل بات ہے) لنگڑا آدمی پھر مسکرا دیا۔

"پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے۔"

"اچھا؟"

"جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی برا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں۔"

"میرے گھٹنے پر تو دوا باندھ گئی ہیں۔ جس سے بہت فائدہ ہے۔"

"ایک بوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی دیکھو بوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے یہ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔ گو آن لے"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ "پھولوں سے واقف ہے اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے؟"

شام کے کھانے پر برطخ کا ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

مخالہ پوچھتی ہیں آپ ہمارے مئے ڈے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیں گے؟"

"ہاں مگر باورچی خانہ میں بیٹھ کر۔"

"شوق سے ـــ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل تو گھبراتا ہوگا؟"

"ارے نہیں ـــ لیکن یہ کہو میرا باورچی خانہ میں آنا کسی کو برا تو نہ لگے گا؟"

"واہ برا کیوں لگتا۔ ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔"

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یکلخت جو اٹھا تو لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دیئے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے چھوٹے کھردرے، سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے کر دیا۔ ایشرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازہ تک پہنچا۔ اس شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی کہ چلتے چلتے اسٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی۔ اور باورچی خانے میں پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح اٹھا تو گھٹنے کا ورم بہت ہلکا ہوگیا تھا۔ دوپہر تک اسی چمن میں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام بُک اور رِک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا۔ اس لئے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا شرمیلے مگر ذہین۔ رنگ بہت گورا نہ تھا۔ اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی ایلشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں پٹر پٹر باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انھیں یاد تھے چار بجے تک ایک ایک کر کے ایلشرسٹ کو سکھا دیئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انھیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ ایلشرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پہ بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انھیں دیکھتا رہا۔ آخر کار بُک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"جپسی ہوا اس پتھر پر بیٹھتا ہے۔"

"وہ کیا بلا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڈھے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا۔ جس دن ابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہوا یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے۔"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ۔"

"معلوم نہیں۔"

"اس کی شکل کیسی ہے؟"

"کالے رنگ کی۔ بڈھا جم کہتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے۔" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟"

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے۔"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سنا ہے۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔"

لڑکا چپکا ہوگیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے ہوا اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جناب کو ہوا اچھا لگتا ہے؟ جن کہیں کا؟"

"جن کیا ہوتا ہے؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔"

چھوٹے لڑکے نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نِک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔" نِک نے دیکھا کہ ابھی تو اچھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا پھرندی پر جا پہنچا۔ جہاں پھر دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جیسی ہوا کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو۔؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیونکر آئے گا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڈھے جم نے یونہی کسی ٹٹو کو دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔"

"تو بہرحال جپسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "وہ سب منحوس ہیں۔"

"پر کیوں؟ اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول لگتے ہیں۔ وہ منحوس ہوتے ہیں۔ یہ نھارن کے درخت بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا۔"

"ارے نہیں! نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں ہوا بیٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے!"

"پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا۔

"خیر میں جاؤں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

"جلد؟"

"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"

"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دیدیتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

"تم چاہتی ہو میں ٹھیر جاؤں۔"

"ہاں"

"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چیں بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ میں نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی۔ کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیچ کے سرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنوں کو جو تیز روشنی میں مٹیالے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشہ کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے سلامی ہو گئے تھے۔ نچلے ہٹنے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا۔ اور بنفشے کے پھولوں۔ گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے برکین میں کھڑا ڈیوبری کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آرپار دکھائی دیتا تھا۔ انگلیوں سے چھیڑتا رہتا۔ کبھی گگو جیخپانے لگتے۔ کبھی سبز ہد ہد بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ و گل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں ہوتی یا سے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا، پائپ سلگا لیتا۔ لنگڑے جم یا مسز نیرد کو سب سے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونا لے بیٹھتی۔ یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی جھلکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھوں سے

ٹکٹکی لگائے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوتی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلّی کی ہوتی ہوگی۔ جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت الیشرسٹ باغیچے میں لیٹا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ استنے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال گالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ الیشرسٹ سے بیس گز کے فاصلہ پر آ کر لڑکی ٹھیر گئی۔ جو بھی آ پہنچا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ الیشرسٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ لڑکا آگے بڑھتا گیا۔ لڑکی اسے پیچھے ہٹاتی رہی لڑکی کے چہرہ پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ الیشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہٹتی ہٹتی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ مار کر غائب ہو گیا۔ الیشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل ٹپ بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

الیشرسٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں"۔

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے الیشرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔ الیشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر الیشرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھیر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو"۔

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں"۔

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہوگا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔

الیشرسٹ ہنس دیا۔ "کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں"۔

لڑکی یکلخت جذبہ سے بے قرار ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں"۔

الیشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ حتیٰ کہ اس کا تمتمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ الیشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل میں سوچا کہ

میں عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ اکھڑ جو میرے مقابلہ میں کتنا حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس کھردرے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی۔ لیکن اب یکلخت تھر تھر کانپتی ہوئی الیشرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت الیشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے۔ یکلخت بے تاب ہو کر باہنیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ زرد تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے الیشرسٹ کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا۔ "میگن" اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے الیشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

الیشرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور حواس پریشان تھے۔ ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی۔ ان شگوفوں کو جنھوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا۔ حسن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسرت اور احساس فتحمندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے۔ مگر کاہے کا آغاز؟ بھنگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ بیفل ہنس رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کر لے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑی میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا؟ لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبہ کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انھیں خراجِ عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آجاتی ہے۔ لیکن الیشرسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا

ہو جاتا ہے۔ وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک علو پیدا ہو جاتا ہے۔

ایلشرسٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کو بے قرار تھا۔ لیکن ڈرتا بھی تھا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ کس چیز سے لیکن ڈرتا ضرور تھا دل سے کہتا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ۔ چھلکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا یہ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے۔ اب خدشہ کا ہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا یہ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف ہو۔ سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چار بجے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی جڑوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے برابر ہوتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا۔ وہاں پہونچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور پھر اس نے یکلخت اپنے عشق روستائی کو بیرونی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس گھاگ عورت یعنی مسز نیرد کو مٹ کی ترش روئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیتی وضع لڑکوں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیئے۔ اکھڑ جو کا چہرہ غصہ سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔ گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنھیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔ لمحے بھر کو اسے اس اسفل طعنہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے پاس سے گذر کر نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایلشرسٹ نے مڑ کر دیکھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور تقریباً گول ایلشرسٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ پگڈنڈی پر رات اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے توس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلال یوکون کے بل آ گرے ہوں۔ گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگن سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بے قرار کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تک رہا تھا کہ ایک اُلّو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُلّو کی آواز جیسے تاریکی میں گونج اٹھی۔ دن کو کوکوؤں کا چہچہانا۔ رات کو اُلّوؤں کا بولنا۔ ایلشرسٹ کے دل کے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ ایلشرسٹ درختوں سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن، میگن پیچھے ہٹی۔

غائب ہو گئی۔ پھر آئی باہر کو جھکی۔ الیشرسٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز کرسی سے ٹھوکر لگی۔ دم روک لیا۔ میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازو میں جو غیر واضح نظر آرہے تھے۔ کوئی حرکت نہ ہوئی۔ الیشرسٹ نے کرسی سرکا کر دیوار کے ساتھ لگادی اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازہ کی ایک بڑی سی چابی تھی الیشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے۔ اور بال پریشان تھے۔ کپڑے اس نے بھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری الیشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں الیشرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس کے چہرہ تک ہاتھ پہونچ جانا بھی کیتی خوش نصیبی ہے! تو پھر بولا۔ سوئٹ برائڈ کی خوشبو الیشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ الیشرسٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوا اب کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو اوس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آرہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور الیشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

رات کو بھر کا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا۔ تو طبیعت میں گرانی تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگذشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج پورے جوبن پر تھا۔ راتوں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے۔ اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب الیشرسٹ نیچے اترا تو دل ڈر سا رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نیرد کو مب لے کر آئی تو الیشرسٹ کو ناگوار گذرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرد کو مب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا۔؟

"اچھا مسٹر الیشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

الیشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہو گا۔"

کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر پچھم کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو ـــــ! الیشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا۔ "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لحہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہدی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی وہ عشقیہ نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا اور اس کی بتیاں بنا بنا کر اس نے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے بے خبر تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی۔ ایشرسٹ دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس کی جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا، چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یکلخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی برا ہو گا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھدیا۔ اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آرپار دیکھ رہی تھیں ایشرسٹ کو ان چھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں۔ میں کتاب لینے اوپر آیا تھا"

میگن کا وہ تکیہ کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا۔ "اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو نعمت"۔ اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا۔ لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ......" لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساسِ عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسۂ عشق جس میں کیف آور نشہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہو گا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں"

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھا۔ کچھ اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں اتر آیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن

ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ اِترا بھی رہا تھا۔ پچھتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے۔ جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سُنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

ایشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ لیکن تمہیں خدائی فوجدار بننے کو کس نے کہا؟"

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گذری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

میری مرضی۔"

"چندیا کی استری ہو گئی تو مرضی ورضی سب بھول جاؤ گے۔"

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصہ کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی۔"

اکھڑ۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصہ اور حسد سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھا۔ کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا۔

ایسی کی تیسی تمہاری۔"

یہ الفاظ منہ سے نکلے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی اور بولی۔

"دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔"

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ سچ مچ قرمزی ہو رہا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتنا بڑے مزے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ پڑے مزے سے

میگن کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔"

"جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک پجارن کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا جیسے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔

"نہیں!" سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا

"جم بڑا اچھا موسم ہے۔"

"گھاس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے ـــــ"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "جم جب تمہیں جپسی ہوّا نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے۔؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے۔"

"کیا واقعہ بھی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔"

"یہ ہوّا آتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیرد کو مب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جپسی لوگ اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح خبر پہونچی ہوگی کہ مسٹر نیرد کو مب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھوت کو بھیجا کہ جاؤ تم پاس رہو ـــــ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب جھوٹ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوئے تو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو۔"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور ان درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے رہا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں۔"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکا دی۔ اور پراُٹھتی ہوئی نظروں سے ایشرسٹ کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ تو خدا جانتا ہے لیکن آخر بھوت یوں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا گے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں، بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے بعض کو نہیں آتا۔ اب ہماری جو کو یا ہمارے لڑکوں کو لیجئے۔ سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میگن کی نظر کیا مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا۔ دکھائی دے گا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔"

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے۔"

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "لو پائپ بھر لو۔"

"تھینک یو حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔"

ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے۔" بجا لیکن میں بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹر کپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھورے جوبن پر تھا۔ ککو اور ہزار ہا پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے.... باغ جنت میں...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اُگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیوبل اس کثرت سے اگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں مٹیالے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں تو جیسے آسمانوں کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس فرق کو دیکھ کر محوِ حیرت تھا۔ ککوؤں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلیوبل کے پھولوں پر پڑنے

لگے۔ دیوانہ وار خیال آیا۔ آج صبح اسے چوما تھا۔ آج رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ بن دیویاں ایسے ہی درختوں پر آرام کرتی ہیں اور سوکھے ہوئے برگین کی رنگت کے نکیلے کانوں والے دیوتا ان کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں ہوش میں آیا تو لگو جھبار ہے تھے اور بہتے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن سورج پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آگئی تھی اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا "آج رات" جس طرح ہر شے زمین سے ابھری آرہی تھی۔ اور ایک غیر مرئی ہاتھ کی نرم اور پر اسرار مشاطگی سے اس کا حسن ہر لحہ آشکار ہو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی جیسے تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جارہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا سیب کے درخت کی بھی ایک ٹہنی توڑی۔ شگوفوں میں وہی میگن کا حسنِ صحرائی۔ وہی سیبی سا شہابی رنگ۔ وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی ٹہنی کو کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھِل رہی تھی۔ اس کا تمام تر جوش تمتمندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا۔ لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔

(۶)

اوڈیسے کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے کتاب رکھدی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہونچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک الشی کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پرجلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سوّر ذرا چونکے اور ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور قہقہے (دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کون سا) لگاتار پپ۔ پپ۔ پپ کر رہا تھا اور ایک نائٹ جار کے اڑنے اور ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے اردگرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بے شمار کلیاں اور شگوفے جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے یا فرشتے کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک تر زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوش رُبا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچہ میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسنِ پراں جس میں زمین دن بھر ملبوس رہی تھی۔ چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی۔ صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سیب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں تقریباً دگنا۔ کھلے میدان اور ندی کی طرف

جھکا ہوا صاف پہچانا جاتا تھا۔ گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہونچ کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سور دھیمی آواز میں ڈکرا رہے تھے۔ اس کے مس سے تنے کی کھردری کائی دار سطح میں سے کوئلے کی مٹی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ مچ؟ تھرتھراتے ہوئے مسحورِ ماہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بدگمانی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے ہے۔ ایشرسٹ اور اس دیہاتی لڑکی کے لئے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک مخلصی کا سا احساس نہ ہوگا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ نہ معلوم پرند بدستور ہیپ ہیپ کر رہا تھا ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں محبوس چاندنی کو جھانک رہا تھا۔ آنکھ کے برابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا ہر لحظہ زندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بے تابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ نوخیز شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہِ عظیم نہیں؟ یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سور پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھا تو حیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاموش رفتاری ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا "میگن!" اور ہاتھ بڑھا دیئے وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیرِ نسواں اور دفورِ عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور سادگی تھی۔ اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول کر لے۔ اور اسکے دل کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ اُلّو بولتے رہے چاند چپکے چپکے بلند تر اور سفید تر ہوتا گیا۔ ان کے اردگرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے۔ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کی سبک پائی۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر نہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملانے بجز اس بوسے کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایشرسٹ کے دل کو نشیلی مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا کہا کون موڑ

سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے۔ تو دوئی نور آحائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ موثر تھا۔ الیشرسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگن۔ تم کیوں آئیں؟"

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی۔ کچھ مجروح۔

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرینک۔"

"میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"بس"

دھیمی آواز میں جو بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا۔

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

الیشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔"

"اوہ"

اس "اوہ" میں جو ڈر اور مسرت تھی۔ اس سے الیشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ او میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

الیشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کل میں ٹورکی جاؤں گا۔ اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خرید لوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کر لیں گے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی مردانگی سے خود ہی مسحور ہو کر الیشرسٹ نے کہا۔

"نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن تمہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی لیکن یہ کبھی میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے۔"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشرسٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اسکو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس لئے کچھ نہ بول سکا میگن نے کہا۔ "آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاند کی روشنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا۔ کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی۔

"وہ دیکھو۔"

ایشرسٹ کو روشن ندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جیسی ہو گا!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس۔"

ایشرسٹ نے برافروختہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! اچانک اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ سؤروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی باہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تنا؟ کھردری کائی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردرا پن۔ کہاں اس کا نرم رخسار؟ صرف خوشبو۔ جنگل کی خوشبو۔ کم و بیش ویسی تھی۔ اور اس کے اوپر اور اس کے ارد گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رک رک کر ٹہلتا رہا۔ کیونکہ وہ

انگلستان کے ساحلی مقامات کی اس ملکہ یعنی لڑکی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ۔ گرد آلود بوٹ اور پھٹی پرانی ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے محض بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک لندن میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو یہیں سے روپیہ نکلوائے۔ جب بنک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو پہلا دھچکا لگا۔ انھوں نے پوچھا آپ لڑکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیجد یجئے۔ وہاں سے جواب آئے گا تو ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کر دیں گے۔ ٹھوس کاروباری دنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیجدیا۔

ڈاکخانے کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دوکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقانی کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دوکان کے اندر گیا ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے تعجب کے آثار تھے۔ الیشرسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکتا رہا۔

"کہئے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے"۔

نوجوان عورت مسکرادی۔ الیشرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یکلخت اور بڑے زور سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا

"کس قسم کا لباس چاہیئے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"

"نہیں سیدھا سادا"

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی؟"

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے!"

"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو الیشرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ——— اس کی میگن۔ سوائے کھردری پٹی کے سائے۔ کھردرے بلاؤز اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بارہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرحدار جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختئی رنگ الیشرسٹ کو بہت پسند آیا

لیکن میگن کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کرسکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی۔ لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ کیا چنے اور کیونکر چنے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کرو سب کچھ خرید کر اسے پہنا دیا اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا جیسے اتوار کے کپڑے اکثر دہقانوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ غور و فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تاڑ گئی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا۔ "یہ خاکستری رنگ کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کرسکتا۔ دوپہر کے بعد آؤں گا۔"

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے موزوں لباس نہیں مل سکتا۔"

ایشرسٹ نے کہا "غالباً نہیں۔" اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے۔ جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن نے انھیں نگل لیا ہے۔ اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

"فرینک ایشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے۔"

ایشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتابِ دل آفتابِ فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے فل ہیلی ڈے؟"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔"

"لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں۔ انھیں خسرہ نکلا تھا۔"

ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا۔ تو آواز میں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

"میرے کمرے میں آکر مونہہ ہاتھ دھو لو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔"

الیشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ——— کا ہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں لنچ کھانے گیا۔ تو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورا۔ آنکھیں نیلی ہیلی ڈے نے کہا۔ "یہ فرینک الیشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یکلخت اوپر اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی۔ ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا۔ بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں سامنے سے تیکھی۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بشاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا الیشرسٹ پر ایک متجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹا لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈائنا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ۔ پُرجوش۔ بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون منجھا ہوا بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو اوکھا اور پھر اس قدر مانوس معلوم ہوا کہ فارم ہاؤس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی کا نام استیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر الیشرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ الیشرسٹ اس کی طرف مڑا اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا۔ سبینا نے افسوس کے بجے میں کہا "ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں۔"

"قریباً دو میل۔"

"سچ مچ۔"

"خوب"

"واقعی۔"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایلشرسٹ کو اپنی نئی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔ ہیلی ڈے نے کہا۔

"ایلشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟

"میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایلشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا۔ اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے۔ جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ ایلشرسٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایلشرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایلشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساسِ حسن ہو اسے وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی۔ اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔ ایلشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہو گا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہاہا۔ اب تو آپ کو ٹھیرنا ہی ہوگا۔"

ایلشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "میری جان میں سامان خریدنے ٹور کی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔" اسے یاد آیا کہ میگن تھر تھرا اٹھی تھی اور اس کے الفاظ کو سنکر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر یکلخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب پر کھڑی متحیر نیلی آنکھوں سے بغور اسے دیکھ رہی ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟ انھیں کیا معلوم کہ آج رات کے لئے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انھیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا۔

"آہاہا۔ اب، تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہہ رہا تھا۔ "لطف آ گیا۔ بس رات کے کپڑے

میں تمہیں دیدوں گا۔" اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنّا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا اداسی کے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک تار بھیجنا ہے۔"

تالاب کے کھیل سے اکتا گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایلٹرسٹ نے مسز نیر ڈکومب کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔ "افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤں گا۔" اس سے دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا نیلا تھا اور ایلٹرسٹ تیراکی کا شوقین! خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور ہیلی ڈے کے بشاشت چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگن کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ ہیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور اکٹھے روانہ ہوئے۔ ہیلی ڈے اور ایلٹرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایلٹرسٹ پانی میں داخل ہوا۔ اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ہیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایلٹرسٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا۔ میں ایک اجنبی ہوں۔ میری شمولیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سبینا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھائیے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ اسٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے۔ یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔ یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایلٹرسٹ نے دیکھا تو سٹیلا مرمریں اور نازک بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے زرد چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چھینٹیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔

"فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو۔"

ایلٹرسٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ ایلٹرسٹ سے سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اونچے کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایلٹرسٹ نے "واپس جاؤ اسٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا۔ اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ ہیلی ڈے دو سے زیادہ غوطہ نہ کھانے پایا تھا کہ ایلٹرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ اس نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایلٹرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آ گئی آئی فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ ایلٹرسٹ اور اسٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی ڈے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایلٹرسٹ سے بولا۔ "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں!" ایلٹرسٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا کے نم، اشک آلود سرخ چہرے پر حسن کا سکون

برہم ہو چکا تھا۔ نظر پڑی تو سوچنے لگا میں نے اسے سٹیلا کہہ کر پکارا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو ہیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا

"ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لٹا دیا۔ مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

ایشرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سبینا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب نیولے نہ بنیئے یہاں آیئے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے سٹیلا ہیلی ڈے۔ سبینا ہیلی ڈے فریڈا ہیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے ہوئے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں سبینا بولی

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومیں گی۔"

اور فریڈا بولی۔ "ارے ہاں واقعی!"

ایشرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے ملک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے۔"

ایشرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی یہی حال تھا سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور فریڈا پکاری۔

"اب جلد بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب مجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"بکومت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم۔"

سبینا پھر ہنس دی۔
"اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف کو مڑی ہوئی۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگا لیا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں۔ فریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہوگی۔ میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ہلکی پانی کی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خربوزے پر، نارنگیوں پر، چمچے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ سفید رنگت پھر عود کر آئی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا ایک اجنبی کے ساتھ ان لبّاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو لنشست تھی اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جوان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں، تیز تیز، قدرے خنک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں سٹیلا کے انداز میں ایک خنکی، ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محجوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ ہیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا۔ اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے۔ اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا گیا فضول معلوم ہوتا ہے۔"

ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم۔"

ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو لڑکیو سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

فریڈا بولی۔ "تم بہت وحشی ہو!"

اور سبینا نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو اسے سٹیلا بلاتے ہو۔"

"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"

الیشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ بھلا اسے کس نام سے پکارے گی؟ لیکن اس نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو الیشرسٹ نے عمداً کہا۔

"گڈ نائٹ سٹیلا۔"

"گڈ نائٹ مسٹر۔ گڈ نائٹ فرنیک! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی۔"

"اس کا ذکر مت کرو۔"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحہ بھر کو اس نے الیشرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

الیشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ——— اس نے اپنی گھڑی کو نہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا؟ لیکن پھر سوچا میرا ارادہ تو اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستہ میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گذرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

تم ہو! الیشرسٹ! اندر آجاؤ۔"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ مونہہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

الیشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ماضی کا بیشتر حصہ جوں کا توں مدفون رہا شاید میں موت سے ابھی بہت دور تھا۔

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

ہیلی ڈے پہلے تو کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ ——— قریباً ——— اب میں تمہیں کیا بتاؤں تم خود ہی سمجھ لو۔ میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہرحال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تک میں گہرے سمندر میں محو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ لیٹنے کو بستر ملتا۔ نہ پینے کو تمباکو۔ کچھ بھی نہ ملتا۔ ایشرسٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

ایشرسٹ بولا۔

"میں جانوں شعلوں کی طرح بجھ جاتے ہیں۔"

"واللہ!"

"شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹما لیتے ہوں۔"

"یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہرحال ——— میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں۔"

"بہت اچھی طرح۔"

ہیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھ لئے۔ اور کھڑکی کی طرف سر موڑ کر بولا۔

"بیچاری بری نہیں۔"

ہیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا تو سمندر کی تہہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بشاشت ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی۔ شاید لپٹا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو گیا ہوتا۔ اور حشر کے لئے (نویں دن کا؟) منتظر رہتا۔ دفعۃً ایشرسٹ کی مسکراہٹ عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے یہی سب کچھ ہے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہیئے۔ شمع بجھا دوں؟"

ہیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بری چیز ہے گڈ نائٹ ایشرسٹ۔"

ایشرسٹ کا دل بھر آیا۔ ہیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آ گیا۔ ہال کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا۔ وہاں جا پہنچا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائلک کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ ایشرسٹ نے اپنا رخسار ایک ٹہنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو میگن کتے کے بچے کو سینے سے چمٹائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ "مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے ایک دفعہ ——— قریباً ——— میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔" یکلخت سر کو لائلک کی شاخ سے ہٹا لیا۔ اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دونوں سروں پر دو لیمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں تصور لمحہ بھر کو پھر زندہ ہو گیا۔ ایشرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا ندی ہنستی کھیلتی بہہ رہی تھی چاندنی کی نیلاہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر معصومیت اور عشق نیاز مندی کی جھلک۔ وہ آگ

نگاہ دینے والے بوسے۔ اس کا زرات کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آیا۔ فائلک کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے وقت ندی کی آواز نہ تھی۔ یہاں سمندر کا شور تھا اور سمندر سر مار رہا تھا۔ اور آہیں بھر رہا تھا۔ کوئی ننھا پرندہ۔ کوئی اُلو۔ کوئی نائٹ جار یہاں بولتا نہ اڑتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور لائلک کی خوشبو سے فضا معمور تھی۔ کسی اونچی منزل میں ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب احساسات کے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ بلویا جا رہا ہو۔ لپٹا جا رہا ہو۔ جیسے بمار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں! انھیں راستہ نہ ملتا ہو۔ یہ لڑکی جب اسے زنبیک پکڑ کر پکار اٹھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً بھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش۔ خلاف شرع عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑے گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح بے حس حرکت آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ——— شاید ——— پھر اسے پھینک دے؟ کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو۔" دونوں ہتھیلیاں دائیں۔ بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی کچھ باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی نہ آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا۔ "میں کیا کروں؟" شاید مینن کھڑکی کے پاس کھڑی ننگوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے! بیچاری میگن! پھر خیال آیا۔ "کیا ہرج ہے؟ میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن ——— لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟ پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کالے سمندر کو تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضاء جیسے جڑ گئے تھے۔ اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کوئی کرخت آواز میں پکارا

"اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے۔"

ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ——— ہاں ہاں یاد آگیا!

باقی لوگ مربہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔

"ذرا جلدی کیجئے ساڑھے نو بجے یہاں سے چلنا ہے۔"

"ایشرسٹ ہم بیری ہیڈ کوارٹر جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہوگا۔"

ایشرسٹ نے سوچا۔ "میرا ان کے ساتھ جاؤں ناممکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے"۔ اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ سٹیلا نے جلدی سے کہا۔

"ضرور چلئے۔"

اور سبینا بولی۔

آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"

زیڈا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

آپ چلئے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔"

ایلشرسٹ نے سوچا۔ " ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا۔ ایک دن اور!" اور پھر بولا۔

" اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میری ایال کھینچنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہرّا!"

اسٹیشن پر پہونچ کر اس نے ایک تار اور بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انھیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آسکتا برکسم سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ایلشرسٹ سبینا اور زیڈا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگے تھے۔ راستہ میں " اپ جینکنز " کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا تو یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کر دوں گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگتے پھرے (ٹہلنے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے۔ اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے۔ سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں ایلشرسٹ کے کندھے سے سر رکھ کر سو گئیں۔ ایلشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے ایلشرسٹ کو اور ایلشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"فل کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے فرینک!"

ایلشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابرو کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایلشرسٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے۔"

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"

یہ کہا اور نظر بھر کر ایلشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن برتری کی خواہش غالب آ گئی۔ بولا۔

"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

جز ہے۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

ایشرسٹ نے سوچا اب ضرور اسے صدمہ ہوگا۔ بولا۔

"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے۔ اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہیں گے۔"

"لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں سمجھتے؟"

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آئی۔ "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔" اور کون ایسا ہوگا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت ضرور منتظر ہوگی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا، "تم کس قدر ذلیل ہو۔"

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے) حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور رہ تعجب کی بات ہے اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا۔ ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے۔ اور جب بچوں کے سونے کا وقت آ پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (سونے کے بال ہلکے رنگ کے ان کے نیچے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی!)

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش صورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے اردگرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا۔ کس کی جرأت ہے کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر بھی ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا؟ اس کے بعد ہیلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی۔ اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے ایشرسٹ کا گانا سنا۔ اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی "ارخ گردل نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤن پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سبینا کے "بڑا مزہ آیا۔"

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا ہو گیا تھا اور ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر احاطہ کر لیا تھا کہ فارم اور میگن — خود میگن! خواب و خیال ہو گئی۔ کیا سچ مچ اس نے اظہار عشق کیا تھا! کیا سچ مچ

اسے بھگا لے جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ نہیں نہیں وہ مسحور ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا۔ بہار کا۔ رات کا۔ بیب کے شگوفوں کا! اس کو۔ اس کمسن بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ اپنی داشتہ بنانا۔ اس خیال کے آتے ہی ایشرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ "میں نے بہت بُرا کیا۔ میں نے بہت بُرا کیا۔" شومان کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی۔ اسے تصور میں سٹیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ مرمری ہلکے رنگ کے بال۔ لچکدار گردن۔ ارد گرد فرشتوں کا سا نور۔ اس نے سوچا "میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بدنصیب میگن!" "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی!" "میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بےچینی مٹ جاتی ہے۔ ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر کیا ہوا ـــ چند بوسے ـــ مہینہ بھر میں بھول جائیں گے۔"

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چک کے روپے وصول کئے۔ لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس فاختئی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دو دن سے دل میں امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا۔ جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سٹیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"فرینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

فیرر کی "سرانج لیورع۔" ایشرسٹ مسکرا دیا۔ سٹیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوتی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ بولے۔ شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور ہیلی ڈے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایشرسٹ سٹیلا سے مخاطب ہوا۔ "مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔ گویا انعام کے لئے ہمیں بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ یہ رجا در حقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے۔"

وہ صوفہ پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

سٹیلا نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔

"میں نہیں سمجھی۔"

الشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

"ذرا غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟"

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! الشرسٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو۔"

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اور راحت ملتی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے درخشاں پرسکون۔ خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا جیسے اس ملبوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر "ٹوئنس" جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری پومرائے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے اسے فسخ نہ کیا اور گھوڑدوں کی طرف پیٹھ کرکے ہیلی ڈے کے ساتھ لینڈ میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ الشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا میگن ـــــ خود میگن! ـــــ پرلی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر الشرسٹ نے یکلخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے۔ یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھیر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو الشرسٹ سے نہ رہا گیا دروازہ کھول کر بولا "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ الشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا! کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہوگی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیفیں سہے گا۔ پچھتائے گا اور پھر اکتا جائے گا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ

سادہ لوح ہے۔ بھولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی متاملی حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر لڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ نصیب ہوا ہوگا! جو ارادہ کرتا تھا دل اسی پر ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا درد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے سنگر ایک ناگیر لازمہ مڑ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بے چاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں؟" یکلخت تصور میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال ہوا سے اس کے ماتھے پر نظر آئے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ٹوپی اب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ دھبہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سینے میں خلا سا محسوس ہوا (جب تعقل کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ اسٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا ننھے بچے بیلچے اور بالٹیاں لئے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا۔ لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عنان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ توقیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں۔ اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لئے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے۔ اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لئے یوں مضطرب تھا۔ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پُر کیف شور۔ بٹرکپ کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریخی چٹانیں۔ گگو اور مسیغل کی کوک۔ الوؤں کا بولنا۔ سرخ چاند کا مخملی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرہ کا نظر آنا (اور ہاتھ وہاں پہنچ کر رہ جانا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے؟ تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے ایک

نازک ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو بھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے اس کا نام پکار کر کہتی ہے "تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟ یہ کچھ اور اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا جس میں جا بجا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلا اور گلاب کے پھول اور لونڈر اور لائنک کی خوشبو ہو) خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا نچوڑ جنھیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا یکلخت اسے خیال آیا۔ "ممکن ہے وہ ادھر ہی کو آنکلے اور مجھے دیکھ پائے۔" اٹھ کھڑا ہوا ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں بنوں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا، قطعاً ناممکن ہے۔ اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائیگا لندن میں اس کی سادگی اور اس کا گنوار پن اس قدر نمایاں ہو گا کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ان خیالات میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے سرکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ میگن کا چہرہ اوپر تک رہا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے۔ اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں پنجے گاڑ دیئے۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے رہ رہ کر ستاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دیئے اور تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سُن ہو جائیں۔ اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعۃً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا اور سمندر کی رَو اسے بہا کر لے گئی۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے۔ تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا۔ (فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے)۔ فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔ "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید ـــــ ہر حال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے!" مجنونانہ خوف کے اس لمحہ میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا۔ لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا جسم خنک اور تر و تازہ ہو گیا تھا۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھا) یا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس ان پر مکھن لگا ہوا۔ مربہ۔ غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی

تھی۔ خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سٹیلا کے سینے پرونے کی ڈکری اٹھالی۔ تاگے کی گڑیوں اور خوش رنگ ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا رہا۔ ڈکری میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا ہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب اسٹیلا نے اس کے پاس لا کر رکھی تھی۔ وہ وہیں پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھک کر باغیچہ میں جو تھرش بول رہے تھے۔ ان کو سنتا رہا۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی دکھائی دیں۔ سٹیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ڈکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل، ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کر کے چڑتا تھا۔ لیکن ان کی پُرسکون معصومیت اور سٹیلا کی دید سے مسرت اندوز ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سٹیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ کھوئی سی جیسے کوئی ڈری ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرا دی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور کھچ بھی گیا۔

”فرینک تم نہ آئے نا؟“

”وہاں آنا ہی نہ ہو سکا۔“

”دیکھو ہم کیسے بنفشے کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔“ سٹیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔

ایشرسٹ نے انھیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مر بھی گئیں۔ میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر تک رہی تھی۔ راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ”بہت خوبصورت ہیں“ اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور بستر پر جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قرعہ پھینک چکنے کے بعد۔ میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ کم و بیش ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انھیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سٹیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دلفریب محجوب حسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کر کے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بے چاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہوگی کہ ایشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہوگا۔ تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر ایشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چپ تھا۔ اس کی

اداسی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت بے لطفی ہی کٹا۔ کئی بار ایلشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایلشرسٹ بگڑا ہوا تھا اس لئے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مغرور احمق سمجھتا ہے کہ میگن کو بہت ہی صدمہ ہوگا ہفتے دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا! نیک لڑکا! سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ مجھے شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت قہقہہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ مو قلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہوگی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ہے نا؟"

ایلشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں —— تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت، سریع اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دینے۔

تین دن کے بعد ایلشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی........

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب ایلشرسٹ کے دل میں جب کہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گورس کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں میگن اسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فارم اور

باغیچے اور چھپی ہوئے والے مرغزار کو پھر جاکر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر دو چیڑ کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان۔ اسے اچھی طرح یاد تھی۔ فارم کے دروازہ تک پہونچ کر رک گیا۔ وہ بھوری سی نیچی عمارت۔ پرانے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل جوں کے توں تھے وہ پرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہوکر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لی تھی پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سور بھی ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ کیا سچ مچ چھبیس سال گذر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آگیا پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جبکہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبو نے جو بس سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے ایک ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا اور ان کے پاس وہی پتھر جہاں گھنٹے تھے جیسی ہوا آن کر بیٹھتا ہے۔ گم کردہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیرینیوں کو ضایع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر ملوث حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جدا نہ ہونے دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچا تو اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا۔ شباب اور بہار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کڑبڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟" بولا۔ "یہ ایک قبر ہے!"

اداسی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لیے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت بے لطفی ہی کٹا۔ کئی بار الشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ الشرسٹ بگڑا ہوا تھا اس لیے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مغرور احمق سمجھتا ہے کہ میگن کو بہت ہی صدمہ ہوگا ہفتے دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا! نیک لڑکا! سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبطِ نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ کیسے شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت قہقہہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ موقلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہوگی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ہے نا؟"

الشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں — تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سریع اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دیئے۔

تین دن کے بعد الشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟ اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی ....

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب الشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گودس کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں میگن اسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فارم اور

باغیچے اور جپسی ہوتے والے مرغزار کو پھر جاکر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر وہ پہر چڑھ گئے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان اسے اچھی طرح یاد تھی! انعام کے دروازہ تک پہونچ کر رک گیا۔ وہ بھوری نیچی عمارت۔ یکے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل جوں کے توں تھے وہ پرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سور بھی ادھر ادھر پھر رہا تھا کیا سچ مچ چھبیس سال گذر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آگیا پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جبکہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبو نے جو بیں سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے ایک ککر کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا اور ان کے پاس وہی پتھر جہاں کہتے تھے جپسی ہوا آن کر بیٹھتا ہے۔ گم کردہ شباب کا خیال آیا عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیریں بینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر ملوث حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جدا نہ ہونے دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچا تو اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا۔ شباب اور بہار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چورا ہے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کڑ بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟"

بولا۔ "یہ ایک قبر ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"

بڈھا مسکرا دیا "یہ لمبی داستان ہے۔ میں اسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "پائپ بھر لو۔" بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں، جو جھریوں اور بالوں میں سے اوپر کو تنگ سی تھیں ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بے چاری نے خودکشی کر لی تھی۔"

ایشرسٹ نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ جبھی تو چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا اب یہ دستور نہیں رہا۔"

"مگر یہ تو بڑے عرصہ کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری بڑا خدا ترس شخص تھا۔ اگلے میکلمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے۔ اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسز نیرد کومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا اب وہ فارم جک نیرد کومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر لیتا ہوں۔"

ایشرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیا سلائی بجھ گئی۔ لیکن ایشرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا "اچھا!" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گزرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گو انھوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا۔ جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا مزدور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا لامڑا تڑا ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیوبل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا!"

بوڑھے نے کہا۔ "بس یوں سمجھئے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔"

قبر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایشرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی داڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے۔ کہا۔

"اچھا!"

"یہ موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا جواب ہے۔ یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک کالج کا لڑکا آکر ٹھیرا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا کھنچ کر رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسی نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا ایکا ایکی یہاں سے چل دیا۔ اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے اپنی چیزیں منگوا کیوں نہ لیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایشرسٹ نے پھر کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو نامی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ میں جانوں لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بچھڑوں کو لے کر آتا۔ تو وہ لڑکی باغیچے پر بڑے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا۔ "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی خالہ بڈھی مسز نیرد کو سب ددلوں دیلز سے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا دکھ کیسے نہیں۔ ہے اور ضرور ہے کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا تو پھر تم روتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ وہ بولی نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی چنانچہ اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لئے آ رہا تھا کہ میں نے ندی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی دیکھی۔ میں سمجھا سؤر ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سؤر کے لیٹنے کی جگہ ہے۔ قریب پہنچا تب معلوم ہوا کہ کیا ہے؟

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظر میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

"ندی میں ایک چٹان ہے۔ اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف

میں سے سنہری پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اسے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی۔ اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی مرگ ہوئی تھی۔ ورنہ اس بیا ڈنگھا سے کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ میں آپ سے کیسے کہہ دوں کہ یہ جنگل بھاری ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ اسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے کہ بھاری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سنکر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی چنانچہ انھوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر رک رک کر بولا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد لینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں لنچ چن رکھا تھا۔ اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام! اس کی پرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز، گل ریز، مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو میں
شباب اور خود سری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔

الہام یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اے سائپرین۔ اے سائپرین تو حکومت کرتی ہے
صرف تو —
یونانی مسیح کہتا ہے۔ میگن! حسرت زدہ میگن! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن پرانے سیب کے درخت کے نیچے
راہ تکتی ہوئی! بے جان۔ مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے!

ایک آواز کانوں میں پڑی۔

"وہاں ہو تم۔ لو آؤ دیکھو"۔

ایشرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی۔ اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"فرینک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"

"ہاں"

"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔۔ ہے نا؟"

ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کمی؟ سیب کا درخت۔ موسیقی اور سنہری پھول!"

ترجمہ: پطرس

(کاروان)

نوعِ انسان کی کہانی

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں

اس باب میں میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ ظہورِ انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جاندار اشیاء کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو نھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان یا انسان کی طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصہ سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دل چسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہ نمودار ہوئی ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسا سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی

پہاڑیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھیں۔

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے اپنا چہرہ نکالا اور دیکھا کہ اس ننھے سے کرّے کی سطح پر پانی کے چند تالاب سے بن گئے ہیں۔ یہی تالاب بعد میں مشرقی اور مغربی نصف کرّوں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک دن ایک حیرت انگیز معجزہ ظہور میں آیا بے جان دنیا نے جاندار چیزوں کو جنم دیا۔

پہلا جاندار ذرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ ذرہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اسی عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا گیا اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پا لیا۔ بعض ذرے ایسے بھی تھے جو جھیلوں اور جوہڑوں کی تاریک گہرائیوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی اور کیچڑ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے بہہ کر نیچے آ گئی تھی اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پودے بن گئے بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا یونہی ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں سے بچھوؤں کی سی عجیب و غریب جوڑدار ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں اور ان سبزی مائل لوتھڑوں کے درمیان جو جیلی مچھلیوں سے مشابہ تھے۔ رینگنے لگے۔ بعض چھلکوں والے ذرے ایسے بھی تھے جنہیں خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر تیرنا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ کروڑوں مچھلیوں سے آباد ہو گیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں رہنے کے لئے نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ حوصلہ کر کے پانی کو الوداع کہا اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کر لی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے انہیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتے۔ لیکن باقی تمام وقت بڑی بے چینی سے گھٹتے اور رقیق ہوا میں جو زمین کی سطح کو لپیٹے ہوئی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے۔ کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہوئے کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے۔ ایسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں رہنے لگے۔ بڑے ہوئے تو جھاڑیاں اور درخت بنے۔ اور آخرکار خوب صورت پھول پیدا کرنا سیکھا۔ جب پھول اُگے تو بھونرے آ کر رس چوسنے لگے۔ پرندے دور دور تک بیج اڑا کر لے گئے۔ یہاں تک کہ سب زمین پر سبزے نے اپنی چادر بچھا دی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دئے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو فاکابی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ فاکابی جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے جانوروں سے آباد ہو گئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں اکتھیا سورس (IEHTHYOSAURUS) میگا سورس (MEGALOSAURUS) اور برانٹوسورس (BRANTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے نہ تھے، چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی

سی بنالی اور اسے لگے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلا لیا۔ پھر اس جھلی پر پر اگ آئے۔ دم سے مڑنے تڑنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اڑنے لگے اور سچ مچ کے پرندے بن گئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ رینگنے والے جانور سب کے سب مر گئے اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا شاید آب و ہوا یک لخت تبدیل ہو گئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مر گئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ نہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ رینگنے کے۔ اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے دکھائی دے رہے ہوں لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں بہرحال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لے لی۔ یہ اولاد تو انہی رینگنے والے جانوروں کی تھی لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو چھاتیوں کا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ مچھلیوں کے سے پیان کے جھڑ چکے تھے۔ پرندوں کے سے پر اختیار نہ کئے۔ ان کی بجائے بال اُگ آئے۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ جب تک بچے پیدا نہ ہو جاتے مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پہ چھوڑ دیتے لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائیں خود ان کی حفاظت کرتے۔ اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے اردگرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بازار میں اور گھر پر وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔

ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ اپنے لئے ایک رستہ نکالا عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کش مکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ از سرِ نو سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر، کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئیگا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیسس اور نیفتیس کا دامن پکڑتے تھے اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکی۔ طنز سے زندگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے۔

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو۔ ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔"

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانشمندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب "نوع انسان کی کہانی" مصنفہ ہنڈرک فان لون
مترجمہ پطرس

بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کم از کم بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ فطرتاً ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے۔ ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت ہمیں حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی مامتا اور بچے کے لاڈلے پن کا جو دلاویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضرر رساں قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو (روسو کی مانند) اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے۔ جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے۔ اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کماحقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موقعے پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے۔ اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور

وہ چوسنے کی خواہش ہے جب تک بچہ اس عمل میں مصروف رہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تحیّر کے عالم میں گذارتا ہے جس سے یوں نجات حاصل ہوتی ہے کہ دن اور رات کا بیشتر حصہ نیند میں گذر جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے اور بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تواتر کے ساتھ ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ اس لئے بچہ ان باتوں کا متوقع رہتا ہے یعنی یوں کہیئے کہ اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہوا انہیں کو پسند کرتا ہے گویا قدامت پسند بن جاتا ہے اور قدامت پسند بھی ایسا کہ اغلباً پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نئی چیز اسے ناپسند ہوتی ہے اگر بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہوتا تو بڑے بوڑھوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ میاں جانے دو اس عمر میں اب ہم بھلا نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہیں۔ اوّل اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گرد وپیش سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کیلئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تنومند تو ہو لیکن اس کے اخلاق بُرے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہیئے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں کے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں لوگوں کا یہ سلوک اسے از حد ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبہ سے معرا سمجھ لیتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اور بے جا خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو ضدی اور حریص ہوتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی مفروضہ بے توجہی سے کڑھتا رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اوّل ہی سے شروع کر دینی چاہیئے۔ تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیئے۔ کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل ہی بے توجہی برتی جائے مثلاً جو بات صحت کے لئے ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنی چاہیئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہیئے۔ تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہیئے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کرنا فضول بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیئے اور

ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ بچوں کی پرورش چاؤ چونچلوں سے نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی سے کرنی چاہیے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادات کے رستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مدعا یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو غفلت اور لاڈ کے بین بین رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد درآمد نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بہ ظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں۔ اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا ان کے اعضا کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گاتے گاتے پھرتے تھے۔ اور انہیں چوبیس گھنٹے چوما چاٹی کا تختۂ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہیے۔ خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے۔ اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیے، بازوؤں میں تھام کر "سو جا سو جا" نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے۔ تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچہ کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اوڑھا لپٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بہ خود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیا کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیا کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس، ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا انا کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ

وہ اشیاء کی شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اشتراک سے بچے کے ذہن میں عادات وضع ہو جاتی ہیں تو مس اور بو اور نظر کی بدولت ذہن میں اشیاء کے تصورات شکل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرتے ہیں۔ (دودھ کی بو آتی ہے تو چھاتی یا بوتل کے مس کے لئے تیار ہو جاتا ہے ماں کی آواز آتی ہے تو ماں کی شکل دیکھنے کا منتظر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک اشخاص اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جس بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے۔ اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تمام عرصے کے دوران میں تعلیم کا ذریعہ محض جسمانی ہونا چاہئے۔ بچے کی تمام مسرتیں (جو زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اور اس کے تمام دکھ محض جسمانی ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور اس کی عادات یوں شکل پذیر ہوتی ہیں۔ کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک حد تک تو ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس دکھ کو دور کیا جائے (جیسا کہ کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوش گوار ہوتے ہیں چنانچہ رفتہ رفتہ بچے کو یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرانے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی ذہانت کی پہلی فتح ہوتی ہے لیکن باوجود انتہا کوشش کے جب تک اسے دکھ نہ پہنچ رہا ہو وہ ویسا نہیں رو سکتا۔ جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار ماں اس قسم کے رونے اور اُس قسم کے رونے میں بخوبی تمیز کر سکتی ہے عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ کا رونا دکھ کا رونا ہو تو اس پر بالکل توجہ نہ کی جائے۔ بچے کو لئے لئے پھرنا اور اس سے کھیلتے رہنا یا اس کے سامنے گانا آسان بھی ہے اور پُر لطف بھی۔ لیکن بہت جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گزرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہئے۔ لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اعصاب کو کام میں لا سکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے ان کی نگہداشت زیادہ کرنا پڑتی ہے حیرت ہے کہ ان لوگوں کی مامتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آ سکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو ہوا سے ہل رہی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیا کو پکڑنا نہ سیکھ لے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ لے۔ تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اسی میں مشغول رہتا ہے۔ جھنجھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ جھنجھنے کے زمانے سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں بچہ یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں، بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلانے کا بہتر سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے جو تعلیم کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سوئی کے نگلنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔

پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اُکتائی رہتی ہے جب وہ مزے میں ہو تو سو جاتا ہے جاگ رہا ہو تو کوئی نہ کوئی بے چینی اسے ضرور رہتی ہے انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے سے کم عمر کے بچے کو نہ تو کسی چیز کا کافی تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً بہت جلد زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں فطری ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس اکتائے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے نیند پوری طرح آتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے ممیز ہونے لگتے ہیں۔ اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ اور نہ صرف جانوروں کی مانند بلکہ اور طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر بجایا اور فخریہ مسکرا کر سب کو باری باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام تر زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیئے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی چاہیئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ خود بول کر اسے سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بالارادہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی معین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیئے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک جھنجھنا ہلا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ محض شوق پر تازیانے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے۔ اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات باقاعدگی سے پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور بچہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں

بچہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی نئی بات یکلخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا عمر بڑی ہوتی ہے تو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچے کو ڈر محسوس ہوتا ہے جس سے اسے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر، تو اپنا فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے۔ ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیئے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہش مند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیئے۔ بچہ بڑا ہو تو اس اصول پر بیش از بیش کاربند ہونا چاہیئے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیئے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو خود اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متوقع رہتا ہے۔ حالانکہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہیئں۔

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے بچے کے قوائے کمزور ہیں۔ اور اس کا علم محدود۔ لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حارج نہ ہوں وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے

ماخوذ از کتاب "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں"

مصنفہ برٹرنڈ رسل — مترجمہ پطرس

دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تو تھے ہی۔ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گیا۔ اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں۔ جہاں بڈھے میاں کھڑے بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "نہ کسی کے کانوں میں مرکیاں دیکھیں۔ نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے، نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں، یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ کیسے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور ہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے، نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لئے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا "سلام اے لوگو! ہاں میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر ضرور میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا: "واہ وا۔ تو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: "کہئے آپ کا کون سا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی اس

کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ اسے دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہیں بدلنے لگے تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف ہو گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سلائی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اسے کب چھوڑنے والے تھے۔ سب کے سب چلا اٹھے "ہیں، ہیں بڑے میاں کہاں چل دئے۔ ٹھہرو تم ابھی نہیں جا سکتے۔ تم پہروں بیٹھے بڑی عمر کے لوگوں سے باتیں کرتے رہتے ہو، کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟

سقراط نے کہا۔ "یہاں میری ضرورت بھی کیا ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم اور تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں میری ضرورت ہو۔"

استاد نے کہا۔ "نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریئے اور کوئی نئی بات بتایئے۔"

سقراط نے کہا۔ "میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔"

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا "اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو" کہانی کا نام سننا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے۔ "ٹھیک ہے کہانی کہئے کہانی۔"

سقراط نے کہا۔ "میں کہانیاں وہانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے۔ "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔"

سقراط نے کہا۔ "یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو پیٹ پالنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس پر ننھی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر یہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔"

سقراط نے کہا۔ "خوب خوب، مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا مگر مچھ بہت ہی بڑا ــــ"

"رہنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کوئی کام کی کہانی سناؤ۔"

"دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ، جس میں بادشاہ ہوں، شہزادوں شہزادیوں کا ذکر ہو۔ اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا۔ "اب آئے نا راہ پر، ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ جس پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا تو نہ تھا ہاں ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے

سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے دل میں بہت ڈرا کیونکہ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا "اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ہماری سلطنت پر قبضہ کرے گا۔ اور اگر میں نے اپنی بیٹی اسکے بیٹے سے بیاہ دی تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کرے گا۔ ہم کریں تو کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا۔ "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اس پر سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں یہاں تک کہ حیوانوں اور درندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیئے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے۔"

کوؤں نے کہا۔ "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا۔ "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی۔ مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ تھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا۔ "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا۔ "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی۔ "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا، اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔"

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے، جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں کھیوں کا بادشاہ ہوں۔ اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔" جاؤ یونہی فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے ٹھٹھا کرنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا۔" جاؤ۔ تمہیں اجازت ہے میرے دشمن کو برباد کرنے میں اپنا سارا زور لگا دو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ کھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ کھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دہائی دینے لگا۔ اس نے چلّا کر کہا "بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے مغرور اور ظالم ہمسائے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔" چپ رہ بڈھے، کیا بکتا ہے؟" اور بے چارے بڈھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دئے۔ گر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔"

ایک لڑکے نے کہا" خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا" اگر تم یوں میری بات ٹوکو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا" یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔" یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں اِدھر اُدھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا" احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا۔"نہیں"۔

ایک لڑکے نے کہا" مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔"

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک تلاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ تو پہیلی ہے پہیلی۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی کہتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی۔ آپ کوڑا کرکٹ تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ گرد کا ایک ذرہ بھی تو احاطے کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول کے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے یقین جانو مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑ دو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے اب صفائی ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے۔ اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دو بھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ، ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا "لو بھئی سنائے دیتا ہوں۔" اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آ گیا۔ خوب صورت شہزادی باغ میں بیٹھی جاب بن رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

تو پھر یہاں چھوڑی ہو گی کہ "بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔"

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ خیر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چھوٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ تو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شان دار جشن منانا چاہیے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسایے کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شان دار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر اس میں شامل ہوئے۔ جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا، بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکایک وبا پھیل گئی اور دھڑا دھڑ موتیں ہونے لگیں۔ بہتیرے جتن

کئے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناچار بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے افسر تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کریں گے یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڈھوں، امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو جشن کیا تھا اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔"

بادشاہ نے کہا "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" اور سب بڈھے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال چھوٹے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر اسے مبارکباد دینے آئے جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اتنی اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلّا کر کہنے لگا "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے "لے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سر انجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں۔ اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغا باز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ہرگز دغا باز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا "ثابت کر۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ثابت کرتا ہوں۔ سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے ٹٹوؤں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے۔ اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا۔ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے تو گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے۔ ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ تو اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ جوتے اتارتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضہ کے جراثیم یہاں لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ اور چلّا کر کہا "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ! اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرّا اٹھے اور بادشاہ نے کہا "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دونگا۔ اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہو گی۔"

اب وہی بڈھا جس نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا بولا "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے، کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھئے۔"

بادشاہ نے پوچھا "بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس دن تم لڑکوں نے ٹھیک بوجھ لیا تھا کہنے لگا "جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ

کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہئے ہمیں آئے دن جو طرح طرح کی بیماریاں گھیرے رہتی ہیں ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "تو اب میں کیا کروں؟"

سقراط بولا: "حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا: "ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سقراط بولا: "تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہئے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو ڈرپوک تھا۔ بول اٹھا "بادشاہ سلامت! خدا کے لئے اس طاقتور دشمن کو ناراض نہ کیجئے" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہئے، ورنہ مکھیوں نے جس طرح ہمارے ہمسایہ بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا "اے بادشاہ! مجھے انعام کب ملے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے ذرا بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھیں اور جہاں چاہتی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ کر مر گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں کے نیچے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور بکسوں میں بند کر کے رکھتے اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا۔ اور وہ وبا نہ پھیلا سکتیں۔ اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گڑھے کھود لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس رسم کو بالکل بند کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ کوئی شخص کبھی سوائے گڑھوں اور گھروں کے پاخانوں کے جو انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے بنوائے تھے۔ اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پائے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے اور لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں۔ اور ان میں خمیر اٹھتا رہے۔ اور مکھیاں وہاں بھی انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت عمدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے۔ اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ رہا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں۔ اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم بجائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی، مکھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔ اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی

نے بڑی سلطنت کے شہزادے سے شادی کرلی اور وہ اور اُن کی رعایا ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔"

سقراط نے ننھی لڑکی سے کہا: "کیوں ننھی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے سہنے لگی ہے۔"

پھر وہ بڑی عمر کے لڑکوں کو مخاطب کرکے بولا: "لڑکو! اب جب سالانہ جلسہ ہو تو تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سنائی ہے ناٹک تیار کرکے دکھانا۔ اس میں شیر بھی لانا اور بھیڑیئے وغیرہ بھی۔ اور مکھیوں کے بادشاہ کے لئے کوئی اچھا سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر پر بھی لگانا جب تمہارے والدین اور دوست اس ناٹک کو دیکھیں گے۔ تو ان کی سمجھ میں آجائے گا۔ کہ تم نہانے دھونے اور صفائی کا اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے اسکول اور احاطے اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟"

(دیہات میں بوائے سکاوٹ کا کام)

از ایف۔ ایل۔ برین، ایم سی، آئی۔ سی۔ ایس

مترجمہ: پطرس

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گذرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض تو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتہ دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہونچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چائے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بپھر کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں۔ ہم سے کہنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کئے اس لئے ہم متنبہ کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف 'اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں تھا، کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں۔ پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنے شاید جوانمرد سمجھیں اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان، نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا۔ نہیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں، لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو نازش تھا، نکہت یا عندلیب، گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں غلام رسول، احمد دین، مولا داد ایسے لوگ تو ناپید ہی ہو گئے ہیں۔ جسے دیکھئے تسنیمی کنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت غزنوی، نزلہ کھانسی، ثعلب مدنی ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے۔ دیکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسن ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے ہم نے بعد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وجہ پوچھی۔ ہم نے کہا پیچیدگیاں۔ کہنے لگیں آگے بولئے ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لئے ہم تائید تردید کچھ نہ کر سکے میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہرحال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق ہے؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں اخبار انہوں نے محض خدمت خلق اور رفاہ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ، ان کے ماموں کا انتقال ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہو گئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہو گا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زیر لب فقرے کسنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ بچے نہایت ہی ہونہار ہیں اور حالات حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لئے لئے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہنے خرقہ دیرینہ ہے اس فقرے کو مٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پر ہم چپ ہو گئے پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریزیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں اسی لئے سب ایڈیٹر

کو سلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیپ کے سیفما سٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کیا جائے وہاں کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے)

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرزِ عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہونچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرضِ وجود میں آیا ہے، ہوائی جہاز اڑتا نہیں محوِ پرواز ہوتا ہے، مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کا ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بلا ہونا چاہیے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال یہ پروپرائٹر اور ان کے اہلِ خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا، علیٰ ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا ـــ

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ ہمارے پروپرائٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے بہت بڑھ رہا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کون سی بات؟ اپنے ڈیوڑھی پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی ۔۔۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہلِ جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوقِ صحیح رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہوگی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں۔"

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر، روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "دستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے" نے مسجد میں واعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوے لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

بہ بانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوے دار ہے آپ کی آزاد منشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری اور بددلی لپک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو غرہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر جھکائے دبکا بیٹھا

ہے اور باہر پڑا پڑ مینہ برس رہا ہے۔ اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائداعظم یہاں تشریف لائے — اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا "روز گارڈن" کا نام "گلستان فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور طفلانہ تھی کہ مدرسے کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستان فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سایے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں، نہ وہ پتلون پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے، کیونکہ ایسے شان دار موقع کے لئے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آ سکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر، اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں، ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور خانقاہوں ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت، کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے کلچر کے احیا اور تحفظ کے لئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں تمہیں کھا لو کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کر لو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں، اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے، لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھئے گا، تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہئے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹنی چٹے بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں۔ وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو تہ کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جان داروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ دریا، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی جرنتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا کہ پابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جان دار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوال حق بین مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو وین گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "سچ" بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تکمہ یا ڈوری لیلےٰ کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً ختم ہو جائے گی۔ اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔

باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کون سا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردگرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہونچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور مو قلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے درّے لگائیں؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں کبھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لئے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن، نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہگیر سے لینے پر تلا ہوا ہو، نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں، نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لئے تصویریں بناتا رہے، نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے بک لینے دیں۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو، کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا اس کا دور اب گذر گیا ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جانداری کی تصویر پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب، چھوٹے بڑے، ادنے اعلےٰ سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہد زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے تہمد میں، سیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں انہیں یہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں اس بیگانۂ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرحتے نیست کہ در پہلوئے آں صد غم نیست
روز مولود جہاں کم ز شب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی بڑے بڑے ارباب حل وعقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہئے کہ

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

(نقوش جشن آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ۔ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گذرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجنا دے دیجئے۔ یہ جھنجنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے مامتا یا "باپتا" کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔ سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس "ڈیوٹی" پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک

جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے۔ رہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سُر ذرا باریک ہے۔ آپ انگلیاں چنخوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر، کانوں میں روئی دے کر، لحاف میں سر لپیٹ کر سوئیے، ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔ انہی مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت! آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسم سے کہتے ہیں "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو، سلام کرو بیٹا، اس کا نام اختر ہے صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا" میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا" گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقر عید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی، کیونکہ ایسے موقعہ پر ضد کارآمد ہوا کرتی تھی، لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں۔ ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرہانے میز پر جو انگور کا خوشہ رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لئے۔ مہینے دو مہینے کے بعد کوشش کر کے بیٹھے بیٹھے غسل کر لیا یا گاہے گاہے ناخن ترشوا لئے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گذر گیا۔ ارباب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گذر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا یقین تھا اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم —— ہر چند کہیں کہ ہیں —— نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا، نرم نرم گدیلوں پر گویا بستر عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحب فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا۔ غسل کر لیا۔ ناخن ترشوا لئے۔

تمام تگ و دو لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے ——

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے اردگرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کنچن جنگا کی طرح اپنی بلندی پر جما بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پر اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گنے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثار صنادید کا سا مٹیالہ رنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور سٹول میسر آ گیا وہیں کھانا منگوائے گا اور کھانا کھا چکنے پر کووں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام برقرار رہے

اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی کے دن بال نہ کٹوائے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات

پڑجا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلا تکلف ہضم کر جائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لئے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فورتھ ایر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے غائب ہو جائیں گے۔ اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحب کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر ہفتوں سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہل فن کی داد دیتا ہوں جو روزانہ دیر سے آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں۔ کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہوسٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا۔ اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لئے یہ سوال کافی ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے دفتر کی گھڑی ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

دہی میں نے کھانا کہ انگور کھا لیا، غسل کر لیا، ناخن ترشوا لئے ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

"پطرس"
(راوی سنہ ۱۹۲۹ء)

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگسان کا فلسفہ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کبھی کسی کے منہ چڑانے پر کبھی کسی کے ظریفانہ فقرے پر اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کون سی ہے؟ ہم کس طریقے سے ظرافت کی اس پری کو شیشے میں اتار سکتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف اجسام میں آ کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے اور سامانِ تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کر دیتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے۔ لیکن تو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں۔ اس نام کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بند منہ میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے۔ اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو بھینچ ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں۔ اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے کاغذ پر رکھ دے۔ اور ممکن ہے یہ آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو۔ کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریقِ عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی آوارہ و وارفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دوہرا ہوا جاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے۔ تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دئے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میدانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دورانِ بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے یہ ہے کہ کوئی سامانِ تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ خوب صورت ہو۔ ممکن ہے کہ دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے۔ کہ ہماری نگاہ کو اس جانور

کی ہستی میں کوئی انسانوں کا سا انداز یا انسانوں کی سی حرکت محسوس ہو جاتی ہے جو سامانِ تضحیک بن جاتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ ایک لمبوتری نوکدار کاغذی ٹوپی کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔ لیکن اس میں جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا کاغذ نہیں۔ وجہ خندہ اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو یوں معرضِ ظہور میں لانے کا باعث کوئی انسانی ہاتھ ہوا ہے۔ یعنی مضحک انگیز ٹوپی کی قطع وضع ہے۔ جو اس وجہ سے مضحکہ انگیز ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و مضحکہ خیال کی ترجمان ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا بین نکتہ حکماء کی تفتیش سے اس قدر مامون رہا ہے۔ اکثر لوگ انسان کو "حیوانِ ضاحک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوانِ ضاحک" بلکہ "حیوانِ مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز کبھی ہنسی کا باعث ہوتی ہے۔ تو یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ عنصرِ مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہوتا ہے یا صنعتِ انسانی کا کوئی نقش اور یا پھر مضحک وہ کام ہوتا ہے۔ جو کوئی انسان اس چیز سے لے رہا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کر دینا ضروری ہے یہ ہے اکثر دفعہ ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی جب تک روحِ انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایک ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں۔ یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر ہم اتنی دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چند ایسے اشخاص کی جماعت میں، جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ وہ جذبات کا خزینہ ہوتا ہے) معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت عد درجہ کی حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہلِ دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچتی رہتی ہے۔) ایسے اشخاص نہ تو ہنسی سے آشنا ہیں نہ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات وافعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دل بستگی پیدا کریں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں اوروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں، مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظروں میں اس قدر وقیع و اہم بن جائے گی۔ گویا کسی طلسم نے اشیا کی حقیقت کو یک لخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی۔ جو آپ کو ہنسی سے محروم کر دے گی اب اگر آپ کشمکشِ حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پر ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں، کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارہ رقص مضحک ہو جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی فعلِ انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پر نظر ڈالیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً متانت سے گرے ہوئے نظر آئیں گے۔ ثابت ہوا اگر کسی مضحک چیز کے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدامِ جذبات ضروری ہے، تضحیک کا تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغ سے دور افتادہ نہ ہو۔ اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے رفیق محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج، ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے۔ یہ صاف و صریح، نپی تلی اور شدہ آواز نہیں۔ خود اس آواز

کی نوعیت میں گونجتے رہنے کی خواہش مضمر معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایک دھماکے کی طرح یکایک جیسے زور سے پھٹ کر شروع ہوتی ہے اور ایک تسلسل رزاں کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ گویا پہاڑوں میں بادل گرج رہے ہیں لیکن باایں ہمہ نہیں ہو سکتا کہ یہ گرج بلا غایت و انتہا گونجتی رہے اس کے اشاعع کا حلقہ جس قدر بھی وسیع ہو آخر حلقہ ہے اور اس لئے محدود ہے یعنی ہماری ہنسی ہمیشہ ایک جماعت یا ایک حلقے تک محدود ہوتی ہے۔ آپ کو ریل کے سفر میں کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ کہ آپ کے بعض ہمراہی مسافر آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ جو ان کے لئے یقیناً ظرافت آمیز ہیں۔ کیونکہ وہ دل کھول کر ہنستے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں۔ آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی وعظ فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ سب سامعین زار و قطار رو رہے تھے سوائے ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی۔ تو اس نے جواب میں کہا "میں اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں۔" رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنستا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ہجوم کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت کی باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو وہ ظرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے جنہوں نے اس نکتے کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت ایک نہایت ہی حقیر مشغلے سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی کی باقی تگ و دو سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت کی یوں توضیح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے" یا "ظرافت ایک محسوس بے ہودگی کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات تو ایسے ہیں۔ کہ ان کو دیکھتے یا سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیا بھی دنیا میں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھ کر دیکھنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مفصلہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:—

(۱) سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

(۲) ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

(۳) ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔

فصل۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا تو وہ گرا نہیں بلکہ جان بوجھ کر یوں زمین پر بیٹھ گیا ہے۔ تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا اس کا ایک غیر ارادی فعل تھا۔ یعنی باعث خندہ اس شخص کے انداز کا یوں یکایک متغیر ہو جانا نہیں بلکہ اس تغیر میں عدم ارادہ کے عنصر کا پایا جانا ہے۔ اس شخص کو چاہئے

تھا کہ جس پتھر سے اسے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے ہٹ کر چلتا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور چونکہ اس کے بدن میں یک لخت کترا جانے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں غرق تھا (یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا) اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور خمیدگی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے پھر حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس نے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی آگے کو چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے حالانکہ متغیر حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے، جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور بچا تلا ہے۔ اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سر مو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ قرینے اور ترتیب سے رکھی رہتی ہیں۔ اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے۔ کوئی شریر لڑکا آ کر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے۔ اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آ جاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ "مخزن" کا فائل نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے۔ اب اگر خلاف معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا۔ یا منحرف کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بہ خط مستقیم چلتا رہا۔ تو گویا جو شخص، اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے۔ جو دوڑنے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک، دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ہم ایک انسان سے اس بات کی توقع کرتے ہیں۔ کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مڑ تڑ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو گرنے کا سامان سوءِ اتفاق نے مہیا کیا تھا۔ اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے۔ ان دو وجوہات سے ان دو شخصیتوں میں فوراً کترا جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحک نتیجہ رونما ہوا اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے شہود کے لئے کئی مواقع نکال لے تو سامان تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے، جس کا دماغ اپنے گذشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے۔ اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو صبح اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر ٹھہر جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور خمیدگی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے۔ کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بلند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامان تضحیک (اور اس کی علت ظہور) خود اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آ جائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مضحک ہونا بعض اوقات دیگر وجوہ سے اور بھی زیادہ قوت پکڑتا ہے مثلاً اگر آپ کو کسی شخص کے خیالات کے یوں غیر حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی وارفتگی گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہوا ور آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ کیسے بڑھتی رہتی ہے اور کس وجوہ سے ترقی کر رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ، عشق کی وحشت، صحرا نوردی، خود فراموشی، بےخودی اور دیگر کیفیات میں مصروف رہتا ہے۔ حتّٰے کہ قیس اور فرہاد کا کیریکٹر اسے اتنا جاذب و دل کش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے اب وہ اپنے آپ کو بالکل قیس سمجھتا ہے۔ اور اس کے خیالات اور ارادے اس کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگر چندے اس کی یہی حالت رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا۔ تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے اور وہ اسی خواب میں ادھر ادھر چل پھر رہا ہے اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ایسے شخص میں سامان تضحیک کس قدر موثر و عمیق ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پر چھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ مدحیہ گانے لگ جاتا ہے۔ ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات زائد ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے بے خبر ہے۔ وہاں متخیلات سے باخبر بھی ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بےکار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غیر حاضر ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں ؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بےخبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عرف عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوئے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت درخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کی بےخبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے سوانح اور ان کے حادثات علت و معلول کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں دے سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس لئے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب ذرا اس سے آگے چلئے اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بداخلاقیاں دو قسم کی ہیں۔ بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لئے ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں درد انگیز اور ملال آمیز ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر سوار ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسمار سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکٹر کا جزو بدن بن

جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اس کے ہمارے پیشِ نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو بھر دیا جاتا ہے اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسمِ معرفہ ہوتا ہے۔ مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی چسپیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت اور ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ وہ بہ ذاتِ خود ایک کیریکٹر بن جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا زیادہ وہ مضحک بھی ہوتا ہے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ کیا ہے اس میں کونسی برائیاں ہیں۔ اور ان برائیوں کو ہم کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی اصلاح یا تغیر نہ پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب تقائص مضحکہ کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا۔ وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی یا کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا ہے لوگوں کی ہنسی مصلحِ اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گر پڑتا ہے۔ اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوئی ہے۔ کش مکشِ حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیدار رہے اور آگاہی کے ساتھ واقعاتِ حاضرہ کو پیشِ نظر رکھے اور ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی میں بے جوڑ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ اور انواع و اقسام کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک انگشت نمائی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافتِ قلبی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تحفظ نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوقِ فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

یہ مضمون آج سے چھتیس سال قبل کا ہے۔ اس وقت فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگسان کا فلسفہ بے انتہا مقبول تھا۔ "عالمِ خواب"۔ "دماغ و قوت" اور خندہ کے متعلق اس کے نظریات دنیائے مغرب سے خراجِ تحسین وصول کر رہے تھے۔ پطرس نے اس کے فلسفہ خندہ سے اردو کو پہلی مرتبہ روشناس کرایا یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ قابل مضمون نگار نے اس کے فلسفہ میں ڈوب کر انگریزی مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسبِ حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے

(ادارہ)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر کس قدر قابلِ مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب سرحد پار سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر زیادہ نزاکت پکڑتا جا رہا تھا کہ بمشکل توجہ کسی دوسری طرف مبذول کی جا سکتی تھی اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گذر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا نہ ہمارے نظامِ تعلیم اور طریقِ امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا، اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے میدانِ عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائگاں کھو دیا تو وہ بر خود غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرما گرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی، اوائل سال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرینِ تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت احساسِ فخر و اعتماد پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یا دیر میں ہمیں اس پونجی کو ضرور استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی استعمال کی کئی صورتیں ہیں۔ پونجی فضول خرچ کر کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر پونجی کو کسی سودمند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں تعلیمی آزادی کا مطلب یہ ہے نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم بلکہ یوں کہیے مکمل نصابِ تعلیم میں حسبِ ضرورت مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی۔ سات کروڑ بندگانِ خدا کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لئے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے ماہرینِ تعلیم خواہ وزارتوں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تاحال برآمد نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریقِ تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے باتفاقِ آراء مذموم قرار دیا جاتا رہا ہے موجودہ نظامِ تعلیم سے بے اطمینانی و بددلی کے احساسات ہر جگہ موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف جگہوں میں مختلف تھے یہی وجہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی لوگوں نے فوراً اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظامِ تعلیم کے

نقائص سے آزاد ہونے کی مساعی شروع کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل و مکمل فہرست تیار کرنا تو یقیناً بے حد دشوار ہے تین باتوں پر تو غالباً سب متفق ہوں گے۔

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ـــــــ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ نہ صرف قومی بلکہ خالص علمی نقطۂ نگاہ سے بھی بے حد قابلِ اعتراض ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ یہ طالب علم کی ذہنی نشو و نما کو محدود بھی کر دیتا ہے یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور اس اقدام کا جواز بجز ہمارے نظام کے بانی کی حماقت خالص اور غرورِ بے جا کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی "ناقومیت" ـــــــ اس "ناقومیت" کے مختلف مظاہر ہیں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی قومی زبانیں کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے نفول و بے سود ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لایعنی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے ہماری تعلیم کی "محدودیت" ـــــــ پڑھے لکھے لڑکوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم ہے اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب فی صد تو اس سے بھی کہیں گیا گزرا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے ابھی تک ہم کسی آخری فیصلے یا قطعی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض جدید رجحانات اور نئے میلانات منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ بے سود نہ ہوگا مثلاً زبانوں کے مسئلہ پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ صدر نے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ:۔

"پاکستان میں صوبائی زبانوں کو نشو و نما کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہونچانے ہوں گے چنانچہ ہمیں ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے جن سے وہ تہذیب و تمدن جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص ہے اس زبان کے توسط سے ترویج و ترقی پا سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدانیت و یگانگت کو صدمہ نہ پہونچنے پائے۔ ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مراسلت و مکاتیب و اظہار و استظہار کا کام لینے کے لئے ایک خاص زبان کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابلِ غور ہیں، اردو نہایت آسانی اور عمدگی سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اردو کا تعلق فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی ہے اردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ موجود ہے ان سب وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے، جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں ہے لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت و مکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے صفِ اوّل میں جگہ دینا پڑے گی گذشتہ تیس چالیس برس سے فرانسیسی کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان ہوتی جا رہی ہے علاوہ ازیں محض ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے قطع نظر

ہمیں اس قدر جلد ایک ایسی زبان ہاتھ سے نہیں کھو دینی چاہیئے جو نہایت آسانی سے ہمیں مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس کراتی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہٰذا ان زبانوں کے مطالعے کو بھی ہمارے نظامِ تعلیم میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دو مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں ہماری قیادت کا کافی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں ایک پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا تا حال باقی ہے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو نصف درجن زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے "اردو" کو خاص اہمیت دی جائے گی کلچری یگانگت و وحدانیت کی خاطر صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا موقعہ دیا جائے گا تنوع کی خاطر انگریزی کو "صفِ اول" میں جگہ دی جائے گی منفعت کی خاطر فارسی اور عربی کو "ممتاز جگہ" دی جائے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے سبب اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیلِ حیاتِ ملی کے خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حقِ انتخاب یا کم از کم حقِ ترجیح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہوا ہے لیکن ابھی تک کہیں سے نصِ قطعی کے صدور کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اردو کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن یہ بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا مثلاً اس مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں، یہ تو ہوئیں کمیٹی کی سفارشیں، جن میں پنجابی ماہرینِ تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ نیچے درُں نیچے بروں کی سی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگو فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو اسے صدارتی خطبے میں دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے اس کی تعین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعۂ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو اکثر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیرِ قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان تو نہ کرے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لئے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لئے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتا، سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعوےٰ نہ کر دے کہ قومی یگانگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیئے۔

مغربی پنجاب تو بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کو وطن سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی محبوب زبان قرار دیا ہے ممکن ہے جب سکھوں کی یاد محو ہو جائے تو پنجابی کا گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہٰذا یہاں مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے عہدِ ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی ترویج و ترقی میں جن لوگوں

نے روڑے اٹکائے وہ غیر مسلم نہیں بلکہ وہ قدامت پرست تھے جن کے نزدیک عروج و زوال عربی و فارسی کے مترادف تھا انہوں نے اپنے علاوہ چند اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بھی خیال خام راسخ کر دیا کہ چونکہ اردو اور ہندی دونوں "جدید ہندوستانی زبانیں" ہیں لہٰذا اردو کی ترویج و ترقی کے سارے منصوبے دشمن کی چالیں ہیں اور ان چالوں کو ضرور ناکام بنانا چاہیے خواہ اس میں اپنا گھر ہی کیوں نہ لٹ جائے لیکن اب اس قسم کے خیالات کا وجود نہیں چند ہی ماہ کے عرصہ میں پنجاب سکول بورڈ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دو تین سال ہی کے عرصہ میں تمام اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہو جائے گی اور یونیورسٹی نے بھی انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے میں اردو کو دیگر انتخابی مضامین کے برابر اہمیت دی ہے۔

اردو کی حقیقی ترقی کا کام واقعی محنت طلب ہے یونیورسٹی میں تمام مضامین کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اردو میں ان مضامین پر کس قدر جلد کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اور کتابوں سے مراد محض نصاب کی کتابیں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و تحقیقی مواد جو طالب علم اور استاد دونوں کے ذہنی آفاق کے لئے وسعت اور پس منظر کے لئے پختگی کا سامان بہم کرے یہ کام اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ بجز حکومت کے شاید اور کوئی ادارہ اتنا بڑا کارخانہ قائم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا لیکن تاحال اس قسم کے اقدام کی کوئی علامتیں ظاہر نہیں ہو رہیں۔

ہماری تعلیم کو ہمارے قومی جذبات و تصورات ہمارے ملی مقاصد اور نصب العین کے مطابق بنانے کے لئے فکری تشکیل نو کی ضرورت ہے، چنانچہ اس سلسلے میں کراچی کانفرنس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی طرز فکر پر پڑنی چاہیے۔ خصوصاً عالمگیر اخوت، رواداری اور عدل و انصاف کے اوصاف حسنہ پر زیادہ زور دیا جائے۔

عرف عام میں ہم اسے "آزادانہ" (لبرل) اعلان کہہ سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بالاتفاق آراء منظور کر لیا گیا تھا درحقیقت اس قرارداد نے بہت سے ماہرین تعلیم میں تشنگی باقی رہنے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن اوصاف پر یہاں زور دیا گیا ہے وہ اسلام سے مختص نہیں کوئی مذہب بھی ان کے اپنے ہونے کا دعوے کر سکتا ہے ان کا نظریہ یہ تھا کہ اوصاف و خصائل کی جگہ "عقائد" کا لفظ استعمال کیا جائے اور عالمگیر اخوت، رواداری اور عدل کی جگہ توحید، رسالت و آخرت کر دی جائے کیوں کہ ان کے نزدیک موخر الذکر عقائد ہی اسلام کا طرۂ امتیاز تھے اس سے اجمالاً یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سے دو طریق فکر ہماری تعلیم پر غلبہ پانے کے لئے برسر پیکار ہیں اور ابھی تک "آفاقیت" اور قومیت کا مجادلہ ختم نہیں ہوا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں رنگی جائے گی کیونکہ طلبا اور اساتذہ، منتظمین، مصنفین، ممتحنین میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی لیکن سوال محض تشکیل نو کی ماہیت اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا پورا موقعہ دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کش مکش مختلف مظاہر میں عیاں ہو جائے گی اور اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہر کمیٹی سب کمیٹی پینل یا بورڈ جو موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے وہ اس ذہنی کش مکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے چلئے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم میں قومی رنگ ہونا چاہئے لیکن "قومیت" کے مفہوم میں اختلافات ممکن ہیں اور یہ اختلافات جگہ جگہ اپنا سر اٹھا دیتے ہیں مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی ہے کیونکہ "قومی" کا مطلب "پاکستانی" بھی ہو سکتا ہے "مسلم" بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین تعلیم نے تو نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو مدرسوں کے ابتدائی مدارج میں ہی لازمی قرار دے دیا جائے پنجاب کی ایک سلیبس کمیٹی میں یہ احساس قوی تھا کہ مڈل سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی مضامین ہونا چاہئے (غالباً اردو اور انگریزی بھی) لیکن اس سے چشم پوشی اختیار کر لی گئی تھی۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ عربی اور فارسی میں سے ایک کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے۔ لیکن اس تجویز کو اس خدشہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر طلبا کو حق انتخاب دیا گیا تو وہ زیادہ تر عربی کی بجائے فارسی ہی لیں گے اس سے کم از کم والدین اور نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے

دوسری کش مکش ادبی اور افادی مضامین کے بارے میں ہے افادیت کے حامی ادبی مطالعہ کو محض تعیش ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی توجیہہ و تاویل پیش کرتے ہیں ان دو الجھنوں کے علاوہ دو اور بڑی بڑی الجھنیں ہیں۔ (ii) موعظ بر مقابلہ استاف ——— فارسی صرف گلستان کے ذریعے پڑھائی جا سکتی ہے۔ فارسی "کیمیائے سعادت" پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ (iii) مذہبی طرزِ فکر بر مقابلہ عقلی طریقِ فکر ——— آیا تاریخ فلسفہ کو انسانی فکر و ذہن کے ارتقا کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلمات کفر کے مجموعے کی حیثیت سے۔

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف زاہدان خشک کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قوتوں اور تحریکوں کا حقیقی یا غیر حقیقی چیلنج نظر آتا ہے۔ اس امر پر زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکارِ جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ "اسلامی" بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا "ہمارے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے؟ سوال ہمیشہ یہ لیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک نقطے میں پرونا ہوگا ورنہ ہمارا نظامِ تعلیم ہماری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سرسید کے زمانے میں بھی اس قسم کے سوالات کئے گئے تھے اور اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سرسید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دھرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو قوت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے اس میں دیر لگے گی یا زبردست جنگ کے ذریعہ اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ سمجھوتہ اور اشتراک نہیں ہے بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا، اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں اگر ہم ہر مختلف زاویہ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلبا رتو ایکسترادت رہے ہماری تعلیم بجائے خود اس بارگراں کی شاید متحمل نہ ہو سکے۔ ہر تجویز کو اس شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیئے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طریق کے مطابق چلا ہوا اب تک انگریزی، اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس، ان سب کو لازمی مضامین قرار دیئے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا مواد بہت کم ہوگا بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہوگا اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہوگی یا بالکل فضول ہوگی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی۔ لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشرتی اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے اور اس کی کلچری وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا بالآخر اثر یہ ہوگا کہ اس مضمون کی تعلیم کا معیار گر جائے گا ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں منصور و ہارون و مامون کے بغداد کے مقابلے کا بغداد علمی از سرِ نو تیار کرنا پڑے گا لہٰذا ہمیں زمانہ حال کو زمانۂ تراجم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

اہلِ الوطن سے پہلے ہم اس سے مغربی سائنس اور کلچر کے تمام راز ہائے سربستہ اخذ کر چکے ہوں لیکن بظاہر علامات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اپنے کلچر اور زبانوں کے تحفظ و بقا کے جوش و خروش میں اس انگریزی زبان سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لیں گے جو ہمارے لئے منفعت بخش ہو سکتی ہے۔

ان خطرات، مشکلات اور الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک واقعاتی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً سائنٹیفک بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ٹیکنالاجیکل تربیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی اپچ ہے زندہ رہنے کی اپچ اس وقت دنیا کے کونے کونے سے آلات جنگ کی جھنکار سنائی دیتی ہے حتیٰ کہ اس نوزائیدہ مملکت کو بھی اپنے حالات کو صنعتی اور جنگی نقطۂ نگاہ سے جانچنا پڑتا ہے یقین مذہب کی روح بے شک سائنس کی جان ہے لیکن زندہ رہنے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی اپچ اس شدید حد تک قوی ہے کہ بڑے سے بڑا قدامت پرست مُلّا بھی سائنس کو محض چند ظاہری شرائط کا پابند بنا کر منظور کر لے گا۔ بہ ہے سائنس دانوں، ٹیکنیکل ماہروں اور تجربہ گاہوں کے خاص ٹیکنیکل ساز و سامان کی مانگ کو بلا رد و کد فوقیت اور برتری دی جاتی ہے اور تعلیمی مباحث میں سائنس ایک ایسا طلسماتی لفظ ہے جس سے اختلاف آرا پر مہر لگ جاتی ہے غالباً یہی وہ نکتۂ اتفاق ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کو دور کرنے کا باعث بن سکتا ہے ہمیں سائنس کی زیادتیوں کا پتہ ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سائنس کا نظریۂ حقیقت و صداقت، بہت محدود اور تنگ ہے ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ سائنس حسن و مسرت کے سے لطائف کو سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے اور ہمیں اس کے "غیر اخلاقی" (اخلاقیات سے بے نیاز) نقطۂ نظر کا بھی علم ہے لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اگر سائنس ہمیں اپنی الجھنوں اور پریشانیوں سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے تو اس کی راہ چلنا اس سے بدتر راہ چلنے سے بہتر ہے۔

اختتام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالغاں کے بارے میں بھی دو چار کلمے مناسب رہیں گے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تعلیم کی موجودہ رفتار جاری رہی تو ملک بھر سے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال درکار ہوں گے اگر ہم فوق الطبیعیاتی کوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لے آئیں یعنی یہ کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں اور ہر گلی کے کونے کو اسکول بنا دیں تو ڈیڑھ سو سال کا کام ربع صدی میں طے پا سکتا ہے افسوس ہے کہ اس محاذ پر کوئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ برطانوی راج پر سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدے کے لئے پڑھایا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہو گا اگر ہمارے اربابِ اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھاتے رہیں۔

ایڈیٹنگ کا فن

اگر خوش قسمتی سے مجھے دس حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھنا گوارا کریں تو ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور اظہارِ نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر لیتے ہیں لیکن اقبالِ جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں:۔

"شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی رونلڈ کالمین کے فلموں کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم ...."

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان اصحاب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے سر الزام تھوپنے میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ مظہر اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے؟ مصور کے کمالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر وسعت ہے آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصاویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے۔ جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھلائے جاتے ہیں۔ تو انہیں فلم کہا جاتا ہے "شاٹ" فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا "شاٹ" ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم نامے کا مرتب کرنا ہے۔ میں یہ تو بہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نامہ کتنے مرحلوں کے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم نامے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روئداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شاٹ کا حال پورے تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ قلم بند کر لئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے۔ ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع

کیا ہوگا۔

آیا وہ یکبارگی نمودار ہوگا۔ اور یکبارگی غائب ہوجائے گا (یا سینما کی اصطلاحی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ اسے ابتدا میں اور خاتمہ پر کاٹا جائے گا) یا وہ ابتدا میں بتدریج نمودار ہوگا اور خاتمہ پر بتدریج غائب ہوجائے گا۔ اور آیا تصویر کے نمودار ہونے اور غائب ہونے کا یہ عمل آہستہ آہستہ ہوگا یا بسرعت، اور اگر یہ دونوں صورتیں نہیں تو کیا وہ پہلے شاٹ میں سے رفتہ رفتہ نمودار ہو کر اگلے شاٹ میں تحلیل ہوجائے گا جسے اصطلاح میں عملِ تحلیل کہتے ہیں اور آیا عملِ تحلیل آہستہ آہستہ ہوگا یا تیزی سے۔ پھر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرہ ایک ہی جگہ رہے گا یا آگے بڑھ کر "معمول" کے قریب ہوجائے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا۔ اور یا گھوم کر پورے منظر کی تصویر لے گا۔

"فلم نامہ" میں یہ بھی بتایا جائے گا۔ کہ جس چیز کا شاٹ لیا جا رہا ہے۔ کیمرہ اس کے سامنے اتنی ہی بلندی پر ہوگا جتنی بلندی پر انسان کی آنکھ ہوتی ہے یا کسی اور "نقطہ" یا زاویے سے شاٹ لیا جائے گا۔ کیمرہ اس سے کس قدر فاصلے پر ہوگا شاٹ قریبی ہوگا یا وسطی یا بعیدی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ کے متعلق تفصیلی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامہ میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں پردے پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لئے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز لاہور سے ہوتا ہے اور خاتمہ بمبئی میں۔ اگر ضرورت پڑے تو آپ بمبئی کے تمام سین پہلے لے لیں گے۔ اور لاہور کے بعد میں۔ اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیں گے اور اگر کیفیت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا سٹوڈیو میں مصنوعی طور پر تیار کردہ سے تعلق رکھتا ہو اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو اور مناظر کے مقامات متواتر اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ اکثر فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے اسے پہلے لیا جائے، اور جو بعد میں ہے اسے بعد میں "فلم بند" کیا جائے۔ اس کے بعد آپ گھر آ کر تمام عنوانات کے فوٹو لے لیں گے۔ جب تمام واقعات اور عنوانات کا عکس لے لیا جائے گا تو سلولائڈ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک، ایک شاٹ الگ کر لیا جائے گا پھر ہر شاٹ میں کسی قدر کانٹ چھانٹ ہوگی (ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد فلم لے لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے) اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے۔ اور فلم کی تکمیل ہوجائے گی۔ فلم کی قطع و برید اور از سرِ نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں۔ فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک "صوری" فن ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمر لیکن اس کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا کنائۃً حرکت کا مفہوم ادا کر دیا۔ لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں۔ وہ "حرکت" کو بین اور واضح طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی۔ جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت، اور اس کا اتار چڑھاؤ، اسکا تھم جانا یا روک دیا جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے گویا فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور

یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتیرے تصویر دار پوسٹ کارڈوں کے البم تو دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں ڈھل جائے اور اس متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے۔ یعنی نوٹ سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتائے کہ کیوں کر ہوا؟ اس کے اظہار پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صورت اور کیفیت اس کی مالہٗ و ما علیہ سمجھ میں نہ آ جائے لطف نہیں آتا۔

ناولسٹ الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ ڈرامہ نسٹ مکالمے سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ فلم نامہ لکھنے کے لئے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی مرئی اشکال ہوں جو بہ آسانی ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی میں جو فلم کے لئے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے :۔

"زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا" یہ جملہ بحیثیت فقرے کے بامعنی اور اظہارِ مطلب پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن اسے بعینہٖ فلم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ناولسٹ کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے یہ تو اسی صورت میں فلم کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ اکثر ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر "اکثر" کا مفہوم پورا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد مسرفانہ ہے ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی۔ کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ زید اس مکان میں نووارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

"اے وومن آف پیرس" نامی فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے ہیں اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا نوکروں کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر سیکسوفون بجاتا رہتا ہے، پھر اسے خیال آتا ہے کہ میرے پاس رومال نہیں وہ بغیر کسی پس و پیش کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر اور نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول کر ایک رومال نکال لیتا ہے۔

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ ابتدا ہی سے کہانی مرتب کی جائے۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے۔ میں یہاں بعض اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں۔ جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی گرونڈ پوٹمکن۔ دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری۔ اے وومن آف پیرس۔ وانڈرنگ شیڈوز دی سالویشن ہنٹرز۔ دا لیول۔ دی پلگرم۔ برلن اور دی میزیج سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مختار نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "ٹس" کو لیجئے، فلم میں خیر ایک تو یہ جاہلانہ تصرف کیا گیا ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے عامیانہ نظر آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لئے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت نہ سہی اتنا تو ضروری ہے

کہ فلم کار تصاویر کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی مہارت ہارڈی کو الفاظ کے فن میں تھی لیکن بدقسمتی سے وہ بے چارہ اس مہارت اور قابلیت سے محروم تھا۔ اس فلم کے بہترین حصے جن میں فلم کار نے بزعم خود بڑا کمال صرف کیا ہے۔ دیکھئے تو زیادہ سے زیادہ آپ اسے ہارڈی کی کتاب کا بھدا سا مصور ایڈیشن کہہ دیجئے گا۔ اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم "پیٹرا" سے کیجئے یہ بھی گو وہ بھی ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو نکتہ میں پیش کر رہا ہوں اسی کے اعتبار سے بے حد کامیاب اور مختلف حیثیات سے جامع ثابت ہوا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کا ڈائریکٹر ارنسٹ لوبش جیسا شخص ہے جس کا شمار کاملین فن میں کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں پنہاں ہے۔ میں ذیل میں ناول کے ایک ٹکڑے کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"میرا ایک فوجی افسر تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کا ایک ہاتھ سلام کے لیے ٹوپی پر جا پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی بے حس و حرکت مورت کھڑی ہے۔ زار کے پیش خدمت کا دھڑ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور سارا جسم زرد ہو گیا تھا اس کے کولہوں کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اس کے کندھے زانوؤں کے ساتھ پیوستہ ہو گئے تھے پیشانی پر رگیں ابھری ہوئی تھیں اور سر سینے کے ساتھ جا لگا تھا۔

زار دروازے میں کھڑا تھا آنکھوں کے پپوٹے پھڑک رہے تھے۔ برآمدے میں جس قدر لوگ تھے وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نظریں ان سے گذر کر برآمدے کے بیرونی سرے تک جا پہنچی تھیں۔ زار اسی کیفیت میں غرق کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر بدستور دہی محویت چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دہنا کندھا بائیں کندھے سے اونچا معلوم ہوتا تھا اور بار بار پھڑکتا تھا۔ وہ ایک سن رسیدہ شاف کپتان کے پاس سے گذرا جو بیمار کی پلٹن اور رسالے کے بھاری بھرکم بھوٹ سے ٹھوکر ماری۔ اپنی غلطی محسوس کر کے فوجی قاعدے کے مطابق سیدھا کھڑا ہو گیا۔ زار نے سر اٹھایا اور کپتان کے چہرے پر جو ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا نظریں گاڑ دیں۔ اور بلند آواز میں پکارا۔

"مراولیف"

ایڈجوٹنٹ تین قدم آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ زار نے شاف کپتان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے از راہ تنبیہ پیدل فوج کی رجمنٹ متعینہ مولیبٹ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

مراولیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی۔ زار کی مطالعہ گاہ کے دروازے میں کونٹ پاہلن کا مضبوط جسم اور خشونت آمیز چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کونٹ نے نیم باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی نگاہوں میں غصہ کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور اس کے ابرو کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔"

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت رکھنے والا کوئی ناول لکھا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہے جس میں معنی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر جب فلم نگار کا قلم ان تصویروں میں رنگ بھرتا ہے تو اور ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے سنو! میں تمہیں ایک راز بتاتا ہوں۔ میرا باپ بھی قتل کیا گیا تھا اور غالباً میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کر دیا جائے گا۔

اب فلم کار کی جدت طرازی دیکھئے کہ زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلوانے کی بجائے اس کے باپ دادا کی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت موزوں طریق پر ہماری نظروں سے گذرتی ہے زار آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی شبیہہ ہے ٹھہر جاتا ہے یہ عجیب پر حسرت منظر ہے زار کی آنکھوں میں التجا اور استفہام کی ملی جلی کیفیت نظر آتی ہے گویا یہ کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔

ایک جگہ ناولسٹ لکھتا ہے کہ "زار نے گھونسا تان کر کہا۔ میں زار ہوں اور زار رہوں گا۔" فلم نگار نے یہاں بھی اپنی معنی آفریں قلم کے عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ زار بھاگ کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچتا ہے قاتل پیچھے پیچھے ہیں زار بھاگ کر چبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر داہنا ہاتھ بلند کر کے کہتا ہے۔

"میں زار ہوں اور زار رہوں گا۔"

فلم نگار کے قلم کی ہلکی سی جنبش نے اس منظر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ جب ناول کے الفاظ کو جو خود تصاویر سے کم نہ تھے یوں واضح تر کر دیا جائے تو ایسی فلم کی کامیابی پر کسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم جن مرئی اشکال سے بنتا ہے وہ بہ آسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہیں ایک تصویر پردے پر جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے اور یہ رنگ بدلنے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں۔ ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہر خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پورے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور وہی تصاویر منتخب کی جائیں جو سب سے زیادہ واضح ہوں۔ اور ہمارے مفہوم ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے۔ گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ غائر نگاہ سے کرتا ہے اور فلمکار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے سہارا دینے کے لئے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے۔ تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مطالعہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ بلندی سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے۔ فلمکار تماشائی کی توجہ پر پوری طرح تصرف کر لیتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا اور یاد رکھتا ہے جنہیں فلم ڈائریکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی مقام پر فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہلیت رکھتا ہے۔ فلم کار کیمرے کی مدد سے ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کر کے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لئے کوئی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ امتداد زمانہ کو واضح کرنے کے لئے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کر دے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر رکھے۔

اب دوسری طرف فلمکار کو دیکھئے جو اس بعد مکانی کو بڑی آسانی سے مٹا دیتا ہے۔ وہ ایک شاٹ اس وقت لیتا ہے جب کیریکٹر نقطہ الف پر ہوتا ہے۔ اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ ب پر پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دئے جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وقت کو ایک دھارا سمجھئے۔ جس کے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلمکار کی ہنرمندی غیر اہم لمحوں کو نظر انداز کرکے بلکہ محو کرکے ایک نیا زمان پیدا کر دیتی ہے جس میں محض اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو ایک جگہ وقت کا دھارا تھم جائے اور دوسری جگہ بہتا دکھائی دے اور دو مختلف مقامات میں بیک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور تو اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا سیل دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے۔ اور دو دھارے پہلو بہ پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلمکار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب و غرائب دکھایا کرتا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزا کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کلیہاف نام نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کئے تھے :۔

۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دہنی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔

۳۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔

۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت فراخ ہیں۔ تو وہ سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لئے گئے تھے۔ اور پھر انہیں متذکرہ صدر ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں۔ مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کرکے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سپید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا در حقیقت یہ سپید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سپید تھا اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں) اب دیکھئے کہ سلولائڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائش سراب ہے، اور در حقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے "تخلیقی جغرافیہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلا فلم کار ہے جس نے فلمی مکان و زمان کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ گو اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دہلی کے قطب مینار سے کودتا ہے اور دریائے راوی میں آگرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہوگا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ اور ان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ فلم کا نقطۂ نگاہ ایک نہیں کئی ہیں وہ جس زاویہ سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے، جس نقطہ سے چاہے مشاہدہ کرے۔ اور ساری جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ نیا زمان و زمان پیدا کرے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ڈائریکٹر کی خواہش کے سوا کسی کا تابع نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا لامتناہی سلسلہ پڑا ہے اسے اختیار ہے کہ زمان و مکان کے دامن میں جتنے رنگارنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے اور اک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "اے وومن آف پیرس" کے ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی نگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی، وہ آپ کو یاد ہو گی۔ اور ابھی آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہو گا جس نے دراز سے رومال نکالا۔ تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہارِ تعجب نہ کرنا، غور کیجئے ایک کتنا بلیغ اندازِ بیان ہے۔ حسنِ انتخاب کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا نزاکتیں بھری جا سکتی ہیں اور کیا کیا معنی پنہاں کئے جا سکتے ہیں۔ "ان ٹالرنس" میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گرفتھ تھا ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی علت میں ماخوذ تھا۔ وہ بیچاری اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمے کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ یہاں صرف اس کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ یا ہاتھ ہیں وہ بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ تشویش و فکر کے جتنے مظاہرے ہو سکتے تھے ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کر لئے ہیں جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں۔

ایک اور مثال سنیئے۔ پچھلی گرمیوں میں "لاسٹ پرفارمنس" نام ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا۔ پال فیجوس ڈائریکٹر تھا اور کونراڈ ویڈٹ ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ کہانی کا موضوع تو کچھ ایسا شاندار نہ تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم جس درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے تھے ان کے لحاظ سے بہت قابلِ تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں اور صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے۔ ایک دن مداری کی نیت بدل جاتی ہے اور وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں سچ مچ قتل کر ڈالے۔ اب غور کیجئے۔ کھیل دیکھنے والوں کو ارادہ قتل سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ تماشائی اس کے لئے پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، اور بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے۔ مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی، کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب حیص بیص اور گومگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹہرا سا بن گیا ہے کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تاکہ مداری کا سر تلوار کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے تلواروں کے دستے بوجھل ہیں اس لئے ان میں ایک لرزش سی پیدا ہو رہی ہے اور پھل چمک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہولناک چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی۔ جو "آرکسٹرا" کے گمبھیر لرزاں کارڈ سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ایک اور فلم "بیٹل شپ پوٹمکن" میں جس کا ڈائریکٹر آئزن سٹائن تھا۔ ایک منظر دکھایا گیا تھا کہ باغی اپنے جہاز سے اوڈیسہ تھیٹر پر گولہ باری کرتے ہیں۔ اس منظر کے پہلے شاٹ میں توپ کو فائر کرتے دکھایا گیا ہے۔ دوسرے شاٹ میں دکھایا گیا ہے کہ آتش گیر مادہ پھٹ گیا ہے۔ بہت بڑا دھماکہ ہوا جس سے تھیٹر کا پھاٹک کانپ اٹھا ہے اس کے بعد تین شاٹ آتے ہیں ایک میں تو ایک پتھر کا شیر دکھایا گیا ہے جو پڑا سو رہا ہے اور دوسرے شاٹ میں شیر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور تیسرے میں شیر کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ تینوں شاٹ ملا دیئے گئے ہیں۔ تو یہ نظر آیا کہ پتھر کا شیر یک بیک اٹھ کھڑا ہو کر چیخنے لگتا ہے ایک نقاد کا خیال ہے کہ اس منظر سے کچھ اثر ہوا کہ جو بگل پر تین چڑھتے ہوئے "سر بجلنے" سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہم یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ جنگی جہاز کا منظر اوڈیسہ میں لیا گیا تھا پتھر کے شیر کی تصویریں کریمیا میں "فلم بند" کی گئیں تھیں اور پھاٹک کی تصویر ماسکو میں۔ یہ گویا "تخلیقی جغرافیہ" کی ایک اور مثال ہے۔

اب ایک اور مثال سنیئے۔ یہ موضوع کے حسن انتخاب کی مثال نہیں۔ بلکہ اس سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس زاویے سے شاٹ لیا جاتا ہے اس کے انتخاب میں کتنی احتیاط برتی جاتی ہے "دی وائل" جو ہندوستان میں "ویرائٹی" کے نام سے دکھایا گیا ایک ایسا فلم تھا جس کے لئے "ایمل جننگز" ایکٹر اور دوپان فلساز مستحق تحسین ہیں، تماشائیوں کو ہال کی چھت کے وسط میں جو بہت بلند ہے بازی گر جھولتے نظر آتے ہیں ادھر بازی گروں کو کبھی چھت میں برقی روشنی کے قمقمے دیواریں اور تماشائی نظر آتے ہیں۔ یہ سب جلوے ان کی نگاہوں میں اس طرح آتے ہیں گویا نظریں سمندر کی لہروں کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی ہیں۔ یہ مختلف مناظر یکے بعد دیگرے نہایت سرعت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ تو سر گھومنے لگتا ہے اگر کسی دوسرے زاویہ سے تصویر لی جاتی تو یہ اثر پیدا کرنا ناممکن تھا۔

اوپر کی مثالوں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصویروں کے انتخاب میں کتنا غور و فکر کیا گیا ہو گا۔ اور پھر ان سے دیکھنے والوں پر جو اثر ہوا۔ اسے پیش نظر رکھئے۔ تو فلم کار کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ کیمرے کی کار فرمائیاں نہیں، بلکہ فلم کار کے دماغ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ کیمرہ دیکھتا بھی ہے اور دکھا بھی سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا تو فلم کار ہی کا کام ہے۔ کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے مناظر لینے کا فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے فلم کار کو ایسے نئے نئے طریقے ہاتھ آتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کر کے پیش کر سکتا ہے ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اظہار واقعات پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کر کے پیش کرتا ہے۔ ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انہیں ہمارے ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ "کلوز اپ" یا قریبی شاٹ ہے۔ کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو قریبی شاٹ سے وسطی شاٹ تک پہنچتا ہے اور وسطی شاٹ سے ہٹتا ہے تو بعیدی پر آ ٹھہرتا ہے گویا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے جب تصویر مدہم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ معمول سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اوقات کیمرہ گھومتا ہے اور پورے منظر کو فلم بند کر لیتا ہے بعض اوقات سارا وسیع منظر سامنے ہوتا ہے، تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز بھی کر دی جاتی ہے یعنی کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے حلقہ میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ہماری توجہ جذب کر لیتی ہے پھر کبھی ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے ان مختلف طریقوں کو فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ چنداں محتاج بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی "ایڈیٹنگ" کو لیجئے جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ سمجھنا چاہیئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے ڈرامے کو فلم بند کر لیا جاتا ہے، تو سلولائڈ کو کاٹ کر شاٹ الگ الگ کر لئے جاتے ہیں پھر ہر شاٹ میں کسی قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں تو بجائے خود ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ فلم کے بگڑنے اور بننے کا کام حلقے ہو جاتا ہے تو کہیں ایڈیٹر کی باری آتی

آتی ہے اور اس کے کام کو فلم سازی کے دوسرے معنوں کے مقابلے میں رکھا جائے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو زیادہ دماغی محنت صرف نہیں کرنا پڑتی وہ مشین کی طرح ایک ہی ڈھرے اور بندھے ہوئے قاعدہ پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں تو انہیں کاٹ کر جوڑ دیا جاتا ہے لیکن روسی اور جرمنی ڈائریکٹر تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدوین میں طبیعت کی اپج اور تخلیقی قوت کے جوہر دکھلانے کی ضرورت ہے۔ میں بھی اس مضمون کے اغراض کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کو محدود چیز نہ سمجھا جائے اور اس کے یہ وسیع معنی مراد لئے جائیں ورنہ بعض باتوں کے لئے مجھے الگ عنوان قائم کرنے پڑیں گے۔ ایک مرتبہ کلیسہاف نے کہا تھا کہ تمام فنون لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ اول 'مواد' دوم اس کی ترتیب کا اسلوب' یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو مصور کا مواد مختلف رنگ ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے مغنی کے نزدیک آوازیں مواد ہیں جنہیں لے کے مطابق مرتب کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے۔ کلیسہاف کے نزدیک فلم کا مواد اس کے اجزا یعنی مختلف شاٹ ہیں اور ان کی ترتیب کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جسے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم کر سکتی ہے جوڑ دیا جائے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایکٹر کی حرکات و سکنات سے شروع ہوتا ہے اور شاٹ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ دراصل مواد کی فراہمی کے مدارج ہیں۔ فلم ساز کا اصل کام تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائریکٹر فلم کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ویسے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے ذمہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہے دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا انحصار اجزا کے سیاق و سباق اور ان کے باہمی ربط پر ہے جس طرح ایک جملے کے معنی کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزا کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو جملے لے لیجئے۔ "کتے نے آدمی کو مار ڈالا، آدمی نے کتے کو مار ڈالا" دیکھئے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیر نے سارے جملے کے معنی بدل ڈالے۔ یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ ایک متبسم چہرے کا شاٹ لیجئے۔ دوسرا شاٹ ایک بچے کا ہو جو کھلونے سے کھیل رہا ہو اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی بجائے ابرو پر بل پڑے ہوئے ہوں۔ اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص بچے کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا اب ساری ترتیب الٹ دیجئے۔ یعنی آخری شاٹ پہلے آ جائے اس کے بعد بچہ کھیلتا نظر آئے پھر متبسم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے۔ اسی مثال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ جو شخص فلم کے اجزا کو ترتیب دیتا ہے (اسے ڈائریکٹر کہہ لیجئے یا ایڈیٹر کے نام سے پکاریئے) بہر حال وہی فلم کا جنم داتا ہے۔ فلم کی کامیابی میں ایکٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائریکٹر تو تدوین کی قدرت کے اس حد تک قائل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگا رنگیوں کو واضح کرنے کے لئے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے اس نے کسی فلم سے مشہور روسی ایکٹر موس یوخین کے کئی "کلوزاپ" یعنی قریبی شاٹ لئے۔ اس نے کلوزاپ بھی ایسے منتخب کئے تھے جن میں ایکٹر کے چہرے پر کسی جذبے کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی فلم کے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا۔ ایک کلوزاپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا۔ جس میں میز پر شوربے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی۔ ان دونوں کے ملانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موس یوخین شوربے کی جانب دیکھ رہا ہے دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوزاپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا۔ تیسری مرتبہ اس نے ایک لڑکی کا شاٹ لیا جو کھلونوں سے کھیل رہی ہے۔ اور اسے موس یوخین کے کلوزاپ سے جوڑ دیا۔ اس ڈائریکٹر نے لندن

کی فلم سوسائٹی کے سامنے اس کے نتائج کی دل چسپ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں ایسے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ شوربے کی پلیٹ کو بھول چکا ہے اور اس کی طرف اب کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مرد کو عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے تیسری تصویر میں انہیں ایکٹر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم دکھائی دیا۔ جو گویا لڑکی کو کھیلتے دیکھ کر پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سب کو کوئی نہ کوئی اہمیت حاصل ہے۔ بجز ایکٹر کے ہم میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایکٹر کو اتنا بے حقیقت نہیں سمجھتے۔ تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ شاٹ کے اثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایکٹر کو مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہیئے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف سروں کا اتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی اپنا اثر پیدا کرتی ہے اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا ٹیڑھا سا ہے اور اس قابل ہے کہ سینما سے شغف رکھنے والے لوگ جن کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں۔ میں صرف چند ضروری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں پڈوکن نے یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کی ہیں کہ مختلف مقاصد کے لئے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ پے در پے جس رفتار سے آتے ہیں وہ رفتار کس طرح بدلتی رہنی چاہیئے اس سے منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں موقع و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

عنوان

"مزدور کی بغاوت فرو کر دی گئی"۔

۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ اور زمین پر خالی کارتوس اور بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گذرتا ہے۔ جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک لوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵۔ پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہراتا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکون اور غم پایا جاتا ہے ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں اس لئے تحلیل ہو جاتا ہے تاکہ نگاہ کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ

آہستہ نمودار ہونے اور غائب ہو جانے سے بھی یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بذاتِ خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اب ایک پُرشور اور ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا جمِ غفیر دوڑتا نظر آتا ہے وہ لینز کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں سب کے سب یکے بعد دیگرے لینز کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پر سے کودتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان :۔

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے۔

۵۔ مزدور جو کرین پر چڑھا ہے اسے جھک کر نیچے دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے۔)

۷۔ مزدور جو کرین پر ہے پوری قوت سے چلاتا ہے

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں۔

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ کلوزاپ دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردہ پر اپنے اصلی وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تانا بانا خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے یہ مثال بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے حادثہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے پاس سے ایک موٹر کار گذرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بدنصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔

گھومتے ہوئے پہیئے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

۵۔ موٹر کے پہیئے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۶۔ گاڑی ٹھہر گئی ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں اگر مرنے والے کا منہ دو سیکنڈ کے بجائے ایک منٹ تک کھلا دکھایا جاتا تو سارا اثر خاک میں مل جاتا۔

یہ تو تعمیری تدوین کی مثالیں ہیں، یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے۔ جسے اصطلاح میں "تخلیقی تدوین" کہتے ہیں۔ جس میں ایڈیٹر کے ذہن رسا کے عجیب عجیب کرشمے نظر آئیں۔

میں گذشتہ اوراق میں "دی لاسٹ پرفارمینس" نام ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ بھی ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لئے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے۔ صحیح عمل پیدا کرنے کے لئے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ اور وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں جھلملاتی نظر آتی تھیں اس دوسری تصویر میں بڑے بڑے اونچے مکانات جیسے نشے میں جھومتے دکھائے گئے ہیں یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دھندلے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آ جاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اس طرح پردے پر رنگا رنگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا اثر بے حد حیرت انگیز تھا ——— ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے ان کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر کے آغاز میں میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کر دیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ لیا اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام کا نہ تھا پردے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتیرے تجربات کے بعد آخر کار میں فلم کے پردے پر دھماکہ ہونا اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کا کوئی ٹکڑا استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک مشعل سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شورش و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لئے "میگنیزم فیتہ" سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانہ میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل آ گئی جسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو در حقیقت دھماکہ پیدا کرنے کیلئے استعمال کیجاتی ہو

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ در اصل تدوین ہی فلم کو جنم دیتی ہے فطرت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے حقیقت اور فلم میں یہی تعلق ہے ——— فلم کے مضمون کو انہی الفاظ پر ختم کر دینا چاہئے میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے تعلق رکھتا ہے ہندوستان میں رہ کر جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کیلئے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ سینما کے زر پرست مالکوں اور قدامت پسند سنسر کے نزدیک ابھی تک اکثر ایسے فلم مردود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل کی عظیم ترین کامیابی سمجھنا چاہئے اور ہمیں ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے جب آپ اس نوع کی مجبوریوں کو میری دوسری خامیوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون غنیمت معلوم ہوگا۔ (نیرنگِ خیال)

انگلستان کا جدید تھیٹر

پطرس

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دل چسپی ہے اس لئے سفر یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصّہ اسی کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصود صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آ کر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا۔ یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گردت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر گاہے گاہے امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا۔ اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی، سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اندریں حالات میں ہرگز اس بات کے لئے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ رائے نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشاہدات قارئین نیرنگِ خیال کے لئے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو یہ مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کماحقہٗ بیان کرنا بے حد مشکل ہے دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامّل کے شاہد تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا۔ جس کا نام فیسٹی ول تھیٹر (FESTIVEL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ خوبئ قسمت سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا۔ لیکن اس کے لئے اسکیمیں مدت سے تیار ہو رہی تھیں۔ اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونی ورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں وہاں فیسٹی ول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے گئے تھے :-

"فیسٹی ول تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانے کے عظیم الشان ڈرامے سٹیج پر پیش کرے۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت پڑی ہوئی ہے یا وہ لوگ جو محض کتابوں ہی کے کیڑے ہیں اور جو ڈراموں کا بحیثیت تصانیف کے مطالعہ کرتے ہیں اور ناٹک کے فن کے نقطۂ نظر سے ان پر غور نہیں کرتے۔ ان کے دماغ میں ڈراموں کا تصور کیا ہے۔ دنیا کے سب سے دلچسپ ڈرامے یہاں دکھلائے جائیں گے موجودہ زمانے میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض کے لئے کھلے ہوتے ہیں ان میں اعلیٰ ترین ڈرامے کے فن کو تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا انصرام ایسی زر انداز کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی نہیں رکھتا اور وہ لوگ جو اس فن کے دل دادہ ہیں اور فی الواقع اس فن کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں عمارت کی ساخت اور سٹیج کا سامان پچھلی صدی سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طرز ادا کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اصل فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرز تعمیر اور سٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سلجھ جائے میری طاقت اور نیرنگِ خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔

انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک میں ایک ہی کھیل ہر رات، مہینوں بلکہ بسا اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال دو سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور کوئی بڑا کھیل فیل ہونے پر آئے تو دوسرے ہی دن فیل ہو جائے۔ جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے برخلاف اس کے فیسٹی ول تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب یونی ورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو جاتا ہے، حق تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے۔ کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں۔ جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اسی لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعتِ نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر کے مارے قبول نہیں کرتے کہ کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھلانے میں ماہرین تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی آسٹرین اور نارویجن سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں البتہ ہوتے سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ ٹریجڈی کامیڈی فارس وغیرہ سب اصنافِ ڈرامہ شامل کر لئے جاتے ہیں۔

یہاں کی سٹیج کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ یہی چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کرسکوں۔ یہ کام تصویر ۲ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں سٹیج پر جو سین لگا ہوا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے۔ سٹیج کا بہت سا حصہ سینری کی وجہ سے رُک گیا ہے تاہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض نکات بیان کرنے کو کافی ہے)

پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے ورے کو نظر آرہی ہیں (سٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں۔ لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تعمیر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے بڑی سطح پر پہونچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سین کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حلقے کی شکل میں ایک خط سا کھنچا ہوا ہے یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ پچھلی سیڑھیوں کے نیچے آکر چھپ گیا ہے اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بہ وقت ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا عقبی نصف حصہ اور بھی ایک درجہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

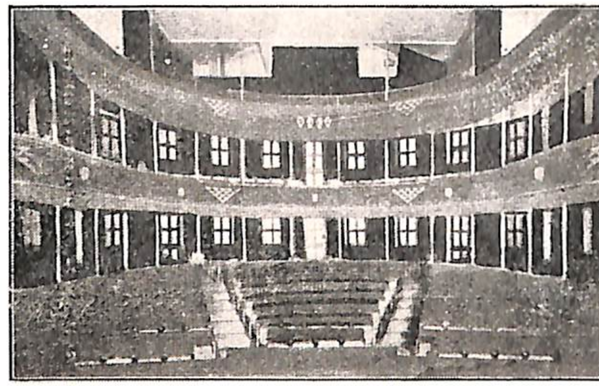
اسی تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لئے ہاتھ کو خم کرکے شمع کے پیچھے رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ دیوار کھوکھلی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہوسکے اور اس پر بہت ہی پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی ٹکر سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (CYCLORAMA) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر ۱ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا۔ ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے ہلکے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہوجائیں۔ تھیٹر کے اس حصّے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ دو درجے اوپر کی منزلوں میں ہیں اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لئے خالی چھوڑ دئے ہیں۔

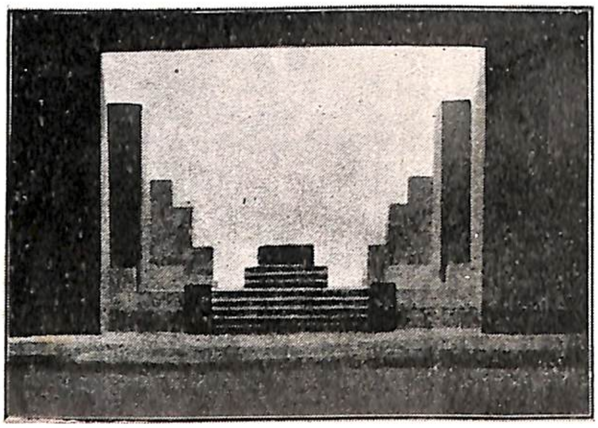
یہ تو عمارت کا حال ہوا لیکن اس تھیٹر کا سب سے ضروری جزو جس کی وجہ سے اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لئے خاص طور پر مایۂ ناز ہے وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائیٹس یعنی وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً مفقود ہیں سامنے سے روشنی کے آنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر ۱) جن کا رخ سٹیج کی طرف ہے اور جو بڑی احتیاط کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کی روشنی سٹیج یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی۔ اور نہ ایکٹروں کے سائے سائیکلوراما پر پڑا کریں۔

سٹیج کے اوپر ایک پُل سا بنا ہے (اس کے محل وقوع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آگرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں بعض کا رُخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے لیکن چودہ لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور بس۔ سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوسِ قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔

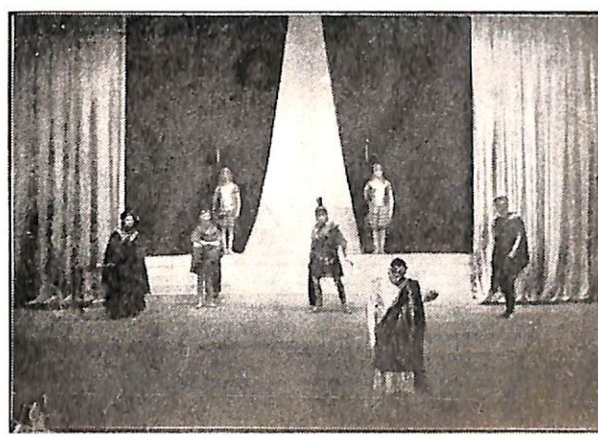
١



٢



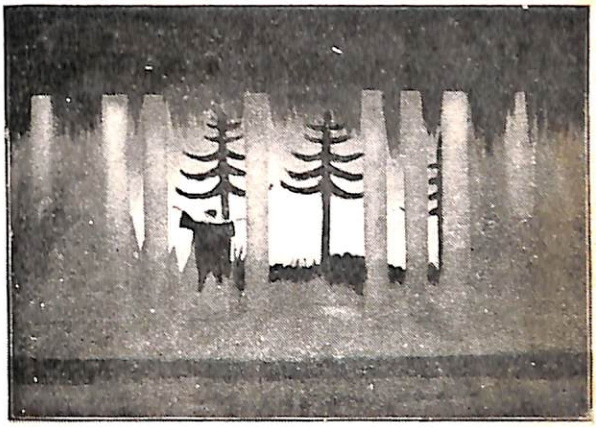
٣



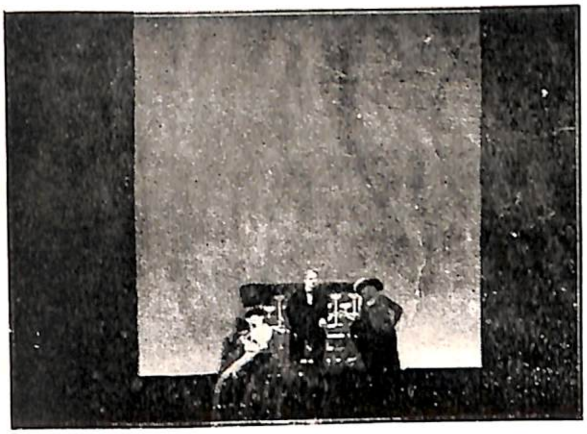
٤



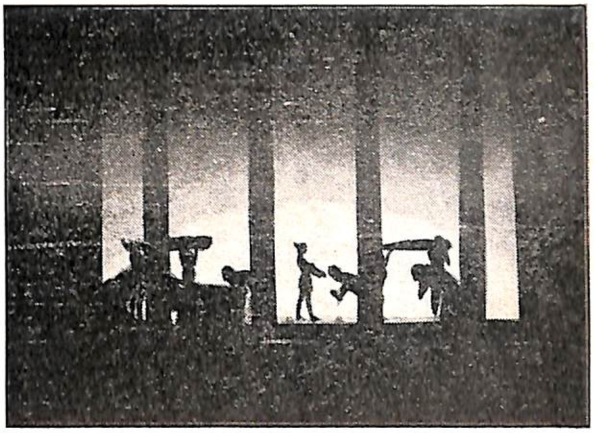
٥



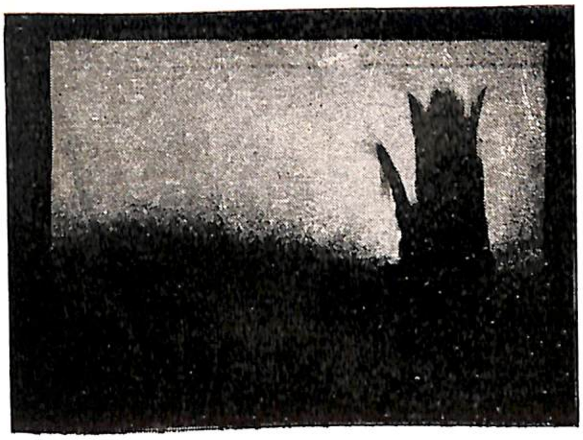
٦



٧



٨



اور چونکہ انہی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر دنیا کا ہر ایک رنگ بنایا جا سکتا ہے اس لیے سائیکلوراما پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگتے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر ان کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدہم پڑ جاتا ہے اس لیے ان میں ایک تو اس قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے

صرف ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اس کے بعد اس سٹیج کے گورکھ دھندے کو بند کر کے رکھ دوں گا۔ ہر ایک لیمپ کے جلانے کا بٹن علیحدہ ہے نہ صرف یہ بلکہ اس بٹن کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل ہی بے معلوم طور پر مدہم یا تیز کی جا سکتی ہے تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں۔ جہاں بٹنوں کی قطاروں کی قطاریں لگی ہیں۔ اور جہاں سے تھیٹر کا ماہر روشنی اپنا کام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی۔ لیکن مسٹر رچ جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف بٹنوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی یا ان کو کسی رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے وہ بجلی کے بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزماتا رہتا ہے تو ہال اور بجلی کے کمرے کے درمیان عارضی ٹیلی فون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تو تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے، ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ہدایات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل کہربائی رنگ مطلوب ہے۔ ماہر روشنی اپنی اٹکل سے محض بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کرتا ہے حالانکہ سائیکلوراما خود اسے نظر نہیں آتا۔——

تصویر نمبر ۲ میں سائیکلوراما کو دیکھتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خداوند تھیٹر دنیا کے اعلیٰ ترین ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات انوکھے ہیں پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو خیر ذلیل سے ذلیل تھیٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ فیسٹی ول تھیٹر کا رجحان زیادہ تر اسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر نمبر ۱ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر نمبر ۳ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سے سائیکلوراما دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پر آگے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ فیسٹی ول کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پر آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر نمبر ۴ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کیے گئے ہیں۔

تصویر نمبر ۵ والے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا۔ اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لیمپوں سے روشنی کی شعاعیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں) بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا (یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے۔ اس لئے درخت گو صرف تین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک غذائی فیکٹری دکھانے کے لئے جو جو انتظامات کرنے پڑے۔ ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبراتا ہے لیکن اس تھیٹر نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ سٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا نتیجہ تصویر نمبر ۶ سے ظاہر ہے۔

تصویر نمبر ۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی میاں بنا کر لے جا رہے ہیں۔ صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے لوگ کیریکٹروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس لئے اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجئے جو میرے خیال میں بہ اعتبار فن کامیاب تر ہے۔ (تصویر نمبر ۸) شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سویا ہوا ہے۔ اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں سٹیج پر ایک لیمپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر میرا کچھ بیان کرنا بے معنی ہو گا اس لئے اس قصے کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز و نہج کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض جدت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے اس کھیل میں جو پیغام مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور (اس سے کم درجے پر) انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں جو حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور اس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں۔ برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر اٹھنا۔ اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا۔ وہی ہندسے جمع کرتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں۔ کوئی انوکھے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کاروباری دنیا میں نیرنگی بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک اور دوسرے کلرک یا ایک مزدور یا دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح ہندسے

دیئے ہوئے ہیں۔ یعنی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں، کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں۔ گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں، جانور بلکہ مشین ہے، ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کرنا ہو تو بجز اس کے کہ ہر ایک پر ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں اسی لئے افراد کو ہندسوں سے تعبیر کیا گیا ہے صرف چونکہ کھیل کے "ہیرو" یعنی منجملہ ان انسان نما مشینوں کے ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے ممیز کرنا تھا اس لئے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ اور اس کو سٹیج پر ادا کرنے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ (میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے) پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دو بستروں پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہے۔ گویا نہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر ہی میں بے رونق ہے بلکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں بلند آواز کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ صرف کبھی کبھی جب لمحے بھر کے لئے بیوی آرام لینے کے لئے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفے میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں اس کو یوں ادا کیا گیا کہ جہاں بیوی چپ ہوئی تب پردے کے پیچھے سے چار پانچ ایکٹر بھاری اور ڈراؤنی اور نہایت ہی مدھم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی۔ اس دوران میں مسٹر صفر لب تک نہ ہلاتا تھا۔ صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے سے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا مہیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اتنی مردہ ہو چکی ہے اور نئے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس درجہ سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح طرز زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے۔ پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا ڈور فاڈیسک ہے دونو طرف دو اونچے سٹول ہیں، جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیسک کے عین اوپر ایک لمپ ٹنگ رہا ہے۔ لمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ اردگرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے بس سب سامان سٹیج کے اس حصے پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے۔ مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں۔ لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے ایک بل کو اٹھاتی ہے۔ رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کئے جاتی ہے۔ مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے رونقی ٹپکتی ہے بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یہاں شاید برسوں سے اسی لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دل میں یہ امید ہے کہ آج نہ سہی کل میری ترقی ہو گی آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں، مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا ہوا آخر کبھی تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اتنے میں دفتر کی سیٹی بجتی ہے۔ دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ سٹولوں پر سے اترتے ہیں دونوں کی حرکات میں اس درجہ مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا۔ کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں۔ لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفر جانے ہی کو ہے کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے۔ بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے ہو یعنی رقمیں جمع کرنے کا۔ اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگالی ہے اس لئے تم آج سے برخاست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں مانتا اس بحث کے دوران میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں سٹیج گھومنے لگتی ہے لیکن مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ گو سٹیج گھومتی رہتی ہے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی ہے سٹیج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی چمکتی کبھی بجھتی ہے۔ پردے کے پیچھے سے ایکٹرڈراؤنی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں، جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر میز پر سے فائل اٹھا کر اس کے نوک دار لوہے سے مالک پر حملہ کرنے کو بڑھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک زور کا دھماکا سنائی دیتا ہے (یہ آواز پیتل کے ایک تھال کو زور سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں مکمل خاموشی اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لیمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت خانے کی ایک جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں!

(نیرنگ خیال)

یُوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندانِ لاہور

جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے۔ (غالب)

"کاروان" کا یہ دوسرا نمبر دنیا کے سامنے ہے۔ یہ رسالہ پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر قیادت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے کہ حسب استطاعت ان فنون لطیفہ کے ذریعے جن کا ظہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل ہے۔ ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے۔ اس میں کسی صوبے کی قید نہیں، اور فہرست مضامین سے ظاہر ہو گا کہ اس مبارک دریوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض دل پسند نام کہ فہرست میں نظر نہ آئیں تو اس کو سائل کے استغنا پر نہیں، اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے۔ نہ اس لئے کہ اور کوئی زبان درخورِ اعتنا نہیں۔ نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کاروان سے وابستگی کا فخر حاصل ہے۔ اپنی تعلیم اپنی تہذیب، اپنی تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لئے بہترین ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ مبصرین سے پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو پی، حیدر آباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بینش بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں کہ یو پی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدر آباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشو و نما محض خونِ عشاق کی مرہونِ منت ہے جس جگہ یہ زبان خودرو ہے وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمیٔ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوت نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈتی ہے جو بخط مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یو پی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یو پی کی روایات سے یک قلم مقاطعہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہو گا۔ یو پی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہو گا جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جان بنا کر نہیں رکھا۔ لیکن یو پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب

پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ یوپی میں ادب اردو کا ایک سسکتا ہوا سانپ ہے جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس۔ اب یوپی صرف اعتراض کرسکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کرسکتا۔ اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑاپن، اس کا مربیانہ انداز، اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بین ہستی کو اس کے انحطاط کی خبر سنانا بے رحمی ہے لیکن یہ بے رحمی ایک نشتر زن کی بے رحمی ہے اس میں معمول کی دلداری کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجئے، جو کسی یوپی کے مرتب کئے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں۔ مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں، سٹیج کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیات درخور اعتنا نہیں۔ اس کی جدت زیر غور نہیں۔ اس کی ذہنی کش مکش پر نظر نہیں اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں۔ فضا کا احساس نہیں، مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر توجہ نہیں اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کو پرکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل مدعا کے متعلق چھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کرسکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروان اردو کئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یوپی ہنوز "تک" اور "تلک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گزشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کئے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یوپی کے حضرات کو اس شغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یوپی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے گو چڑچڑے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نقرے کو ہر بڑی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گور پر لات مار دیں۔ مطالب یا فن یا حسن بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی نقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے کھوسڑوں سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشہ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جہل سے مرکب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوش گوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ٹکرانے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات

کوترقی کا پرچم سمجھتا ہے۔ لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کاروان پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ "زبان کی لغزشوں" کی نذر کر دیا۔ افسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیراگراف لکھا اور وہ بھی ایسا جس میں علم کم اور متانت پرشس بچپن زیادہ پایا جاتا ہے۔ تصاویر کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا کہ "سب کی سب دلکش اور دلآویز ہیں"۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن نہ اس قدر کہ ان کے شگافوں میں سے تنقید نگار کا کوراپن نظر نہ آئے۔ البتہ یہ بڑے وثوق سے کہہ دیا کہ "معراج" مؤنث ہے مذکر نہیں۔ اس کا جواب دراصل تو یہ ہے کہ بہت اچھا صاحب معراج مؤنث ہی سہی۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑے گی کہ جہاں "معراج تھا" لکھا ہے وہاں پنسل سے "تھا" کی بجائے "تھی" کر لیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مضمون کو پڑھئے۔ اگر لطف آئے تو کہئے اچھا ہے ورنہ اس پر خاک ڈالئے۔ مخفیانہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے بقول آپ کے ہم "اس قسم کے اعتراضات سے آزردہ ہوتے ہیں"۔ ہمیں آزردہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے تو نہ صرف آپ کی تنقید کا معیار ہی بلند رہتا بلکہ ہماری دلی عقیدت بھی متزلزل نہ ہونے پاتی۔ ناسخ نے کیا خوب کہا ہے ؎

کسی دن تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرشِ اعظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔

محولۂ بالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے حالانکہ تازہ ترین اشاعت میں انہوں نے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"سالنامہ کی خصوصیات اس کی دل چسپیاں اور دلفریبیاں ہم سے نہ کہلوائیے" ــــــــــــ
(عطف کا یہ غلط استعمال خاص علیگڑھ میگزین کا حصہ ہے اور "خصوصیات کہلوانا" تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہئے۔)

"چھوٹے ہوؤں سے ملنا" (پنجاب اس مطلب کو یوں ادا کرتا تو آپ ہی مربیانہ تبسم سے فرماتے کہ یہاں "بچھڑے ہوؤں" چاہئے۔

"سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونیورسٹی کا قیام ہے"۔ (جناب اہلِ زبان صاحب! کابل یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائے گی تو جو آپ کا دل چاہے لکھ لیجئے گا۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

"پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے....." (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

"تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے"۔ (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعثِ فخر و ناز سمجھے۔ ہم مہینے کے مہینے خود یو پی کے رسالوں میں سے زبان، صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہلِ بصیرت کی عبرت کے لئے مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم نوشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعۂ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں۔ آپ نے زبان کو اپنے لئے مردِ تسمہ پا بنا لیا ہے جو بخنسہ ہے گر جس نے آپ کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔

"جامعہ" کی حالت اس سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے کیونکہ "جامعہ" کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی

توجہ کرنا بھی باعثِ سعادت ہے ان کا جوشِ عمل اور ان کا تبحر علمی ہم ہیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں، کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بے خود ہو کر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان درازی کا حوصلہ ہمیں صرف اس لئے ہوا کہ "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں 'منزل گاہ' جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا اور کہہ دیا کہ "یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔" یہی وہ ادعا اور تیقن ہے جس کی ایک موروثی تیزی کے اکثر دماغوں پر جمی ہوئی ہے۔ اے کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے لہجے میں تھوڑا سا منکسرانہ مگر فلسفانہ تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہیں گے کہ "ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔"

جامعہ کے جس نمبر میں کارواں پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دل چسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوءِ ادب سمجھتے ہیں لیکن ارباب جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "عمل پیہم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" مدنظر ہے اور "ہمیں خوشی ہے" اور "ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "وزن مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل درد مند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے بھلائی کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابلِ بحث ہیں۔ علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور کنایتہً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابدی ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقار کا مطالعہ کیجئے اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہوئی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ ان ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں، چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ باز "مجھے جانا ہے" کہتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چرغتائیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا "پنجابی ڈھنگوں" کی طرح باتیں کرو، ریختی مت بولو۔ کارواں کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؏

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

ان سے کہا گیا کہ "تو نے ...... کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" رکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے یا جملے کے ترنم کے مطابق جہاں

پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خواں کے اسے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔"

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علم بردار اور آئینہ دار ہیں۔ جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہلِ پنجاب کے نزدیک بوجوہ محبوب و مقتدر ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی بالغ نظری ہمارے نزدیک مسلّم اور ان کی صحبت کی یاد (ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی) بالیدگیٔ روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کریں گے ادب و انشا کے مقابلے میں ایسے معیار قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اہلِ قلم کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور بلدیاتی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے۔ جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے نہ ہو سکے گی۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کو تیار ہے اس لئے ظلم ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے کہ تمہارا خون رذیل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہزنی کو آپ کی شان کے شایان نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم نیاز مندوں کو شرف باریابی بخش کر ہماری عقیدت اور اپنی دریا دلی سے بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے نہ یہ کہ قلعۂ معلّے کے کھنڈروں پر تنت سنے تالے ڈالتے چلے جائیں گے۔

بقلم پطرس"

ہمارے زمانے کا اُردو ادیب

ترجمہ
مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ اجلاس منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چھبتے ہوئے انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو اُن کی انگریزی انشاء پردازی ہے جس کا اُردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیرِ نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، اُن کے اندازِ نظر اور جدید اُردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس مقالے کی "معروضیت" اور "بے لاگ مطالعہ" شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پہ چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ وہ ایک عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور اُن پہ ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبالؔ اپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے تو دور و نزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکھٹے ہوئے۔ غالبؔ اور میرؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور گرامیؔ، حتیٰ کہ نظیریؔ، رومیؔ اور حافظؔ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گو مگو کی حالت میں بھی گزرے۔ مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومیؔ اور اقبالؔ کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور "نقد دیرانم" پہ اقبالؔ کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالبؔ کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد ساز گار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے باآواز بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے زماں لہروں پہ حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور اُن میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود

فہم و بصیرت کے تازہ اور فرح بخش نقش و نگار دریافت ہوتے۔ اقبال قدماء میں سے نہ تھے پھر بھی قدماء کے لئے اجنبی نہ تھے۔ بس ذرا نئے نئے اور بھرپور سے لگتے تھے۔

آج کا نوجوان اُردو ادیب، اگر اس کو اس سفر پہ وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے، اس محفل میں کیسا لگے گا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال مروّت اور شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ خوف بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا لگے گا۔ قدماء سے اظہار خیال اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ نیا مسافر، اپنے اور اُن پیشروؤں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل پائے گا جسے پاٹنے کے لئے اس کو کتب خانہ فردوس میں طویل نشستوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا جائز ورثہ وصول نہیں کر سکا۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ راشد اور فیض، فراق اور فرحت اللہ بیگ، جوش اور حفیظ۔ ماضی کے ساتھ ان سب کے رسم اچھے ہیں اگرچہ انھوں نے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ، اپنے آپ کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ مگر وہ بہم کم ہوتی ہوئی اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی ایسی یادگار ہیں جو بجانے پھر کب پیدا ہو۔ ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت، اپنے آپ روایت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، انبیاء کے اقوال کو احترام کے ساتھ اور شعراء کے اقوال کو کراہت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ اُن کا ولن انبیاء کو کراہت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی۔ دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے اُردو ناول نگار میں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھتا نہیں۔ وہ بلانوش قسم کا قاری ہے مگر ولایتی ناشروں کی چھاپی ہوئی "بہار کی فہرستیں"، "خزاں کی فہرستیں" اور سمندر پار کے "ایڈیشن" کچھ ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ چُننے اور چھانٹنے کی فرصت رہ جاتی ہے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ ہمارے دور کا نصاب بھی اُلجھا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تو تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اُردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو، ماضی کوئی نہیں۔

اِن قطع تعلق کی وجوہات گوناگوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب نے جس نظامِ تعلیم کے تحت نشو و نما پائی ہے۔ یہ سب اُسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں، شرافت اور دیا تقدس کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور (یا اس دنیا کے لئے انبیاء و شعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلّمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء و شعراء بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سر انجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں، ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ٹانک ٹوئیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹانک ٹوئیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بند اور پشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا ناک نقشہ درست تھا۔ ناک نقشہ پھیل پھیل کر یوں متزلزل ہو گیا ہے۔ جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم

معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے، رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیا اور شعراء دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اُس چیز سے جو اُسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ و تلمیحات اور حکایات عالم کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کار آمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی واردائیں۔ اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اُس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے، اُسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں۔ اُسے اُن چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اُس نے اپنی تخلیقی شخصیت پہ ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دو چند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گومگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ لفظ جن سے اُس نے پہلو تہی برتی تھی۔ اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ (مسز) ڈیمی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیر عنوان انھوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت قومی تہوار معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جزو "گھسے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے، اسی انداز سے، اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا! اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علماء اور ماہرین تعلیم، تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے۔ اور اس کے لئے بھی جس نے اُسے اختیار کیا۔ اُن کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے اظہارِ خیال

اس کا فرض ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے۔ چاہے کتنی زبانوں سے اس نے ذہنی غذا حاصل کی ہو، ذہن تو اس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک دریچہ سبز ہے تو دوسرا سُرخ مگر ذہن میں یہ دونوں رنگ آرام سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ وہ آپس میں گھل مل کر ایک تیسرے رنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ایک دریچے کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ مگر نہ تو کہیں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سُرخ۔ یہ لطیف اور پُراسرار روشنی اس کے لئے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعثِ فخر بھی۔ مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سُرخ فلٹر میں سے اپنے اصلی رنگ میں گزارنا کتنا مشکل ہو گا۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے۔ مگر اس صورت میں بھی ایک دقت ہے۔ اُس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے باہم ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو نیم واضح اور بے ربط و مہمل قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس کی تحریر کی بُنت میں آپ کو عجیب قسم کے خم و پیچ نظر آئیں گے اور ابہام و اشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر، انگریزی ساخت کے جملے بے ڈھنگی اُردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف آلۂ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے۔ مگر یہ دوغلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور گونگے کے اشاروں سے زیادہ قابل فہم نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے اُن کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ جب احساسِ شکست قوی ہو جاتا ہے تو اردو کا ادیب اُردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے مگر فلٹر سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ معاشرہ اس کے فہم و بصیرت کی حدوں سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ اس کے اسلاف کے تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پُر جوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھ جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب ایک نہ ایک انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جبلی اور مجنونانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان آوارگیوں اور سیاحتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کل" کو پالے اور چونکہ بیرونِ خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس کو درونِ خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے۔ زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی۔ ای۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسٹلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسٹلر کے نزدیک، الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی اور کھُلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی۔ جو فن کار کے لئے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسٹلر نے

یہ بھی کہا تھا کہ باہر کی دنیا ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کرکے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کرے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ باہر کی ہوا، باڈ ڈالنے کی بجائے اس کو باہر بھی کھینچ سکتی ہے تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پہ جھک جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے یعنی مشاہدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر و بیشتر کھڑکی پہ جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہئے۔ باہر منظر اس کے لئے اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ وہ پیچھے چلانے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ وہ لکھنے کی میز پہ واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا ابھر آئی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بے شمار چیزیں ہیں اور چھان بین کے لئے بے پناہ مسالہ ہے۔ اس حالت میں اس سے عظیم فن پاروں کی توقع بے جا ہے اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی میں ڈالے رکھے گا اور گلیوں بازاروں کے ہجوم میں شامل نہیں ہوگا۔ آنیوالے فنکار ساتھیوں کو اس کے یہاں مقصد کی سنجیدگی ملے گی اور آگے بڑھ کر دیکھنے اور مستقبل کو تلاش کرنے کی ہمت، چاہیے اسلاف کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی تیز نظری، اضطراب، آگاہی اور بے جگری، نئی راہوں پر چلنے کا عزم اور کچھ کھونے پانے سے اس کی بے نیازی یادگار رہے گی۔ ہم اس سے بڑا خراج تحسین اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات اور مجبوریوں، تکلیفوں اور تعزیروں کو سمجھیں تاکہ اس کی جد و جہد اور اس کے کارنامے کی بیش از بیش قدر کر سکیں۔ میں نے اس جگہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانہ میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ "سعیدہ موٹی تھی تو کیا، کمر در تو حد سے زیادہ تھی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے"۔ جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لئے اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازرہ تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے بہرہ یاب ہو چکا تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا۔ "لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے"۔

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجئے اور اس پر تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ پھیر لیجئے، تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے جو حال فربہی کا ہے وہی حال کئی اور معروف اور متداول لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں تسم قسم کی اشیاء پر چپکے نظر آتے ہیں ذہنی کسالت اور خوف اور بزدلی کے مارے ہم اکثر فیصلے لیبلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں۔ ان سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور تولنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ مامتا اور عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر آئے کہنے اور سننے والے دونوں ایک غلو اور ایک پاکیزہ رقت کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جنسی مشاغل تحقیق کہ پستی کی طرف لے جاتے ہیں، چنانچہ ان کا بیان بغیر کراہت یا اخلاقی غیظ کے ہو تو لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سا پیار جاننا چاہئے۔ کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہذا بہن بھائی کے درمیان بجز اس جذبہ عالیہ کے کسی اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رہنما بھی اندھا دھند ایسے ہی لیبلے ہوتے تو ادب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے۔ وہ لیبلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کئی کیفیتیں ایسی ہیں جن سے وہ اکیلے میں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں۔ ایسے انشا پرداز کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، دقت نظر اور جرات بیان کے گذارہ نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس محرومی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرات اور دقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ فی الحال ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبل گوند سے چپکے ہوئے نہیں میخوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیروں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا بچہ قدرت کو منظور ہے تو ہوا کرے، ہمارے ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ نطرت کا مطالعہ؟ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجوں کا عذر آوارگی! ہمیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا تو اب کسی کی

کیا مجال ہے؟ ہم جب کبھی کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ..... ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ؎

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے ـــــ اور اپنوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں ـــــ جو عصمت چغتائی کے قدردان اور مداح ہیں، ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ گلہ ہے کہ وہ بھی ہر پھر کر لیبلوں ہی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت مرد نہیں اور افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور گمراہ کن لیبل عورت ہے۔ مردوں کے قرنوں کے خرابوں اور محرومیوں سے چپکا ہوا۔ عورت دلفریب ہے، سکار ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، مجموعۂ اضداد ہے ...... جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھڑے گھڑائے معنی ذہن اگل کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آ کر ایک ہونہار اور ذہین دیباچہ نویس فرماتے ہیں:۔

"عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُرپیچ اور دشوار گذار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے۔"

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیزوں پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بقول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:۔

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجئے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر میں کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح، کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لئے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں اردو ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تُک ہی ملا اور بوجھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی ما بہ الامتیاز ایسا ہے ـــــ خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلّی اور بنیادی۔ جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیّز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہرحال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ صف قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی افسانے میں خاندان، گھربار، اعزہ و اقربا کا ذکر آگیا۔ یا کسی متمول لڑکے نے کسی مفلس لڑکی پر ہاتھ ڈالا، جوشیلے اور درد مند دل رکھنے والے نقادوں نے مسرت کا نعرہ لگایا اور بغلیں بجائیں کہ سماج کی خبر لی جارہی ہے۔ اب غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عصمت کے اچھے افسانوں میں ماحول محض اس لئے شامل فسانہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ کردار کہیں تو رہیں گے۔ کسی سے تو ملیں گے۔ افسانہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کا کوئی گوشت پوست تو ہوگا پھر اس کے بغیر بھی چارہ نہیں کہ وہ ماحول ایک نہ ایک معروف طبقے کا ماحول ہو۔ بود و باش کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ تو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ ماحول جن معاشی اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوا خود وہ اصول جانچے اور پرکھے جارہے ہیں۔

عصمت کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ سماج کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے جہاں کبھی سماج کو اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے ان کا ہاتھ چھوٹا ہی پڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سماج کی جن باتوں سے عصمت کا جی برا ہوتا ہے ان پر عصمت نے غور ضرور کیا ہوگا۔ لیکن تلخ کام و دہن ابھی ان کے رگ و پے تک نہیں پہنچی اور جب تک یہ نصیب نہ ہو سماجی کمزوریوں پر اخباروں میں مضمون لکھ لینے چاہئیں۔ ان کو فن کی لپیٹ میں لانے کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ عصمت کو فی الحقیقت شغف سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ اشخاص سے ہے۔ ان کے جوش اور ہوس سے۔ ان کی تھرتھراہٹ اور کپکپی سے، ان کی باہمی کش مکش اور عداوت اور فریب کاری سے، غرض ان تمام کیفیتوں سے جو انسان پر جب طاری ہوتی ہیں۔ تو جسم پھڑکنے لگتا ہے اور دوران خون تیز ہو جاتا ہے یا اعصاب میں الجھاؤ اور طبیعت میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اگر عصمت اور سماج کا باہم ذکر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ان کی سی انشا، ان کا سا رجحان اور ان کا سا اسلوب انتخاب ایک خاص زمانے اور خاص سماجی کش مکش کی پیداوار ہیں تو یہ بحث مناسب ہی نہیں بلکہ نتیجہ خیز بھی ہوگی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اردو میں عصمت جیسے ادیب اس صدی کے اوائل میں بھی مفقود تھے۔ اور اس سے پہلے کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ ایک امر واقعہ ہے اور اس میں کئی دلچسپ نکتے مضمر ہیں۔ جن کی توضیح یقیناً خیال انگیز ہوگی۔ لیکن حالات سے اثر پذیر ہونا اور حالات کا مفسر ہونا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس بات کا مطالعہ کرنا ہو کہ بعض سماجی حالات نے کیونکر عصمت جیسی انشا پرداز کو پیدا کیا۔ تو شوق سے کیجئے لیکن اس شوق میں خواہ مخواہ سماج کی نباضی عصمت کے سر نہ منڈھ دیجئے۔ سیب درخت سے گرا تو یقیناً کشش ثقل ہی کی وجہ سے گرا۔ لیکن اس کارگذاری کے صلہ میں سیب کا نام نیوٹن نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ سیب کو سیب سمجھنے میں کچھ اس کی ہیٹی ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجموعوں میں ڈرامے، افسانے اور اسکیچ تینوں قسم کی چیزیں شامل ہیں ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہیں اوّل تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یہ کہئے کہ ابھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہیں تو ناپ کر قینچی سے نہیں کترتیں۔ یونہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہیں چنانچہ پیوسٹ جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی سین جب پھیلتا ہے تو سمٹے بغیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ خیر اس قدر نازک مزاجی سے کیا حاصل؟ کھیر نہ سہی دلیا ہی سہی پیٹ بھر جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھئے، کہانی سمجھ کر پڑھئے اور فرض کر لیجئے کہ کہانی نے ڈرامے کا لباس کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض تنوع کی خاطر پہن رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ رواداری سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک جبر اپنے اوپر ضرور کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ قصہ اوّل سے آخر تک مع اپنے نشیب و فراز کے تمام تر افراد قصہ ہی کے اقوال و افعال کے ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے مصنف سے یہ آزادی چھن جاتی ہے کہ ساتھ ساتھ کرداروں کے جذبات و خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی افوٹ یا تیور کے واضح کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا کیریکٹر سے

کچھ کہلوا لیا، جب چاہا خود کچھ کہہ لیا۔ لیکن جب اپنی زبان بند ہو اور سب کھیل کیریکٹروں ہی کو کھیلنا ہو تو عصمت قاصر رہ جاتی ہیں۔ اور ان مجبوریوں میں گھر کر ان کا مطلب اکثر فوت ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مکالمے بھی پھسپھسے ہو جاتے ہیں اور ان میں اس کرارے پن کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ (پردے کے پیچھے میں کس قدر چستی اور پھرتیلا پن ہے) بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا بے جوڑ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعہ کیا پیش آیا۔ چنانچہ ان کا ڈرامہ "انتخاب" کے واقعات بیشتر اس کے کہ سمجھ میں آسکیں بہت کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ (یہ نقص ان کے افسانہ "تاریکی" میں بھی رہ گیا ہے) ڈرامہ نویس کو تو اجازت نہیں کہ وہ سیدھے منہ ہم سے بات کرے۔ باقی رہے کیریکٹر سو وہ آپس میں الجھی سلجھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ (ڈرامہ جو ٹھہرا) گر ہمارے پلے کچھ نہیں پڑنے دیتے۔ ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مجبور ہے اور کیریکٹروں کو تعاون کا سلیقہ نہیں۔ ان حالات میں ڈرامہ کامیاب ہو تو کیونکر؟ پھر ان ڈراموں میں (جہاں تک میری سمجھ میں آئے ہیں) عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند اشخاص نہیں چند ٹائپ پیش کریں۔ یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے۔ مگر اس کے لئے اشخاص کا ادراک نہیں گروہ کا احساس چاہیئے۔ اور عصمت ادر گروہ میں وہ انہماک نہیں جو اشخاص میں ہے تو پھر نہ معلوم انہوں نے یہ مصیبت کیوں مول لی؟

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہا ہے۔ ان سے وہ طبعاً گھل مل نہیں سکتیں۔ یعنی وہ مرفہ الحال لوگ جو کہلاتے تعلیم یافتہ ہیں مگر جن کی ترکیب میں تعلیم کم اور ریانت زیادہ ہوتی ہے۔ جو خوش حالی، بے حسی، انحطاط اور اپنے رنگ و روغن کے بل پر اپنے مشاغل اور اپنی گفتگو میں بے فکرا پن اور چمک پیدا کر لیتے ہیں جس کی بدولت وہ "سمارٹ سیٹ" کہلاتے ہیں۔ اور کم نصیب لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر رشک کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس طبقے کی بعض حماقتوں اور خود فریبیوں پر عصمت کو غصہ آتا ہے جس کو وہ بیان کرنا چاہتی ہیں۔ اور اس کی عشرتوں پر تھوڑا سا رشک جس کو وہ خود بھی نہیں جانتیں لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس چمکیلے طبقہ کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے۔ قریب آنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کے نقوش اور خد و خال واضح دکھائی دیتے اور اس کے خوب و زشت اور ظاہر و باطن کا وہ اچھی طرح موازنہ کر سکتیں۔ چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹروں یا ان کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو نوک پلک کبھی درست نہیں ہوتی۔ چھری، کانٹے، "ارغنون" (یعنی چہ؟) ٹینس، ڈرائنگ روم، ڈنر سیٹ، الم غلم اس قسم کی اصلی اور خیالی چیزیں جمع کر کے ایک کباڑ خانہ سا بنا لیتی ہیں۔ گو ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے امیرانہ ٹھاٹھ باندھا جائے اور کچھ اس یقین کے ساتھ اسباب چنتی جاتی ہیں کہ ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب مصنف ہنسائے تو رونا آتا ہے اور رلائے تو ہنسی آتی ہے۔ ایک تصنع تو ان میں وہ ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آ جاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے، اور جو در اصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی کیریکٹروں کی سطحیت کو تو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایکٹروں سے پہلے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تھیٹر کی سی سچوایشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں اور کچھ اس طرح بنتے ہیں کہ ان کے تو خیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ "سانپ" میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگین تریا چلتر سے مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فعلیوں کا تماشا کیجیے۔ تو اس نتیجے پر پہنچئے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کر لیں لیکن اس سے زیادہ کی امید بے چاریوں سے خام ہے۔ معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں ہیں۔ جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں دو ایک جگہ صوفے اور کرسیاں بچھا کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہی

ہیں۔ قیاس اس امکان کو بھی رد نہیں کرتا۔ کہ وہ فلم خود مصنف ہی نے دیکھا ہو۔ اور اس کی ارزانی کا احساس اس کو نہ ہوا ہو۔ ایک مکالمہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے کہ اپنے بے ساختہ میلوڈرامیٹک اسلوب کی وجہ سے کشتِ زعفران سے کم نہیں۔ رفیعہ کی منگنی عفار سے ہو چکی ہے لیکن اب وہ اس سے نہیں ظفر سے شادی کرے گی۔ عفار کو اس سانحۂ جانکاہ کا علم یوں ہوتا ہے:۔

رفیعہ۔ نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔

عفار۔ (جوش سے) برباد نہیں۔ تم میری زندگی آباد کر دو گی۔

رفیعہ۔ نہیں، میں تمہیں نگل جاؤں گی۔ سانپ جو ٹھہری۔

عفار۔ (شدتِ جوش سے کانپ کر) کیسی باتیں کرتی ہو، تم مجھے نگل بھی جاؤ، تو میرے لئے عین راحت ہو گی۔

خالدہ۔ (رفیعہ کی سہیلی) مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا۔

عفار۔ (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا؟

خالدہ۔ یہی کہ وہ تمہیں نہ نگلے گی۔

رفیعہ۔ ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی......

(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے۔)

عفار۔ (سمجھ کر) تو...... تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ٹھکرا رہی ہو!

رفیعہ۔ اونہہ۔ اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی۔

عفار۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔

ظفر۔ عفار رنجیدہ نہ ہو، یہ ناگن تمہارے بس کا نہ تھا، شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے۔ تم دیکھنا میری وہ گت بنائے گی کہ توبہ ہی بھلی۔

عفار۔ کاش میری ہی وہ درگت بن جاتی۔

خالدہ۔ مگر عفار سوچو تو....

عفار۔ ایک عرصہ دراز سے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی۔

خالدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدی ہے!

عفار۔ (اندوہ گیں ہو کر) میں ــــ جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرے تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو کامک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈرامہ نویسوں میں ان کا نام رہ جاتا۔ لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر جمجے مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ اور جب مصنف ہنسانے والی باتیں لکھے اور خود اسے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسا ہی بے تکا پن ڈراموں کے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید نما چمکیلے لوگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ کیریکٹر کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑ لئے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنالی ہے۔ "پنکچر" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے اور "میرا بچہ" میں تو برنارڈ شا کے "آرمز اینڈ دی مین" کے پہلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں

یہ سیلیا اور نلی اور "ارغنوں" اور پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ اجنبی رہتی ہیں اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی۔ تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہتر افسانوں یعنی جوانی 'ڈائن' نیرا' بھول بھلیاں' ساس' بیمار اور تل میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے فقرے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جس میں نواڑ کی پلنگڑیوں پر پٹاریاں رکھی ہیں۔ مہترانیوں کی جوان بہوئیں کمر لچکا کر چلتی ہیں۔ الھڑ لڑکیاں گوبر بینتی پھرتی ہیں۔ اور تلیا میں ڈبکیاں لگاتی ہیں جس میں گلگلے بچے ماں کے پیٹ سے چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے چپڑ چپڑ منہ مارتے ہیں اس کے گردوپیش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔ کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو ہی چار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں۔ عصمت کے بہترین افسانوں میں آپ کو فضا اور ماحول کے لمبے لمبے پر تکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہ ملیں گے۔ لیکن جو بات ہے وہ ایسے پتے کی ہے۔ کہ اختصار سے تشنگی اور خلار کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ "ساس" کے شروع کے فقرے ہیں:—

"سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اے لو پھر پیروں پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم ٹھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی۔ "خدا غارت کرے پیاری بیٹیوں کو" ساس نے بے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی" دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جیئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر۔ ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آ پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

اتنے تھوڑے سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ نہ ضرورت سے زیادہ مدہم۔ یہی حال "نیرا" میں کے ایک ٹکڑے کا ہے:۔

چھوٹے تال سے گذر کر پلیا پر سے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا تو اب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے۔ چاہو جتنا نہاؤ، پیاؤ پر سے ٹھنڈا پانی جتنا چاہو پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رموّ کو تو دھوتی کا بھی مرہون منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ سیاہ سوت کا ڈورا جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر مرنے

سے ٹک جاتا تھا ضرورت سے زیادہ تھا۔ مزے سے تلیا میں ڈبکی لگائی، کناروں پر اکڑوں بیٹھ گئے اور لو کے چھپاکوں سے سوکھ گئے۔"

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ:۔

"اندھیری سنسان راتیں جیسے تیسے کٹنے لگیں۔ بیجھڑکی روٹیاں اور لوٹا بھر مٹھا حاصل کرنے کے لئے سارے گھر کو دن بھر تیرے میرے کھیت میں مجتے جُتتے گذر جاتی۔ بیزا گھاس چھیل لاتی، بھینسوں کو بھی دن لگے اور دودھ چرانا شروع کر دیا۔ کون دیکھتا بھالتا۔ کانجی ہاؤس میں ہی ایک تھنبط ہو گئی۔ دوسری بیاہنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بھینس جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال کھچڑی ہوں۔"

ان اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں نقل بھی کر لیا۔ ورنہ اسی قسم کے ایک ایک دو فقروں کے کنائے تو کئی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے۔ بہرحال امیروں، نفاست پسندوں اور تراشیدہ لوگوں کی دنیا نہیں۔ اس میں فاقے ہیں غلاظتیں ہیں (اور غلاظتوں کا حال عصمت کتنی برہم ہو کر اور کبھی کے مزے سے لے کر بیان کرتی ہیں) جہالتیں ہیں، بدزبانیاں ہیں، ہاتھا پائیاں ہیں، بیماریاں ہیں ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک خط ہے جو دبائے نہیں دبتا، امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ ذہن میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفسِ انسانی کا پہلوان زور آزمائی کرتا ہے۔ جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی بلندی یا بہت پُر معنی گہرائی نظر نہ آئے گی۔ عمیق امن، خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی۔ نہ وہ حزن و ملال ہی ملے گا جو کہر کی طرح دل پر جم جاتا ہے اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی۔ لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اس طرح دوڑتا ہوا جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا اور ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ آتے تو) عشقیہ افسانے یا "عشقیہ افسانے ہی سمجھو" کہتے۔ لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا۔ لیلے مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، غزلوں کا عشق، فلموں کا عشق، امردپرستوں کا عشق۔ سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لئے عشق کے لفظ سے نہ جانے کہنے والے کا مفہوم کیا ہو، اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ "جنسی بھوک" پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے بی ایڑس سے لے کر کتے کتیا تک سبھی کو لگتی ہے۔ عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہیئے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ جو جذبہ ان کے پیشِ نظر ہے اس کی تحریک کے لئے حسن کی ضرورت نہیں۔ یہ محض خون کی تاریک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی معمے پیدا نہیں ہوتے۔ صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ رگوں میں

سرایت کر جاتا ہے۔ دل کی کیفیتیں جسم ہی سے رنگ پکڑتی ہیں۔ اور جو کرب یا تسکین بھی نصیب ہوتی ہے اس کا مظہر اول سے آخر تک جسم ہی رہتا ہے عصمت ہی کے فقرے ہیں کہ "شہر کے تندرست لوگوں کا گھر ٹڑی جیسی سرخ سرخ بیویوں سے اجڑ جاتا ہے۔" اور "جب تک بدن چست ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر کچھ نہیں۔" اور پھر "وہ بیمار تھا تو کیا، دل تو مردہ نہ ہوا تھا پھر اس میں بیوی کا کیا قصور۔ وہ نوجوان تھی۔ اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا۔ مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کوئی اس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔" مطلب یہ کہ جسم مردہ ہو تو یہاں دل کی زندگی سے کام نہیں چلتا۔ جسم کا شعور عصمت کے افسانوں میں اس قدر نمایاں ہے کہ پڑھنے والا جسم کے متواتر ذکر سے خود مصنف کی طرح ہیبت زدہ اور مسحور ہو جاتا ہے۔ "صلو دبلا پتلا سوکھے دن کا مریض تھا۔ اور پھر جب جوانی آئی تو خون کی حدت سے اس کا چہرہ سانولا ہو گیا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلی دار مضبوط شاخوں کی طرح جھنے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے..... بیگم جان کے اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ اور پنڈلیاں سفید اور چکنی...... ربّو کا گٹھا ہوا ٹھوس جسم اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی سی توند اور پھیلے بڑے بڑے پھولے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے ہیں...... بیار کا موٹا پڑوسی سرخ چقندر بڑی گھنی دار مونچھوں والا جس کے جسم سے موڑھا بھرا جاتا ہے۔ اور جس کے جبڑے چکی کی طرح چلتے ہیں۔ رانی کے چکنے چکنے سیاہ گال اور وہ دیسی جگہ کا تل...... شبراتی کے سینے پہ کتنے بال تھے، گھنے پسینے میں ڈوبے ہوئے۔ اور اس کے کسے ہوئے ڈنڑوں اور رانوں کی مچھلیاں کیسے اچھلتی تھیں۔ اور وہ اس کی چھوٹی چھوٹی مرکیں اور ککڑی جیسی موٹی انگلیاں..... بہادر کے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ اور اس کا کافوری سینہ...... جنو کی کھونٹے جیسی ناک...... غرض جسم سے کہیں چھٹکارا نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دل لبھانے والا جسم یا آراستہ جسم اپنے تناسب میں رعنائیاں لئے ہوئے یا پاکیزگی اور نفاست کے لئے داد طلب۔ نہیں، بلکہ محض جسم، اپنی گرمی سے پُر نم اور مقناطیسی خون کی حرارت سے سنسناتا ہوا، جسم بھی ایک آفت ہے۔ یہ ہم پھر اپنی خواہشوں کے ساتھ اندھے مشٹنڈے کی طرح یا بقول عصمت کے "جوان جاٹنی" کی طرح سوار ہے جب خواہشیں پھنکارتی ہیں اور جسم جسم کو پکارتا ہے تو ان افسانوں کے کیریکٹر آہیں نہیں بھرتے، غزلیں نہیں گاتے، شعر نہیں لکھتے، بلکہ بے چون و چرا کے اس پر اسرار آواز کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور وہ جدھر لے جائے بغیر سوچے بوجھے اسی طرف چل دیتے ہیں۔ "ایسی گھڑکتی ہیں، سانسیں الجھتی ہیں۔ بے پروا لوگ عجا دے جاتے ہیں۔ افلاس کی سڑاند سے دم گھٹتا ہے لیکن اس کے قدم نہیں رکتے" یا عصمت کے الفاظ میں یوں کہئے کہ "جوانی غربت کو نہیں دیکھتی۔ بن بلائے ٹوٹ پڑتی ہے اور بے کہے چل دیتی ہے پیٹ بھر روٹی نہ ملی تو کیا سہاونے خواب تو کوئی روک نہ سکا۔ جمپر اور شلوکے نہیں جڑتے تو کیا جسم نے پیر روک لئے۔ وہ تو بڑھتا ہی گیا۔" اور یہاں عزت اور شلوکوں کی جگہ کچھ ہی رکھ دیجئے، جسم کے پیر نہیں رکتے۔

اور جب اس جسم میں طوفان آتا ہے" اور پیٹ پر کن کھجورے رینگنے لگتے ہیں۔" اور دل و دماغ پر اندھی کیفیت طاری ہو جاتی ہیں تو یہ عجیب عجیب بیر باندھ لیتا ہے لیکن جسم اپنا بدلہ جسم ہی سے لیتا ہے چنانچہ اس کشمکش کے زیر اثر حلم اور گداز اور ملائمت نہیں پیدا ہوتی۔ کیریکٹر تخیل کے ریشم میں لپٹ کر غنودہ نہیں ہو جاتے بلکہ ان میں کرخت قسم کا الھڑپن اور درشت قسم کی شرارتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چھیڑتے ہیں۔ دق کرتے ہیں، کچکچیا کر کھٹولیوں پر پٹخ دیتے ہیں۔ ننگے جسم پر بدھیاں ڈال دیتے ہیں۔ ہونٹوں کو چٹکیوں سے مسل دیتے ہیں۔ پیر سے پیر دباتے ہیں۔ تھپڑ رسید کرتے ہیں۔ بال پکڑ کر جھٹکے دیتے ہیں۔ دھولیں مارتے ہیں چاہے پر کس کس کر لگاتے ہیں۔ گھسیٹتے ہیں، بھنبھوڑتے ہیں یعنی دل پر کچھ ہی گذرے۔ جسم کی گرفت کبھی ڈھیلی ہونے نہیں پاتی۔ اور یہ جذبہ شروع سے آخر تک اپنے کھردرے پن اور بد دیانتی کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو پھر عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے؟ نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ افسانے بلا شبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں۔ اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ جسم نہ چاند تارے نہ پھول نہ صحرا۔ آرٹ کو تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی واردات کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے یہ سب چیزیں تو محض محرکات

ہیں۔ ان میں نہ سہی دوسری سہی۔ اس سے گذر جائیے کہ کس چیز کا نام لیا ہے۔ یہ دیکھئے کہ ذکر کیا ہو رہا ہے۔ اگر ذہنی کیفیات کا دخل نہ ہو تو مصور مصور نہیں ایک کیمرا ہے۔ ادیب ادیب نہیں نقل نویس ہے۔ اور جسم کا وقائع نگار علم الاعضا کا ماہر اور شارح تو بن سکتا ہے ادب پیدا نہیں کر سکتا۔

جو کچھ میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عصمت کی جنسی کشش کی ماہیت واضح کر دی جائے۔ اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے محرکات اور مظاہر کیا ہیں۔ لیکن بحیثیت آرٹسٹ کے عصمت کو پرکھنے کے لئے بالآخر یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنسی بھوک سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کو انہوں نے کس سطح پر اچھالا ہے اپنی مخلوق کو ان سے جو رنگینی بخشی ہے وہ کس رتبے کی ہے اور روح کے لیل و نہار میں ان کا کیا مقام ہے ان سوالوں کا جواب میں مجملاً اوپر ایک دو جگہ دے چکا ہوں۔ اس سے زیادہ تفصیل شاید سود مند نہ ہو ایسی باتوں کو جہاں تک ہو سکے بحث سے مخلصی دلا کر مذاق کے سپرد کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ جو آرٹسٹ عصمت کی طرح اپنی مخلوق کو یوں حیوانیت کے کنارے تک لے جاتا ہے وہ تلوار کی دھار پر چلتا ہے۔ چنانچہ ان کے مشہور افسانہ "لحاف" میں میں سمجھتا ہوں۔ ان کا قدم آخر اکھڑ ہی گیا ان کی لغزش یہ نہیں کہ اس میں انہوں نے بعض سماجی ممنوعات کا ذکر کیا ہے۔ سماج اور ادب کی شریعتیں کب ایک دوسرے کے متوازی ہوئی ہیں۔ مٹیلے کے ڈھیر سے لے کر کہکشاں تک سبھی چیزیں احساسات کی محرک ہو سکتی ہیں۔ اور جو چیز محرک ہو سکتی ہے وہ ادب کے املاک میں شامل ہے۔ آپ جس زمین سے چاہیں شعر کہیں۔ اس سے کیا غرض کہ زمین کون سی ہے غرض تو اس سے ہے کہ شعر کیسا ہے اس لئے اس پر معترض ہونے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے ولیسی باتوں کا ذکر کیوں کیا۔ لیکن اس کہانی کی قیمت گھٹ یوں جاتی ہے۔ کہ اس کا مرکز ثقل (یا عسکری صاحب کی اصطلاح میں اس کا "تاکیدی نقطہ") کوئی دل کا معاملہ نہیں۔ بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے۔ شروع میں یہ خیال ہوتا ہے کہ بیگم جان کی نفسیات کو بے نقاب کریں گی۔ پھر امید بندھتی ہے کہ جس لڑکی کی زبانی یہ کہانی سنائی جا رہی ہے اس کے جذبات میں دلچسپی ہوگی۔ لیکن ان دونوں سے ہٹ کر کہانی آخر میں ایک اور ہی سمت اختیار کر لیتی ہے اور اپنی نظریں امنڈتے ہوئے لحاف پر گاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ پڑھنے والا بے چارہ اپنے آپ کو اس قسم کے لوگوں میں شامل پاتا ہے جو مثلاً جانوروں کے معاشقے کا تماشا کرنے کے لئے سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔

عصمت نے کچھ تھوڑے سے اسکیچ بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک بھی دلچسپی، وقت نظر اور عصمت کی مخصوص کنایہ بازی سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کوئی "دوزخی" کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں اس اسلوب نظر کی مثال نہیں ملتی۔ جو عصمت نے اس اسکیچ میں اختیار کیا ہے۔ ان چند صفحات میں عصمت کچھ اس طرح اپنے پروں کو پھیلا کر اڑتی ہیں۔ کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہیں "میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر ...... میں بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں"۔ انہیں اس عذر خواہی کی ضرورت بھی یوں پیش آئی کہ اپنی دیانت پر تو ایمان تھا پڑھنے والوں کی دیانت پر ایمان نہ تھا لیکن چند ہی فقروں میں وہ اپنے خلوص اور اپنی جرات سے پڑھنے والوں کی ہمت بلند کر دیتی ہیں۔ آرٹسٹ کسی کا بھائی نہیں ہوتا۔ کسی کی بہن نہیں ہوتی۔ احساسات اور اقدار کی دنیا میں ایسے رشتے تو محض اتفاقات کا نام ہیں۔ چند لیبل جو نہ معلوم کن چیزوں پر لگے ہوئے ہیں۔ لیبل ہٹا کر دیکھئے تو نیتوں اور ذہنوں کا امتحان ہوگا۔ اور ذہن جلا پائے گا۔ عصمت نے کس خود اعتمادی کے ساتھ لیبلوں کو ہٹا کر پھینک دیا ہے اور جو زندگی میں بھی لاش تھا اس کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے لغوی مذاق میں بھی ہمارے لئے ایک ہدایت ہے۔ عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ترکیبوں اور فقروں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر بجز ایک آدھ لاحاصل سی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیبِ خیال سے بھی پاک ہے۔ اس زمانہ کے اکثر انشا پردازوں کو بہ وجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے سُر بھی سنائی دے جائیں۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مصنفوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھلیاں تو اکثر مل جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے خیر و شر دونوں سے مبرا ہیں۔ یہ تو بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور اس پاکدامنی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت وہ ٹھیٹھ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ادھر اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ اُدھر خانہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے اور جملوں کا زیر و بم روزمرہ کا سا پھرتیلا زیر و بم ہے۔ اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا۔ اور ان میں نشاستہ ثقالت اور تکلف نہیں آنے پاتے۔ مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابلِ قدر اہلِ زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہلِ زبان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قدآور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ مضمون بذاتِ خود اس امتیاز کا اعتراف ہے۔ لیکن بھول نہ جانا چاہئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سنِ رشد یا سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جبکہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اردو ادب کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں۔ تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے۔ مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو۔ ہمارے ادبِ جدید کے پات ضرور چکنے چکنے ہیں۔ لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے۔ اتنی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے۔ کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اس کارنامہ کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

(ساقی دہلی فروری ۴۵ء)

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں اور اشیائے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے کلموں کے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انھیں یاد ہو گئے ہیں اور تقریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود رہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں۔ وہ بھی اگر خط طغریٰ میں لکھا گیا ہو۔ چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپری کی تصویر بنی ہوئی ہے اس سے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

سے متعلق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام۔ گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بوڑے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے (ہندوستان کے مداریوں کا یہاں بڑا شہرہ ہے) ایک خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر بالشویکی شبہات قائم کر لئے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں سے اکثر تراجم کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلفریبیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبتناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور ہر افسانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلاء کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری ہو جائے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن کا استاد تھا اور یہ جو آجکل اس صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ تو پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر

مسلم ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جہاں کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لئے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ مہیا کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائیاں لے رہا ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے اور آنکھیں باہر پھوٹی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سفاک کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لئے جو جو تدابیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہو گی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ۔ درد۔ کرب وغیرہ اِس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہونچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ۔ درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اِس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے وصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈ لیتے ہیں یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کر لیں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا میں بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہونا چاہیئے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے ہجوم اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے ماتحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تجاوز کی متحمل نہیں۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کر کے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی اِن افسانوں کا مقصد ہے۔ اور جس کامیابی جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابل وقعت ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

"موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں، جس کی پختگی اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ بے حد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے ترشے ترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے۔"

یہ اختصار وحشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی و تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے۔ ورنہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی میں نمایاں طور پر فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو ہیو والپول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام لٹل تھیٹر یا چھوٹا تھیٹر ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "چترا" اور "تائیس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "لیلے" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف "ہیبت ناک افسانے" ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں۔ کسی انگریز کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ "ابے گدھے" سے لے کر "خر عیسے" تک جو شعر و ادب۔ فلسفہ و مذہب رسم و عادات۔ محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اسکو منتقل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، ذہانت مذاق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعۂ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لئے وقف کر رکھا ہے ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیاز مندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

"شام پڑ رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ سمجھ لو یا جو کچھ سمجھ لو ایک بورا سا اس کے پاس تھا۔ اسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی

باندھ کر کندھے پر ابھار رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا بھوکا تھا۔ پڑ رہا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ دور بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے ماں باپ کون تھے۔ لاوارث کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا تو وہاں سے نکل بھاگا۔ اِدھر اُدھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹیوں کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذر رہی تھی۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔ جیتے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا بے درد تھے۔ شکی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے ڈرتا ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

"پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔"

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک "اہل زبان" کے لئے باعث فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار۔ داغ اور امیر۔ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثہ میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنھیں خود "اہل زبان" محض مسکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا متاع ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا۔ اب ایک اور صفحے کو پڑھئے۔ جو دہلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

"اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخر کار جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے اِدھر اُدھر تکتا رہا۔ مدہم روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگر کچھ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز آئینے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست دندانے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑ دی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا یہ کوئی اس قسم کا گریز یا تصور نہ تھا جو

انسان کا تخیل پیدا کر لیا کرتا ہے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں لیکن یکلخت خیال جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک ہلکی سی گہر نے اسے ملفوف کر لیا...... اور پھر مجھے عام کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر آنے لگی۔"

یہ اردو نہ بازار میں پیدا ہوئی نہ گھر میں۔ اس نے نہ لشکر میں پرورش پائی نہ قلعے میں۔ بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ نئی تہذیب کی ضروریات نے اسے ایجاد کیا اور مطالعے اور خوش مذاقی نے اسے یہ دلفریب صورت بخشی۔ اس بارے میں ہمارا ادب سجاد حیدر۔ ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنھوں نے بعض ایسے دروازے کھول دیئے کہ ترقی کے کئی راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے میں نے امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف میں اتنے متباین ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب میں ڈوبی ہوئی ہو۔ محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یقین مانئے انشا پردازی کا کوئی ایسا فن نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

"پطرس" از کیمبرج

(مخزن مئی ۱۹۲۸ء)

وارفتگیِ جذبات

بھائی...... تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے۔ جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس نے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تھکان کے بعد خوابِ راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری، اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا ' رباب کی سادہ موسیقی ' رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سرحدی کوہستانوں کے درشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، غیور، اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنع سے مبرّا فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ خیبر کی آغوشِ کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محجوبیت آ گئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے رعبِ حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصہ میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے۔ اور ندی کے بیچ میں سے گذر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظر در سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور ریتلے کوہستان میں اس کے گیت کی مہجور سُریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو، عشق اس میدان و کوہ میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ خیبر کے بنجر اور ڈراؤنے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دور افتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی دہشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں۔ اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پر اسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بے حد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں کھاتا فقط ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک طلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ اور تنہائی ایک محشرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ اور گیت میں لے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن۔ جولائی ۱۹۲۱ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا، جس تیز روی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرۂ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گذرنے پائے گا جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینۂ دل

بچپن کے جذبات گویا ساحلِ دریا پر چھوٹی چھوٹی، ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں جہاں ننھے ننھے ننگے پاؤں سیپیوں کی تلاش میں ریت کی باریک اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مسل دیتے ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں اور پانی کے چھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوش نما نازک بربط جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا، اور جو ایک درخت کے سایے کے نیچے تنہا پڑا ہے۔ جس کا زیر و بم لاابالیانہ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھرا پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک خندۂ آزاد، ایک بے ترتیب سا نغمہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

اٹھتی جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں کے طلاطم پر سطحی سکون بے خبر سا مسکرا رہا ہے۔ جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں اٹھتی ہیں۔ اور سطح کو چھیڑ کر واپس ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک طلاطم پنہاں ہے اور ایک محشر فروانی۔

جیسے بربط ایک ہنرمند مغنی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی ہنسی روکے ہوئے منتظر کھڑے ہیں اور مضراب کو نافہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق کا بلاخیز طوفان روئے دریا اور قعرِ دریا کو ایک کر دیتا ہے۔ جب غرقابی کی ہر کشتی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کرلے جاتی ہے جیسے قہرِ خداوندی، جہاں ہر ایک بھنور طاقت ور سے طاقت ور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے جیسے قسمت کی مجبوری۔

بربطِ ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خراش نغمے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور اپنی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر و بم کو تنکوں کی طرح لپیٹے لئے جاتے ہیں۔ ہوش و حواس سروں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دل چیرنے والے سرد ایک نشیلے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ اگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوشِ مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل کر الٹی پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان لیس ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی لنگ رہ جاتی ہے اور آخر کار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجۂ ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا تو بیاباں ہو جاتا ہے اور ایک ویران سنسان، ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گیت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے حجابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نازک اپنی لباط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط 'بربط' نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحہ، ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی۔"

(مخزن۔ نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھ میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں الٹا کر ہی لگا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے مانوس فطرتِ انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا پھر جب میں آئینے کو یونہی ہاتھ میں تھامے اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھینکے ہوئے چلنے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک مہیب افتاد کے کنارے پر ہوتا اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑک رہا ہوتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل کے ناتمام ہاتھوں نے اسی فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں جھکا کر دوڑ بھی سکتا ہوں۔ اب اس کی حقیقت کے متعلق ہرزہ سرائی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں اس کو کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام بے چینی مجھے نیند سے ناآشنا کر دیتی ہے دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام رہگیر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کے پھنکار کی پُراسرار گونج معلوم ہوتی ہے گویا فطرت کی آہِ سرد ہے یا الہام کی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک اندوہ کے راز سے مجھے غرقِ تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و ما فیہا پر چھائی ہوتی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پُرہیبت عظمت کے نیچے ایک ذرہ حقیر اور ایک روحِ بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے۔ جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں گھرا ہوا پاتا ہوں جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک وارفتہ سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پہنائی پر ایک افق سے دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلب گار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہرِ سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت و رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا تاریک منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتہً ایک کم لقا سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر مل گئی ہے جب یہ آواز ایک لمحہ کے لئے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ اور میرا دل ایک لمحہ کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آکر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنسان کے بخیف نغمہ کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو سلگتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کہیں تاریکی میں غائب ہو جائی گی۔ میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لمپ کی روشنی مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے بھیڑ کے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں چھا رہی ہے حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے ماتھے کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پُر اسرار چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر یکلخت مجھے اپنی وحشت دکھائے گا۔ اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔

میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں. لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے، جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا. گھڑی کی سوئیاں جن میں میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی اب کسی اور جگہ ہیں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں. کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ کر مجھے کھینچنے کیلئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور کیا خاموشی اور تاریکی کے جادو نے مجھے اس تنہا بچھانک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک ٹانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے، یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا. سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔

میں اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں ۔

(نیرنگِ خیال)

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکن) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمونوں کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ، آر، مرو (EDWARD. R. MURROW) کی ایک تالیف دِس آئی بی لیو THIS I BELIEVE سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاہیر میں سے ہیں۔ کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے اور تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دل چسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہلِ انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف، جمہوریت، ملت کا خیال، جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا سوچے سمجھے اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی۔ اور شدید خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت مین میخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہی کسی بحران کے زمانے میں بروئے کار آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکنوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک، اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا — دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں کے اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ اور امید ہے دل چسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکنی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک — ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا — ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا اسلام

کا ـــــ ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ، دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز ـــــ ایک یورپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر بھی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دست بردار، دونوں ایمان کے قائل، جدوجہد کے قائل، عزم وخدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشری خدمت اہم ترین ضروریاتِ ملی میں سے ہے، البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں۔ اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ بطن مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر ومسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسر کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصّہ لینا لابد ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو بہت عرصہ تک سربرآوردہ نمایاں قوم مہیا کرتا رہے گا۔ ان کے خیالات اولوالعزمانہ ہیں۔ وہ بلندی کے خواہاں ہیں ملت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشری خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جزوِ عظیم سمجھتے ہیں اور منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پس ماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو ـــــ

جب میں اس مجموعے کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھیے۔ تو دلچسپی کا باعث ہو گی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید خاں) سالک (بٹالوی) کے ہاتھ آج ہتکڑی میں بند ہیں اور صفحۂ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ فطرت کے جو خال اس کی قلم طرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چشم امتیاز کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ جب تک زندان کی چاردیواری سالک کو اہل نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے روشن دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشین محشر۔ وہ انجمن خلوت، اس وقت حراست و بند سے آزاد ہوتا تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کج بیں اور نکتہ چیں ثابت ہوتی ــــ ایک وقت اور صرف ایک وقت ــــ جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادب لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا، جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار دگل گشت میں یہی رنگ دبو تھا۔ بادیۂ دشت میں آج یہی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہل مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہل درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو، خواہ وہ "فلورا پارکنس" ہی کیوں نہ ہو، اس کا حجلۂ عروسی۔ اس کی چمپا نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "عذرا" کی وفا حسد و رشک کو پامال کر گئی۔ "بیہولا" کی آہ وزاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دیئے، اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں پر روشن نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے" سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس اور معکوس۔ اسم اور مسمیٰ دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں۔ اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر ساز دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "بیہولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بیہولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار ہندو دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے

پر تلک کا ٹیکہ نظر آتا رہتا ہے۔ "ارشاد" کی کشتی دیکھتے ہی دیکھتے نیلے افق میں غائب ہو گئی" ہے لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل دوز وحشت اب تک ہنس رہی ہے۔

سالک کو انتہائے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر، لاہور اور بمبئی کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پا بجولاں دیکھا تو انہیں "سدا بہار ٹاپو" میں دلدلوں اور سرکنڈے کے جھنڈوں کے بیچ میں لے کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا جوانمرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے۔ "ہلال عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے، ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشاپردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صورت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "چترا" کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اس شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار ٹیگور کے ذوقِ سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریری سالک کی کافرماجرائی کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ حیات ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے مجھے اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مخلصانہ نے تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے نیاز مند آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

"پطرس"

۶۱۹۲۲

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصہ سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں، تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے، جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فن" کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پر مست ہیں۔ ایک ایسی شراب طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظرباز؟

۱۹۲۵ء

"پطرس"

جھولنے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہلکی پھلکی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے دیباچہ کا بوجھ نہ پڑنا چاہئے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی پخ بھی لگا رکھی ہے۔ صوفی تبسم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ "والدین" بھی ہیں اور "استاد" بھی، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے۔ اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے، بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا، گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہو لئے۔ بڑے کہیں گے، چیچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں۔ اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہر حال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں۔ جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی ملانا بے فائدہ بات ہے بوجھوں مارنا چاہئے۔

خدا کا شکر ہے صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور بلیاں بیر کھاتی ہیں اور ٹرٹر موٹر چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لئے قابلِ رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں چہچہا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش ذوق سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا اس کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا اسی طرح سہل ممتنع بھی مہمل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدر دان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ ؎ چہل سال عمرِ عزیزت گذشت مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت۔ "پطرس"

دہلی ۵ر جون ۱۹۳۶ء

ایران میں اجنبی

ن م ۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف المدرسین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ لئے۔ این کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ع

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اور ان کو بیچ میں لاکر دزدیدہ اوقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں لیں۔ این کے کیفے ٹیریا میں ہوئی ہیں۔ اور ہم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نقادی پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل ضرور سمجھیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعرا پر طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی قافیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے

جو اس سے قبل نظروں سے اوجھل تھے نا ممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا اندازِ فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی ہمت بڑھی بلکہ راشد کے اسلوبِ بیان میں تو کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے۔ لیکن فیض کی کئی ادائیں فضائے نظم میں حلول کر جاتی ہیں ہر پتے اور ہر پھول میں نظر نہیں آتیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چسکا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑ جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے نہ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جدید شعراء جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تصرفِ نظر کے مابین کیا علاقہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دل چسپ فریب ہے۔ جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یک جا کر دئے ہیں۔ ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کا حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخلِ ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق و بُعد ظاہر ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری باغ لگاتی تھی وہ ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہوتے؟ ایران تو ہمارے شعراء کا رضاعی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ لسے ایران (اور عربستان) کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہوا۔ "من وسلوے!" میں تو آپ ایران سے درپردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں، اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے "رضاعی بھائی" کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ———

خدائے برتر

یہ داریوشِ بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور "جانِ عجم" سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریز کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے "سیاہ فام" جسم میں ایشیائی روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی ناآشنا تھا۔ اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور "غیر کے بے پناہ بھرے ہوئے ستم" نے ایک نئے انداز سے آپ کو جھنجھوڑ دیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ———

قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژادِ کاہل ہیں
اور اپنی اجل کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بے قرار ہو کر للکارے ——
ان اونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارو پہ اپنے نگہبان چڑھا دو!
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشد نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہلِ مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتا ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے نردبان پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں، لیکن آپ کی نظر اور بلندیوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں، جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا طنز واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ——

مگر وہ تیری حد سے گذری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشہ گر میں دیکھتا ہے

جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا
جس میں ملت کے افکار کی اک کرن کا گذر ہو
اسی کا نتیجہ کہ اک روز
کہنے کو باتیں بہت تھیں
مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو کر ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کسلِ مذاق ہے۔ یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند انسانوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔ اس ہول کا نقشہ جو انتہائی نخوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیازمند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب تو اس مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے۔ ایک کو الفاظ پر محمول سمجھئے دوسری کو جذبات پر۔ گو الفاظ و جذبات کی یہ تمیز محض بغرضِ سہولت ہے اس پر بہت بوجھ ڈالنا نہ چاہئے۔ پہلے شوکت کو لیجئے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹھیٹھ زبان کے ماہر بھی تھے۔ اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے۔ (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں مسکین اور گھریلو الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اکثر اپنے نعت کو ایران اور عربستان کا جبہ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ سرنگوں بات بھی ہو تو اسے "سرنگوں" کہہ کر اس میں کروفر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم جھوم کے پڑھتا رہا ؎

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر ڈھونڈتا رہا کہ اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ عجز جتنا بھی تھا اس سے نعت کا طنطنہ کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قدامت پسند ہیں۔ نعت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایتِ ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک فات پات کے قائل ہیں کہ جو شودر ہوا وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستانِ شعر تک کبھی نہ ہو گی اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کب تک ہماری شاعری کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھریں گی اور وہ دن کب آئے گا جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نوازیں گے۔ اور قیام پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں۔ اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو ملزم کیوں بناؤں اس حمام میں ہم سبھی ننگے ہیں۔ غنیمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو محض بوجھوں تو نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں وہاں بھی خون کو گرما ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "داریوش" اور "دلاک" اور "لباس کبودی" اور "لہستان" اور "کوروادی" واللہ سب گوارا ہیں۔ بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے کوہ کاں الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں ___

شکر اور قہوے کے ملفوف ارزاں
جو بازار میں انتہائی گراں تھے
اس لئے گمان ہے کہ انہی بلند آہنگیوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ـــــ
منو کے آئین کا قلم سہتے ہوئے ہریجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے دزدِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے سینے سے
آج بھی کور وکرہیں ہم سب
جواب بھی چاہے
تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہو گا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوشش کہہ بیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوشش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے شاعر اپنی ہی کیاریوں کو روند ڈالتا ہے جیسے بچہ ضد میں آ کر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعرا ر جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں انہوں نے نام پیدا کیا۔ اور علاوہ بریں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پہلے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ نہمت میں آپ اس شدت پر وہ قابو نہ پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے، جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی۔ کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کے شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

کہ دیکھی ہیں میں نے ہمالہ دالوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

میں معنی کی دو تین جہتیں ہیں جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں لپیٹ کے رکھ دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا ـــ

یہ درویش
جن کے اب وجد
وہ صحرا کے دیرانہ کی ریت پر
تھک کے مرجانے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست اور خاک تیرہ میں غلطاں
جو تسلیم کو بے نیازی بنا کر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے
جنہیں تھی فروغ گدائی کی خاطر
جلال شہی کی بقا بھی گوارا
جو لاشوں میں چلتے تھے
کہتے تھے لاشوں سے
"سوتے رہو
صبح فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہار شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا حد کی کس کو خبر ہے؟

"لاشوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بپھرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار رعنت اور کیا بہ اعتبار واردات قلب اور مزاج شاعری کے حاصل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا انگارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں" یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن کے آپ بانیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں

اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدما رکے مکالمے الف بے الف بے ...... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے ——

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال

وقس علیٰ ہذا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچدار معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ لہجے کا نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ نبنا پڑتا ہے۔ یہ مہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی۔ اور آپ نے اسے جا بجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعتِ مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے ——

زمستاں کے دن تھے
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے
مگر برف کا رقصِ سیمیں تھا جاری

......

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ کے گلولے پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے
کف آلود ساحل سا لگتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری ——

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو لامحالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اس کے کلام کو کبھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ ابلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو دررانہ دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

"پطرس"

نیویارک

۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

چھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض یورپین نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟ انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔ عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو بچہ جننے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر اوروں کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیا ہے، ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے۔ جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرتِ نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دل جمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرتِ نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانت داری سے لکھتی ہے، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے ہمارے ہاں ادیب عورتوں

کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روداد جس جرات اور بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے مردانہ ادب کو بھی ریا کاری کے گھونگٹ الٹنے پڑے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے۔ پہلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی نظرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی نظرت ہی کو نبھا رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ انوکھے اور پُراسرار جال ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں، اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں۔ اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خار پشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو، ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ..... " میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قُرب —— ایک بَیر اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جلاپوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس رینگتے ہوئے سایے سے ڈر آنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں، وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے بھی قدر دان ہی سمجھنا چاہئے۔

"کاروبار" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم ملے جلے پائے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں۔ اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی۔ کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمر یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائے گی۔

"ایک بچی" کو آپ محروم ماتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال زاہدہ (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

"مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے..... گلی کے اس مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا..... میرے اندر ہی اندر کوئی الجھ کر ٹھنکنے لگا..... میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گڈ مڈ کر دوں...... گلی میں جیسے کوئی نشہ میں بہکتا ہوا گذرا، مست اور بے پروا، اور مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری باہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں، سینے پر بے کار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں، تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے، کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں، نہ

معلوم ہاجرہ نے بننے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سلجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس سلیقے کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے وہی آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے اپنے لئے کتنا سہل بنالیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ـــــ "سرگوشیاں" اور "لاعلاج" ـــــ ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیئے۔ دونوں کا اسلوب ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو اپنی تیز رو میں ماضی کی باتیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھلتا ہے۔ جیسے کوئی "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" پکار کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب گیتا کی گذشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کرکے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رقت بسا اوقات دہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پُر ہے لیکن آفریں کہ ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لاعلاج" میں ایک دادی ہے ایک پوتی ـــــ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصلیت اور حساسی کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا کرمین کی بھائیں بھائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرمین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کرکے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے :-

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی۔ کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن و سال کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلے جاتی ہے اور یہ اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی اور زندگی کو نہ جانے کس وقت کوئی پھونک مار کر بجھا دے۔ کہنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں ......"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک الوٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں۔ ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچدار ہوتا ہے جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کھٹے پھل لگتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا۔ نئی

سے نئی جز نظر آئی۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہرے سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں کئی نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینیں بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی خلوت شعاری کی وجہ سے رسائی اور مصنوعی "ادبی" زبان سے بہت حد تک مامون رہی ہیں، چنانچہ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو جیتے جاگتے الفاظ کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے۔ اِترا اِترا کر اپنی طرف نہ دیکھتی نہیں رہتی اور اسی الھڑپن کی وجہ سے بے تکلف وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے مشیانہ گلے میں اٹک کر رہ جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی ژرف نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ دیکھئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں:

"کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے۔"

"لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے کم بخت منہ کی اودواہٹ چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو اور سخت نب پر زور دے کر کھینچو تو یونہی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھسنے پر جسم سے لپٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولھا۔"

"اس کے احساسات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقرے کو کھبوریں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا۔۔۔"

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے نساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔"

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگتی۔ جیسے جیٹھ بیساکھ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گذرا جیسے کوئی ننھی چڑیا چہکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں..."

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور جذبے یا خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آئی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے کیوں کر چل سکتا ہے اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ ان کی طبیعت کا اصلی جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا۔

"پطرس"

سفرِ انگلستان

(خطوں کے پیرائے میں)

۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء ۱ بجے دوپہر

امتیاز بھائی! یہ خط بحیرۂ احمر میں ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ۹۰۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ ذرا اندازہ لگائیں میں اس وقت بمبئی سے ڈھائی ہزار میل کے فاصلہ پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں۔ اسے کہتے ہیں سفر۔ لاہور سے پشاور کا سفر اس کے مقابلے میں چہل قدمی سا معلوم ہوتا ہے۔

خیر اپنی داستان کو ابتدا سے شروع کروں۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ یکم ستمبر کو جہاز پر پہونچ جائیں۔ وہاں ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ آگے ہی ڈانواڈول ہو رہا تھا دعائیں مانگتا گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے۔ اس معائنے کی کیفیت میں یونہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں۔ جس کی نبض بند ہو اسے بمبئی میں ہی روک لیتے ہیں۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بھانت بھانت کے جانور دکھائی دیئے۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی بنگال۔ مدراس۔ پنجاب۔ یوپی۔ بمبئی سبھی صوبوں کے لوگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے بڑے چغدوں کو چن کر بھیجا ہے۔ ایک سے ایک نرالی صورت کا آدمی اور ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے بعض نسان نما حیوان ہیں کہ پھولوں سے لدے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت "اپ ٹو ڈیٹ" ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس اظہار کے لئے کبھی کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر تیز تیز قدم اٹھاتے نکل جاتے ہیں۔ جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں۔

آخر جہاز روانہ ہوا اور جہاز پر سے بھی اور ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے۔ کئی دیسی شرفا معلوم ہوتا تھا برسوں سے رومال ہلانے کے انتظار میں تھے۔ دل کھول کر "رومال لانے" ان میں سے ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا اور جب کسی حضرت کا رومال ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں گر جاتا تو ان کی خفت قابل دید ہوتی۔ جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو یہ طوفان بدتمیزی تھما۔ اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے۔ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں۔ "اچھا۔ تو گویا یہ سمندر ہے۔ تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں۔ بھئی بہت اچھے!" جو دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ

بیٹھے ہیں اور ابھی سے وینس، لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت واقفکارانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفت گو کر رہے ہیں۔ ایک کونے میں میں بھی بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے ہوا تیز ہونے لگی اور سمندر یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی گھٹیا سے مصوّر نے کوئی تصویر کھینچی ہے۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور میں بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں دور افق کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت معلوم ہوا جیسے افق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے جیسے ترازو کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لمحے بھر کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے۔ ایک دو منٹ نہ گذرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دفعتاً ٹخنوں اور گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے کر دیئے ہوں۔ معدے میں ایک برف کا گولا بہت زور سے نیچے کو گرا۔ انتڑیوں نے اچھل کر پھیپھڑوں کے ایک گھونسا مارا اور کھوپڑی کے اندر بھیجے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کیا۔ اور پھر تے۔

یہ ابتدائے عشق تھی۔ ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا۔ بس انتہا! کچھ پوچھ مت۔ دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہوگی۔ موت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ نزدیک و دور سے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی ندائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغا جا رہا ہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو تمام جہاز چت پڑا تھا۔ "کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی۔"

پانچ دن رات میں بستر پر پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک فرانسیسی لونڈا سا ہے۔ شکل ہیرلڈ لائڈ سے بہت ملتی ہے۔ انھوں نے آتے ہی بے تحاشا فرنچ شروع کر دی اور متواتر بیس منٹ تک بکتا چلا گیا۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے۔ چنانچہ کیا۔ اس سے قے تو بند ہو گئی لیکن دماغ برابر جھولا جھول رہا تھا۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہو۔ ہر لمحہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا۔ ہم ہمت کر کے تختۂ جہاز پر پہنچے۔ اور ایک کرسی پر لیٹ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کئی کشتگانِ ناز باری باری باہر نکل رہے تھے۔ شکلیں چوہوں کی سی بنی ہوئی۔ چال ایسی جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو۔ جہاں بیٹھتے تھے بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگنے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی۔ جہاز پر دن میں پانچ دفعہ کھانے پر جمع ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تابانہ داخل نہ ہوا ہوں۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے۔ ہندوستانی بھائیوں کے لئے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیوں، بے حوتیوں اور خفتوں کے سامان موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اتنے عرصے سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کر لیتے اور انگریزی کھانے کے آداب و قواعد کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ ویشنو حضرات کے لئے اور بھی مصیبت ہے۔ بار بار پوچھتے ہیں اس میں گوشت کی تو کوئی آمیزش نہیں۔ اس میں یخنی تو نہیں ڈالتے۔ یہ چربی میں پکا ہے یا مکھن میں۔ آئسکریم میں انڈے تو نہیں پڑتے۔ لنچ اور ڈنر پر دس دس بارہ بارہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ لیکن ان بے چاروں کے پلے ایک دو ابلی ہوئی ترکاریوں سے زیادہ نہیں پڑتا۔ مہولتوں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو بائیں ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں اور دائیں ہاتھ کے ساتھ چمچے سے کھاتے

جاتے ہیں۔ آئس کریم کے چمچے کو نمک کلھیا میں ڈال دیتے ہیں اور پھر نمک کے چمچے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر کھاتے کھاتے ہر وقت مجرم نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سؤر کا گوشت ہر روز کھانے پر ہوتا ہے۔ لیکن بھائی اب تک تو ہم نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہو۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور عدن کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب بنا۔ وہ غوطہ لگانے والے لڑکے بہتیرا تلاش کیا کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متقدمین یونہی گپیں ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے لیکن بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دوکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے۔ تمہیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر میرے جہاز کی تصویر تھی، امید ہے ملا ہو گا۔

یہاں سے ۷ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہوں اور رات کو وہیں بستر بچھوا کر سوتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے لبا اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر۔ وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ۔ جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو روح جیسے پھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے۔ جزیرے کے ایک سرے پر لائٹ ہوس ہے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے لمپوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُر اسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے ہر روز رات کو سنیما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے۔ کھانے پر ہی دعوتی رقعہ مل جاتا ہے ایک پروگرام میں تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے۔ اچھا خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بمنزلہ بینڈ کے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے (THE BACK BITER) باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی فلم نمبر ۲ ہیرلڈ لائڈ کا کامک تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سنیما سمجھو۔

اب ہم بحیرۂ احمر میں ہیں۔ مکے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے رہے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی ہیں اور افق تک جا بجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمہیں یاد ہو گا میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور سمجھ بھی لیتے ہیں ورنہ جہاز کے افسر اور ملازم بس اشارے۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس انشاء اللہ پہنچوں گا تو سناؤں گا۔ ہزارہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب۔ سالک صاحب۔ جگل صاحب، منشی صاحب، اختر صاحب حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام، بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار

بخاری

(۲)

لندن ۲۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

امتیاز بھائی! میں تم کو وینس یا یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لئے نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور دوسرے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو اس خط سے جلدی نہ ملتا۔ پچھلا خط میں نے آپ کو سوئز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہنچا۔ کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں نہایت خوش وضع اور خوبصورت ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق مغرب کی تقلید کی ہے۔ لیکن افریقی طرزِ تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دوکانیں خوش رنگ ہیں۔ تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بے کار ہیں۔ انگریزی سوٹ، سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں، حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دوکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی کے انداز میں چل دیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں اور از حد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ جیں بجیں ہو کر ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرۂ روم میں داخل ہوئے۔ سب نے گرم کپڑے پہن لئے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعلیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈیزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اتر کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ برنڈیزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع رابن ہڈ سے ملتی جلتی ہے۔ سر پر ویسی ہی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا زاویہ بانکپن کی شان دکھا رہا ہے۔ پولیس کے افسر بڑے بھیلے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی میں تنے کھڑے تھے جس پر پیتل کی آرائش عجب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار، جب بازار میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے تو آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے بعد شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں جہاز کو الوداع کہا۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے ایک لوان انگیز خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس سمندر کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا پڑھا ہے وہ سب ہیچ ہے۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا سماں نہیں باندھ سکتا۔ عورتیں

نہایت حسین، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مرد از حد با اخلاق، خوبصورت اور بانکے بانکے لمبے لمبے بال رکھتے ہیں اور ان کو بہت پریم سے سنوارتے ہیں اکثر لوگ مرد اور عورتیں سر ننگے پھرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ان کے بالوں کی خوبصورتی کو خوشنما سے خوشنما ٹوپی میں چھپانا بھی ظلم ہے۔ اخلاق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں میں پیر میسیاں پیر میسیاں (PERMISSION) کی آواز آتی رہے گی۔ جو انگریزی کے (EXCUSE ME) کے مرادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس لوچ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ قوم انگلش کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا۔ رات کو وینس ایک دلہن ہے جس کا سنگھار کوئی ایسی زبان بیان کر سکتی ہے جس میں مجھے دسترس ہو VIOLIN اور BONJO اور QUITAR وینس کی نہریں خوبصورت، نازک، ہلکے ہلکے گنڈولے، ہفت رنگ کی روشنی، حسین لوگ جن کی زندگی سر تا پا محبت کا ایک قہقہہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز! خدا کی قسم یہیں مرنے کو دل چاہتا تھا۔ ہائے میں کیا کروں ہندوستان میں کوئی بھی تو ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے یہ کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہوش انگیز ہے۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا۔ دنیا بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں۔ میں دن بھر (pirra San Marco) (وینس کا ایک بہت مشہور چوک ہے) میں کھڑا اپنی آنکھوں کی ساقی گری کرتا رہتا تھا۔ رات کو گرینڈ کنال (Grand canal) کے کنارے جیسے نشے میں جھومتا رہتا تھا۔ ایک دن پورا سینٹ مارک کا گرجا (Ducal Palace) اور اکا ڈیمیا دیکھنے میں گذرا۔ ان کے حالات انشاء اللہ خود حاضر ہو کر سناؤں گا ورنہ یہ خط کبھی ختم نہ ہوگا۔

وینس کا شیشہ تو آپ جانتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے ایسے کے وہ وہ عجائبات دیکھے کہ ان کے تصور سے آنکھیں اب تک خیرہ ہیں دل کڑا کر کے وینس کو خیرباد کہا اور میلان (MILAN) آیا۔ یہاں کی چند عمارتوں کے علاوہ کوئی بات قابل بیان نہیں اور ان کے ذکر سے میں اپنے خط کو خشک بنانا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس کے بعد لوزان کی کوہستانی دلنوازی اور سوئٹزر لینڈ کی دلفریب فضا یہ سب قصے دہلی مسلم ہوٹل میں بیٹھ کے ہوں گے۔ فرانس میں داخل ہوتے تو پیر میسیا کی جگہ پارداں میسیو (PARDON MONSIEUR) اور پارداں مادام (PARDON-MADAME) نے لے لی۔ فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گذرتے ہیں تو دونوں یہی فقرہ دہراتے ہیں۔

یورپ کی ٹرین (CORRIDOR TRAIN) ہوتی ہے اور سفر بہت لمبا تھا۔ اس لئے اکثر لوگ ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے تھے۔ میں محض شوقیہ ادھر سے ادھر تک چکر لگاتا تھا۔ بس سر نیچا کئے، چہرے پر مسکراہٹ، پارداں میسیو، پارداں مادام، پارداں میسیو، پارداں مادام کہتا ہوا نکل جاتا تھا۔ عجب لطف تھا۔ فرانس کے لوگ ٹرین میں ہمسفر ہوں تو گو آپ ان کی زبان سے ناواقف ہوں اور انھیں اس بات کا علم بھی ہو تاہم مرد ہو یا عورت، آپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیں گے۔ میرے ساتھ ایک مادام تھیں وہ فرانسیسی بولتی جاتی تھیں اور مسکراتی جاتی تھیں۔ میں انگریزی بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ نہ میں ان کی بات سمجھتا تھا نہ وہ میری بات سمجھتی تھیں۔ تاہم ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا جو بہر نوع بہت خوشگوار تھا۔

اسی ٹرین میں انگریزی آدمی دور سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ پائپ منہ میں ٹھونسے ٹرین کے ایک کونے میں بیٹھا۔ ماتھے پہ تیوری چڑھائے ٹائمز کے اشتہاروں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ آپ نے کسی موقع پر (Excuse me) کہا تو انھوں نے اپنی بھنویں ذرا اونچی کیں۔ آپ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ خدا شاہد ہے کہ اطالیہ، سوئٹزر لینڈ اور فرانس دیکھنے کے بعد انگریز کو منہ لگانے کو دل نہیں چاہتا۔ ریل میں یہ تھا کہ کوئی دوسرے کی قومیت سے واقف نہ تھا۔ اس لئے ایک پیر میسیاں دوسرا پارداں کہنے کی کوشش

کرتا تھا اور بعد میں معلوم ہوتا تھا دونوں انگریز ہیں۔ ریل میں دو نیوزی لینڈ کے باشندے (میاں بیوی) جو سوئٹزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آرہے تھے اور جو اپنے (Honeymoon) پر سب دنیا کا چکر لگا رہے تھے ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ بھی آجکل لندن میں ہیں۔ یہاں ان کی اپنی موٹر کار ہے۔ آج شام کو انھوں نے مجھے کھانے اور سیر کی دعوت دی ہے۔ اغلباً تھیٹر لے جائیں گے۔ افریقہ، سیلون، چین اور امریکہ دیکھ چکے ہیں۔ ہندوستان جانا فضول سمجھتے ہیں۔ فی الحال یورپ کی سیاحت کر رہے ہیں۔

خیر میں داستان کو مختصر کروں۔ ہوتے ہوتے لندن پہنچا۔ لندن کی وسعت اور عظمت کی کہانیاں تم کئی سن چکے ہو۔ لیکن لندن مجھ جیسے آدمی کو موہ نہیں سکتا۔ بھلا جہاں بازاروں میں لاکھوں موٹریں اور ٹرمیں اور بس گاڑیاں اور جانے کیا کیا بے تحاشا بھاگی جا رہی ہوں وہاں دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور دل بے چارا کس شمار میں ہے۔ دل میں ہو کیں تو جب اٹھیں جب دم نہیں ہو۔ ہائے دہیں کی کیا بات ہے!

یہاں آتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر تھیٹروں کے اشتہار دیکھے۔ کام کی تین EVERY MAN'S THEATRE میں Old voice ہو رہا ہے۔ کمبخت دور بہت ہے۔ لیکن بھلا ہم دیکھنے سے کیوں باز آنے لگے Arms of the man میں Light of Asia میں (PHILHORMOUR) ہو رہا ہے وہ بھی دیکھوں گا۔ KING JONN میں ہو رہا ہے۔ وہ رات دیکھ آیا ہوں۔ فلم بہت شان سے شروع ہوتی ہے اور دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ایکٹنگ تو خیر معمولی ہے (بے ہودہ نہیں) لیکن Atmosphere بہت نزاکت سے پیدا کیا گیا ہے۔ فلم تو آپ لاہور میں ضرور دیکھیں گے لیکن اللہ کرے جو موسیقی یہاں تھی وہ وہاں بھی ہو۔ گوتم کی پیدائش میں انھوں نے یسوع مسیح کی پیدائش کا سا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دوران میں جو موسیقی بجی تھی اس میں بھیرویں کی بے شمار تانیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس میں آپ ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ سمجھیں اور یوں بھی آرکسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگوں کا رنگ نمایاں تھا۔ ایک مقام پر گوتم کا باپ ایک خواب دیکھتا ہے۔ وہاں پر باقی آرکسٹرا تو بالکل خاموش تھا صرف CELL زدہ طنبورے کی مانند بہت بڑا سا وائلن VIOLIN ہوتا ہے صرف اس کے تار کمان سے نہیں ہاتھ سے بجا رہے تھے جس طرح ستار بجاتے ہیں اس کی گنبیر تھرتھراتی ہوئی سُریں بہت ہی موزوں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر کچھ ہنگامہ سا تھا وہاں سب آرکسٹرا بجانے والے اپنے گلے سے بھی سُریں نکالتے تھے۔ الفاظ نہ تھے محض الاپتے تھے۔ یہ تصویریں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تماشے کے بعد مفت ملتی ہیں۔ ملتی کیا معنی وہاں ایک طاق میں رکھی ہیں جو چاہے جتنی چاہے اٹھا کے لے جائے۔ باقی سینما، تھیٹروں وغیرہ کے متعلق جو سوالات آپ کے دل میں اٹھیں وہ یا تو مجھ سے پوچھئے یا میرے آنے تک ملتوی رکھئے۔ میں فی الحال لندن میں مقیم ہوں۔ چند دن کے بعد کیمبرج جاؤں گا۔

لندن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن میں بھی گیا حب وطن کی خاطر! وہاں کا ممبر بھی بن گیا۔ لیکن وہاں کی فضا میرے لئے ناموافق ہے۔ بھلا جہاں طرح طرح کا نیٹو اپنی جبلی بدتمیزیوں پر ایک ہلکا سا انگریزی اخلاق کا غلاف چڑھائے فرعون بے سامان بنا پھر رہا ہو وہاں بخاری کے پیٹ میں درد ہو یا نہ ہو؟ خیر دیسی بھائیوں کا ذکر ہی جانے دیجئے ؎

مرا از روز قیامت اگر غم است اینست

کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

عدن اور پورٹ سعید میں بہت سا اسلامی درد لئے ہوئے داخل ہوا تھا اور حال یہ ہوا کہ محض اپنی شرافت کی وجہ سے ابھی تک مسلمان ہوں

ورنہ اسلام نعوذ باللہ ننگ معلوم ہوتا ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ نہ سنایئے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دینا۔ جنگل سے کہنا کہ ظالم تو دنیس میں نہ ہوتا ورنہ زندگی سپھل ہو جاتی تیرے پیارے دوست سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا (محاورہ کیا ہے؟ پیار لینا؟ لیکن "سالک کو پیار لینا" کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ "سالک سے پیار لینا" کچھ کاروباری معاملہ معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں۔ تین یا شاید چار۔ آتی دفعہ ان کے لئے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ خرید لاؤں گا اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں ونیس میں بہت یاد آئیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "گنگو تری سے نکلی" گاتا رہا۔

قبلہ مولوی صاحب اور برادر محترم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجئے۔ گردھاری بابو، لالہ صاحب، اختر صاحب .... اور منشی رشیمین کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہیئے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجواتے رہیں۔ نہ معلوم ابھی تک تہذیب کیوں نہیں ملا۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ اور کہیئے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیں۔

تاثیر صاحب کو سلام۔ باقی جو تمھیں خیر اسے اس سے کہیئے بخاری نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ آئندہ سے میں ایک فہرست بنا کے رکھ چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپوا لوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(۳)

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا۔ بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیر اور بدحواس سا ہو تا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کئے دیتی تھیں اور بسا اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ سمجھ میں نہ آتی تھی سیکھنے کا بے حد مشتاق تھا۔ لیکن کوئی سکھلانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں مقیم ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا۔ لیکن ان کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "کھوکھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں گھبرا گیا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے پندرھواں دن ہے۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پوری اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج میں پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچا لیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں ادھر ادھر ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کھل گئے۔ جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے کالے گون پہنے تمام شہر پر چھا گئے۔ نو وارد منتے نئے گون، سہما سہما چہرہ، پرانے گھاگس گون کیا کالر پتھڑے، چال میں بے پروائی۔ چہرے پر ایک تمکنت، اساتذہ زیادہ تر فہمائش سے بے خبر اپنی دھن

میں چلے جا رہے ہیں۔ یونیورسٹی نے سانس کیا لیا ایک چھینک ماری جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آ گیا جیسے کسی گھڑی ساز کی دوکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دھکیلے دھکیلے چلا جا رہا تھا۔ سینے میں ایک عجب قسم کی دھڑکن تھی اور دل پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور میں بے یار و مددگار، نہ ہم سخن، نہ ہم خیال گھر سے کوسوں دور، بجز اپنے دل کی تقویت کے کوئی سہارا نہیں۔ ہفتے کے ہفتے گھر سے خط آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا۔

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی۔ وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو قویٰ میں ایک حرکت اور خیالات میں پرواز محسوس ہونے لگتی۔ اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ نوٹ بک کھولے بیٹھا ہوں، پنسل ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں لکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ ماتھے پر تیوری ہے۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دہراتا ہوں لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ کچھ لکھنے لگتا ہوں لیکن نہیں لکھ سکتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ معنی نہیں ڈال سکتا۔ ایسے لکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ، دلگیر انسان کیمبرج میں نہ ہوتا ہوگا۔ اپنی کم مائگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے جو سال ہندوستان میں ضائع کئے ان کا بیحد افسوس، دل میں غضبناک سے نئے ارادے، نخوت علم کو شدید صدمہ، غصہ اور رنج، ولولہ اور امنگ، سر جھکا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھائے لائبریری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان جنت نشان میں انگریزی کا ماہر، ننھی عمر میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا، دھوکا، امتیاز سب دھوکا، اے میرے بچپن کے رفیق اے مایۂ ناز ہم عصر اسب بابا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ اس فقرے کے صحیح معنی جب تمہاری سمجھ میں آئیں گے جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی لائبریری بھی ولایت میں جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے۔ اس کتب خانے میں یوں ہاتھ پاؤں مارے جیسے مثلاً تم رود بار انگلستان کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرو۔ غرضیکہ ایک بخار چڑھا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے لیکن یہ کیونکر ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے، ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے اور علوم و فنون کے اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لکچر دیتا ہے اکثر ہفتہ میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتہ میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لکچرار ہیں اور بعض لکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر یونیورسٹی بھر میں ایک ہفتہ کے اندر تیس پینتیس لکچر ہوتے ہیں۔ ہر کالج میں ایک لکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوورسیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ٹرم کے شروع میں باری باری ہر طالب علم اپنے کالج کے اوورسیر کے پاس جاتا ہے۔ ہماری باری بھی آئی۔ گون پہنے ہوئے شام کے چھ بجے اوورسیر کے کمرے کے پاس سہمے ہوئے پہنچے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ ایک نہایت نرم آواز نے "کم ان" کہا۔ اندر داخل ہوئے تو اپنے آپ کو کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک صوفے پر مسٹر بینٹ (BENNET) دراز تھے۔ مسٹر بینٹ شکسپیر اور چاسر کے ماہر ہیں اور چاسر کے زمانہ پر ایک قابل قدر تصنیف (THE PASTORS.ETC) کے مالک ہیں۔ معمولی اخلاق کے بعد انھوں نے ہمدردانہ سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ گفتگو نہایت ہلکی تبسم آمیز قسم کی اور زیادہ تر ہندوستان، اردو لٹریچر، افغانستان، سوراجیہ پارٹی، عمر خیام، الف لیلہ، پنجاب یونیورسٹی، اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور حیدر آباد کے متعلق تھی اور چونکہ ہم بھی آخر بڑی بڑی مجلسوں سے نکالے گئے ہیں اس لئے تمہیدی ہچکچاہٹ کے بعد ہم نے بھی دل کھول کر بکنا شروع کیا۔ گو بعض اوقات داستان کو زینت دینے کے لئے حقیقت سے ذرا انحراف بھی کیا، محض حب وطن کی خاطر، لیکن عام لہجہ ایک راست گو، حق پرست انسان کا تھا جو اپنی اور اپنی قوم کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے، جو باوجود قوم انگلش کے گوناگوں اوصاف سے باخبر ہونے کے انھیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مضر ہی سمجھتا ہے اور جو اب تحصیل علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھنے کو باعث صد فخر و ناز تصور کرتا ہے۔

جناب کچھ مسکرائے۔ ایشیائی تہذیب اور تاریخ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ میرے انگریزی تلفظ کی بہت تعریف کی اور مجھ سے یوں باتیں کرنے لگے جیسے میں الف لیلہ کا کوئی کیریکٹر ہوں۔ لیکن افسوس کہ تھوڑی ہی دیر بعد گفتگو نے انگریزی لٹریچر کی طرف رجوع کیا۔ ہم نے اپنے عجز اور کم مائگی کا اعتراف کیا۔ اپنی نالائقی کو کوسا۔ اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی اور جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج کیا ہے؟

جو کچھ انھوں نے جواب میں کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بالکل چغد ہو۔ اگر تم یہ توقع کرتے ہو کہ تمہیں ہر لکچر سمجھ میں آجائے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر لیوس (LEWIS) کے لکچر جن کے متعلق تم نے شکایت کی ہے وہ کیمبرج میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور کوئی بھی اس قدر گدھا نہیں ہوتا کہ چاسر سے لے کر ہارڈی تک سب انگریزی لٹریچر کی ایک گولی بنا کر نگل جانا چاہے۔ جو مصنف تمہیں پسند ہیں، جن جن کی تصنیفات تمہارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں صرف وہی پڑھو۔ صرف انہی کے متعلق لکچروں میں جاؤ۔ باقی بالکل چھوڑ دو۔ چنانچہ یہ رہی لکچروں کی فہرست۔ فلاں فلاں لکچروں میں جاؤ۔ ان کے متعلق اس ہفتے صرف یہ دو کتابیں پڑھو۔ اگلے ہفتہ اور اس کے بعد ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو۔ جو دقت تمہیں پیش آئے بلا تامل دن اور رات میں کسی وقت مجھ سے مل کر بیان کرو۔ یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے جاؤ۔ پرسوں اگر میرے ساتھ چائے پیو۔ میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ رہتے کہاں ہو؟ میں کسی وقت آ کر تم سے ملوں گا۔ جب لندن میں جا کر پروفیسر جیمز سے ملو تو بعد میں مجھے آ کر ملاقات کا مفصل حال سنانا۔ کوئی کھیل کھیلتے ہو؟ نہیں؟ کوئی اور شغل؟ ڈراما، موسیقی! خوب کبھی ہمیں بھی گانا سنانا۔ تمہارے ڈنر کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اور حیران ہوں کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی کیونکر سیکھ لیتے ہو۔ تمہارے دستانے کہاں ہیں؟ رستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟ نہیں! اچھا خدا حافظ، خوش رہا کرو اور جب تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہو فوراً میرے پاس آ جایا کرو۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپسی میں تمام راستے مسکراتا آیا۔

پھر تو ہمارے حوصلے بڑھنے لگے اور جوں جوں دن گذرتے گئے۔ زندگی خوشگوار تر ہوتی گئی۔ آج اس نے چائے پر بلایا۔ کل اس نے

کھانے کی دعوت دی۔ واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آئی۔ ایک آدھ حضرت سے محبت دھول دھپے کی حد تک بڑھ گئی ہے۔ لیکن ـــ

لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ شعربازی، وہ پھبتیاں، وہ روٹھنا، وہ منانا، وقت بے وقت گھر کا غلام، موقع اور محل خانہ زاد، وہ ہوٹل کی مجلسیں، وہ دارالاشاعت کے مجمعے، ہائے امتیاز! ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ پیارے چنگا کی خوش بغلیاں، ننھے منشی کی چہلیں، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ دودھوں نہلائے اور پوتوں پھلے) وہ حفیظ کی ٹھمریاں۔ (اللہ کی امان)

خیران باتوں کو دو سال کے لئے بھلانا پڑے گا۔ اب تو زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہاسٹل میں دو کمرے ملے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹھنے کو ایک سونے کو۔ باقی جگہوں میں صرف رات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاسٹل میں یہ دستور ہے کہ ہاسٹل کے رہنے والے جن کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ ناشتہ اور لنچ کامن روم میں اکٹھے کھاتے ہیں اور شام کا کھانا سب کالج کے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے۔ چائے کا اکثر یہ حال ہے کہ یا میں کہیں مدعو ہوں یا کوئی میرے ہاں آیا ہوا ہے۔

صبح کے وقت ڈریسنگ گون، پاجامہ، سلیپر اور تولئے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غسل خانے کے اندر سب ننگے ہو کر بغیر کسی شرم وحیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔ پھر کامن روم میں حاضری، نو بجے کے بعد سب گون پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ نو بجے سے ایک بجے تک لیکچروں کے اوقات ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کیمبرج کا نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے (۱) گون (۲) نوٹ بک اور (۳) جلدی۔ دس بجے ایک لیکچر اس کالج میں ختم ہوا۔ اور دس ہی بجے دوسرا لیکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا ہے چنانچہ لب اوقات بازاروں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ لیکچرار ہر قسم کے ہیں۔ ایک مسٹر جینٹ ہیں۔ ادھیڑ عمر، جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہوں گے۔ شکسپیر اور زمانہ وسطیٰ کے لٹریچر پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت، اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو دو منٹ تک داد دیتی رہتی ہے (جس کا طریقہ یہ ہے کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں) ایک مسٹر ٹل یارڈ (TILL YARD) ہیں ملٹن پڑھاتے ہیں اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لیکچر دیتے ہیں۔ لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر اسی پر صرف کر دی۔ ایک مسٹر لوکس (LUCOS) ہیں پچھے دار فقرے۔ اعلیٰ درجہ کا تفنن۔ غضب کی تشبیہیں۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے مگر مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں۔ اس لئے گوئٹے کا ٹیٹی سن پر لیکچر دیتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے مضمون کا ذکر نہیں کیا ایک ڈاکٹر لیوس (LEOWIS) ہیں۔ نوجوان لیکن D.L.L.D کی ڈگری کے مالک۔ دور جدید ان کا خاص مضمون ہے۔ تمام تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے موجودہ مصنفوں کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ ان میں بے چارے ہکسلے بھی شامل ہیں) لیکن اپنے موضوع میں اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ ہنسی، مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں۔ جو شخص ان کے لیکچر میں دو فقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے یقینی امر ہے کہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہوگا۔ لیکن ہائے وہ دو فقرے!

میں ان کے پاس بھی ہفتے میں دو دفعہ اپنا جوابی مضمون دکھلانے جاتا ہوں بے چارے میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں لیکن جس بلندی پر وہ اڑتے ہیں اور جس زمین پر میں رینگتا ہوں ان میں فاصلہ اس قدر ہے کہ میرا ان سے برابر کا واسطہ شاید کبھی ممکن ہو سکے

ان کا مجھ تک اترنا قطعی ناممکن۔ لہٰذا اگر ان سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ بہت کچھ۔ لیکن ہر دفعہ اپنی بے بضاعتی کا از حد تیز احساس اپنے ساتھ لاتا ہوں جو بہت دیر تک بوجھ کی طرح رہتا ہے۔

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر آرتھر کوئلر کوچ (ARTHUR QUILLER COUCH) ان کے نام سے تو تم واقف ہو گے اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی انتہا نہیں ہے۔ کیمبرج میں ہر کہ و مہ ان کو کیو Q کے نام سے پکارتا ہے۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے ہیں۔ اور باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے۔ صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں۔ بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے۔ جس میں ہم پچاس ساٹھ آدمیوں کو ارسطو کی POETICS پڑھاتے ہیں۔ کلاس کا حال سن لو۔ ایک اوسط درجے کا کمرہ ہے۔ فرش نہایت عمدہ۔ بیس پچیس کرسیاں۔ انگیٹھی میں آگ خوب جل رہی ہے بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرچ پیالے پڑے ہیں۔ سوا آٹھ بجے سے لوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی فرش پر آلتی پالتی مار کر یا نیم دراز۔

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے اور Q صاحب داخل ہوتے ہیں۔ سر اور مختصری مونچھوں کے بال سفید، خمیدہ قامت، ہاتھ میں سگار لیے ہوئے، چہرہ پر مسکراہٹ۔ مسکراہٹ بھی شرابیوں کی سی اور فی الواقع پیتے بھی بہت ہیں۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں (ان کے علاوہ باقی لیکچروں میں کھڑے ہونے کا دستور نہیں) ان کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں قہوہ لیے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کافی کا پیالہ اٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے۔ پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو پڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ایک آدھ پیراگراف پڑھتا ہے اور پھر Q صاحب اس پر بحث کرتے ہیں۔ جس میں دنیا جہان کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ خوب ردوقدح کی بحث بھی ہوتی ہے۔ کلاس کیا ہے۔ مذاق اور متانت، علم اور دل لگی کی ایک ضیافت ہے جس سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خود پروفیسر Q کی شخصیت کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ ان کی ترکیب طبیعت کا نسخہ ان الفاظ میں لکھ کر شبلی، غالب، حالی، آزاد اور اودھ پنچ کو ملا کر اسکی انگریزی بنا دو اور سو سے ضرب دے دو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں۔ لہٰذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگا لو۔

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں اس کے بعد دو بجے تک لنچ اور دو بجے سے چار بجے تک، تمام طلباء ایک نہ ایک کھیل کھیلنے جاتے ہیں۔ چار بجے شام ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ چائے کے بعد ہال تک (یہاں کی اصطلاح میں ہال شام کے کھانے کو کہتے ہیں) چاہو تو ایک آدھ گھنٹہ مطالعہ کرو، چاہو تو کسی اور طرح وقت ضائع کرو۔ ہال کے بعد کافی کے لئے آگ پر پانی رکھ دو اور جب تک دل چاہے پڑھتے رہو جو آئے اسے بے شک کان سے پکڑ کے باہر نکال دو اور اگر بہت ہی بدتمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہے تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر بیٹھو (یہ فعل گونا گوں شبہات کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنی سمجھنے کی عادت ڈالو۔)

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے۔ چنانچہ یہاں کی زندگی میں مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے ہر کالج سے متعلق ایک گرجا ہے اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت موسیقیت میں بسائے رکھتے ہیں۔ ہر ہفتے یونیورسٹی کے کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا واعظ یا مبلغ کا لیکچر ہوتا ہے۔ کیمبرج کا شہر بہت چھوٹا سا ہے۔ اور یہاں کی آبادی خاص طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور جو تعطیلات

کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں ان کو GOWN MAN کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جس قدر شہر کے اصلی باشندے ہیں وہ سب کے سب دوکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو TOWNS MAN اور طلبا کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر رشتہ مفقود ہیں۔

انڈر گریجویٹ UNDER GRADE لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر چھا جوں پانی برس رہا ہو تو خیر ورنہ ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ پٹی کا کوٹ اور فلالین کی پتلون یہ ان کا لباس ہے۔ پتلون پر بڑے بڑے سیاہی کے داغ، گون کی بے عزتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جا بجا سوراخ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ نوارد معلوم نہ ہوں۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو، قسم قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ سفر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جنوبی افریقہ تک ہو آتے ہیں، مچھلیاں پکڑتے، گولف کھیلتے ہیں۔ کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گرجاؤں ہیں۔ تبلیغ کا کام سیکھتے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے نمائندے دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے۔ بعض صبح سے شام تک لیباریٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں۔ بعض صرف اوپرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں۔ بعض صرف یونانی کھیل۔ بعض سیدھی سادی کامیڈی۔ سینری، ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے آئین کے ساتھ۔ انہاک و انضباط یہاں کے دو بڑے اصول ہیں۔ اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کام کر رہی ہے جس کو TRADITION کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پسینے بہا دینے والی مصروفیت میں گذرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں۔ رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں۔ اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اتوار! یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے۔ وہ بھی سیاہ پوش سست رفتار، سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم۔ آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مرد و زن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل از دواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جائز ہے اور شادی کے بعد بھی۔ شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہی ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں۔ لیکن یہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار، البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور

زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتی ہیں۔ وہ پہلے تو گلے سے لومڑی کی دم کھول کر میز پر رکھتی ہیں۔ پھر دستانے اتار کر رکھتی ہیں۔ پھر کوٹ اتار کر بنچ کی پشت پر پھیلاتی ہیں۔ دستانوں کے پاس ٹوپی اتار کر رکھ دیتی ہیں۔ پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتی ہیں، رومال سے ناک پونچھتی ہیں، ہینڈ بیگ کے چھوٹے سے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتی ہیں کنپٹی پر سے زلفوں کے گھنگھر سنوارتی ہیں۔ پھر کچھ جھک کر کہنی کو پڑوسی کی ناک میں دے کر بہت خوبصورتی اور سلیقے سے نوٹ لینا شروع کر دیتی ہیں۔ دو منٹ کے بعد ان کے قلم میں سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ طوعاً و کرہاً آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہیئے۔ ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں۔

یہ حضرت کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر تودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے۔ یہ وہ دارالعلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرام ویل CROM WELL سٹرن STERENE کولرج سیموئیل۔ بٹلر، بیکن، ٹینی سن، تھیکرے، میکالے۔ نیوٹن۔ بل ورلیٹن، پیٹ، لارڈ چسٹر فیلڈ، مارلو، ولیم پٹ، گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا ایک بے رنگ پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فسانۂ آزاد کا دلدادہ۔ طبلے اور سارنگی کا شوقین۔ "زمیندار اور گرو گھنٹال" کا خریدار۔ الرشید کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا۔ مغلیہ عیش و عشرت کا خواہشمند، اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا، میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔ خدا آبرو سے رکھے اور آبرو سے وطن کو واپس لے جائے۔ آپ میرے لئے یہی دعا کیجئے۔

دو سال کے بعد "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے۔" (دگا گر)

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا۔ گلیڈس کوپر اور جیرلڈ . . . . کو ایکٹ کرتے دیکھا۔ لیکن تھیٹروں کے متعلق پھر کسی خط میں لکھوں گا۔ ایک دن پورا فرتھ کے ساتھ گذارا اور ان کی معیت میں پروفیسر جونز اور یونیورسٹی کالج کے اساتذہ سے دن بھر اردو، پشتو اور پنجابی کی اصوات کے متعلق نہایت تپاک سے ملا۔ انھوں نے میرے حروف تہجی کو سراہا۔ میں نے ان کی قراءت کو مرحبا کہا۔ بعض اصوات کے متعلق کچھ تیز بحث ہوئی کہ حلق کے کون کون سے کونے میں سے نکلتی ہیں ہوتے ہوتے ہاتھاپائی کی نوبت آنے لگی۔ لیکن بعد میں صلح صفائی ہو گئی۔

ایک دن لندن سے ہاشمی کا خط آیا۔ "ارے تم؟" "ارے ہیں؟!" "اوہ" اس قسم کے جذبات کے اظہار کے بعد جناب نے فرما رکھا تھا کہ کسی دن شام کے سات بجے کے بعد فلاں پتہ پر ہم سے آ کر ملو۔ حضرت یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ میں لندن میں ہوں (خط میرے بینکوں کی معرفت بھیجا تھا، ہم نے انھیں جواب میں لکھا۔ "بے وقوف ہوا ہے۔ ہم جیسے شرفاء کو لندن سے کیا واسطہ۔ ارے ہم کیمبرج میں ہیں کیمبرج میں یہاں آ کے ہم سے ملو۔ چنانچہ ایک دن شام کے تین بجے کے قریب آپ وارد ہوئے۔ "ارے یار بخاری" "ارے یار ہاشمی" قصہ چہار

درویشوں کے ڈھنگ پر بغل گیر ہوئے۔ اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے۔ کبھی گانے لگ جاتے۔ کبھی شعر پڑھنے لگ جاتے۔ غرضیکہ عجب ہنگامہ رہا، عجب عجب قصے دہرائے گئے۔ ہندوستان کی حالت زار پر بہت افسوس کیا گیا۔ اور آپ سب لوگوں پر جو انگلستان آنے سے محروم ہیں لعنت و نفرین کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے۔ تم پوچھو گے ہاشمی کا کیا حال ہے؟ بس بالکل وہی چیز ہے بالکل وہی۔

اس ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط ـ ہرکشن کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں۔ یعنی ہندوستان میں مجھے جو کچھ محبوب ترین اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت چھت پھاڑ کر میرے سر پر آ گرا۔ جگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی غزل نے مجھے گھنٹوں مست رکھا۔ جگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی خط ضرور لکھتے رہا کرو۔ تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو، ایک خط ڈپٹی صاحب کو، ایک خط اپنی رفیق حیات کو، ایک رفعت صاحبہ کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ سکتا ہوں (میری آواز اس وقت بھرائی ہوئی ہے) لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ دارالاشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو غائبانہ مجروح کرنے کی ازحد سعی کی جائے گی۔ فلک حقہ باز کو کیا کہوں؟

سالک صاحب! استاذی، محبی! خدا کے لئے خط لکھو۔ جگل کے خط نے تڑپا تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری

عمانویل کالج کیمبرج

۲۵ نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری جب سنہ ۱۹۴۹ء کی پہلی عالمگیر ریڈیو کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا:

مکرمی و مشفقی، سلام مسنون

ڈان کے ایک تازہ نمبر میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طور طریقے انوکھے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان کا مختصر حال لکھ بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا، یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر بنا، وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو کب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکمران رہے اور لوگوں کا خون چوسا۔ سنہ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سو سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی۔ جس میں بڑے بڑے لیڈر اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کتنے سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ذکور مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم بروئے کار آئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے۔ یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ محض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جابجا ملتے ہیں۔

ایڈالگو (HIDALGO) موریلاس (MORELOS) جواریز۔ ان میں سے دو مشاہیر نے سنہ ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن سنہ ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام داستان قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایڈالگو (HIDALGO) نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر سنہ ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ علیٰ ہذا کوئی اجنبی یا سیاح جب میکسیکو آتا ہے تو لامحالہ ایک نہ

ایک دن ان تاریخوں کی اہمیت دریافت کرتا ہے۔ گویا خواہ مخواہ میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ خود قوم پر بھی اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ (ARTICLE — 123) ہے یہ میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے جو آخری مرتبہ ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیے گئے ہیں اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کی کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیر خواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور دارالخلافہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام پیرس بازار ہے۔ ایک کا نام "مارسیلز" ایک کا نام "لندن" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہل فن اور اہل علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں مثلاً شیکسپیر، ڈارون، دینان کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، گوائی لاما وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اسے بالکل نہیں بدلتے، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انار کلی بازار، چوک وزیر خاں، تیر انداز کی گلی۔ ایسے نام نہ بدلے جائیں کیوں کہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دل چسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بریں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہل شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت و حرفت اور فن اور کاری گری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالم اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں، جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں۔ تو احساس قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیب اسلامی اکثر مشہور حکماء اور ادیبوں کی ممنون احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتی رح یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے۔ جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہئے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ نیک کام پاکستان کی وزارت داخلہ بوجہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اس لئے یہ مشورہ آپ کے گوش گذار کرنے کی جرأت کی علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مغلوں کی دلی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا۔ لیکن

روڈ اور اسٹریٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ بازار، چوک، چوراہا، تراہا، چھتہ، گلی، کوچہ وغیرہ وغیرہ۔ کئی الفاظ اردو کے ایسے ہیں یا وضع کئے جا سکتے ہیں جو روڈ یا اسٹریٹ وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپ کی خیریت اور بہبود کا طالب

بخاری

خطوط

بنام عبدالمجید سالک :—

نیویارک۔ ۱۳؍اگست ۵۱ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا۔ آپ کی (کا؟) شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا مبارک ہوا کیونکہ اسی دوران میں ن۔م۔ راشد کا خط بھی ملا جس میں حفیظ (ہوشیارپوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ نہ سنا ہو تو سنا دوں۔ راشد نے جدید شعرا پر ایک مضمون لکھا جس کے بعض فقرے حفیظ صاحب (جالندھری) کو گراں گذرے۔ انہوں نے تاؤ کھا کر راشد کو یہ شعر لکھ بھیجا ؎

خبثِ دروں دکھا دیا ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

اس پر حفیظ (ہوشیارپوری) نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ "خبثِ دروں" (۱۳۷۰ھ) راشد نے چند اردو کی کتابیں بھی بھیج دیں۔ جن سے شب و روز میں کچھ رنگینی پیدا ہوگئی۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا "زیخ ٹوٹا" تو سلمان صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی تو دل میں لہو کی ایک اور بوند نظر آنے لگے گی۔ بہر حال محض انہیں مخاطب کر کے بھی رُبعِ ملاقات کا مزا تو آ ہی گیا۔ اگلے دن ایک کتب فروش کے ہاں ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف "انڈین تھیٹر" نظر آئی۔ کتاب مختصر ہے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے۔ لیکن جہل اور تعصب کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے لیکن ہندوستانی تھیٹر کے عنوان کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے آغا حشر کے متعلق کہا ہے کہ ..... "A HACK WRITER CALLED AGHA HASHR "A THIRDRATE POETASTER" اور اسی قسم کی اور خرافات بک کر آغا حشر کو تین چار سطروں میں اُڑا دیا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سالہا سال سے اقبال سے التجا کرتا چلا آیا ہوں کہ آؤ ہم تم مل کر اردو تھیٹر پر ایک کتاب لکھیں اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ہمارے انتقال کے بعد کوئی یہ کام نہ کر پائے گا۔ جو مسالہ ہمارے پاس موجود ہے اور جتنی جوانی ہم نے تھیٹر پر چھڑکی ہے کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی لیکن انہوں نے توجہ نہ کی فلم سازی انہیں ایسی چمٹی ہے کہ ان کی علم دوستی خواب اور افسانہ ہو کر رہ گئی ہے ان کے بغیر یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔ ذخیرہ سب ان کے پاس ہے اور وہ متعدد کھیلوں سے واقف ہیں جن کا مجھے صرف نام معلوم ہے۔ آپ کو یہ داستان درد اس لئے سنا رہا ہوں کہ اگر ان کی طبیعت میں اکساہٹ پھر سے نہ پیدا ہو سکے تو آپ اس کام کا بیڑا کیوں نہیں اٹھاتے۔ مانا کہ آپ کراچی میں ہیں اور میں نیویارک میں اور نہ معلوم یہ بُعد کب تک رہے گا تاہم یہ مشکل ایسی نہیں کہ اسے پھاند نہ سکیں جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت رستے میں حائل ہو گئی تو کوئی اسے نہ پھاند

سکے گا۔ لیکن "ہاؤ ہو غلغلہ" تو "پھینک" سکتے ہیں۔

ہندوستان سے جو تناؤ ہے اس کی خبر محض سرکاری ذرائع سے ہم تک پہونچتی ہے۔ تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں اس لئے طبیعت متفکر رہتی ہے نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں شاید آئندہ الیکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں کجی پیدا کردی ہے اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان کے ڈنڈن کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو پاکستان کی ہمت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے یہاں سب لوگ قائل ہیں اور بیش از بیش کالم نویس ان کے معترف بنتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہونچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے تاہم یار زندہ صحبت باقی۔ انہیں میرا سلام شوق بھی پہونچا دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

نیویارک، ۱۹ ستمبر ۵۱ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ مع الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہئے گا چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہونچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی لبا اوقات فائدہ پہونچتا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں حکمران ہیں یا کچہری روڈ کی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی اور کیا شریف صاحب کراچی میں ہیں یا لاہور واپس آگئے؟ ان سوالات سے محکمانہ معاملات کو کریدنا مطلوب نہیں محض احباب کے مستقر و ماحول کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کرلئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے کھیل کا خاکہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی۔ کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے "اسلامی کلچر" پر یہاں کے ایک مقتدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب اور فلسفیانِ عالم کے رشحاتِ قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہبِ قدیم اور حقوقِ انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی کنیڈا کی McGILL یونیورسٹی وظیفے دے کر اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب

اشخاص کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ضرور ملیں۔ سمتھ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں ——— "MODERN ISLAM IN INDIA" کے مصنف ہیں۔ آغا حمید وغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مباحثہ کشمیر کے آنے والے سین کے لئے سٹیج تیار کر رہے ہیں اور بے انتہا الگ ودو میں مصروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ برآ ہوں۔ ایک اور یونیورسٹی خشک علاقوں میں آب پاشی پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ اغلباً کام بن جائے گا۔ بس اپنی حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے اشارے کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر لیکس (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے ممد ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور میں پھر براجمان ہونے کا خیال آتا ہے تو کئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں لاہور کا (بقول ملاپ پرتاپ) "اب کیا بنے گا؟"

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اغلباً اب بھی اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر علے الصباح سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ ردّی چھانٹ رہا ہوں۔ یہ مشغلہ ہر ملک اور ہر زمانے میں سوہان روح ہوتا چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے ٹیکے لگوانا شروع کر دوں گا۔ پہلے ٹیکے سب کے سب زائد المیعاد ہو چکے ہیں۔ کل شام ٹیلی وژن پر میری انٹرویو نشر ہوگی۔ کچھ کشمیر کچھ جاپانی عہد نامہ کچھ کوریا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے الخ

خاکسار

بخاری

---

(۳)

12 E 65th STREET NEWYORK

۲۲ مارچ سنہ ۵۲ء

برادر محترم سلام مسنون۔ نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری ہی بیماری سننے میں آتی ہے۔ سلمان بے چارے کو نمونیا ہو گیا انور کا خط آیا تھا کہ اب بہتر ہیں۔ اسے بھی ایک دو ہفتے گزر گئے نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں ۸ فروری کو پہنچا۔ بالکل چور۔ پہلے انفلوئنزا ہو گیا اس سے صحت پائی تو خون کا دباؤ یک لخت گر گیا، سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو عرصہ سے اونی گیریا کی شکایت ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں امید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی (بشرطیکہ آپ کراچی نہ اٹھ آئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمیمنٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے گئی لوہے آگ میں ہیں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی لوہا ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہوئے تھے۔ جنوری کی بجائے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ

انہیں اپنے ساتھ بلادِ اسلامیہ کے دورے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہونچے تو کہیں سیڑھیوں پر سے رپٹے۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے تنے میں اور تاخیر ہوئی۔ غرضیکہ بوجوہ پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ کچھ جمنے لگا ہے۔

لاہور کی خبر صرف اتنی ملی۔ کہ ہاشمی صاحب امریکہ آئیں گے۔ یہ مژدہ سلمان نے سنایا، اسے بھی کئی ہفتے ہونے آئے۔ مزید اطلاع نہ آئی۔ صوفی صاحب کا ایک نادر سلام حمید الدین (ابن مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید یہاں کولمبیا یونیورسٹی میں نفسیات پڑھ رہے ہیں عنقریب واپس جائیں گے۔ عباس کو بی بی سی سے یو این بلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آجائیں تو بہت ہی خوب ہو۔ خلیفہ عبدالحکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں۔ اب واشنگٹن میں سستا رہے ہیں۔ اگلے ہفتہ نیویارک آئیں گے اور دو چار دن کے بعد کراچی کا عزم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہو لیں اب سرتوں کا ذکر باقی ہے۔ پرسوں یہاں برف پڑ رہی تھی۔ یہ مارچ کا آخری سنبھالا تھا یوں جنتری کے حساب سے بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ عنقریب مکان کی دیوار پر جو بیلیں سرما میں مضمحل اور بے رونق تھیں وہ ہری بھری ہوں گی۔ وطن یاد آتا ہے۔ طالب علم تھے تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رعشہ طاری تھا۔ معلم ہوئے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بہار کی ہوائیں یوں بھی چلتی تھیں اور یوں بھی۔ اور کاروبارِ عشق بہر نوع جاری رہتا تھا۔ کیا اب بھی راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟ کیا اب بھی فالودے کا موسم قریب آ رہا ہے؟ جب بیماری کے عالم میں بالکل خالی الذہن تھا تو شباب لاہور اور لاہور شباب کے کئی موقعے تھوڑی تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے۔ دارالاشاعت کی بزمِ عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں وارفتگان کا ہجوم، بے دل مرحوم۔ فرزند علی (جو ہر وقت پان کی وجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کی "ہیئے ہو"۔ پرانی انارکلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان اور باپ کا گناہ۔ تاثیر کی فیل پائی اور تہمتیں۔ چراغ حسن حسرت (صحت! کی قسم وہ یہیں ہیں") ڈیگ پر مچھلی کا شکار۔ جگل کی پاسدار معصیتیں۔ پھر گورنمنٹ کالج لاج کا دور۔ صوفی کی پنجابی غزلیں۔ شب دیگ کی تقریبیں۔۔۔ اے کاش کوئی از سرِ نو ان اوراقِ پریشاں کا شیرازہ باندھ دے۔

دوش بر یادِ حریفاں بخرابات شدم ۔۔۔ خمِ مے دیدم و خوں در دل و پا در گِل بود

بس بگشتم کہ بپرسم سبب دردِ فراق ۔۔۔ مفتیِ عقل دریں مسئلہ لایعقل بود

آپ کی خیریت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر۔

ہر آنکہ جانبِ اہلِ وفا نگہ دارد ۔۔۔ خدایش در ہمہ حال از بلا نگہ دارد

خاکسار

بخاری

---

(۴)

نیویارک، ۲۰ اپریل ۱۹۵۲ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ بے تاریخ لیکن بمنقہ اوائل اپریل شرف صدور لایا۔ آپ خط نویس نہیں پرچہ نویس ہیں ایک ہی مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا چھڑکاؤ کر دیتے ہیں کہ مہینوں کی تشنگی مٹ جاتی ہے۔ جب سے پیرس آیا۔ مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس

بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی حیلہ تو باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو این میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بہت نامی اخبار نے (نام ابھی نہ لوں گا) خاص مجھ پر ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے طریق کار کے مطابق ایک نامہ نگار میرے ساتھ نتھی کر دیا ہے جو رات دن میرے ساتھ پھرتا ہے اور بے شمار سوالات پوچھ پوچھ کر نوٹ لیتا جاتا ہے۔ پندرہ دن یہی شغل رہے گا اس کے بعد وہ دو صفحے کا آرٹیکل لکھے گا۔ یہاں کے صحافت باز لوگ بھی عجیب والہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایک آرٹیکل لکھنے کی خاطر چھ مہینے ان کے ساتھ ایک انشا پرداز کو نتھی کر دیتے ہیں۔ سنا ہے میرے والے آرٹیکل پر ان کا دس ہزار ڈالر خرچ ہوئے گا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کی طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت برسائی۔ تصفیہ تونس کیونکر یو این میں لایا گیا۔ اور معاملے نے کیا کیا پلٹے کھائے اور دنگل میں کیا کیا تماشے ہوئے — یہ داستان ایک ڈرامہ سے کم نہیں۔ عندالملاقات انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں میں تقریر بغیر نوٹ کے کرتا ہوں۔ ہر مرتبہ تقریر کے ابتدائی فقروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ مجلس امن کے سامعین (ریڈیو وغیرہ ملا کر) کروڑ دو کروڑ سے کم نہیں ہوتے اور پھر دائیں بائیں بھی گرگے اور جغادری قسم کے لوگ، لیکن وہ لطف رہا کہ کیا عرض کروں۔

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں ستمبر اکتوبر سے لے کر جنوری تک۔ جنرل اسمبلی کی وجہ سے میرا نیویارک میں رہنا ضروری ہے آیا تو یا ستمبر اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقف یوں ہے کہ ہارون میاں چاہتے ہیں میں ان کی شادی کے موقع پر کراچی ضرور موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ ابھی انہوں نے مقرر نہیں کی۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ خاتون کا نام روشن ہے۔ اور ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی امید ہے آپ اپنے برادرانہ مشورے سے اُسے، مجھے اور ہارون کو محروم نہ رکھیں گے۔ کبھی فرصت ملے تو ذوالفقار سے عام معاملات پر بھی تبادلہ خیالات کیجیے۔ اس کا اکثر باتوں میں رویّہ کچھ غیروں کا سا ہے میں تو متوکل انسان ہوں البتہ زبیدہ کو جو خاندانی یک جہتی کی عادی ہے دکھ ہوتا ہے۔ نہ زبیدہ ہی صبر شکر سے کام لیتی ہے نہ ذوالفقار ہی کا دل پسیجتا ہے اس بدمزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجب نہیں کہ کسی لمحے میں آپ کا کلام ذوالفقار کے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس کی کدورتیں (واللہ اعلم کیا کدورتیں ہیں) دور ہو جائیں۔

آپ بھی اب کراچوی ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ مسلم ٹاؤن کی کوٹھی کے بعد بھابی بے چاری کو ہوٹل میں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سا رس نہیں لیکن جب حلقۂ احباب کے باقیات الصالحات سب کراچی میں ہیں تو لاہور سے بہتر ہے۔ کم از کم آشنا صورتیں تو نظر آئیں گی۔ شریف (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہے ڈاکٹر وحید بھی (حقوق انسانی کے کمیشن کے سلسلے میں) یہاں ہیں۔ خلیفہ حکیم اس وقت بلاد اسلامیہ میں مزار مولانا روم پر فاتحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ یا غضنفر کے ہاں پلاؤ کھا رہے ہوں گے عنقریب کراچی پہنچیں گے۔ مجید ملک اور آمنہ کی کبھی کوئی خبر نہیں آتی۔ فلیمنگ روڈ کے ایام کے بعد ان سے مُخلّی بالطبع ہونے کے موقعے کم ملے ہیں (بجز دوران جنگ اور دلی میں) سلمان یقیناً صحت مند ہوں گے کیونکہ عرصہ سے ان کا خط نہیں آیا سنا ہے امتیاز کراچی آئے تھے چند محفلیں روشن کر کے پھر لاہور چلے گئے۔ ان کی جانب سے تو کبھی خط آتا ہی نہیں۔ ہمارے دوست ماشاء اللہ اہل القلم سے بڑھ کر اہل القط ہیں۔

خط لکھتے رہا کیجئے اور "چو یا جیب نشینی و ...... الخ

خاکسار

بخاری

(۵)

نیویارک، ۳۱ اگست ۱۹۵۲ء

برادر محترم، سلام مسنون۔ یہ بھی میری خود لیدہ ایام زندگی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا، میں ایک کانفرنس میں، تھا کھول کر صرف آنکھیں سیراب کیں اور پھر جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا اب نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں آخر ارادہ کیا، کہ "منہ زبانی" ہی جواب لکھ دوں، اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خاموشی کے شاکی ہیں اور خط کا خاتمہ اس پُر معنی فقرے یا جملے پر ہوا تھا کہ آپ "عقب ریڈیو سٹیشن" رہتے ہیں۔ عقب پیائی نہ چھپی!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت۔ یعنی بالکل کلکتہ اور گاہے گاہے مدراس۔ اس دوران میں کام برابر جاری رہا۔ کشمیر کے مسئلے کو یہاں سے جنیوا روانہ کیا تو دس آرمیمنٹ کمیشن اور سکیورٹی کونسل کے اجلاس ترا تر ہونے لگے۔ ۱۴ اکتوبر کو جنرل اسمبلی ہے اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو لی ہیں معاذین سے جو توقع تھی کہ رستم کی گور پر لات ماریں گے وہ توقع محروم ہوئی۔ ہم سمجھے تھے کہ "مبارک باد اسد غم خوار جان دردمند آیا" لیکن انہیں فرصت کشاکش غم پنہاں ہی سے نہ ملی۔ کئی مرتبہ تکان کے مارے برا حال ہو گیا اور ہفتہ بھر صرف بستر میں لیٹ کر ناول پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ پر کیا کریں کہ دل ہی عدد بے فراغ تھا۔ بہرحال اب دسمبر تک تو یونہی بار برداری کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ "چھٹی" ایک سے دو مہینے "تک کی ہے گھر رہنے کو بھی دل چاہتا ہے لیکن قواعد کی رو سے قبناً عرصہ پاکستان رہوں، اتنا عرصہ فارن الاؤنس چھن جاتا ہے خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو کراچی پہونچنے کے نقشے دماغ میں ڈھل رہے ہیں۔

اس دوران میں غضنفر یہاں آئے کسی تیل کے بادشاہ کے مہمان تھے چنانچہ اس ٹھاٹھ سے رہے کہ ہماری میزبانی کے متوقع بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی۔ حسب دستور کچھ ہم سے خوش کچھ شاکی گئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں ایک دو مرتبہ ما حضر تناول فرمایا اور وطن کے حالات سنائے امجد بھی موجود تھے۔ وطن کے حالات سے یوں بیشتر بے خبر رہتا ہوں بس اتنا ہی علم میں آتا ہے جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی۔ جو سیاح یہاں آتا ہے وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حال سناتا ہے۔ غلام محمد بیمار تھے پھر محمد علی بیمار ہوئے اب سنا ہے عبد القادر صاحب فراش ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا یکسر بدل ڈالنے کا تہیہ کر لینا چاہیئے۔ سلمان سے تو ان سے کہئے کہ ان کی جانب سے ایک مسودہ عرصہ ہوا موصول ہوا ہے۔ جس میں نیازی صاحب اور کسی اوستاد حسین کی آپس میں تو تو میں میں کا حال مفصل مندرج تھا۔ پھر ایک اور مسودہ شرف صدور لایا جو خود ان کی ایک ریڈیو ٹاک کا مسودہ تھا۔ حاشیہ پر چند کڑے کڑوے "بقلم خود" منقوش تھے اسی کو ان کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو لیا۔ لیکن اس سے اتنی اکساہٹ پیدا نہ ہوئی کہ "لائیر تو قلم دانی" کہہ اٹھتا۔ بہرحال انہیں عنقریب نئے ساز و سامان کے ساتھ خط لکھوں گا۔

ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہو گی۔ میں وسط دسمبر سے کسی صورت پہلے نہ پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے آپ زبیدہ کی اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر احباب گرامی کام میں بقدر فرصت حصہ لیں تو بتقاضائے نیازمندی بے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہو گی۔ سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا۔ لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ کریں

آپ اور سلمان پر بھروسہ ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔
امریکہ سے کچھ منگوانا ہو تو ابھی سے لکھ بھیجیے۔ یہاں کا شاپنگ ازحد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار
بخاری

---

(۶)

نیویارک۔ ۹ فروری ۵۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترا (بے آرامی میں ایک قیمتی اوورکوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں) سخت نزلہ اور بخار، سیدھا ہسپتال لے گئے۔ اب افاقہ ہے۔ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا، جو مضافات میں واقع تھا بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ اردگرد وسیع باغ، دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا کسی دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں ملاقات یا ٹیلی فون کی کوشش نہ کی۔ موسم صاف تھا خیال تھا نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ کسی کو گذرنے کی اطلاع نہ دی تھی البتہ روم کے ایرپورٹ پر اسلم ملک اور اس کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی معیت میں گذرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس قاہرہ جا رہے تھے۔ قاہرہ کے ایرپورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی مہلت نہیں ملی۔ چودہری ظفر اللہ خاں یہاں سے جینیوا جا چکے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً اور کچھ دل بہلانے کے لئے۔ مصروفیت دافع تفکرات ہوتی ہے۔ آج ہارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجیے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہوگی خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ فی الحال تو تجوری کھائیں کھائیں کر رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت سب منتشر ہوں گے اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہئے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا، تو اسے بھی بخار اور زکام تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کافی تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ اغلباً تعطیل منانے دلی چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں ہے ملک آج کل دورے پر ہے وہ ۲۳ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں وہ آپ جانتے ہیں۔

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر متفکر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات بیشتر دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا لیکن لاہور سے محظی بالطبع ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو برات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے اور شادی کے انصرام میں بھی آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی پچک گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت اور شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصل وطن تھی۔ ان سے میری

جانب سے معذرت کر دیجیے گا کہ وہ خدا حافظ کہنے آئے تو میں گھر پر موجود نہ تھا۔ ان کی طباعی اور بذلہ سنجی اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاق اور ان کی الفت کی یاد سے طبیعت تا ابد سیراب رہے گی۔ خدا ان کے دماغ کو اور جلا دے۔ ان پر سلام ہو نیز ندوی صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی (جو آپ کو انہوں نے تحفۃً دی تھی) اور وہ میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجیے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں، یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ سنا ہے کہ ان پر انحطاط آ گیا ہے اور ان کا دل پژمردہ ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاش معاش میں وطن سے اس قدر دور۔ ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت بھی ان کی حساس ہے خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوشدلی ان میں نہیں (ہائے وہ نرسنگھ داس گارڈن کی زریں سہ پہر!) یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے اس لئے اختصار مدنظر ہے باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاد دہانی کراتے رہیے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی محتسب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری

---

(۷)

نیویارک

۱۹ فروری ۱۹۵۲ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ آپ نے جیسے چاہا تھا اسی کے مطابق آپ کا ۱۵ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو نہیں بلکہ ۱۰ کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں بلکہ خود بخود خط ہے۔ اور ایک ضرورت سے آپ کو لکھ رہا ہوں "بھنگیوں کی توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہونچ گئی؟

اس ریسرچ کا محتاج یوں ہوا کہ ایک جرنیل کی استمالت کرنی ہے۔ ان حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں، بجز بھنگیوں کی توپ کے۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے (اسے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں) اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا تو وہ پھولے نہ سمائیں گے بلکہ شاید انہیں مطلّا و مجلّا کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ رکھوا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کون ہیں اور جواب جلد دینا انہیں گوارا ہو گا یا میرا خط محکماتی مسلوں ہی میں کہیں چکر کھاتا رہے گا۔

اوّل تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے (آپ کا دماغ اور حافظہ عمر عیار کی زنبیل سے کم نہیں) اور نہ معلوم ہوئے تو آپ کراچی میں کسی ماہر

سے حاصل کر لیں گے۔ جواب ذرا جلد بھیج دیجیے۔

غالبؔ کا ہندی ترجمہ خوب رہا۔

لوبھ کو کاج کام کیا کیا ہے

یعنی ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" کاج کام" کی داد دیجیے۔ نشاط کا ہندی ترجمہ "کام" اور (اردو کے) کام کا ہندی ترجمہ "کاج"۔ لہٰذا "نشاطِ کار" "کاج کام" ہوا۔ یہ ترجمہ روزمرہ میں بھی مفید ہو سکتا ہے، مثلاً کہا جائے کہ "آج کل کام کاج میں: کاج کام نہیں ملتا" مگر یہ تو فرمائیے کہ "نیند رات کیوں رات بھر نہیں آتی" میں بجر دیا سمدر کہوں؟) کون سی استعمال ہوتی ہے۔ "مارچ میں شادی" پر ہارون نے مجھے خط لکھا ہے۔ تجویز دراصل کسی کی ہو۔ وہ اس سے بہر نوع متفق بلکہ اس پر مصر معلوم ہوتا ہے میں نے اسے جواب بھیجا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ کر کے اس کی رضامندی حاصل کر لے۔ روپے کا جو انتظام کرنا ہے اس کے اعتبار سے میرے لئے آخر مارچ یا آخر اپریل دونو برابر ہیں۔ لہٰذا اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہیئے۔ اور محض اس خیال سے مارچ کو رد نہ کرنا چاہیئے۔ روپے کا انتظام انشاء اللہ ہو جائے گا۔ باقی حالات آپ پر اور زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ ہارون کے نزدیک شادی کا اپریل تک التوا کسی کے (یعنی ہارون کے) لئے خوش گوار نہیں۔ بلکہ ذہنی پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس کے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپریل پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرنا چاہیئے البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں تو اور بات ہے ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی رہ گئی تو اس کا الزام ہم پر نہ آئے گا۔ لہٰذا اس بارے میں زبیدہ کو کوئی ہراس اپنے اوپر طاری نہ کرنا چاہیئے۔ ہارون کا خط کچھ "دردیلا" سا تھا۔ اس لئے میں نے مزاحم ہونا قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو منصور سے معلوم ہوں گے۔ جب وہ کراچی واپس آئے گا۔

احباب کی یاد ابھی تازہ ہے۔ مجید لاہوری اور دیگر کرم فرماؤں کو سلام پہنچے۔ ؎

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی   جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی!

"شام" سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کٹتی تھی۔ اور "سواد" پنجابی کا "سواد" ہے۔

بخاری

---

(۸)

نیویارک، ۱۶ اپریل سنہ ۵۲ء

برادر محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ نمکدان بھی کتاب کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خیال تھا اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا۔ لیکن فرصت نہ ملی۔ مجید صاحب کو بہر حال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجیے۔ نمکدان کی وجہ سے کئی دن اور شامیں روشن ہو گئیں۔ اور صحبت یاران سرِ پل کا مزا آگیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کہ نسیم کا ایسا جھونکا کبھی کبھار وطن سے آجائے تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تخفیف کی ضرورت اس حد تک محسوس ہو گی میں سمجھتا تھا یہ عہدہ اتنا اہم ہے اور یہاں ہم نے رستم کی گور پر دولات ماری ہے کہ ہم مامون رہیں گے۔ بہر حال ہماری خوش فہمی صحیح ہی کیوں ثابت ہوتی؟ یہ بھی خیال تھا کہ جو لوگ خود فارن سروس سے متعلق نہ ہوں اور باوجود اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کہیں ساٹھ برس کی عمر میں ہوتی ہے میں نہ تو فارن سروس میں ہوں

نہ ابراہیم رحمت اللہ۔ ڈاکٹر عمر حیات۔ غضنفر وغیرہم کی طرح سیاسی زندگی سے سفارت پر آیا ہوں۔ مجھ پر کون سا قانون لگے گا؟ ہم کچھ خوش فہمی میں رہے تا آنکہ حکم آیا کہ یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء سے تم بہر حال سبکدوش کر دیئے جاؤ گے۔ عرض معروض کی ہے کہ مجھ پر فارن سروس والوں کا قانون وارد نہ کیا جائے تو مجھے توسیع ملازمت ارزانی فرمایئے۔ ضابطے کا جواب ابھی نہیں آیا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر کچھ نہ کچھ نوازش ضرور ہوگی اور مجھے ایک سال کی توسیع یعنی یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء تک مل جائے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو تاکہ مجھے کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل قدرے سہولت کے ساتھ شکست و ریخت سے بچا سکوں۔

ساتھ ہی ساتھ تلاش معاش جاری ہے ادھر ادھر ہاتھ مار رہا ہوں آثار قدرے امید افزا ہیں۔ سرکاری ملازمت پر اب مزید تکیہ کرنا فضول ہے کب تک کوئی میری معروضات پر غور کرتا رہے گا۔ ضابطے کا چکر بے پناہ ہوتا ہے بار بار اپنے آپ کو مستثنیات میں سے ثابت کرنا طول عمل ہے۔ معاش کی تلاش امریکہ یورپ ہی میں کرنی پڑے گی۔ وطن میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے جس کے ہم منشی لوگ قابل ہوں اور جب سرکاری ملازمت سے نکل گئے تو باقی کیا رکھا ہے۔ پنشن کی معیاد کے ساتھ ہی ساتھ سہولت بھی وارد ہو جاتی۔ تو کسی بستر پر پڑ رہتا، لیکن سخت جانی کا کیا علاج؟ "ابھی تو میں جوان ہوں" یا کم از کم ستر ا بہترا نہیں۔ رہے بے چارہ کیا کرے جو ضابطے کا بوڑھا ہو اور دل و دماغ کا بوڑھا نہ ہو۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ہارون کی شادی ستائیس اپریل کو ہوگی۔ اور آپ اس میں شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی رہنمائی زبیدہ کو اور بچوں کو حاصل ہوگی تو میں پریشان کیوں ہوں تاہم دل وہیں اٹکا رہے گا۔ ہو سکتا تو آتا۔ لیکن جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ منصور کی شادی پر خرچ کر ڈالا۔ جو کچھ بچ رہا تھا اسے جوں توں کر کے ہارون کے لئے بھیج دیا۔ اب محض قلندر رہوں۔ آئندہ معاش کا بھی ابھی کچھ یقین نہیں۔ عمر بھر جو کمایا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ کسی دن فرصت سے اس پر غور کروں گا۔ ممکن ہے میں نے کہیں دفن کر رکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ میں نے عرصے تک آپ کو خط نہ لکھا۔ خیال تھا کہ آپ شاید مرزا غالب کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں اور جو پہنچتی ہیں ان کا مالہٗ و ماعلیہ اکثر پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر حال کچھ سمجھنے کی ایسی جلدی بھی نہیں۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

---

(۹)

نیویارک، ۵ مئی ۱۹۵۳ء

برادر محترم۔ آپ کا بے تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر وہ خط بھی موصول ہوا تھا جس میں عزیزی اعجاز کے کوائف شامل (مشمول؟) تھے۔ اعجاز صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے بالواسطہ تحقیقات کی کہ ایسے گریڈوں میں کھپت کی کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ نہ پڑا تھا (آپ نے فرمایا ہے کہ "ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے"۔ معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں اپنی مساعی میں مدد ملے گی) جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں وہ یوں ہیں کہ نمبر ا نچلے گریڈوں میں ہمیں اپنے کوٹے سے زیادہ حاصل ہے ۲ کلرک عموماً مقامی طور پر بھرتی ہوتے ہیں۔ ورنہ آنے جانے کا خرچہ تنخواہ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے گویا یا تو امریکنوں کو بھرتی کیا جاتا ہے یا ان لوگوں کو جو غیر ممالک سے آئے ہوں لیکن یہاں

موجود ہوں۔ ۲ بطریق مغرب ایسے کام عورتیں کرتی ہیں۔ امریکن ذہنیت کے لئے ایسے کام پر کسی مرد کو مامور کرنا ایسے ہی اچنبھے کی بات ہے جیسے ہم اپنے وطن میں چپراسی کے عہدے پر کسی عورت کو مقرر کرنا چاہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ کام وہ بھی کرے گی۔ یہ تو ہوئیں معمول کی باتیں۔ اب میں خود کسی بااختیار افسر سے ملا تو اپنے طور پر پوچھوں گا کہ باوجود ان رسمی موانعات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے اور آپ کو بلاتاخیر اس سے مطلع کروں گا۔

تنخواہ تو یکم اپریل سے کم ہو گئی۔ توسیع کے متعلق ابھی کوئی باضابطہ حکم موصول نہیں ہوا۔ آخری خبر یہ تھی کہ وزیر خارجہ نے توسیع کی سفارش کی ہے اور وزیراعظم نے اس پر صاد کیا ہے لیکن وہ سابق وزیراعظم تھے۔ نہ معلوم اب صورتِ حال کیا ہے۔ افسوس آپ شادی پر نہ جا سکے اس سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ بھابی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض کیا تھا کہ یہاں کسی ڈاکٹر سے بذریعۂ خط و کتابت مشورہ کرنا ہو تو بلاتامل مجھے لکھ بھیجئے۔ خدا کرے ان کی طبیعت اب سنبھل گئی ہو۔ شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس لئے تفصیلات سے بے خبر ہوں۔ البتہ عین شادی کے دن منصور کا لاہور سے ایک تار آیا تھا کہ کام بخوبی سرانجام پا گیا۔ اب زبیدہ کے خط کا انتظار ہے۔ نہ معلوم اس غریب کو کس قدر کوفت ہوئی۔ لیکن بہو کو گھر لانا اس کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدیم چاؤ چونچلوں سے کی جائیں۔ دولہا بدل گئے دلہنیں بدل گئیں۔ خوشحالیاں نہ رہیں۔ غرضیکہ "عبوری دور"! مجھے اکثر اس بات کا شدید احساس رہتا ہے کہ زبیدہ کو کس قدر ذہنی شکست و ریخت کا سامنا ہوتا ہے۔ آج ذوالفقار کا خط آیا۔ کہ پروین کی منگنی پشاور کے رئیس خان بہادر صفدر خاں کے صاحبزادے انفضل سے ہو گئی ہے۔ الحمد للہ۔ خدا کرے اس بچی کی زندگی کامران ہو۔ اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔

سلمان کو نیا گھر مبارک۔ میں تو میرا پیغام تہنیت پہونچا دیجئے گا۔ نمکدان کے پرچے لے ان کے صفحات پر بھی دوستوں سے مل لیا۔ اور مجید صاحب کے ساتھ مل کر ہنس لیا۔ مجید صاحب کو خدا نے شرارت و شرافت کا جو نسخہ بنایا ہے وہ دل کی گرمی اور دماغ کی ٹھنڈک کے لئے بہترین نسخہ ہے انہیں میرا سلام شوق کہئے گا۔ یقین مانئے کہ نمکدان پہنچا تو میں نے اس کے بعض حصے پانچ چھ مرتبہ پڑھے اور سنائے ان کی بدولت میں تو بالکل ہی نمک خوار ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا۔ میں سمجھا تھا ان کا یہ عہدہ ان کے لئے بہت ہی موزوں تھا لیکن شاید وہاں تنخواہ زیادہ ہو، یا خدمت کی گنجائش زیادہ ہو۔ میر نور احمد نہ معلوم اب کیا کرتے ہیں؟ اختر صاحب کو بھی سلام کہئے گا اور ہاں وہ مرد مومن کو جس کا نام "؟" ہے گر نہیں دہلی تو تھے آج کل کس شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی؟ اگر سالک بے خبر نہیں تو وہ ضرور سجادہ رنگین کر رہے ہوں گے۔ خدایا ان کا کیف کم نہ بادا۔

بخاری

---

(۱۰)

نیویارک ۴ر جون ۵۲ء

برادر محترم۔ سلام مسنون! توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی۔ وزیراعظم اور گورنر جنرل دونوں نے ازحد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے بااخلاق خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ تو یہ تہیہ کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب علیہ کو اچھی طرح رگیدا جائے چنانچہ بیوست اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

معاش کی یہاں دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے اور یو۔ این۔ امکانات دونوں میں بلکہ جب سے لوگوں کے کان میں بھنک پڑی ہے کہ میں قومی خدمت

سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ دروازے پر کئی لوگوں نے دستک دی ہے۔ یو۔این کا کام دفتری ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک میز پر نشست۔ لیکن تنخواہ نسبتاً زیادہ ہے۔ تعلیمی اداروں کا کام (از قسم مشقت) ملتا ہے لیکن تصنیف و تالیف کی کئی دل کش گنجائشیں اس میں نکلتی ہیں۔ البتہ تنخواہ نسبتاً کم ہے۔ جیسے بقدر لب و دندان تصنیف کی آمدنی سے پھیلانا پڑے گا۔ آج کل اس گومگو میں ہوں۔ رجحان تعلیمی کام کی طرف ہے۔ تصنیف کی ہوس عمر بھر سے ہے۔ کچھ حالات زمانہ اور بیشتر اپنی غیر صالح طبیعت کی بدولت وہ ہوس کبھی ٹھیک طرح پوری نہ ہوئی۔ خدا کرے آخری فیصلہ یہی ہو کہ تعلیمی کام کیا جائے۔ جب خدا سے دعا کی ہے۔ کبھی نیکی کی ہدایت نہیں چاہی کیونکہ وہ اس نے پہلے سے دے رکھی ہے اور دل و دماغ صراط المستقیم سے ہمیشہ آگاہ رہے ہیں۔ جب التجا کی ہے یہی۔ کہ خدایا ہم کمزوریں نیکی کو ہمارے لئے دل کش بنا جہاں ثواب کا امکان ہو، وہاں تھوڑا سا خرما رکھ دے۔ بہت نہیں۔ تھوڑا سا۔ ہم گدھے ہیں تیرے اشارے کو تو سمجھ لیتے ہیں لیکن اپنی کمزوریوں میں پابگل ہیں۔ اس لئے دور سے کبھی کبھار گاجر دکھا دیا کر۔

خیر آخری فیصلہ تو ہوتا رہے گا۔ ابھی تفصیلات پر بہت کچھ غور کرنا ہے۔ اس دوران میں تصنیف کی طرف رجوع ہونا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے یہاں مشورہ دیا ہے۔ دو کتابیں تم فوراً لکھ ڈالو (انگریزی میں) ایک امریکنوں کے لئے اردو سکھانے کی کتاب۔ دوسرے امریکنوں کے لئے (ایک مختصر) تاریخ ادب اردو۔ ان کتابوں سے جو پیسے وصول ہوں گے۔ وہ آئندہ بہتر کتابیں لکھنے کے کام آئیں گے۔ اب آپ کے ذمہ کام یہ ہے کہ پاکستان سے ان کے لئے مسالہ بھیجئے۔ تاریخ ادب کے لئے تو بہت سی کتابیں جمع کرنی پڑیں گی۔ لہٰذا پہلے اردو سکھانے کی کتاب کا مسالہ بھیجئے۔ اور وہ مسالہ یہ ہے۔ عبدالحق کی قواعد اردو، اور وہ پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگ کے لئے لکھی گئی تھیں۔ (ذوالفقار اور شمس عارف دونوں اس کے ماہر ہو گئے ہیں) اس سلسلے میں مجھ سے مزید تبادلہ خیالات کرنا ہو تو وہ بعد میں۔ پہلے جو کتابیں ہاتھ آئیں وہ بھجوا دیجئے۔ مصارف میں ادا کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب کے لئے فہرست کتب مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام بالخاطر تو نہ ہوگا! اور کس سے کہوں؟ امتیاز کا بار بار خیال آتا ہے۔ لیکن وہ ایسے کاموں کے لئے مدت سے بے کار ہو چکے۔ وہ سستی نہ کرتے تو انہوں نے اور ہم نے مل کر تاریخ ڈرامہ پر ایک نہایت معقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے لکھ لی ہوتی۔ عباس صاحب اکثر کرم فرمائی کرتے ہیں لیکن وہ کچھ اپنے مخمصوں میں ایسے گرفتار ہیں کہ پہلی سی اچپلاہٹ ان میں نہیں رہی۔

باقی آئندہ۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۱)

۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ آپ کا یکم جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا جو ثقیل ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ اور کیا کرتا؟ رشید (ریڈیو والے) سے یہاں کئی صحبتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں میں نے اپنی مشکلات بیان کیں۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسب ضرورت آپ کو اردو کی کتابیں بھیج دیا کرے تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق کرنا چاہیں تو بے کتابی سد راہ نہ ہو۔ میں نے کہا اس ایجنسی کا مہتمم کون ہوگا یعنی میں یہاں سے خط کسے لکھوں؟ انہوں نے اپنا نام

پیش کیا۔ یعنی میں انہیں لکھوں گا اور وہ احباب کو بیگار میں پکڑ کر جیسا جس سے ہو سکا کتابیں حاصل کر کے مجھے بھجوا دیا کریں گے۔ اس وعدے بلکہ دعوے کی بنا پر میں انہیں کبھی آزماؤں گا۔ لیکن وہ بھی آخر آپ ہی طرف رجوع کریں گے۔ اور اگر ان کی توجہ کبھی کارگر ہوئی تو اس میں آپ ہی کا ہاتھ ہوگا۔ ان سے ملاقات ضرور کیجئے۔ یہاں آ کر امن کی طبیعت میں چند شگوفے پھوٹنے لگے اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ واپس پہنچ کر پھر پھپھوندی لگنے لگے تو میں کہہ نہیں سکتا آپ کی جواں نکری کا اکثر تذکرہ رہا۔ گورنمنٹ کالج کے علم پرست اور سخن سنج گروہ، یعنی راشد، رشید، حمید، امتیاز وغیرہم۔ چندے شمعوں کی طرح روشن ہوئے لیکن کچھ عجب ہواؤں کا سامنا ہوا کہ شعلے سے زیادہ دھواں ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ کوئی گلگیری کا سامان بھی نظر نہ آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے بس سلگ رہے ہیں۔ آپ کو جن چشموں نے سیراب کیا ہے ان کی تازگی کبھی کم نہ ہونے پائی۔ اس پر میں اور رشید گھنٹوں باتیں کرتے رہے آخر آپ کو ہزارہا دعائیں دے کر آپ سے عہدِ محبت پھر تازہ کیا۔ اس نے بھی میں نے بھی۔ یہ لمحے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحے تھے۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

کتابوں کا پھر شکریہ۔ تاریخ ادب کی مسمیٰ کتابوں میں سے صرف آبِ حیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک سرسری خاکہ بنالوں اس کے بعد اصل کتابوں کی ضرورت بھی پڑے گی یعنی مسب رس سے لے کر انار کلی تک لیکن یہ مرحلہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم تول رہا ہوں۔

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ موسموں کا سا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ ادھر ادھر نہیں ہوتے اس لئے باران کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو تو ہم مرجھانے لگتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے، جو سابق وزارت کے زمانے میں تھا؟

مجید لاہوری۔ رشید اختر ندوی، اور حسرت اور دیگر احباب کو سلام پہنچے۔ امید ہے بھابی کا مزاج اب بخیر ہوگا اور تشویش کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔ انہیں میرا مودبانہ سلام کہئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۲)

نیویارک۔ ۲۲ اکتوبر ۵۳ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ بیماری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام ضرور کرنا چاہئے کہ انسان بیمار ہو تو اپنے ہی وطن میں۔ اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر دنیا میں نہیں، لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو سکتی ہے۔ آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے سکتا لیکن آپ کی آواز تو سن لیتا۔ بہر حال اب بھی آپ کا خط برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب پوچھا کہ علالت کیا تھی۔ جو ہم جیسے اہلِ دل ہیں وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت گراں گذرا۔ پاکستان کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ ملا۔ اخراجات بہت زیادہ ہوئے واپس پہنچا تو بعض بزرگوں کی تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے وہ سب صحیح ثابت ہوئے۔ پھر تنخواہ کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا........... جب مجھ سے مایوس ہوئے تو امریکنوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا اور اسے منتخب کرا دیا

پھر ہیں سرکار پاکستان سے ایک سال کی توسیع ملی۔ اس میں تلاش معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں تو بیمار پڑ گیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پھر کوشش شروع کروں گا۔

لاہور کے کالے کا علاج نہیں۔ آپ ہر دل عزیز انسان ہیں۔ جہاں جاتے ہیں آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ ایک مستقل عرس شریف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے لبوں سے بھی اکثر لاہور کے نام پر آہ نکلی۔ خلیفہ حکیم کو میں نے ایک خط کئی مہینے ہوئے لکھا تھا۔ دست بستہ عرض بھی کی تھی کہ جواب ضرور بھیجئے گا۔ لیکن وہ بیکار۔ باکار انسان خط کے معاملے میں حد درجہ کاہل ہے۔ امتیاز سے بھی سلسلہ پیام کچھ عرصے سے بند ہے۔ بشیر ہاشمی کا ایک خط (از حد رقت آمیز) البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

لیجئے ایک اور کام آپ کے کرنے کا نکل آیا۔ ایک پبلشر نے مجھ سے ایک بچوں کی کہانی مانگی ہے (تخمیناً ایک ہزار الفاظ) یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ کہتے ہیں کہانی ایسی ہو جو قدیم FOLK LORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے موزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو کہ اس سے صلح و آشتی کا سبق اخذ کیا جا سکے۔ نہ قتال و جدال کا۔ یعنی وہ ہو ٹھیٹھ دیسی کہانی۔ ہو بھی بچوں کے کام کی اور یو این کے نصب العین پر بھی پوری اترے۔ اب ایسی کہانی کا انتخاب وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی گود کی اخبار بچوں میں مقبول فاعلاتن کرتے گزری ہو۔ پہلے خیال آیا امتیاز سے پوچھوں لیکن ان سے جلد جواب کی توقع نہیں اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی تو کراچی ہی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب نہ کر سکے تو اور کون کرے گا۔ کہانی اردو میں بھجوا دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا۔ عباس سے کہئے کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے (یعنی بیماری تک جاری تھا۔ اب پھر متوجہ ہوں گا) امین الدین کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ زبیدہ نے میری بیماری کے پیش نظر اسے مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور مجید لاہوری دونو کو میرا سلام وہ کاشمیری اور لاہوری ایسے ہی ہیں جیسے میں پاکستانی ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی فرشتے نے تصنیف کی تھی۔ جس دیار کو فخریہ ہم نے اپنایا اسی سے اخراج ہوا۔

خاکسار

بخاری

عنقریب ایک اور خط لکھوں گا پیاس نہیں بجھی۔

---

(۱۴)

نیویارک ۲۱ر نومبر ۵۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ یکم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن بہر حال مکتوب محبوب۔ دل سیر نہ ہوا آنکھیں تو روشن ہوئیں۔ اس اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا جن دنوں آپ لاہور میں تھے اور دھڑا دھڑ ضیافتیں آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ بے چارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا تھا اور ماتم کر رہا تھا، کہ آپ کی صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی بیمار۔ وہ بھی برلب پنشن میں بھی برلب پنشن۔ دونوں کے خط ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے زیادہ ہوتا ہے اور نزاکت طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خطوط بھی حال میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد عاج میں میری بیماری سے بے خبر رہے چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ بے حد تندرست ہے اور اکثر مقوی ثابت ہوا

ہے۔ ایک کہانی انہوں نے اس دوران میں لکھ ڈالی ہے (یہ بات بصیغۂ راز ہے۔ آپ ہی سے ذکر کر رہا ہوں۔ بات باہر نکلی تو وہ برہم ہو جائیں گے) کسی فلم کمپنی کو یہ افسانہ بخشنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ خدمت سونپی ہے کہ اس کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کروں اور پھر دوستانہ دلالی کر دوں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں لیکن میرے اختیار و اقتدار و رسوخ کا اندازہ لگانے میں حاتمی دکھائی ہے۔ ڈائریکٹر ٹانک کا نام تجویز کر ڈالا ہے کہ وہ ہی اس قسم کے افسانے کو نبھا سکے گا۔ اور اسے تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ بلکہ دانت کاٹے کی روٹی...... وغیرہ وغیرہ

آپ کا اور عباس کا شکریہ۔ یہ بچوں کی کہانی جس کی مجھے تلاش ہے محض خیراتی کام ہے۔ یہاں کی بعض ادھیڑ عمر کی عورتوں نے ایک مضمونوں کا "گٹھ" بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف اقوام کے کھانوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں۔ اب کہانیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی پن، مادریت، اور تصنیف تینوں پرندوں کو ایک پتھر سے مارنا چاہتی ہیں۔ امتیاز کو کیا ہوا کبھی خط لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی لیکن ہر مرتبہ تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر چندے اور احباب کی وساطت سے ان کو سلام شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا۔ اس بے چارے پر کچھ عجیب کھولت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو اور گھر کے آنگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ حجاب اور یاسمین کو بھی ٹائیفائڈ لاحق ہوا۔ خدا رحم کرے۔ یہ خبر سن کر بہت رنج ہوا لیکن کیا کروں امتیاز تک عرض نیاز کرنے کے سب رستے بند معلوم ہوتے ہیں کبھی آپ سے عشق اللہ ہو تو میرا سلام کہئے گا۔

دو تین دن ہوئے حمید الدین (ابن ڈاکٹر صدر الدین مرحوم) امریکہ پھر وارد ہوئے ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی بے عنائیوں سے ملول تھے۔ کچھ تو اس میں حمید الدین کی اپنی تنگ نظری شامل تھی لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں ضرور تھی۔ حمید کی نظر میں لاہور بے حد خزاں زدہ ہے۔ گیارہ بجے کے بعد محتسب تنگ کرتے ہیں اور ہر راہرو کو آوارہ سمجھتے ہیں۔ کچھ حال عابد علی کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا نو عروس رہتی ہے لیکن اگر ماند شبے ماند کا ورد کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

چاہتا ہوں کوئی پبلشر ہم سے ٹیکسٹ بک لکھوائے۔ عمر بھر یہ کام نہیں کیا لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے کسی کو ٹٹول کر تو ذرا دیکھئے۔ میں نے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے کوئی سبیل نکل آئے۔ مانا کہ اس عمر میں جب میں خود یونیورسٹی وغیرہ میں نہیں میری قیمت گر گئی ہوگی۔ تاہم کوئی عقل کا اندھا نہ سہی گانٹھ کا پورا مل جائے تو عجب نہیں۔ عمر بھر میں "نہ" کہتا رہا۔ اب "ہاں" کہنے کو تیار ہوں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

اور باتیں بھی کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں جبراً اسے ختم کرتا ہوں۔ ورنہ عاشق کی داستان لب محبوب ختم کب ہوتی ہے۔ حسرت اور مجید لاہوری اور اختر ندوی اور عباس اور دیگر احباب کو میرا نام اور شوق یاد دلا دیجئے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ میں نہیں آئے۔ مرہاتی کا شعر یاد آیا کہ ؎

عشق کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

خط لکھتے رہیے۔

خاکسار
بخاری

---

(۱۴)

نیویارک۔ ۲۱ ؍نومبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ تجویز ہے کہ میں ایک کتاب ایڈٹ کروں جس کا عارضی نام فی الحال "A STUDY OF PAKISTAN" قرار پایا ہے۔ پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ پبلشر کولمبیا یونیورسٹی پریس یا اسی پائے کا کوئی اور امریکن ناشر ہوگا۔ کچھ تصاویر اور نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ مالیات کا باب غالباً محمد علی وزیر خزانہ لکھیں گے۔ بعض تاریخی موضوعات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف لکھے گا۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ دو ہزار الفاظ سے پانچ ہزار الفاظ تک۔ میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ ڈالیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ ثواب تو ظاہر ہے شاید خرچے کی صورت بھی نکل آئے ابھی کہہ نہیں سکتا کتاب بہر حال دنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہئے اور آپ کے قلم سے توقع بھی یہی ہے۔ قارئین کے دو پہلو مد نظر رہیں اوّل وہ پاکستان کے جرنلزم سے محض بے خبر ہوں گے دوم وہ خود جرنلزم کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ کچھ سلسلہ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے ہمارے ہاں اخبارات کی کیا حالت تھی تعداد کیا تھی۔ اشاعت کیا۔ لکھنے والے، ایڈیٹر اور مالک کون؟ اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی؟ سیاست کے کون سے پہلو ایڈیٹروں کو مرغوب تھے؟ تقسیم کے بعد جرنلزم میں کیا انقلاب آیا۔ پریسوں کی کیا حالت ہوئی۔ انقلاب کے بعد توازن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اردو کے کتنے اخبار ہیں۔ انگریزی کے کتنے؟ بنگالی کے کتنے؟ اشاعتیں کیا ہیں؟ موضوعات کیا ہیں؟ اس پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا۔ اخبارات کی تیاری کیونکر ہوتی ہے (یعنی ٹائپ وغیرہ) اشاعتیں کیا ہیں۔ حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ (روزانہ، ہفتہ وار ایڈیشن، ادبی مضمون شعر، مجید لاہوری وغیرہ وغیرہ) پریس کے قوانین کس قسم کے ہیں؟ کیا اکثر اخبار ان کی زد میں آتے ہیں یا اکا دکا (ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی لیکن نہ اس قدر کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں۔ اسی لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلےٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں) مضمون بہر حال معلومات سے پر ہونا چاہئے اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں۔ آپ کے مختصر سوانح میں خود لکھوں گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اثبات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت درکار ہوگی۔ اوروں کو ایک یا دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور امید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجیے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے لیکن مواد اور رسالہ یہاں ناپید۔ یہ تو ایک طرف یہاں مجھے یہ تک معلوم نہیں، کہ رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں۔ باقی اپنے مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں۔ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس صاحب کو بیگار میں پکڑیے اور ان سے کہیئے میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا کہ اگر کوئی مزے دار اخباری نظمیں پیش نظر ہوں تو ان کا ترجمہ بھی نمونۃً شامل مضمون کیا جا سکتا ہے۔ اور ہاں کارٹونوں کا ذکر بھی کیجیے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر لکھواؤں گا لیکن ذرا وقفے کے بعد وہ آج کل پو کی شادی کے انتظامات میں منہمک ہوگا۔ شادی ۲۵ ؍دسمبر کو ہے آج ذوالفقار کا خط آیا ہے آج ہاشمی کا خط بھی آیا۔ درسی کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی کے ہزاروں لاکھوں کا زمانہ گیا۔ اب تو کوئی دو تین ہزار

روپیہ سال کا بھی لے مرے تو غنیمت ہے لیکن اس نے مزید تفتیش کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب "PUNJAB PRELUDE" نامی میرے پاس ریویو کیلئے آئی ہے۔ مصنف کا نام مس PRIOR ہے جو کچھ عرصہ ہوا اکیسن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ شاید اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان اور پنجاب پر فدا ہیں، اور ہندوستان سے متنفر۔ بار بار ثابت کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی صاحب کے خاندان پر (بہ تغیرِ اسما) ہے اور پیار سے لکھا ہے ہیرا منڈی کے جلوے سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ "بوائے اینڈ گرل ٹربل" کے متعلق ہے ضمیمہ "بوائے اینڈ بوائے ٹربل" کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

آج یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ کابینہ میں ردوبدل ہونے والی ہے نیز یہ کہ فوج کے افسروں میں بددلی ہے۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی آفت سے بچائے۔ ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب اور اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

---

(۱۵)

۹ر دسمبر ۱۹۵۳ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ۳۰ر نومبر کا ملا۔ یہ آپ کے مفصل ترخطوں میں تھا لہٰذا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت مزے لے لے کر طے کی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے تاکہ اس علاقے کی صحافتی مد و جزر کا کچھ حال معلوم ہو نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے لیکن جن کا پاکستانی تحریک سے گہرا تعلق تھا مثلاً ڈان۔ اتنا کہنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ در اصل پاکستانی صحافت کا حال بیان کرنا ہے۔ اب اس کا پس منظر بیان کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے یہ آپ کے حسن مذاق اور احساسِ ربط پر چھوڑتا ہوں۔ ان سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں البتہ یہ خیال رہے کہ قارئین انگریز اور امریکی ہوں گے۔ اور جس نہج سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکوں کے لوگ ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر باتوں سے بے خبر ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیائی لوگ "کس قسم کے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں کس رخ جا رہے ہیں ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیرِ عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس آلۂ جمہور کا ایشیا میں استعمال کیا ہے کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور (اگر ہر اخبار کئی ہاتھوں سے گزرتا ہے) کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقہ کے ہیں کس قسم کی خبریں سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے اخبار کے اثر سے بالکل ہی مامون (یا محروم ہیں) اس نوع کی باتیں یہاں لوگوں کے لئے از حد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لوگ اکثر اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق اچھی بُری جتنی بھی بحثیں ہو رہی ہیں وہ اخبارات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں۔ اور ممالک میں اس کے علاوہ انجمنوں، سیاسی جماعتوں، جلسوں اور لیکچروں میں بھی مختلف آرار کا اظہار کیا جاتا

لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے یا تو لوگوں نے دوستوں کے حلقوں میں بحثیں کیں یا اخبارات میں آئینی اقدامات کے مالۂ و ماعلیہ پر بحث ہوئی اور بس۔ اب اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی کئی باتیں آپ کے بہار آفریں دماغ کو خود ہی سوجھیں گی۔ آفتاب کو چراغ کیا دکھاؤں۔ "ماہِ نو" والا مضمون بھی مجھے بھجوا دیجئے۔

"ادبی رجحانات" کے متعلق عرض کیا تھا کہ میری جانب سے عباس سے استمداد کیجئے۔ اس کے متعلق آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ آپ کہیں تو میں اس سے براہِ راست خط و کتابت کروں۔ شاید آپ کو اس میں سہولت ہو۔ بچوں کی کہانی کے متعلق آپ کی مساعی کا شکریہ۔ امتیاز کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہاشمی کہتا ہے: "کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات قطعی وہی ہیں جو اس سے قبل عرض کر چکا ہوں..... ہاں سالک صاحب کراچی کے امریکن پبلشرز کو اور ٹٹول لیں تو بہتر ہوگا۔" چنانچہ ہاشمی صاحب کا ارشاد آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط بلا وجہ لکھوں گا۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔ صحت بہت خراب ہے۔ آج چودھری ظفر اللہ خاں یہاں سے رخصت ہوئے۔ سیاحت کرتے کراتے ۵ جنوری کو کراچی پہنچیں گے۔ اسمبلی ختم ہوئی۔ اب نسبتاً ذہن پر بوجھ کم ہوگا۔

خاکسار

بخاری

خط کے پتے پر میرا نام لکھ دیا تو منصب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھا کہ آپ کو اس کے لئے بہت ہی خفی قلم استعمال کرنا پڑا۔ اس سے مجھے خفت ہوئی۔

---

(۱۶)

جانِ برادر۔ کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط اغلباً وہ تھا جس میں آپ نے "زمزمہ" کے تاریخی حالات لکھ بھیجے تھے۔ اس کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا اچھا خاصا پُر از معلومات مقالہ بن گیا۔ اور اس کی بدولت میں مفت میں تاریخ دان بن گیا۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری ترجمہ بھی کیا نعمت ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ ترجمہ کے لئے مسالہ فراہم کیجئے۔ عباس نے اس بارے میں دستگیری کا وعدہ کیا تھا۔ ایک خط بھی اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ ملیں تو یاد دہانی کر دیجئے گا۔ آج کل کچھ پژمردہ رہتا ہوں۔ تخفیف کی زد میں آ گیا ہوں۔ تجویز ہے کہ اس عہدے کو فوراً یعنی اپریل سے سفیر سے گھٹا کر وزیر کر دیا جائے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مجھے یہاں سے بدر کیا جاتا لیکن اربابِ اقتدار نے اتنا کرم ضرور کیا کہ اگر مجھے وزیر بننا بھی منظور ہو تو یہاں سے نہ نکالا جاؤں گا۔ میرے حالات آپ جانتے ہیں۔ جس عارضے یعنی سرطان کا خطرہ لاحق ہے اس کی وجہ سے میں یہاں سے ہل نہیں سکتا چنانچہ یہی منظور کر لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اب نہ معلوم یہ بھی کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں (وقت گزر گیا اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ریٹائر ہونے کا سال اور مہینہ بھی یاد نہ تھا۔ خط لکھ کر وزارتِ تعلیم سے دریافت کیا جواب آیا تو چونک اٹھا) نہ معلوم اکتوبر کے بعد کیا حشر ہو۔ توسیع ملے نہ ملے اور ملے تو کن شرائط پر اور کیا کام مجھ سے لیا جائے۔ میں بھی عجب خوش فہم ہوں اب تک یہی غرہ تھا کہ اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گذاری کی ہے اور ستم کی گور پر وہ لات ماری ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آئے گا۔ لیکن ملازمت تو ایک چکی ہے۔ چکی میں دانے کی کیا حیثیت ہے کہ چاہے تو پسے اور چاہے تو نہ پسے۔ عرض معروض ترکی ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہو۔ آپ جانتے ہیں۔ میں عمر بھر جنبہ داری سے دور رہا ہوں۔ محض خدمت گزاری اور خدا پر اعتماد

رہا ہے۔ کون ہوگا جو اپنی مصلحتیں چھوڑ کر میری بہبودی کا بیڑا اٹھالے۔ بہرحال تترس از بلائے کہ شب درمیان است۔ محمود نظامی یہاں سے گذرے دو شامیں ان کی صحبت میں بسر ہوئیں زندہ دل انسان ہیں۔ اس بازار میں کا نسخہ ملا۔ بعض مقامات اس میں نہایت دل چسپ ہیں۔ بعض خطیبانہ ہیں۔ دونو کا لطف اپنی اپنی جگہ آیا۔ بعض لطیفے اس میں نادانستہ وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۱۷ "بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے"۔ جو معنے فوراً ذہن میں آئے وہ اسفل کی طرف راجع تھے لیکن دوبارہ غور کیا تو اصل معنے روشن ہوئے۔ آخری باب میں جو پنجابی گیت شامل کئے ہیں ان میں سے بعض کئی روز دماغ میں گونجتے رہیں گے ؎ میری لگدی کسے نہ ویکھی تے ٹٹدی نوں جگ جاندا۔ ع اگ بال کے دھوئیں دے تیج رووان ع ماہجے دیئے بند بوتلے ؎ تیرے لونگ دا پیا لشکارا۔ تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے۔ کتنا نشہ ان بے ساختہ جملوں میں بند ہے۔ پنج کے معنے مجھے نہ آتے تھے۔ معلوم ہوا "آرڈ" کے مترادف ہے۔ چلئے یہ بھی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس خط کی رسید فوراً بھجوا دیجئے گا۔ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان ہے۔ خدا ہم سب کا نگہبان ہو۔

بخاری

---

(۱۷)

برادرِ محترم اس ڈاک میں دو خط ملے۔ ایک آپ کا ایک والد کا۔ دونو کے جذبات ایک سے تھے گو مضمون مختلف تھے۔ دونو کا اثر طبیعت پر ایک سا ہوا۔ فی الحال انفلوئنزا میں مبتلا ہوں۔ تیز بخار ہے اور ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس جسمِ فانی میں کئی اور نقائص پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ قلب کی حرکت، خون کا دباؤ، جگر و معدے کی حالت، ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ بہرحال اب یہ توقع تو ہمیں کبھی نہ تھی کہ زندگی ابدی ہے نہ اس بات سے لاعلم تھے، کہ جوانی آنی جانی چیز ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکشِ غمِ پنہاں نے وقت سے پہلے بیکار کردیا۔ بہرحال بقول ایلا وہیلر ولکاکس کی اس نظم کے جس کا ترجمہ آپ کسی زمانے میں مشاعروں میں زور و شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ رونا تنہائی پسند ہے۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کروں۔ بہتیری کر چکا ہوں۔

آمدم بر سرِ مطلب۔ حالات وہی ہیں جو آپ نے بیان کئے ہیں۔ پالاں اور طوقِ زریں کے متعلق جو نظریہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ بھی حرف بحرف صحیح ہے۔ میری صرف اتنی درخواست تھی کہ آپ کو میرے اخلاص یا مستعدی پر کبھی شبہ نہ ہونا چاہئے۔ میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا جس طرح بن پڑا، جب بن پڑا۔ میں دریغ نہ رکھوں گا۔ اس میں کوتاہی ہو تو اسے اپنی روسیاہی سمجھوں گا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بری طرح بندھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میری بے بسی کو میری ہی محرومی سمجھئے۔ اسے بے اعتنائی پر محمول نہ کیجئے۔ فی الحال اتنا کیجئے کہ لاہور میں جو صاحبِ اختیار ہیں۔ ان سے کسی وقت ملئے۔ امتیاز کی معیت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہوگا۔ دو ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھیجوں گا۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ انہیں سمجھاؤں گا۔ ملتے وقت میرا نام بھی لے دیجئے اور کہئے کہ میں اس کے ایما سے مل رہا ہوں۔ برادرِ محترم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں۔ لامحالہ مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قسمت یاور ہو تو کامرانی جلد نصیب ہو جاتی ہے ورنہ بعض اوقات شکیب آزما صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آپ کہیں اور میں سنوں۔ برعکس اس کے میں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں میں مجبور بلکہ معذور نہ ہوتا تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا لیکن کیا کروں ؎

نہ کبوتر حرمِ من نہ بدست جامِ جمِ من ۔۔۔ کہ نہ بامِ من بلندے نہ کمندِ من درازے

مجھے اس خط کا جواب ضرور دیجئے، خواہ جواب پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کم از کم اپنی پریشانی میں مجھے ضرور شریک کر لیا کیجئے۔

آپ کی محبت، شفقت، علو فطرت کی بدولت بسا اوقات مجھے تقویت نصیب ہوئی ہے۔ جب آپ پریشان ہوں تو یہ گوارا نہیں کہ مجھے اس پریشانی کا حصہ نہ ملے۔ میرا اختیار ہوتا تو میں آپ کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہ رہنے دیتا۔

میرا وہاں کا معاملہ فی الحال از حد نازک اور بہت مخدوش مرحلے میں سے گذر رہا ہے۔ کبھی فرصت ہو تو ہنسوں سے مل لیجئے۔ شاید وہ آپ کے مشورے یا مدد کے محتاج ہوں۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں کہ کسی کو کچھ کروں۔ صوفیا کا توکل بزدل اور کمزوری سہی۔ لیکن کمزور کے پاس اس کے سوا اور مسلک بھی کیا ہے۔ آپ کی بھابی سلام کہتی ہیں آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۸)

۱۲۔ تغلق روڈ

نئی دہلی۔ ۱۹ر دسمبر

برادر محترم سلام مسنون۔ فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ اور اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا کر چھاپتے ہیں اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں:۔

(۱) نیوز ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لئے لامحالہ ایسے کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں جو انگریزی سے کماحقہٗ واقف ہوں۔ محض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ (خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی ہی مہارت حاصل ہو) کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

(۲) تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں حالانکہ مفصلات میں کئی ایسے دل چسپ واقعات پیش آتے ہیں جو دیسی زبانوں ہی میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بضاعت کم ہو تو مترجم تھوڑے اور کم سواد ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی ہیئت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بر آں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لئے نیز دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگوائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار متعینہ جھنگ (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہونچا دے جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر مترجم کی ضرورت پیش آئے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اب اگر اس میں آپ کو کوئی فائدہ اور سہولت نظر آتی ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا۔ کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیونکر بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں لیکن اس کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں اچھی خاصی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے وہاں شاید دقت ہو۔ لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

اس مسئلے پر اپنی رائے سے مستفید فرمائیے اور اگر ہو سکے تو یہ بھی فرمائیے کہ عام طور پر دوسرے دیسی اخبار کس حد تک اس بدعت یا جدت کا خیر مقدم کریں گے۔ ممکن ہے یہ مسئلہ پہلے بھی آپ کے زیر غور رہ چکا ہو اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ مجھے اس میں ترقی کے بہت سے امکانات نظر آئے۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کیا۔ کہ آپ کی رائے دریافت کروں۔ جواب کا منتظر

بندۂ خاکسار

بخاری

---

(۱۹)

برادر محترم۔ گرامی نامے کا شکریہ۔

میاں صاحب کی معاملہ فہمی اور آپ کی معاملہ فہمائی کی بدولت خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا۔ کل محکمے کے نام چیٹرجی کا خط پہنچا۔ کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہو گا۔ لہٰذا مجھے بروقت سبکدوش کر دیا جائے۔ چیٹرجی کے ایک نجی خط اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا کہ ڈکنسن یکم مارچ سے رخصت لے گا۔

اپنا ارادہ اب یہ ہے کہ جنوری فروری دو مہینے کی چھٹی لے لوں۔ بہرحال دسمبر کے آخر تک قطعی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا۔

آپ کی بنگ درو کا شکریہ۔ درست وہ ہے جو کہ . . . . الخ۔ اس مصرعے کے مطابق پکڑانے کے جو معنے نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق دھکڑنے کے کیا معنی ہوئے؟ اور "پکڑ و دھکڑ" کس کو کہتے ہیں۔ ایک نسخہ مثلاً یہ ہے کہ درست وہ ہے جو کہ دھکڑے دوست کو۔

لطیفہ۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹاٹا کہتے ہیں۔ جس کے معنی گڈبائی کے ہیں۔ یار لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ چونکہ دلی کے ارباب اقتدار پر آج کل سے سرمایہ دار چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے دلی میں جس طرح السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹاٹا کے جواب میں اسی لہجے میں برلا۔ دالمیا بولا جائے۔ جو لوگ دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں۔ انہیں چاہئے۔ اب سری رام (یعنی سر شری رام، مالک دلی کلاتھ مل) کہا کریں۔ غصے کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ "گاندھو" ہے اور اسے "قومی" گالی بنا لینا چاہیے۔ جا بے گاندھو۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں لاہور دورے پر آنے کا ارادہ ہے۔ ملاقات ضرور ہو گی۔ سنا ہے امتیاز لاہور واپس آ گیا ہے نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے دلی سے شمال جنوب کو گزر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔ ملے تو ڈانٹوں گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۰)

برادر محترم۔ گرامی نامہ ملا آپ نے جو زحمت اٹھائی اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ مجھے میاں صاحب کے دلی آنے کا علم نہ

تھا۔ کل (یا ممکن ہے آج ہی) بہترجی سے یہاں ملاقات ہوگی۔ ممکن ہے وہ اور میاں صاحب دونوں کا سفر دہلی ایک دوسرے سے غیر متعلق ہو۔ بہر حال میں میاں صاحب سے بھی مل لوں گا۔ اور آپ کو جملہ کوائف سے مطلع رکھوں گا۔

زبیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ آبدیدہ ہو کر آپ کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مجھے لگی سالک صاحب نے اس خط میں ہماری واپسی پر ذرا بھی اظہار خوشنودی نہیں کیا۔ میں نے کہا میرا خط بالکل کاروباری تھا۔ اس کا ویسا ہی جواب ضروری تھا۔ باقی حساب دوستاں در دل۔ بہر حال عرض نہیں کر سکتا کہ لاہور واپس آنے کے خیال سے زندگی میں ابھی سے کتنی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں کہ دس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے جس سے وہ پہلے کا سا نقشہ نہ جم سکے۔ با ایں ہمہ کئی مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے اور سب نشیب و فراز دیکھنے، کئی تلخیاں چکھنے اور کئی غلطیاں کرنے کے بعد بار بار اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ؎ دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است۔ صراحی مے ناب و سفینہ غزل است۔ لاہور میں جو دوست تھے وہ سب اپنے محور پر قائم ہیں۔ جمگل لاہور میں نہ جانے کب تک ہے۔ امتیاز کی بیوی کی کئی داستانیں سنتا ہوں۔ لیکن ایک سالک ہے جس کا حسن کلیوپیٹرا کی طرح بقول شکسپیر کے مرور زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ میرے لئے لاہور اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ایک بار پھر آپ کی طویل صحبتیں نصیب ہوں گی۔ اور فراغت بے خلل ہوگی۔ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے۔ بہت تھک گیا ہوں دس سال سے کوئی چھٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ ہوں گے ہاشمی ہوں گے۔ بیخودی و خرمی بے خلل ہوگی۔ اور اگر خرمی بے خلل اس دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو بہر حال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے وہ مجھے لاہور ہی میں ہوگی۔ جذباتی سی باتیں ہیں۔ لیکن محض اضطراری نہیں۔ ان باتوں پر میں نے بہت کچھ دماغ سوزی کی ہے کوئی اور بات علم میں آئے تو مجھے مطلع رکھئے گا۔

خاکسار

بخاری

۸ر اکتوبر

---

(۲۱)

۱۰ر جنوری

برادر محترم۔ کل ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس خط کو اس کا ضمیمہ سمجھئے۔ رات میرے ہاں یاران طریقت کھانے پر جمع تھے۔ تاثیر اور ذوالفقار بھی یہیں ہیں ان کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، مجید ملک۔ سب موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرح کا مصرعہ دے رکھا تھا ع گماں الٰہی تھا مجھے بدگماں پر۔ شرط تھی کہ ہر ایک چند اشعار اس طرح پر ضرور لکھ کر لائے۔ چنانچہ سب نے حتیٰ کہ میں نے اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شیاطین جمع ہوں۔ غزل بھی کہی گئی ہزل بھی بکا گیا۔ اور دونوں اصناف میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوالفقار، تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں بحثیں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے مجمع برخاست ہوا اور میں دور دور رہنے والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر سوا چار بجے خود گھر پہنچا۔

ممکن نہ تھا کہ یہ سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا ذکر ایک مرتبہ نہیں ہزار بار نہ ہوا ہو۔ جب یہ خبر سنی کہ آپ ۲۰ر جنوری کے لگ بھگ آ رہے ہیں۔ تو سب مصر ہوئے کہ آپ کے آنے پر پھر ایک ایسا مجمع اور ایک ایسا مشاعرہ ہو۔ طرح تجویز ہوئی کہ " وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں " (قافیہ جہاں، آسماں) اور مجھ سے کہا گیا کہ سالک صاحب کو مطلع کر دوں۔ تاکہ وہ اس طرح پر غزل ہزل دونوں لکھ کر لائیں۔ اور قیام کی تاریخیں بتائیں۔ تاکہ باقاعدہ پروگرام بنایا جائے۔ آپ کے آنے

تک تاثیر نہیں ہوں گے۔ ذوالفقار لاہور اور بعد ازاں بمبئی جا رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے وہ بھی اس وقت تک لوٹ آئیں۔

اس طرح پر آپ کو طبع آزمائی ضرور کرنی ہوگی۔ ورنہ سب کو مایوسی ہوگی۔ اور ہرل کو نظر انداز نہ کیجئے۔ ورنہ مایوسی کے علاوہ صدمہ ہوگا۔ آپ کو فرصت ممکن ہے کم ہو۔ لیکن یہاں بھی ایک تاثیر کو چھوڑ کر باقی سب عدیم الفرصت ہیں آپ ہی میں کیا سرخاب کا پَر لگا ہے۔

اور آنے اور ٹھہرنے کی تاریخیں فوراً بتلائیے۔ ایک آدھ دن کا قیام ہمیں پسند نہیں۔ ایک آدھ دن کو آنا ہو تو آنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیے۔ وہیں سے اپنی ٹاک کا ریکارڈ بھروا کر بھیج دیجئے۔ ہمیں یہ از حد ناگوار گذرے گا کہ آپ آئیں بھی تو اس طرح کہ گھڑی دو گھڑی کو مل کر بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو۔ دن بھر سب لوگ معاش کے مخمصوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ جب تک ایک دو تین شامیں میسر نہ ہوں ہم تشنہ کاموں کی کیا تسلی ہوگی۔ یاد رکھئے کہ آپ کے قیام کی آخری شام محض بے کار ہوگی کیوں کہ ۹ بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے ۹ میل ہے آٹھ بجے تو آپ روانہ ہی ہو جائیں گے چنانچہ آخری شام کو ہمارے حساب میں شمار نہ کیجئے۔

خاکسار

بخاری

۱۳ تغلق روڈ نئی دہلی

۱۰ جنوری

۲۲

۲۰ جنوری

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ معاملات متعلق ورک کیمپ کی مساعی ابھی تک جاری ہیں۔ اور اس میں بہت کچھ دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور عزم جزم کا اظہار کیا تو ممکن ہے بلا کسی حد تک ٹل جائے۔ کیوں کہ یہاں تو مقابلہ محض ہٹ کا ہٹ سے ہے۔ ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ دونوں طرف سے کچھ ضد کچھ اخلاق کا اظہار ہو رہا ہے خدا کرے اخلاق محض ہماری طرف سے اور ضد محض ان کی طرف سے نہ ہو اس میں کچھ شبہ کی گنجائشیں ہیں۔ اس لئے ابھی مطلع صاف نہیں ہوا۔ اور نتیجے کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے لیکن بہرحال اپنی تیاری مکمل کر رکھنی چاہئے۔ مجھے نتیجے کے متعلق کچھ ایسا حسن ظن نہیں۔ یہاں بابائے اردو سے بھی چند در چند مشورے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ معاملہ حسب منشا طے نہ ہوا تو وہ علاوہ یہاں کام کرنے کے فوراً لاہور بھی آئیں گے اور اہلِ صحافت کو مآلِ دماغیہ سے آگاہ کریں گے۔ اور لائحہ عمل کے متعلق مشورہ دیں گے اس پلان کو تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے بُن ران میں عرصے سے ایک مسا نکلا ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے پون انچ کے قریب ہو گیا اور اس کی بیخ بھی کوئی پون انچ کے برابر ہو گئی۔ مدت سے ارادہ تھا کہ اسے کٹوا ڈالوں، "کھتانٹ"[1] ہونے کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ مصروفیتوں نے مہلت نہ دی۔ اب رخصت لی ہے تو یہ خرخشہ بھی پاک ہو گیا۔ کاٹنے کے بعد دو تین ٹانکے لگانے پڑے اس لئے نرسنگ ہوم میں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ دن ڈریسنگ گون میں فرصت اور یکسوئی کے گذارے۔ پھر واپس آ گیا کوئی تشویش کی بات نہیں۔ جو مضغۂ گوشت کٹا تھا اس کا معائنہ کرا رہا ہوں۔ شبہ ہے کہ سرطان نہ ہو۔ ڈاکٹر اس شبہے پر ہنستے ہیں لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے احتیاط کرتا ہوں۔ صحت اچھی ہے۔ رخصت کے ایام میں برسوں سے جو کام معرضِ تعویق میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نبٹانے کی کوشش کر رہا ہوں اب احساس ہوتا ہے کہ اس دس گیارہ سال

---

[1] پنجابی لفظ ہے۔

میں اپنی ذاتی مفاد اور بہبود سے کس قدر غفلت برتی ہے۔ ساتھ ساتھ مطالعے کا شوق بھی امنڈ کر آیا ہے۔ تاریخ اسلامیہ کے بارے میں میرے مطالعے میں کمی رہتی ہیں۔ ان کو بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ہسپانیہ کی تاریخ پڑھ چکا ہوں، ادھر عباسیوں کے آخر تک پہنچ گیا ہوں۔ شعر العجم کے بھی پانچوں حصے پڑھ ڈالے۔ نسانہ آزاد کا خلاصہ کر رہا ہوں تاکہ ایک تہائی میں سما جائے اور کس کی لذت دی رہے۔ دوستوں کی صحبت سے پھر روح دوماں کو سیراب کرنے کے لئے بے قرار ہوں اور دن گن رہا ہوں۔

خاکسار

بخاری

۲۰ جنوری

۲۳

۱۹ اکتوبر

برادر محترم۔ سلام مسنون

میرے تقرر کی میعاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۴۶ء کو ختم ہوگی۔ وائسرائے کے مشورے سے فیصلہ ہوا ہے کہ مجھے مزید پانچ سال کے لئے رکھا جائے۔ اب پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتہ کے اندر یہاں سے خط روانہ ہوگا۔ ٹھیک کس تاریخ کو اور مکتوب الیہ کون ہوگا۔ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جب معلوم ہوا تو آپ کو مزید اطلاع دوں گا۔ بہر حال ممکن ہے مجھے کوئی علم نہ ہو اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل و عقد کا سنبھالنا اب آپ کے سپرد کرتا ہوں گو یقین نہیں وہ معترض ہوں۔ میرے واپس آنے سے کئی اصحاب کو ترقی معکوس ملے گی اس لئے افسروں میں سے کون ایسا ہوگا جو مجھے دور نہ رکھنا چاہے۔

دو ایک نکتے قابل غور ہیں اوّل تو یہ کہ میرے جیسے افسر کے معاملے میں میعاد کا مقرر کرنا محض ایک اخلاقی اور رسمی بات ہوتی ہے۔ میں کنٹریکٹ آفیسر نہیں۔ مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ نہ آئی سی ایس وغیرہ کا رکن ہوں جن کا صوبوں سے مرکز اور مرکز سے صوبوں میں منتقل ہونا خاص قواعد و ضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔ میں خواہ پانچ سال کے لئے صوبوں سے باہر کام کروں۔ خواہ دس سال کے لئے۔ بہر حال اور ہر وقت پوزیشن یہی رہتی ہے کہ میرا LIEN قائم رہتا ہے یعنی مرکز صوبہ اور میں خود، ہم تینوں میں جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تقرر کی میعاد کا معین کرنا در اصل کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ سا رہتا ہے علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری آسامی پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال کا اوفر حکومت پنجاب سے پوچھنے کے بعد کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کسی طرح سلسلہ جنبانی کریں گے یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ وہ نہ ہو کہ آپ کی کسی سعی سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی بہت اہم بات ہے جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے حالانکہ در اصل یہ صورت نہیں۔ اگر برسبیل تذکرہ یہ بات ہو جائے اور کوئی اس پر دو ہفتوں کے دوران میں نگاہ رکھے تو مفید ہوگا۔

میں آج P.E.N کانفرنس میں شامل ہونے کیلئے جے پور جا رہا ہوں وہاں "THE URDU WRITERS OF OUR TIMES" پر ایک پیپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوئے بمبئی سے واپس آیا ہوں وہاں امتیاز حجاب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو سوائے فلم کے اور کسی چیز کا شوق معلوم ہوتا ہے نہیں رہا۔ اس سے کچھ رنج ہوا۔ وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو کبھی محض سیر و آرام کی غرض سے بمبئی جانا چاہئے۔ وہاں آج کل ذوالفقار ہیں۔ آپ کا

قیام یقیناً ان کے پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہیئے گو آپ ابھی سو دو سو سال زندہ رہیں گے۔ تاہم۔

خاکسار

بخاری

۱۹ اکتوبر

---

(۲۴)

۴ جولائی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط دہلی میں میرا انتظار کرتا رہا۔ اسی لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انتخاب افکار و حوادث کے باب میں میں مجرم و نادم ہوں۔ کچھ کسالت، کچھ مصروفیت اور پریشانی۔ علاوہ براں میں نے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور دقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو لاہور آ رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تمام فائل بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا تو آپ مجھے حلقہ و حلقہ بگوشاں سے خارج تو کیا کریں گے کچھ اور ڈانٹ لیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے اور ضرور کروں گا لیکن مذاق برطرف۔ اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں ان شاء اللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

ا۔ب صاحب اپنے بارے میں غیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے تو جو اس عہدے پر مقرر ہے وہ کیونکر مستقل ہو سکتا ہے اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا ممکن ہے یہ کام رہے نہ رہے۔ ا۔ب ہی قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو یا کسی اور قسم کے آدمی کے سپرد یہ کام سپرد کیا جائے یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ا۔ب صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کو تاہیوں کا علم خود براہ راست مجھ کو ہے تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ کہ چونکہ مجھے برخواست نہیں کیا اس لئے میں مستقل ہونے کا حق دار ہوں۔ اگرچہ پڑی دی ہے تو دور ہونی چاہیئے! وہ خواہ مخواہ ایذا طلبی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے عادی ہو چکے ہیں دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اکثر ان کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے بلکہ اکثر شاکی ہی رہتے ہیں ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا اس میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی اس کے لئے وقف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عند الملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے؟ ہے موقع؟

خاکسار

بخاری

---

(۲۵)

استاذی۔ پہلے غزل کا قصہ طے کریں۔

(۱) ابھی قائم ہے محفل عاشقان محفل آرا کی   کہ ان کی خانماں بربادیاں رونق ہیں صحرا کی

آپ محفل آرا کو دشت پیما کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عاشق جو محفلوں کی زینت تھے۔ اب برباد ہو چکے لیکن محفل آرائی ان کی فطرت میں ہے اس لئے باوجود خانماں برباد کے وہ محفل آرا ہیں۔ اور وہ یوں کہ برباد ہوئے تو صحرا کی رونق بن بیٹھے۔ دشت پیما سے معنی بدل جائیں گے۔ لیکن آپ کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو یقیناً معنے الجھے ہوئے ہوں گے۔ المعنی فی بطن الشاعر سے بہتر ہے کہ معنی صاف ہو جائیں لہٰذا دشت پیما منظور گو اس سے شعر کا مطلب وہ نہ رہے گا۔

(۲) ....چشم گل کی نمناکی

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہٰذا منظور۔

(۳) کھلے موتیا ——— منظور

(۴) در میخانہ واہے چشم ساقی میں ہے بیباکی

میں نے کہا تھا در میخانہ واہے آنکھ میں ساقی کی بیباکی۔ آپ فرماتے ہیں ایک ہے کی کمی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا کہ ایک ہے کی کمی ہے کئی فقرے یا محاورہ ایسے ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں بالکل یہی شکل ہوتی ہے اور صرف ایک ہی استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال اصلاح منظور۔

مختصر یہ کہ کلی اتفاق۔ اور بہتر بھی یہی ہے۔ وہ نہ ہو غالباً) سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ آپ کی اصلاح سے متفق نہ ہوں جب بھی اتنا ضروری ہے کہ آپ کے اعتراض سے ایسا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتفاق کے بغیر چارہ نہیں رہتا (اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں) بہر حال دماغ سوزی کا بہت شکریہ!

۳۰ جون سے (تاریخ یاد رہے) میں ۹ اشوکا روڈ۔ نیو دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو 9 ASOKA ROAD لکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اور امتیاز چند دن کے لئے آجائیں۔ برسات جوبن پر ہے۔

او بھائی۔ نماز بخشوانے گئے تھے...... الخ۔ ممنوعین کا معاملہ طے ہوتے ہوتے یہ معاملہ ایسا غائب ہوا کہ خبرش باز نیامد۔ یہ تو کہئے کہ کیا مہر صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے مسئلے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو نتیجہ کیا ہے۔ اس موضوع پر تو برسوں سے آپ نے کچھ لکھا نہ مہر نے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۶)

۲۰۱ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

۲۰ اکتوبر

محترم بھائی۔ گورنمنٹ کو اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے۔ اس لئے خالی آسامیوں کی بھرتی یک قلم رُک گئی ہے۔ اور معلوم نہیں کہ کب تک رکی رہے گی۔ اسی لئے ہر کام میں تاخیر لابُد ہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو عرصہ ہوا آپ نے لکھا تھا اور جس کے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہونگے۔ پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی صحبتیں گرم ہوئیں۔ آپ کا ذکر اور ذکر خیر بار ہا آیا۔ اور مولانا ممتاز علی مرحوم کا ذکر بھی آیا اور امتیاز کا ذکر بھی آیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا۔ (یہ سٹائل بہ تتبع خواجہ حسن نظامی ہے) ایشیائی علم و ادب و تاریخ پر زوروں کی بحثیں ہوئیں۔ شعر خوانیاں ہوئیں۔ بذلہ سنجی ہوئی۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ ملا۔ جو عالم اسلام اور اس کی نیرنگیوں اور رنگ آفرینیوں کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب مٹتی جاتی ہے۔

س خط کو دیکھتے ہی رائے بہادر منوہن صاحب سے ملئے اور ان سے پوچھیے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ اگر ہو تو اس کا مداوا کیجئے۔ تفصیلات انہیں سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی صاحب کو بھی شامل کر لیجئے۔

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر ہے۔ بشیر ہاشمی غالباً والدہ پرستی کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ ممکن ہے امتیاز بھی بحیثیت ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے آجائیں۔ آپ ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آجائیے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔ خاکسار

بخاری

بھئی انقلاب بھیج کر فی الواقع بہت احسان کرتے ہو۔ جس دن انقلاب نہ پہنچے دن خالی معلوم ہوتا ہے کل یہ عنوان نظر آیا

لاہور میں گداگروں کی اکثریت

یہ اکثریت کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لئے سند موجود ہے" اقلیت مال و اکثریت عیال" مشہور فقرہ ہے۔

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ خوب ہے۔

ہوں پہ دم ہے تڑپتے ہیں دردمند ترے

وہ اور کوئی نہیں عاشقان چند ترے

بخاری

---

(۲۷)

۲۳ دسمبر

برادر محترم۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خط کے مفہوم سے آگاہ ہوا اور اس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فروعی فرائض ماتحتوں کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا تا آنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا۔ وہ بھی اپنی فروعات

میں شامل ہے۔ تاہم اس سے غافل نہ رہوں گا۔ اگر فیصلہ حسبِ دلخواہ نہ ہوا تو مجھے دوبارہ تاکید کرنے میں تامل نہ کیجئے گا۔ کہ میرا منصب ہی موکّد ہوتا ہے۔

ہمشیرہ کے رشتے کے متعلق کچھ آپ نے سلسلہ جنبانی کی تھی پھر معلوم نہ ہوا کہ بات کہاں تک پہنچی۔ یا کہاں رک گئی۔

ایک خط ایڈیٹر انقلاب کے نام ملفوف ہے انہیں پہنچا دیجئے گا۔ تاکہ ان کو انکار و حوادث کے لئے مسالہ مل جائے۔ یا کم از کم ان کی اپنی ضیافت کا باعث ہو۔

میں کل صبح ہفتے بھر کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ نہ معلوم اس میں سے کتنے دن ریل میں گذریں گے لیکن سنتا ہوں کہ ریلیں اب چلنے لگی ہیں اور چلتی ہی کا نام گاڑی ہے۔ احباب کو میرا سلام پہنچے۔ اور بالخصوص مہر صاحب، امتیاز صاحب اور حمید علی صاحب کو۔ زبیدہ آپ کو اور بھابی کو سلام کہتی ہیں۔

یہاں میرے پہلے جنم کے اہلِ قلم اور احباب تو بہت جمع ہیں۔ لیکن دلی شہر نہیں صحرا ہے۔ فاصلے بہت ہیں۔ کچھ جسمانی کچھ روحانی، پٹرول بھی کم ہے دل بھی خشک ہے۔ دلی کی آب و ہوا ہی ایسی ہے ہر شخص دفتری کشمکش اور ہوس رانی میں مبتلا ہے۔ میں "اردو مجلس" کے احیا کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھئے۔

بخاری

۲۸

HOTEL MARIACRISTINA

MAXICO D.F.

۱۲ر جنوری

برادرم۔ نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوا کسی اور دوست کا خط اب تک نہیں آیا۔ صوفی۔ ہاشمی فیض۔ تاثیر سب نے گویا مجھے دریا برد کر دیا۔ زبیدہ اور ہارون کے خط مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان سے بالواسطہ کچھ احباب کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اور گھر کے حالات سے تو باقاعدہ مطلع رہتا ہوں۔ ورنہ بالکل ہی رابن سن کروسو بن جاتا۔ سیاسی حالات سے باخبر نہیں۔ ریاض احمد کو کراچی سے جو خط آتے ہیں۔ ان سے دو چار اڑتی اڑتی باتیں معلوم ہوئیں۔ ادبی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نہ معلوم کون سے رسالے بند ہو گئے کون سے نکل گئے۔ کن پر کھل منڈل کی کیفیت طاری ہے۔ کس کس شاعر نے غالب کے گور پر لات ماری۔ آپ نے انقلاب کا ایک ورق بھیج کر میرے کم از کم چوبیس گھنٹے رنگین کر دیئے۔ سلور جوبلی پر آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ میں لاہور میں ہوتا تو دوستوں کے اجتماع کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ جاتا اور سب شاعر دوستوں سے ہزل لکھواتا اور شب دیگ پکتی۔ خیر۔ گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم۔ "انقلاب" کے مد و جزر کا حال پڑھ کر میں کچھ مغموم ہو گیا۔ عمر بھر کی بزلہ سنجی، بزرگوئی اور جھکتی صحافت کے بعد آپ کو یہ سخت مرحلے پیش نہ آنے چاہئیں تھے۔ لیکن آپ نے اخبار کا نام ہی معلوم ہوتا ہے لسان الغیب کے کہنے پر رکھا ہے۔ بہر حال آپ طبعاً قلندر ہیں۔ اپنی قلندری کو کام میں لائیے۔

کانفرنس کہنے کو تو انجنیر بازی تھی۔ لیکن آتے کے ساتھ ہی معلوم ہو گیا کہ ریڈیو بھی سیاسی کھینچ تان کا اکھاڑہ ہے۔ چھوٹی لہریں بجز دور مار اسلحے کے اور کچھ نہیں۔ دو مہینے تک کانفرنس کا تکیہ کلام یہ تھا کہ اصول وضع ہونے چاہئیں۔ چھوٹی لہروں کی تعداد کل (۱۰۰) ہے۔ دن رات کے گھنٹے چوبیس ہیں۔ دونو کو ضرب دیجئے۔ تو تقریباً ساڑھے چار ہزار "لہر گھنٹے" بنتے ہیں۔ سب ملکوں سے ان کی "ضروریات" دریافت کی گئیں۔ تو ضروریات کا میزان پندرہ ہزار تک جا پہنچا۔ ہر ایک نے

حرص سے کام لیا۔ اور بعض تو سیکڑوں بلکہ ہزاروں سے بھی اوپر "لہرگھنٹے" پہلے سے دبائے بیٹھے ہیں۔ یک انار صد بیمار۔ تقسیم کیوں کر ہو۔ رات دن لوگ اصول اصول پکارتے ہیں۔ اور اس بارے میں ہر ملک "غلام محی الدین" بنتا پھرا۔ اور ڈھائی مہینے کی جھک جھک کے بعد معلوم ہوا کہ اصولوں کی کمی نہیں بلکہ بھرمار ہے۔ ہر ملک اپنے اپنے مطلب کے اصول وضع کر لایا۔ فیصلہ ہوا کہ ہمہ گیر اصول جن پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو۔ وضع نہیں ہو سکتے۔ روس اور اس کے بعد امریکہ (ریاست ہائے متحدہ) دو بنے بنائے ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار صفحے کے PLAN ترشے ترشائے لے آئے۔ روسیوں نے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کو مٹھیاں بھر بھر کر لہرگھنٹے دیئے۔ امریکہ نے لاطینی امریکیوں (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی بڑی رعائتیں دیں۔ غرضیکہ ہر ایک نے اپنا سیاسی الو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ جس مرحلے پر کانفرنس اس وقت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سودے ہوں گے۔

غریب پاکستان کس برتے پر کسی سے سودا کرے۔ سوچا کہ ہمارے پاس بجز شخصیت کے اس میدان میں کچھ نہیں، خدا کا نام لے کر شروع ہی سے اسے چمکانے کی کوشش کی۔ لیکن اس طرح کہ اسے بالکل ہتھیلی ہی پہ بھی نہ لئے پھریں۔ جب یہاں آئے تو کوئی ہمیں جانتا نہ تھا بلکہ اکثر لوگ تو پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زوردار تقریروں کا موقع مل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھائے موقع پا کر محض تقریر کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی کہ انہیں ۷ میں سے ۵ سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خیال ہوا کہ بحث و تمحیص میں پاکستان کی دوستی مفید ہے۔ بہر حال اس کی دشمنی مضر ہو سکتی ہے۔ گاہے گاہے لطیفہ بازی سے بھی کام لیا۔ ایک مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی، جو پارٹیوں کے رستے سے کانفرنس کے روزانہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ اور لوگوں نے پاکستانیوں سے موقع بے موقع مسکرا مسکرا کر مصافحے کرنا شروع کئے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجینئروں سے مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ انجینئر تو اچھے ہیں لیکن باقی صورت نہ شکل...... الخ۔ انگریزی مدراسی لہجے میں بولتے ہیں۔ جس پر ترجمان تھوکتے ہیں۔ اور خون بھی تھوکتے ہیں۔ اب میں ہسپانوی بلا تکلف بول لیتا ہوں۔ اور اخبار وغیرہ پڑھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ارادہ ہے کہ خصتی تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس لسانی دستی پر جنوبی امریکہ اور میکسیکو کے لوگ بہت خوش ہیں۔ غرضیکہ سب ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہوں۔ باہر آ کر انسان پہلے سے بھی زیادہ پاکستانی ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب خدا کرے کہ آخری مرحلوں میں ہمیں کامیابی نصیب ہو۔ اور دو تین مہینے کی محنت کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔ اجلاس صبح دس بجے سے شام کے سات بجے تک اور بعض اوقات رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سنیچر کے آدھے دن اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی اور یہ اوقات اور اکثر رات کی ساعتیں سازشوں اور مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجینیر بازی کے مسئلے بھی سمجھنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کی ہے وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے۔ تاہم بعض باتیں بچوں کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں، آپ خوش ہوں گے۔ کہ میں کئی مرتبہ باتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور بلند طبقوں کے مشوروں میں مجھے ہمیشہ خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پہاڑی ملک ہے آب و ہوا خوشگوار ہے۔ لوگ رنگین طبع۔ باخلاق۔ رنگین پوش ہیں۔ پابندی اوقات کو رذیلوں کا شیوہ سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ اور سواری کے بے حد شوقین ہیں۔ دکانفرنس کا افتتاح آرکسٹرا سے ہوا) گفتگو میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ رذیل سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انکسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں کثرت اصلی باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دوغلے لوگ ہیں۔ اور اصلی خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم بروئے کار آ رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو صرف میکسیکو سے وابستہ کرتی ہے۔ اور ہسپانیہ کو بہت سرعت سے بھلا رہی ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گذری تھیں انہیں تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے اور موجودہ دور کا سلسلہ قبل از ہسپانیہ دور سے ملایا جا رہا ہے جب یہاں کے اصلی باشندے برسر اقتدار تھے اور ان کی ایک

عظیم الشان سلطنت اور تہذیب تھی۔ اور ہسپانوی لٹیروں نے آ کر اُن کو تہس نہس کر دیا تھا۔ میکسیکو شہر کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے اور ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل جدید شہر ہے۔ گو اہلِ یورپ کو اس میں کئی عجیب باتیں نظر آتی ہیں۔ پچھلا انقلاب یہاں تیس سال تک رہا۔ جس میں میکسیکو کے ذکور آدھے سے زیادہ مارے گئے۔ اب یہاں REPUBLIC ہے۔ (بطرز امریکہ) تعلیم کا بہت شوق ہے۔ اور میکسیکو نے خواندگی کو ترقی دینے میں جتنا کام کیا ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ وزیرِ تعلیم پاکستان نے مجھ سے کہا تھا کہ اس پر ایک رپورٹ لکھنا۔ میں نے بہت کچھ مسالہ اس پر جمع کیا اور اسے اس قدر خیال انگیز پایا کہ دل میں ایک کتاب (خواہ انگریزی خواہ اردو خواہ دونو زبانوں میں) پاکستان کی خاطر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن افسوس کہ کانفرنس کی وجہ سے فرصت بہت ہی کم ملی۔ وزیرِ تعلیم اور اس کے افسروں سے تبادلۂ خیالات کے لئے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا اور اکثر وعدہ ایفا نہ کر سکا۔

اور کیا لکھوں۔ میں کئی دلچسپ خط لکھتا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے۔ بس تحریک ہی کا انتظار طبیعت کو رہا۔ وہ نصیب نہ ہوئی۔ تو سہل انگاری غالب آئی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ لوگ اُکساتے تو لکھنے کو یہاں انباروں کے انبار لکھ ڈالتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

۲۹

HOTEL MARIA CRISTINA

MEXICO. D. F.

یکم اپریل

برادرِ محترم، سلام مسنون۔ آپ کا تیسرا خط ملا۔ یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب نہ لکھنے کا مجرم ہوں۔ فرصت ہی نہ ملی۔ نیز فرصت کے جو چند لمحے ملتے ہیں۔ اس میں اتنے خط لکھنے پڑتے ہیں کہ سب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار، زبیدہ، سرکارِ پاکستان، فیضؔ، تاثیر سب کو خط لکھے کسی کو صرف ایک اور کسی کو مثلاً سرکارِ پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں رت بدل گئی ہے اپریل میں وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ کے اوائل میں ہوتا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ اس لئے مباحثے میں یا تو چڑچڑا پن دکھاتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ لیکن جو قومیں ہٹیلی ہیں۔ وہ اب بھی خم نہیں آنے دیتیں۔ اور آنکھ تک نہیں جھپکتیں۔ ہمارا کام خدا کے فضل سے بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا کہ یہاں کی کانفرنس تو عنقریب ختم کر دی جائے۔ کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی اصل پلان سازی کا کام جو تفصیلی کام ہے اور جس میں کم از کم چھ مہینے اور لگیں گے ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو ۱۵ جون کو پیرس میں جمع ہو جب چار پانچ چھ مہینے میں وہ اپنا کام ختم کرے تو کانفرنس پھر جمع ہو لیکن چند دن کے لئے۔ اور پلان کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دیئے جائیں۔ اس پلان کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے ہر ملک نے ہاتھ پاؤں مارے۔ جتھے بندیاں ہوئیں۔ سودے ہوئے۔ رعب گانٹھے گئے۔ تقریریں ہوئیں، آنکھیں دکھائی گئیں۔ چوما چاٹی ہوئی۔ غرضیکہ سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ یہ

فیصلہ ایک دن صبح کے ڈھائی بجے کئی گھنٹوں کی گرماگرم بحث اور تقریر بازی کے بعد ہوا۔ جب ڈھائی بجے میں گھر واپس آیا۔ تو عجیب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی بازار خاموش اور ویران تھے۔ اور اپنے قدموں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب ۲۲ اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے تھے تو کوئی ہمیں جانتا نہ تھا۔ پاکستان کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ ستر قوموں میں سے سب سے نئی قوم۔ ستر ملکوں میں سے سب سے ناتجربہ کار ملک۔ نہ ٹرانسمیٹر پاس ہے نہ کہن سال انجنیر۔ ریڈیو کی صف میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ مہینے کے عرصے میں پاکستان کو خدا نے یہ عزت دی کہ ہر اہم کمیٹی اور اہم مشورے میں اس کی حیثیت صدر یا نائب صدر کی ضرور تھی۔ اور اب جب کہ کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے تو اس میں بھی پاکستان اس خوبی سے دہرا ہے کہ کسی کو اس کے حق شمولیت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ وزارت تعلیم پاکستان کا ارشاد ہے کہ کانفرنس کے بعد کچھ عرصہ ٹھیر جاؤں اور میکسیکو کے نظام تعلیم کا مطالعہ کر کے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے عوام بھی ہماری طرح نادار اور ان پڑھ تھے۔ میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسر اقتدار آتے ہی تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا۔ کہ تمام دنیا انگشت بدنداں ہوئی۔ اس لئے یہاں کا مطالعہ ہمارے لئے بہت مفید ہوگا۔ نہ معلوم اس کام کے لئے سرکار کتنی میعاد میرے لئے مقرر کرتی ہے اس لئے آنے میں اب کچھ تاخیر ہوگی۔ بہرحال سالوں کی تاخیر نہیں۔ ہفتوں کی۔ وہ بھی ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا۔ دیکھئے۔ پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور برخوردار سمجھتے تھے اور جب بھی انتخاب کی نوبت آتی۔ لوگ سمجھتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک نوبت آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا ازحد ضروری سمجھنے لگے اب آئندہ خدا کے فضل سے کم از کم ریڈیو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کو کرسی ہمیشہ صف اوّل میں ملا کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پر ایک جشن صغیر کیا اور سب آبدیدہ ہوگئے۔

خاکسار

بخاری

۳۰

یکم جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

برادر محترم۔ آپ کے خط سے دہری ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا تھا تو شرم کے مارے لمحہ بھر کو ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے لیکن یقین مانیے کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ ہی کو ملتی رہی۔ احباب بعید تر ہوتے گئے۔ اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ مہینوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی تو جواب نہ آیا۔ کیونکہ وہاں توجہ کا چشمہ اس عرصہ میں خشک ہو چکا تھا۔ مجھے ندامت اور توبہ کا صلہ کبھی نہ ملا۔ لیکن سالک کی وفاشعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کر جاتی ہے خدا آپ کو زندہ و سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ آئین دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ ورنہ دائیں بائیں الفتیں مر رہی ہیں اور جو مر نہیں چکیں وہ زندہ درگور ہیں ـــ

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں یہاں پہنچا تو ذیابیطس کا شکرانہ ساتھ لایا۔ کئی ہفتہ روزانہ پیشاب کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب تہ کر کے رکھ دئے کہ شفائے شاسی ہو لے۔ تو زندگی کا دھارا پھر ٹھیک سے بہنے لگے گا۔ لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے باقی شیرینیاں حرام ہیں۔ ٹیکے کی پچکاریاں اور قطرہ پیمائیاں، دن رات اسی نوع کے "شیشہ آلات" کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں مکان کی تلاش رہی۔ یکے بعد دیگرے دو اپارٹمنٹ بدلے۔ دونو عارضی تھے لیکن یقین ہو گیا کہ اپارٹمنٹ میں رہنا ہم پہناپندوں کے لئے ناممکن ہوگا۔ ایک پہاڑ سی عمارت اس میں رجنوں ڈربے۔ کوئی چھوٹے کوئی بڑے۔

جو ہمسایہ مقفل اور پراسرار۔ اٹومیٹک لفٹ میں پندرھویں منزل پر رہتا تھا کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر "۱۵" کا بٹن دبانے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو یہ لفٹ کا مقفس کمبخت بے حس دبلا تامل پندرھویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا اور وہاں پہنچ کر اس کا دروازہ کھل جائے گا اور اسے اتنی بھی تمیز نہ ہوگی کہ جس نے بٹن دبایا تھا وہ اب محض ایک لاش ہے۔ دروازہ کھلنے پر بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس خیال سے عجیب وحشت ہوتی تھی۔ انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے کہ اس کے مرجانے پر کچھ غلغلہ ہو گا۔ کوئی تھامے گا کوئی اٹھائے گا کوئی روئے گا کوئی چلائے گا۔ جب یہ توقعات یک لخت مفقود ہو جائیں تو ہم ایشیائی لوگوں کو چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی جماعت کی کتنی عادی ہے۔ اس عرصے میں ملازم بھی کوئی نہ تھا۔ کھانا ہمیشہ باہر کھاتا تھا بجز صبح کے ناشتے کے۔ چنانچہ انڈے پکانے میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن وہ جو بازار سے ہر دوسرے تیسرے دن سودا سلف کے بنڈل اٹھا کر گھر لانے پڑتے تھے اس میں کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی۔ ہمیشہ اپنے آپ پر ترس آتا تھا کہ اللہ اللہ جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ زندگی احتجاج اور افسردگی کا مجموعہ تھی۔

ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء میں مکان کرائے پر لے لیا۔ ایک حبشن کو ملازم رکھ لیا۔ لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آ گیا۔ ڈیلیگیٹوں کا قافلہ پاکستان سے آن پہنچا۔ رات تو شہر میں گذرتی تھی۔ لیکن صبح نو بجے سے شام کے سات آٹھ بجے لیک سکیس میں رہتے تھے۔ جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دن کم و بیش فجر کے وقت سے شروع ہوتا تھا کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے اور بھی تیس میل دور رہتے تھے باوجود اس فاصلے کے صبح نو بجے سب سے پہلے آن پہنچتے تھے۔ ہم شب زندہ دار ٹھہرے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ دنیا و عاقبت دونوں میں سرخروئی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ حال تھا کہ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم۔ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے۔ اسمبلی ختم ہوئی تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا۔ اسمبلی کے ڈیلیگیٹ اسمبلی ختم کرنے کے بعد اور موٹروں اور فریجیڈیروں کا سودا چکانے کے بعد پاکستان لوٹے۔ تو محمد علی اور ان کا قافلہ آ پہنچا۔ وہ گئے تو ڈاکٹر گراہم کا قضیہ لٹکتا چھوڑ گئے۔ خدا خدا کر کے پچھلے ہفتے گراہم یہاں سے روانہ ہوئے تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بھی کب تک۔ رات دن چکر میں ہیں سات آسماں۔

رفتہ رفتہ نئی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو دفتر کو (اپنے معیار کے مطابق) مردہ پایا۔ اس سے متقدمین کی گستاخی یا مذمت مقصود نہیں۔ ہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ بے حسی سے کام کر ہی نہیں سکتا۔ ہلکا ہلکا سا بخار نہ چڑھا رہے تو سمجھتا ہوں کہ حرارت غریزی سے محروم ہوں۔ اور جمود طاری ہو رہا ہے۔ یہاں حالت یہ تھی کہ یو۔ این کا فیصلہ کراچی پہنچا دیا۔ کراچی کے کہنے پر ووٹ دے دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہ مشن محض ایک ڈاکخانہ بن کر رہ گیا ہے۔ "کار دار خاص" بجز ہرکارے کے کچھ نہ تھا۔ کام پھیلایا۔ تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا۔ اپنی وقت پسندی کی شکایت کس سے کروں۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد۔ ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقعے پر اہم بن جاتا ہے۔ سفارتی گفت و شنید عجب سست رفتار ہوتی ہے۔ ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے۔ مناسب وقفے کے بعد خیریت دریافت کیجئے۔ بیوی بچوں کا حال پوچھئے کھانے کی دعوت دیجئے۔ موسم کا ذکر بالتفصیل کیجئے۔ حرف مطلب زبان پر یوں نہ لائیے کہ بار نہ ہو پھر ہفتوں جواب کا انتظار کیجئے۔ اس دوران میں مسکراتے رہئے۔ اور نگاہ رکھئے کہ پہیے چل رہے ہیں یا کہیں رک گئے۔ رک گئے ہوں تو روغن قاز، آتش سیال یا قطرہ تیزاب۔ جیسا حکیم بتائے۔ کام میں لائیے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں۔ جب حکومتیں شخصی ہوا کرتی تھیں۔ تو کئی باتیں دسترخوان پر پوری ہو جاتی تھیں۔ محمد شاہ ایسی دعوت دے کہ نادر شاہ کا دل پسیج جائے تو یہ ہوئی سیاست۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے انگلی تک نہیں ہلاتا۔ پھر بھی کم بخت ضیافتوں پر وقت اور روپیہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ شراب کا میں کبھی دلدادہ نہ تھا لیکن عصمت بچانے کے لئے ایک گلاس ضرور ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی آپ سے تو تعرض ہوتے گا۔ اور آپ جواب دیتے دیتے اور دامن بچاتے بچاتے تھک جائیں گے۔ پھر بھیڑ ہمیشہ اتنی

زیادہ ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوے چھلتا ہے (اور یہ تصادم محض کھووں تک ہی محدود نہیں ہوتا) وقت ایسا ہوتا ہے کہ آپ شام کا کھانا نہ اس سے پہلے کھا سکتے ہیں نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفیر یا وزیر بن جائیں۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ہفتے میں دو تین مرتبہ یہ سزا ضرور بھگتیں۔ میں کاک ٹیل کا یوں منتظر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی آپریشن کا منتظر ہو۔ کہ تکلیف بھی ہوگی لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پارٹی ہو۔ میری شام غارت ہو جاتی ہے۔ دو گھنٹے مسکرا مسکرا کر گلے اکڑ جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے مجھے مکان ایسا مل گیا ہے کہ طبیعت اس میں خوش رہتی ہے۔ مکان سرکار دیتی ہے لیکن ملازموں کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ رتبہ بڑا ہے تنخواہ تھوڑی۔ اس لئے تنخواہ کے مطابق مکان لیجئے۔ تو پاکستان کی توہین ہوتی ہے اور رتبہ کے مطابق ٹھاٹھ رکھئے۔ تو جیب ساتھ نہیں دیتی۔ ہفتوں اسی کش مکش میں گذرے بالآخر ایسا مکان مل گیا۔ جس میں ڈیڑھ ملازم سے کام چل سکتا ہے اور پاکستان کے نام کو بھی بٹہ نہیں لگتا (ملازم کی تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی خوراک اور رہائشی کمرہ الگ) چھ کمرے ہیں لیکن تین منزلوں پر۔ بالکل لب دریا ہے اور رات دن آتے جاتے جہازوں کے نظارے سے تنہائی کا احساس کم رہتا ہے۔ ایک ہزار کے قریب کتابیں اور چند سرخ پتھر کے مجسمے۔ چغتائی کی تین تصویریں، ایک اونٹ کی اوجھڑی کا لیپ۔ دو تین پاکستانی پھلکاریاں۔ ایک تانبے کا آفتابہ چلمچی۔ یہ سب ساتھ لایا تھا۔ ان کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند نظر آتی رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج اور ملاقاتیں۔ اور جاسوسی۔ اور دعوتیں اور بحثیں اور گفت و شنیدیں۔ اور کراچی کے ساتھ تلغراف بازی۔ اور تعمیل احکام۔ دوسرے پبلسٹی یعنی مسلسل تقریریں۔ بیشتر کشمیر پر۔ بعض پاکستان کے عام حالات پر۔ چند ادب اور دیگر کلچرل معاملات پر۔ میری مانگ بہ نسبت اور ملکوں کے کالجوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں اور گرجاؤں میں زیادہ ہے اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اب تک کوئی سو دو سو لیکچر دے چکا ہوں اور اس سلسلے میں اکثر سفر میں رہتا ہوں۔ دنیا میں ہمارا دشمن بجز ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا نام بڑا ہے گاندھی اور سانپ اور سادھو اور بھان متی اور شیر اور ہاتھی سب اسی کے حصے میں آتے ہیں۔ پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں۔ کماحقہ پبلسٹی کے لئے کھربوں روپیہ چاہیئے۔ اس لئے جو موقعے مل جاتے ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں۔ تاہم معقول بات کیجئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لئے دعا مانگی اور ایک مذہبی HYMN میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دو بند پاکستان کے متعلق شامل کر لئے۔ کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمفلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں۔ ان دو شغلوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں، علماء کم دیکھنے میں آتے ہیں مقررین اس قدر مختلف ہیں کہ گھنٹوں ہمزبانی کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے۔ بچاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو اسے لوگ اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ کلچرل دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز حسن مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہاز میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ روپے اور سامان کی بہتات ہے جتنا کھا سکتے ہیں اس سے دگنا پھینک دیتے ہیں۔ دکانیں اٹاکٹ سامان سے بھری رہتی ہیں اشتہاروں کی وہ بھرمار ہے کہ سورج چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے ایک سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگتا ہے کہ پاکستان کے سب اخبار دس سال تک اس پر چھپ سکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے۔ اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہارورڈ یونیورسٹی میں جا کر گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مروت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ جاتا ہے۔ انہی کی بدولت میرے وہاں چند لیکچر بھی انگریزی اور امریکن اساتذہ کے متعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی

اور مادی دونوں فاصلے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا جھمگٹا جس کے ہم لوگ عادی ہیں۔ وہ یہاں میسر نہیں بجز اس کے کہ ایک "پارٹی" کا انتظام کیجیے۔ لیکن میں نے پارٹیاں صرف سیاست دانوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے بعد پیسہ ہی اتنا پاس نہیں ہوتا کہ انسان پاؤں پھیلا سکے لیکن دو تین مصنفوں اور ایک آدھ تھیٹر کے ارباب حل و عقد سے ملاقات ہے ان کی بدولت کبھی کبھار شام رنگین ہو جاتی ہے مگر آپ جانتے ہیں۔ وہ دوستی کے رشتے جو شباب میں قائم ہو جائیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ اردو کی کتابیں بھی منگوائی ہیں۔ تین چار مہینے اردو کی صورت سے محروم رہا پیاس کے مارے زبان باہر نکلنے لگی تھی۔

صحت کے متعلق پریشانی رہتی ہے ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ خدا حکومت پاکستان کا بھلا کرے کہ علاج معالجے کے اخراجات وہ برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرنی پڑتیں تو مردہ ہی خراب ہوتا۔ ذیابطیس مجھے نہیں تاہم احتیاط ضرور کرنی پڑتی ہے۔ پھر کچھ سرطان کے عود کا شبہ ہوا۔ پھر جگر میں خرابی پیدا ہوئی چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹیسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آ گیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر زبیدہ سے ہرگز ہرگز نہ کیجیے گا وہ بے چاری ناحق پریشان ہوگی)

احباب سے محض بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ آغا حمید کی شادی پر ان کو تہنیت کا ایک تار دیا۔ جواب نہ آیا۔ حسرت، صوفی ہاشمی، عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا۔ (مجرم میں بھی ہوں) ذوالفقار مجھ سے بلاوجہ رنجیدہ ہے۔ اس کی بچیوں کو یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں ان سے داستانیں سنتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ نیا شعر ایک برس سے نہیں سنا بار بار وہی شعر گاتا رہتا ہوں جو عہد رنگین میں فردوس گوش ہوئے تھے۔ ہارمونیم ساتھ لایا تھا کبھی کبھی اس پر قوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی۔ آفتاب۔ عبدالقیوم۔ زیڈ اے خاں۔ عبدالقادر (فائننس) غلام محمد وغیرہم یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ان سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بلانوشوں کو اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آ رہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا لیکن آثار تو اندھے کو بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ جو امریکہ کا دورہ کیا تھا اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی کسی دن دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اعصاب پر بھی بہت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر نومبر میں تین مہینے کے لئے پیرس جانا ہوگا کیونکہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی۔ ارادہ ہے کہ بیچ میں کرسمس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں لیکن دیکھیے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وفات سے انقلاب آ گیا ہوگا۔ خدا کرے آپ کی ہمت میں خم نہ آئے اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھئے گا انشاء اللہ میں اب خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھئے۔ کوئی شعر مل جائیں تو وہ بھی بھیج دیجیے۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہئے فارن آفس کی معرفت ڈپلومٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی تو احساس ہوا کہ رونا رویا ہے۔ اور پژمردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھئے۔ پہلا خط ہے۔ اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

(نوٹ) یہ خط نقوش مکاتیب نمبر میں اور خط نمبر ۲۱، اور ۲۸ نقوش کے سالنامہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنام مولانا غلام رسول مہرؔ

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں :-

۱. یہ اس زمانے کے ہیں جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لے لی تھیں۔ حکومت پنجاب کے روبرو ان کے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا تو یہ اعتراض اٹھا کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہوجاتی ہیں وہ اپنی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اِدھر سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں جس طرح اصل محکمے میں رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے جو اصل محکمہ میں برسرکار نہ ہو۔

۲. اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ اور میاں عبدالحیؒ مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ میں نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اوّل جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوجائے لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا اور اسے ان خوبیوں کی سزا نہ دینی چاہئے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ان کے معاملے کو مستثنےٰ سمجھا جائے۔ دونوں نے میری یہ استدعا منظور کرلی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳. مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملنے کا موقع میسر آیا وہ اعتراف کریں گے کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے افسر تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہو کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے اور چودھری چھوٹو رام کو اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چودھری چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کرکے انہیں راضی کیا گیا کہ مسٹر من موہن وقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن، بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے ان سب نے اس دورِ ابتلا میں موصوف کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملہ پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴. دھرم پور میں ملاقات نہ ہوسکنے کا معاملہ یہ ہے کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و وزیر اعظم سے ملنے کے لئے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا کہ بخاری صاحب موٹر میں واپس ہوں گے۔ تو میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہوگئی اور کسی قدر

اندھیرا ہو گیا۔ میں دھرم پور اسٹیشن پر بیٹھا رہا۔ جب کوئی موٹر آتی کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کرا لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن، سے آگے نکل کر اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے جو کسولی اور سناور کی طرف جاتی ہے میں مایوس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے چونکہ میں دھرم پور میں تھا اس لئے فون پر گفتگو نہ ہو سکی سناور پہنچنے پر ان کے فون کا علم ہوا تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی جا چکے تھے۔

۵۔ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ اوّل اس کی رسید بھیجی جائے دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے کہ اس کی اشاعت سراسر خلافِ مصلحت تھی میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا اب اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں، اور یہ اس عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے جس کی ہر تحریر کو اس وقت ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت حاصل ہے

---

(۱)

۲۰، پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

بروز اتوار

مشفق محترم! نہ معلوم کیا بات ہوئی دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دئے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون کیا اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھ سے نہ مل کر آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی جس کے لئے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے لیکن مجھے نظر نہ آئے۔

بہر حال شملے کی داستان سن لیجئے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں یا نہ آؤں یا آؤں تو کب آؤں بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میاں صاحب کو گوناگوں دقتیں پیش آئیں گے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے جب انہوں نے مجھے بغیر واپس بلانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا تو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ، بظاہر تو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو لیکن نہ جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے کہ ایک دن کے لئے شملہ چلے جایئے میاں

صاحب سے مل کر پوچھئے کہ سلکشن گریڈ کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا اور میرے پنجاب واپس آنے کا تذکرہ نہایت سرسری (وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو) کیجئے۔ ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے من موہن صاحب سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ من موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے ڈائریکٹر صاحب ان کے کام سے خوش ہیں میاں صاحب خود ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ من موہن صاحب پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہلِ غرض کا دباؤ دور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملہ سے روانہ ہوا حالات تشویش ناک تھے آپ سے ملاقات ہوجاتی تو بیشتر وقت میں اسی بات پر صرف کرتا اب حقیقت یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی، ہندو افسروں کا وجود تو ضروری ہے اگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی حمایت نہ کی جائے جو لائق، فہیم اور ایماندار ہیں اور خدا گواہ ہے کہ من موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا ریکارڈ خفیف سے خفیف شبہے سے بھی پاک ہے، اور ان کی دیانت اور اصابت رائے مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں جو ان کی جگہ مقرر کیا جاسکے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ وہ اس قدر دلگیر ہیں کہ استعفےٰ تک دینے پر آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجئے اور اس کام کو میرے کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجئے۔ میں آپ کی عنایتوں کے لئے انتہا ممنون ہوں آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی اور آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

۲۰، پرتھوی راج روڈ، نیو دہلی

۵ر جون

محترم دوست۔ سلام مسنون۔ میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ آنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں یقین مانئے میں از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو اس قدر زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پور میں آپ کو تلاش کیا۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالکا پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرنسل ٹیلی فون کیا اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا، ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں لے کر آیا۔ للّٰہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں از حد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی اور ہر پیش قدمی کی لیکن میری بدقسمتی اور انتہائی بدقسمتی کہ بجائے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا۔ الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے درخور اعتنا سمجھئے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اسی کے لیے مجھے معاف کر دیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت

سمجھوں گا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں از حد نادم اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا قصور میری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا، سوائے اپنے عجز و انکسار کے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط ہمیشہ مکان کے پتہ پر لکھا کیجیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۳)

۲۰، پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵ر جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ آیا ہے کہ

"بہر حال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہو گا۔"

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

(۱) گریڈ اور واپسی بیک وقت دو مسئلے سامنے آجانے سے صاحبِ موصوف کو پریشانی ہو گی اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرضِ خطر میں پڑ جائے گا

(۲) اگر میں واپس نہ آؤں اور یہیں گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہو گا چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحبِ موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہو گی۔

(۳) بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہو گا۔

(۴) واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے جب چاہوں واپس آسکتا ہوں کوئی مجھے روک نہیں سکتا اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقعہ آئے گا تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

(۵) گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع میں ختم ہو جانا چاہیئے اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا تو جو مصالح آپ کے پیشِ نظر ہیں ان کو گزند نہ پہنچے گا۔

(۶) فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحبِ موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے، اور ان کی قوتِ فیصلہ مذبذب ہو جائے گی کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہو گی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور بہت پختہ کر لینا چاہیئے اصل چیز یہی ہے واپسی کا مسئلہ ایسا ہے ـــــــــ کہ اسے ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی زور سے اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی اور ممکن ہے غلط مبحث کی رو میں اصل مقصد ہی بہہ جائے

چنانچہ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اپنی جانب سے گریڈ کی گفت وشنید کو خاطر خواہ طور پر مختتم کرائیے۔ واپسی کے مسئلے کو ہلکے سے چھیڑ دیجئے اور کہئے کہ اس پر انشاء اللہ سردیوں میں مفصل بحث ہوگی۔ یا ایسی ہی کوئی بات کہدیجئے۔ تاکہ اس پر گفتگو کرنے کا حق بھی آئندہ کے لئے برقرار رہے اور گریڈ کا کام فی الحال یکسوئی سے ہوجائے۔

جن مصالح کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بہت اہم ہیں اور یقین مانئے کہ میں اس قدر خود غرض نہیں کہ مجھے ان کا بحیثیت مصالح ملی کے کبھی خیال ہی نہ آیا ہو لیکن میں نے اہل رائے سے جب اچھی طرح مشورہ کرلیا تو طریق کار وہی بہتر معلوم ہوا جو میں عرض کرچکا ہوں۔

جب صاحب موصوف سے آپ مل چکیں تو مجھے اس کے نتیجے سے ضرور مطلع فرمائیں کہ میں چشم براہ رہوں گا۔

دھرم پور میں ملاقات نہ ہونے کا واقعہ عمر بھر کے لئے ایک لطیفہ بن کر رہ جاتا بشرطیکہ اس میں مجھے ندامت کا احساس نہ ہوتا بہر حال جب آپ کی کوفت دور ہوجائے گی اور آپ بالکل معاف کردیں گے تو مجھے بھی اس واقعے پر ہنسنے کی جرات ہوگی کیونکہ واقعہ فی الواقع مضحکہ انگیز ہے، کہ دو عاقل وبالغ جو سونمبر کی غرض سے ایک دوسرے کے منتظر تھے ایک دوسرے کو باوجود تلاش کے نہ دیکھ سکے۔

ز خود در جستجوئے خویش رفتم
غبارم سرمۂ چشم عاشقاں را

بندۂ خاکسار
بخاری

---

(۴)

۹، اشوکا روڈ، نیو دہلی

۱۳ر نومبر

برادرم محترم، سلام مسنون وتہنیت عید

گرامی نامہ ملا۔ جس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ بیس فیصدی کا اضافہ تو غیر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار لی جائیں۔ تو عموماً یہی ہوتا ہے لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو لیا تو بہر حال مستقبل کیا ہے بہت کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ واپسی پر کالج میں تقرر ہونا چاہئے اور پرنسپلی کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے اس سے تو مستقبل کے سب دروازے اغلباً بند ہوجائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل ہے لیکن تامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "تامل ارباب نظر کے لئے تکدر کا باعث ہوگا" اس فقرے نے کچھ خائف کردیا اس کی تفصیل اگر

(۱) آپ کرسکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

(۲) کیا یہ صورت تو نہیں کہ واپسی پر میرا کہیں کھپانا مشکل نظر آرہا ہے (بجز اس کے کہ اوروں کو متنزل کیا جائے) اس لئے یہ تجویز پیش ہورہی ہے؟

(۳) علاوہ بر آں اب تک سلیکشن گریڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار بسا اوقات مایوسی کی حد تک پہنچ جاتا ہے اس لئے پہلے وہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں امور پر آپ روشنی ڈال سکیں۔ تو میں کچھ رائے بھی دے سکوں اور ضرورت ہو تو خود بھی آجاؤں گو ہفتہ اتوار سے پہلے آنا مشکل ہوگا میں نے اپنا پتہ خط کی پیشانی پر لکھ دیا ہے اسی پتہ سے خط بھیجئے تاکہ ملنے میں تاخیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

۵

(۱) ترے وعدے پر جئے ہم ...... الخ

(۲) سالکِ بے مہر کو آتے دیکھا[1] میری بد قسمتی کہ آپ کا گھر رستے میں حائل تھا۔[2]

بخاری

(۳) آپ خط کا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کرتے ہیں۔[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عدیم الفرصتی کی وجہ سے بیت الخلاء میں بھی خط لکھتے رہتے ہیں لہٰذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسالِ خدمت ہے۔[4]

---

[1] مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے، مہر ساتھ نہ تھا دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

[2] بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور فلیمنگ روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضان بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں تھا سالک صاحب بک روڈ پر مقیم تھے بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے دور سے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

[3] جو کچھ لکھنا ہوتا تھا پنسل سے مضمون لکھنے کی سلیپوں پر لکھ دیتا تھا بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کا مستحق ٹھہرا۔

[4] تاکہ جواب اس پر لکھوں

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

(۱)

محترم بندہ جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

سر عبدالقادر (اور بعد ازاں لیڈی عبدالقادر) نے بہت تاکید کے ساتھ "کاروان" منگوا بھیجا ہے اور مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں۔ کیا آپ انہیں "کاروان" کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

اور اگر ناگوار نہ ہو تو "مرقع چغتائی" کی کوئی بچی کھچی جلد مجھے اپنے لئے بھی چاہیے۔ کیا کہیں سے مل جائے گی؟

---

(۲)

۱۳۔ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۱؍ اکتوبر

مشفقی و مکرمی جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا، آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط ملا جو بعینہٖ ارسالِ خدمت ہے خط کے دو حصے ہیں ایک آپ کے نام، ایک میرے نام۔ دونوں بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامپسن کمپنی میں ملازم ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دل کش بنانے کے درپے رہتی ہے۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں آج کل کلکتے میں ہیں لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ علاوہ بریں بمبئی کے اہلِ فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں کھنڈت ڈالا، سر دیا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہِ راست ان کو بھیج دیں خواہ میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

(۳)

۱۳، تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۹ر اکتوبر

سلام مسنون۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے پر میں نے وڈ صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ غالباً براہ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہوئی تو یہ خیر خواہ دیرینہ کوتاہی نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش کئے ہوئے لیمپ شیڈ اب تک میرے مکان بلکہ میری زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ اور آپ کو دعا دیتا ہوں فلم لائسنس کا معاملہ میں نے سنا بہت ٹیڑھا اور وقت طلب ہے ملاقات ہوتی تو تفصیلاً عرض کرتا۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

۴۶ ہم جیل روڈ

۱۰ر اگست (سنہ ۱۹۳۴ء)

مشفق من جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے ان کے خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی بھی بہت ممنون ہوں کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسے اپنے لیے بہت مفخر سمجھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ ان کے کمال کی کما حقہٗ داد تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مجھے کتنے دن کی مہلت دی جائے گی علاوہ بریں مجھے "مرقع" کی ایک جلد بھجوا دیجئے کیونکہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔"

آپ ان کو مرقع کی نئی ایڈیشن (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجموعہ میرے پاس لائے تھے جس میں سولہ صفحے دیباچہ کے لئے خالی چھٹے ہوئے تھے وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھجوا دیجئے اس کے علاوہ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے (یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے) بھی انہیں بھیج دیجئے تاکہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پہلے کیا کچھ کہا جا چکا ہے، اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا تھا اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزوں سے ان

کو اغلباً مدد ملے گی۔

دیگر سوالات کا جواب یا آپ براہِ راست ان کو بھیج دیجئے یا جیسا مجھے حکم کریں میں ہر خدمت کے تیار ہوں وہاں کا پتہ گرینڈ ہوٹل شملہ ہے۔

افسوس کہ آج شام آپ کھانے پر نہ آسکے۔ مقصد دوستوں کی ملاقات تھا لیکن جس کسی نے مجھ سے تقریب پوچھی میں نے یہی کہا کہ "نقشِ چغتائی" کے شائع ہونے پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ خیال تھا کہ آپ آئیں گے تو آپ کو احباب کی طرف سے مبارک باد پیش کی جائے گی خیر میری ایک شکایت آپ کے خلاف رہی۔ آپ اسے یاد رکھئے۔ اگر آپ اپنے بھائی کی روانگی کا عذر پیش نہ کر چکے ہوتے تو میں شام کو باوجود آپ کے انکار کے خود آپ کو جا کر لے آتا۔ آپ کے نہ آنے سے سب دوست بہت مایوس ہوئے (ہم لوگ یعنی خاکسار، سالکؔ صاحب، حفیظؔ صاحب، ہری چند اخترؔ صاحب، جگل صاحب چراغ حسن حسرتؔ صاحب یعنی جو لوگ کل یہاں جمع تھے۔ وہ بقول آپ کے اس قابل تو نہیں کہ آپ کے آرٹ کو اچھی طرح سمجھ سکیں لیکن آپ کے معتقد اور نیاز مند ضرور ہیں۔ ہمارا دل نہ توڑا کیجئے۔

آپ کا عزم انگلستان آپ کو مبارک ہو، میں نے بیگم سراج الدین کو لکھ دیا تھا کہ تمہید ایسی ہونی چاہئے کہ انگلستان میں نقاد ان کی بدولت چغتائی صاحب کے فن کی قدر کرنا سیکھیں تاکہ آئندہ قدردانی کے لئے رستہ صاف ہو اب دیکھیں وہ کیا لکھتی ہیں۔ میں جواب کا منتظر رہوں گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۵)

پاکستان ہاؤس

۱۲۔ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ۔ نیویارک (یو ایس اے)

۲۵ ؍ اپریل ۱۹۵۳ء

مشفقی جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ کو ایسے سوالات پوچھنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ یہ سمجھئے کہ گویا آپ خود یہاں ہیں جو خدمت میرے لائق ہو بلا تامل فرما دیا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو یا فلم کا یا ریڈیو کا یا ٹیلی ویژن کا۔ منزلِ مقصود تک پہنچانا شادی بیاہ یا حملہ یورپ کے انتظامات سے کم نہیں ہوتا۔ ہزاروں MIDDLE MEN مشاطگی کے رستے روکے بیٹھے رہتے ہیں جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر دنگل میں لاکھوں چھوٹے بڑے پہلوان زور آزمائی کر رہے ہوں وہاں علم وفن، علم وفن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے اور بزنس ہی کے طریقوں پر چلتا ہے تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی ہوئی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں، کیلیفورنیا (یعنی ہالی وڈ) ہے لیکن آپ مسودے تو بھیجئے، آنکھیں تو اس سے روشن ہوں اس کے بعد کاریگر لوگوں سے مشورہ کروں گا اور نشیب و فراز سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا۔ جہاں برسوں تک شباب رنگیں کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی تشنگی ہفتے عشرے میں کیا

بجھتی لیکن قسمت پر نازاں ہوں کہ احباب کی صحبت میں مسرت بلکہ نشے کی چند گھڑیاں تو گزار لیں۔ آپ سے سالہا سال دل کا سودا رہا ہے آپ کی محبت اور اخلاص برسوں سے زندگی کا جزو بنے رہے ہیں۔ للہ الحمد کہ آپ سے مل لیا اور آپ کی محبت اور آپ کے کرم سے دوبارہ فیض یاب ہوا۔ واپس آکر امتیاز صاحب سے دو ایک چٹھیوں کا تبادلہ ہوا، اس کے بعد پنجاب میں فسادات رونما ہوئے تو سلسلہ قدرے رک گیا۔ وہ ملیں تو انہیں میرا اسلام کہیئے گا۔ ہاشمی صاحب کا بھی ایک بہت محبت آمیز خط ملا، ابھی انہیں جواب نہیں لکھا، انہیں بھی میرا اسلام پہنچا دیجئے گا اور کس کس کا ذکر کروں۔ پورے گلزار کو حسرت و عشق کا پیغام پہنچانا ہو تو کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں جو ملے ان سے کہیئے کہ غریب الوطن سلام کہتا ہے۔

جو پتہ اس خط کی پیشانی پر لکھا ہے اسے کہیں نوٹ کر رکھئے تاکہ میں آئندہ لکھنا بھول جاؤں، تو آپ کو تشویش نہ ہو۔

بندہ خاکسار

بخاری

---

(۶)

نیویارک

۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

بھائی! آپ کی شکایت بجا ہے مجھ سے سہو ہوا کہ میں نے مسودے کی رسید آپ کو فوراً نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشویش رہی ہوگی آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار پڑ گیا دو ہفتہ مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ آٹھ ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد دو مہینے گھر پر صاحب فراش رہا۔ نقاہت کے عالم میں کبھی کام سے مخلصی نہ ہوئی۔ لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا نہ معلوم ترجمے کے لئے ہمت کب نصیب ہو کوشش کر رہا ہوں کہ ہو سکے تو فروری مارچ میں کبھی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں اس شدید بیماری کے بعد اہل و عیال مجھ سے اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ موت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا، تو خوب باتیں ہوں گی۔

آپ کے فسانے میں کئی جدتیں ہیں جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا اور ذہن کو گدگدی ہوئی لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جدتیں ہی رکاوٹ نہ بن جائیں میں نے ایک دو فلم باز دوستوں سے ذکر کیا اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے وہ کہتے تھے کہ کوئی EXPERIMENTAL GROUP اسے فلمائے تو بہتر ہو۔ ورنہ تاجرانہ کمپنیوں کے بس کا تو یہ روگ معلوم نہیں ہوتا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سرعت سے کم ہو رہی ہے بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر فلموں کو چھوڑ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہو کہ آپ سینار یو کو بعینہٖ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سینار یو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں اپنے ہم وطنوں کے لیئے یہ ایک نئی چیز ہوگی۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ علاوہ براں کاپی رائٹ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟

خاکسار

بخاری

(۷)

۱۶ر جون ۱۹۵۴ء

مشفقی جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! آپ کی تصاویر کو یو۔ این میں آویزاں کرنے کی رسم چند دن ہوئے بڑے ٹھاٹھ سے ادا کی گئی ہماری سفارت کا سب عملہ نیز وہ تمام پاکستانی جو یو این میں ملازم ہیں اور اخباروں کے نمائندے اور فوٹوگرافر وغیرہ سب جمع تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں آپ کی تعریف و تحسین سے اپنی زبان کو فخر بخشا۔ سیکرٹری جنرل نے جو خود آرٹ کے بڑے ماہر ہیں آپ کے فن کو سراہا۔ تصویریں یو این کے ڈائننگ روم میں آویزاں کی گئی ہیں اور یہ موقع اور محل ان کے لئے بہت تگ و دو کے بعد حاصل کیا گیا۔ کیوں کہ ہر قوم کے نمائندے نے اپنے ملک کی ناموری کی خاطر کوئی نہ کوئی تحفہ بھیج رکھا ہے وہاں کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ سب سے نمایاں جگہ اس کو حاصل ہو۔ ڈائننگ روم پر سب کی نگاہ تھی۔ کیونکہ یہاں نہ صرف ڈیلیگیٹ اور سیاست دان ہر روز کھانا کھانے آتے ہیں۔ بلکہ سیاح بھی جن کی روزانہ تعداد دو تین ہزار سے کم نہیں یہیں رجوع کرتے ہیں۔ جس دیوار پر تصاویر لٹکائی گئی ہیں اس کا رنگ ہلکا سنہری سا ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ دیوار کا رنگ سیاہی مائل کر دیا جائے تاکہ آپ کی تصاویر کے رنگ خوب اچھی طرح ابھر آئیں۔

آپ کے ٹکٹوں کے فاکے بھی پہنچے اور حسب ارشاد محکمہ متعلقہ کو بھجوا دئے گئے ہیں۔ آپ کی تصاویر کی نمائش کا خیال ایک دن بھی میرے دل سے محو نہیں ہوا لیکن کچھ تو ارشاد ہو کہ کیا حکومت پاکستان تصاویر کو لانے لیجانے اور دیگر اخراجات کی کفیل ہو گی۔ ذرا اندازہ ہو جائے تو ہم اس پار کوشش بھی کریں۔ ورنہ وہ نہ ہو کہ مدعی سست اور گواہ چست۔

حسرت صاحب کی بیماری اور پھر صحت یابی کی خبر ملی۔ جذبات نے اس بارے میں عجیب نشیب و فراز دیکھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ پھر جوان ہیں۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ کافی ہاؤس کی رونق اب ان سے پھر دوگنی ہو گئی ہے۔ خدا انہیں چہکتا اور مہکتا رکھے۔ سالک پھر لاہور آ گئے سب احباب کو مبارک ہو البتہ سنتا ہوں کہ ہاشمی صاحب کراچی ہجرت کر جائیں گے۔ امتیاز کو میرا بہت بہت سلام اور پیار۔ کبھی صوفی ملیں تو ان سے کہئے کہ دو گھونٹ میری یاد میں بھی پی لیں۔ کم بخت کبھی خط بھی لکھنے کے روادار نہیں۔ اور ہم ہیں کہ ہر ہر جگہ سے ان کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔ ادھر ان کی خیریت بے قرار ہو کر پوچھتے ہیں۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے اکتوبر میں وطن آنے کا ارادہ ہے انشاءاللہ۔

خاکسار

بخاری

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام

(۱)

نیویارک

عزیزی و محبی، سلام مسنون۔ ابھی ابھی الیس کا خط ملا۔ جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین مصروفیت کا زمانہ ہے ابھی

کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یک لخت ارادہ کیا کہ آپ کو تار دوں کسی زمانے میں تار مستعدی اور جذبہ فرمائی کی علامت تھا کاروبار کے سلسلے میں اتنے تار بھیجے ہیں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے اور تار کاہلی اور اہتمام محبت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے اس لئے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کردوں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بے فکری، آپ کی ضیافتیں، آپ کی مجلسیں انہیں کی طفیل تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی۔ یقیناً آپ کو بار بار ایک ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔ جس کو اب آپ کسی طرح پُر نہیں کرسکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرہ بھر بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کردے۔ مرنے والے مرجاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

مہینہ بھر ہوا میں نے مستعدی سے ایک نادر لمحہ میں ایلیس کو ایک طویل خط لکھا تھا خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے دھنک ہوگی ایلیس سے کہا بھی تھا کہ خط احباب میں نشر کردینا اگر وہ آپ کی نظر سے گذرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا درجۂ حرارت تنزل پر ہو ایک مہم ہے۔ بہر حال کچھ صورت سہولت کی پیدا ہو ہی گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔

حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے ذرا اسمبلی کا کام ہلکا ہولے تو پھر ان سے ان کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خطوں کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے سالک کو میرا پیار اور سلام کہئے گا انہیں بھی خط لکھنا ہے ہو سکے تو مجھے کو الف سے آگاہ کیجئے۔ عابد، ہاشمی، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

خاکسار بخاری

(یہ خط سالنامہ نقوش ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

---

(۲)

صوفی میرے بھائی۔ ایلیس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ دار تقاریر پر چند لیکچر دینے ہیں چاہتا ہوں اس کے لئے مکمل تیاری کروں آپ کی خدمت میں بوسیلہ ایلیس یہ درخواست کی تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجئے جنہیں پڑھ لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں (اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھئے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے گی تو دیکھوں گا کہ اس میں سے کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگواؤں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے جو آپ مجھ

بہتر کوئی مرتب نہیں کرسکتا۔ کیونکہ آپ اس مضمون کے ماہر بھی ہیں اور مجھے دعوٰے ہے کہ میرے دوست بھی ہیں۔ امید ہے کہ یہ دو باتیں آپ کے کسل پر غالب آئیں گی۔ آپ کے بغیر میں بالکل یہاں بے دست و پا ہوں۔

لہٰذا عاجزانہ درخواست ہے کہ اس میں غفلت یا تاخیر نہ کیجئے، ممنون ہوں گا۔ لاہور کے چند رنگین ایام ایک ایسا خواب ہیں جو محو ہونے میں نہیں آتا۔ الحمدللہ کہ یہ دن نصیب ہوئے اور دوستوں کو ہنستے ہنستے دیکھ لیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

ندرت کو میرا اسلام کہئے گا (یہی نام تھا نا اس دل چسپ اور گرم دل خاتون کا جو ہوائی اڈے تک آئیں اور جنہوں نے مجھے اپنے خلوص سے نوازا)

میرا پتہ یہ کافی ہے: میرا نام UNITED NATIONS, NEW YORK, U.S.A

خاکسار

بخاری

۱۷ اپریل ۱۹۵۸ء

۳

برادر عزیز۔ قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں جو آپ کے دل کو پگھلا دے۔ باوجود عاجزانہ منت سماجت کے آپ کے خط سے محروم ہوں۔ نہ معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکسینہ کی تاریخ ادب اردو اور مرزا عسکری کی اسی مضمون کی کتاب کی اشد اور فوری ضرورت ہے لیکن کسے لکھوں سب سے زیادہ بھروسا آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں۔

نیویارک

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

خاکسار

بخاری

بنام سیّد ہاشم رضا

۱

یونائیٹڈ نیشنز۔ لگزمبرگ (پیرس)

شفقی و مکرمی۔ سلام مسنون! روما سے نیس اور نیس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتہ عشرہ کے

اندر انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا رخ ہمیشہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ ابکے بھی یہی عالم تھا احباب سے مل کر ایسا اطمینان ہوا کہ اب اونٹ کی طرح اسے کوہان میں برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہو گئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ قدرے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا آپ حسن اخلاق اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے لکھ رہا ہوں قبول کیجئے۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجئے۔ اپنی بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہئے گا۔

بندہ خاکسار

احمد شاہ بخاری

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

(۱)

نیویارک

۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء

عزیز بہن۔ وہ جسے فراغ کہتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یا دلوں پر تکان چھا گئی یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے ہیں کبھی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال ہی میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینئر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحب فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر نہ رہتا آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجئے۔ گنہگار کی دعا پر آپ تو کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شناسا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسب معمول ہنسی میں اڑا دیا ان کا یہ وہم یا ایمان سرپل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنھوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصئون رکھے انہیں میرا بہت بہت پیار دیجئے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں پچھلے ایک مہینہ تعطیل میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جب زمانے میں ڈاکٹر اگرام کشمیر کی ابجد سیکھنے میں مصروف ہوں گے

کہ کسی گوشۂ عافیت میں گذارنے چلا جاؤں گا۔ اور صحت کچھ رفو کروں گا۔ لیکن گرانم کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پیرس پہنچنا ہے وہاں اسمبلی تین چار مہینے رہے گی درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا، لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل سخت اداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں کہ کہنے میں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر غرا اور جانے کیا کیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط وکتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پہنچے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ڈنکا بجایا اس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے تالی تک بھی نہ سنائی دی۔ بیگم شاہد حامد صاحبہ (کس قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو میرا اسلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچتے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا اور احباب واقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

(۱)

لندن

۲۹ر اپریل ۵۰ء

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو، نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوئی ہیں جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہو گئے، کب سے.... لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مودّب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

اندر انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا حج ہمیشہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ ابکے بھی یہی عالم تھا احباب سے مل کر ایسا اطمینان ہوا کہ اب اونٹ کی طرح اسے کوہان میں برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ قدرے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا آپ جس اخلاق اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے لکھ رہا ہوں قبول کیجئے۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجیے۔ اپنی بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہئے گا۔

بندہ خاکسار

احمد شاہ بخاری

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

(۱)

نیویارک

۱۵ ستمبر ۵۱ء

عزیز بہن۔ وہ جسے فراغ کہتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یا دلوں پر تکان چھا گئی یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے ہیں کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال ہی میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینئر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحب فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر نہ رہتا آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجئے۔ گنہگار کی دعا پر آپ تو کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شنا سا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسب معمول ہنسی میں اڑا دیا ان کا یہ وہم یا مانِ سرپل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنہوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصئون رکھے انہیں میرا بہت بہت پیار دیجئے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جس زمانے میں ڈاکٹر گراہم کشمیر کی ابجد سیکھنے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک مہینہ تعطیل

کا کسی گوشۂ عافیت میں گذارنے چلا جاؤں گا۔ اور صحت کچھ رفو کروں گا۔ لیکن گرا ہم کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پیرس پہنچنا ہے وہاں اسمبلی تین چار مہینے رہے گی درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا، لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل سخت اداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں کہ کہنے میں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر غرا اور جانے کیا کیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط وکتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پہنچے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ڈنکا بجایا اس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے تالی تک بھی نہ سنائی دی۔ بیگم شاہد حامد صاحبہ (کس قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچتے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا اور احباب واقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

(۱)

لنڈن

۲۹ راپریل ۵۰ء

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو، نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوئی ہیں جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہوگئے، کب سے ...... لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کیے پر نادم اور آئندہ کے لئے مؤدب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

تو پیاری ایلس تمہارے خط سے بہت مسرت ہوئی۔ لاج[1] (LODGE) سے جو خط آتے ہیں ان میں اکثر تم سے قبل ملاقات کا ذکر رہتا ہے کہیں تم نے میری یہ بات پلے تو نہیں باندھ لی کہ میرے بعد بوبی' (زبیدہ[2]) کا خیال رکھنا وہ تو یونہی اپنی تشویش کی جانب اشارہ تھا، اور مجھے امید ہے تم اس کی پیڑی میں بہت وقت نہیں گنوا رہی ہو، بہر صورت اہلِ بخارا کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تمہارے گھر کو اکثر احسان مندی سے یاد کرتا ہوں کہ شہر کا سب سے رنگین گوشہ وہی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کر لیا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے 'فیض' گھر لانے کی خبر آئے اور میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی لکھے گا نہیں۔ شاعرِ مست جو ٹھہرا۔ کیوں؟ کہیں سے سنا تھا کہ اسے جیل بھیج رہے ہیں جہاں سادہ پانی اور نانِ جویں سے اس کی تواضع کریں گے پھر سنا کہ وہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں اور میزبانی کی پیش کش واپس لے لی ہے۔ ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آئی۔ اس پر کہ اسے بند کر رہے ہیں یا اس پر کہ نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری بات پر ہی سمجھو اگرچہ وہ تو شاید راہِ حق' میں کام آنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن میں اور تم (کہ حرص و آز کے بندے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے ہم فارم پُر کرتے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے ہی؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں۔ امید تو یہی ہے" اور یوں نہیں تو پھر؟

یہاں موسم مستقل خوش گوار ہے، کیو (KEW) باغ، میں گارڈینیا، میگنولیا اور چیری کے شگوفوں سے آگ سی لگ رہی ہے لیکن یہاں کے لئے تمہارا دل بہت ترسنے لگے تو یہ بھی سن لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جن گھر والوں کی آمدنی آٹھ دس پونڈ ہفتہ سے زائد نہیں وہ بسر کیسے کرتے ہیں کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہیں، اور جو ہیں انہیں پکانے میں غارت کر دیتے ہیں، لوگ لاپروا ہو گئے ہیں: بیرے آپ کے سامنے چیزیں یوں لا کے پٹکتے ہیں کہ میاں لو جی چاہے تو اٹھا لو ورنہ ہوا کھاؤ۔

آج کل لندن میں لنکاشائر (LANCASHIRE) والوں کا ہجوم ہے اور شاہی جوڑے کی شادی کی نقرئی سالگرہ کے جلوس "(ہائے کیسی پیاری لگ رہی تھی") گذشتہ ہفتے گروزسکویر میں مسز روزویلٹ اور ان کے خاوند کے مجسمے کا قصہ تھا (مجسمہ اچھا ہے) تو یونہی چلتا ہے لندن شہر — آجکل تھیٹر کے دن نہیں لیکن پھر بھی جوں توں شیکسپیئر، برنارڈ شا، گرگل اور شان اوکیسی کے کچھ کھیل دیکھ لئے اور کچھ نہایت ہی عمدہ اطالوی جرمن اور فرانسیسی فلمیں کچھ کرزن میں دیکھیں کچھ اکاڈمی اور سٹوڈیو وغیرہ میں، تمہیں تو معلوم ہے کہاں کہاں، اگلے دن میں آڈن (AUDEN) سے ان کی نظمیں سننے گیا تھا۔ لوئی میکنیس (MACNIEA) نے اہتمام کیا تھا۔ فیض کو سلام بھیجا ہے، کنگز لے مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی کل شام ایک تقریب میں ان کا انتظار رہا لیکن وہ دکھائی نہیں دیئے۔ ہمارا کام[3] ابھی شروع نہیں ہوا' ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا تاخیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں یہ باور کرنے کی توقع کی جاتی ہے کہ کھسرو پھوٹ پڑی ہو گی یا ایسی ہی معصوم اور قدرتی وجہ کوئی اور ہو گی چنانچہ فی الحال متفرق کام کاج کر رہا ہوں۔

چھیمی (اچھا بھئی سلیمہ سہی) اکثر یاد آتی ہے اسے میرا پیار پہنچا دینا، میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا اور تمہارے دوسرے بچوں کو بھی یا شاید ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا بھئی — یہاں سے کوئی چھوٹی موٹی چیز تمہیں چاہئے تو لیتا آؤں، کچھ ہو تو لکھ دینا۔

محبت سے

اے ایس بی

(انگریزی سے ترجمہ)

---

[1] لاج: پرنسپل گورنمنٹ کالج کی رہائش گاہ، جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

[2] بیگم بخاری

[3] بخاری صاحب انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔

منیزہ فیض کے نام

۳۔ رورویوٹیرس۔ نیویارک

۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء

پیاری منیزہ[1]۔ کافی عرصہ ہوا تمہارا ۲۶ اگست کا خط ملا تھا۔ تم میری طویل خاموشی کے باعث جواب سے مایوس ہوگئی ہو، تو حق بجانب ہوگی سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی، اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں دسویں منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی اڑتیس منزلیں ہیں ایک مستطیل سا مینار ہی سمجھو۔ دور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے جیسے ماچس کی ڈبیا اپنے کناروں پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں سے اندر آرہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں۔ جو ادھر سے نظر آتا ہے۔ وہ دریائے ہڈسن کی ایک شاخ ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس میں گرتا ہے۔ اسے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بیڑے دریا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ دور نیچے کی طرف مجھے ان پلوں میں سے ایک پل نظر آرہا ہے جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ویسے ان سب میں مشہور پل بروکلن ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل ہے۔ جس کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ اگرچہ ابھی سردی بہت ہلکی ہے۔ نیویارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑے گی یہاں خزاں کا موسم سب سے دل کش ہوتا ہے۔ امریکی لوگ اسے " FALL " گرنا کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر تانبے کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگریز کا کارخانہ معلوم ہوتا ہے، جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں کپڑے رنگ کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں سڑک پر گاڑی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑتے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ اس سال بھی فصلِ خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا۔ کئی روز تک لگاتار جنگلوں میں گھوما جا سکتا تھا۔ اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آچکی تھیں اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور چھیمی کو پیار دینا۔ مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے اب تک تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی جائے تو زندگی میں ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا منڈ کلیا تو خوب ہی چلتا ہوگا۔

جب جی چاہے مجھے خط لکھنا۔ مگر لکھنا ضرور۔

اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ بھولنا مت۔

تمہارا پیارا

اے ایس بخاری

---

[1] یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے۔

چلتے چلتے۔ میں نے اس خط کی پیشانی پر جو پتہ لکھا ہے اسے مہربانی کر کے کہیں نوٹ کر لینا اور آئندہ یہی لکھنا۔ امی سے بھی کہہ دینا کہ وہ اسے لکھ رکھیں یہ میرے گھر کا پتہ ہے۔ میں ایک آدھ ماہ میں یو۔ این چھوڑ رہا ہوں اور یہاں کی ایک یونیورسٹی میں کام کروں گا۔ اس لئے تمہیں میرے رہائشی پتہ پر ہی خط لکھنا ہوگا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

سید امتیاز علی تاج کے نام

(۱)

ڈیر امتیاز۔ دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا جو بیشتر دلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ دل میں عجیب امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہیجان کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گزارے ہیں کہ ہر امنگ کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا بالکل ہی نہ بدل گئی ہو۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رشتے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کبھی تن جاتے ہیں لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں۔ اور الحمد اللہ کہ تم اور میں دونوں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں اٹھتا۔ تابستان کی طویل دوپہریں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل ہرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی بھی رخصت نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم محفلیں پھر بلا رہی ہے۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام قبول ہو اور یاسمین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر سے ملاقات ہوئی خدا ثریا کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اب ان کے لئے کئی موقعے نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

خاکسار

بخاری

۲۔ نومبر

---

(۲)

یکم جون

یادش بخیر "ورجینیا" ۳ر جون سنیچر کو دہلی سے ہو رہا ہے۔ رفیع پیر اور رشید خود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیتیں زیادہ۔ اس لئے داد فن کاری نہ دے سکوں گا۔ اس کا افسوس رہے گا تاہم ایک آدھ بات آپ ایسی ضرور پائیں گے کہ دل پژمردہ نہ ہوگا۔ فرصت ہو تو سن لیجئے گا۔ اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرصت نہ ہو یا RECEPTION بُرا ہو

تو لکھ بھیجئے، تاکہ آپ کو ریکارڈ بھرا دیں۔ اور آپ کسی وقت لاہور اسٹوڈیو میں جا کر اسے سن لیں۔ مدّت کے بعد کھیل کے سلسلے میں آپ سے پھر تعلق قائم ہوا۔ گو اس کی حقیقت بوسہ بہ پیغام جیسی ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل کو جیسے کسی نے دستک دی۔ برسات میں دہلی آ جائیے گا؟ سالک اور تم دونوں آنے کا پروگرام بناؤ اور یہاں آ کر رامپور کے شاہی باغیچے کے آم کھاؤ۔

بخاری

---

(۳)

گورنمنٹ کالج لاہور

۱۰ر جولائی

ڈیر امتیاز۔ نیویارک میں میں نے چارج ۱۰ر جون ہی کو لے لیا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے بعد مہینے دو مہینے کے لئے لاہور آؤں گا لیکن مہلت صرف پندرہ دن کی ملی۔ اس میں سے بھی پانچ چھ دن کراچی میں ضائع ہو گئے۔ آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بالآخر ۵ر جولائی کو لاہور پہونچا۔ اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا، اور پندرہ جولائی کو وہاں سے انشاء اللہ نیویارک۔ پھر نہ معلوم کب مراجعت ہو۔ گھر کا سامان سب پیک ہو چکا ہے، بیشتر کراچی جائے گا۔ وہاں ایک مکان کا انتظام ہو گیا ہے۔ منصور وہاں رہے گا، اور زبیدہ بھی فی الحال وہیں رہیں گی۔ وہ بھی ہفتے عشرے تک کراچی چلی جائیں گی۔

احباب سے فرداً فرداً رخصت ہو لیا۔ آپ سے تاثیر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں یہاں پہونچا تو تاثیر ایک دن پہلے انگلستان روانہ ہو گئے تھے۔ اب آپ سے اور حجاب سے نہ ملنے کا بہت افسوس رہے گا۔ نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو۔ میرے امتیاز آمیز منصوبے بدستور جاری ہیں۔ جانے سے پہلے آپ سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ کہ اگر یہ کیا جائے تو کیسا ہو اور وہ کیا جائے تو کیسا خیال ہے۔ چاہتا تھا لاہور سے پھر کچھ تجدید عہد کرتا جاؤں۔ بڑے رنگین دن اور راتیں اس شہر میں اور ریلوے روڈ پر گزاری ہیں۔ لاہور چھوڑنے کا کچھ قلق سا ہے۔ تشفی کا پہلو صرف اتنا ہے کہ دو سال کی جہاں گردی کے بعد کہیں تو قیام ہوگا۔ میں سفر سے تنگ آ گیا ہوں۔ ٹکٹ، پاسپورٹ، سوٹ کیس کا خیال آتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے لاہور میں جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا نہ توقع تھی کہ آئندہ ہوگا۔ یہ آخری لمحے یہاں اس طرح گذر رہے ہیں کہ کچھ آپ ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ یا آپ یا سالک باقی دنیائے عشق میں نو وارد ہیں کہاں تک انہیں کوئی ہمراز بتائے کون انہیں بتائے کہ دہلی مسلم ہوٹل کتابِ زندگی میں کس مضمون کا ورق تھا۔ رحمت علی خاں کا تھیٹر کیسا مردم خیز گوشۂ حیات تھا۔ مچھلی کے شکار کا مولانا عبدالمجید خاں سالک کی روح پر کیا اثر پڑتا تھا۔ ولیم صاحب کون تھے۔ ہم تو پانیر میں کے کیا معنی؟ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ اس کے سمجھنے والے بس سالک، سلمان، آپ اور میں ہی باقی ہیں۔ حکیم احمد شجاع خشک ہو گئے۔ حفیظ جوبلی منا کر جیتے جی ملکہ وکٹوریہ سے واصل ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اور ان کی دنیا ہم سے الگ ہے۔ "لو پھر بسنت آئی" کا زمانہ یاد کیجئے اور پھر الحمرا میں ان کا شام بھر (رات بھر) نظمیں پڑھنا، یہ اس کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے فلم لوینٹ کا حال سنا۔ آپ ہوتے تو اس میں سطوت شیر کے دخل دیتا۔ مشری میرا پرانا پیشہ ہے آپ میرے پرانے گاہک ہیں۔ یہ کاروبار عادت ہو گیا ہے اب نہ معلوم نشہ کیوں کر پورا ہوگا۔ خلیفہ عبدالحکیم سے بھی خدا حافظ کہنے گیا معلوم ہوا وہ مری چلے گئے ہیں۔ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں ان کو میرا اسلام اور پیار لکھئے گا۔ بلکہ تکلیف کر کے ان سے بالخصوص مل لیجئے گا۔ (تکلیف کی نکلیف سیر کی سیر) بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا سند میں خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا، کہ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ نہ معلوم خلیفہ صاحب نے کیا غیر محتاط باتیں میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان

کی دوست پروری پر شبہ نہیں مردم شناسی پر ضرور ہے۔ وہ خود بھی کج ہیں اور کج فطرت لوگوں کی بدولت غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔ میری طرف سے ان کے گلے نوچ کر ان سے کہئے کہ برخوردار اب تم بڑے ہو گئے ہو اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است۔ ببانگ چنگ بخور مے کہ محتسب تیز است۔ لوگ آج کل شر کا رستہ ڈھونڈھ نکالنے میں بڑے طاق ہیں۔ بات پر یاں زبان کٹتی ہے۔

یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر سنے اتنے ہی کم سمجھ میں آئے بہر حال اب امید ہے اصلاح کے رستے لوگوں کو سوجھیں گے۔

خط لکھنے کا شوق آپ کو مدت سے کم ہو رہا ہے۔ مجھے ابھی باقی ہے لیکن تحریک ہونی چاہئے۔ رہا لکؔ اس معاملے میں وفاکش ہیں خط لکھتے ہی رہتے ہیں۔ جن سے یہاں کی محفلوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ انہیں جواب میں ضرور خط لکھتا ہوں اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی کریں تو مجھے دور افتادگی کا احساس کم ہوگا۔ بہر حال آپ کی خیریت کی خبر ہمیشہ طمانیت کا باعث ہوگی۔ رحجاب سے میرا سلام کہئے اور یاسمین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے ——— PAKISTAN HOUSE, NEWYARK, U.S.A.

ہوائی ڈاک سے خط بھیجنا مہنگا پڑتا ہے لیکن نہ اتنا کہ خط و کتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا مری کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لاہور کے پتہ پر خط بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

نیویارک۔ ۲۵ اگست ۵۸ء

ڈیر امتیاز۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیف اور مرنجان مرنج پہلو ہی سے سروکار رکھا اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا زمانے کے ہاتھوں یوں تکلیف اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وقتاً فوقتاً کسی کی مخاصمت یا ایذا رسانی کا ہدف بنے۔ لیکن تمہارے حسنِ طبیعت اور حسنِ اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں یا تم سے انصاف کرنے میں متامل ہوں۔۔۔

۔۔۔۔ یہ دور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آز دلبے مروتی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا تمہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے علو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں پر غلبہ پاؤ گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں اور بے بس اور دور افتادہ۔ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آسکتی ہے تو یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھتی ہے نہ رکھ سکتا ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں جسے بآسانی سلیم الطبع کہا جا سکے۔ میری کمزوریاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیونکہ تم سب کو ان سے پالا پڑ چکا ہے اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر انہیں در گذر کیا ہے لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحانِ طبیعت یہ کہتا ہے کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اسی لئے کوئی دوست چھن جائے یا دور ہو جائے تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ہمارے دوست اب کم رہ گئے ہیں۔ تقریباً ہر ایک تفکرات یا ہوس کی گرداب میں آ چکا ہے اور نکل نہیں سکتا۔ تاہم سالکؔ جیسے لوگ معتنماتِ روزگار میں سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس سے غم غلط ہوگا۔ اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں وہ اتنے صبر شکن معلوم نہ ہوں گے۔ فیض اور ایلس بھی

واپس آ چکے ہوں گے۔ ملنسار لوگ ہیں اور ان کی محبت بھی مرہم کا کام دے گی۔ سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور رفاقت فہم بیوی عطا کی ہے اور ایک بچی جو یقیناً تمہاری بہترین امیدوں کا مجسمہ ہو گی ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی۔ جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں، غور سے دیکھیں تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور ان ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ بلیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے اور ان بیبیوں کے کام آئے جو بلیاں پالتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود حجاب ہی سب سے پہلے اس کی قدردان ہوں گی۔

اس سال کے آخر تک یو۔این۔ او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچھ اور کرنی پڑے گی ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہو گی اس کا سہارنا مشکل ہو گا۔ دو گھر چلانے پڑتے ہیں، ایک یہاں ایک زبیدہ کے لئے کراچی میں۔ پھر کچھ ڈالر و‌ں کی نذر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی لیکن دنیا بھر سے زیادہ فیس لیتے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا انہوں نے اطمینانِ قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکال لی ہے۔ دھڑا دھڑ ترجمے کر رہے ہیں۔ از بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے شاید انہیں یہ احساس ہے کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہئے آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب لوگوں کے منظور نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت اور آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں، ضرورت پیش آئی کہ کسی نکتہ رس دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کر دوں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک لیکچر تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست تو مرتب کی لیکن کتابیں بھجوانے کا کام ستعدی سے سر انجام نہ دے سکے چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور بک سیلر کے مابین لٹک رہا ہے آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی کہ آپ اپنے قضیوں میں گرفتار ہوں گے۔ اردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب . . . . سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کریجے۔ حجاب کو میرا اسلام اور یاسمین کو میرا پیام پہونچے۔ خط ضرور لکھتے رہا کیجئے۔

آپ کا خادم

بخاری

۲۵ اگست

۵

۱۱ مئی ۵۰ء نیویارک

ڈیر امتیاز۔ واپس پہونچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا بنا۔ دو ایک کتابیں بھی آپ کو بھجوائی تھیں۔ بہت اچھی نہ تھیں لیکن میری وفا شعاری کا ثبوت ضرور ان سے ملا ہو گا۔ افسوس کہ کتابیں مجبوراً سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجوایئے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (MYTH) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے کہا کہ بھائی دو صفحے لکھ دو۔ وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق تو کئی نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں تو اس

بارے میں بدمعاش آدمی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر فیصلہ کیا ہے کہ ان سے پوچھ پاچھ کے میں خود ہی کچھ گھسیٹ ڈالوں گا۔ اگلے ہفتے آپ کو ایک کتاب (بذریعہ سمندری ڈاک) انشاء اللہ بھجواؤں گا۔ حال ہی میں نکلی ہے اس کا نام ہے "نظرِ بد" یعنی EVIL EYE ' ایک ماہرِ چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے اور اس میں آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات لوگوں میں مروج ہیں انہیں یکجا کر دیا ہے۔ "نظرِ بد" بھی ان میں سے ایک ہے اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر لکھ دی ہے کئی باتیں طبی نقطہ نظر سے مفید اور انوکھی ہیں مثلاً عام خیال ہے کہ بہت پڑھنے سے یا باریک لکھائی پڑھنے سے نظر پر زور پڑتا ہے اور آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ یہ غلط ہے اور اس "وہم" کا ڈاکٹری میں کوئی جواز نہیں ملتا۔ کتاب کا ثانوی عنوان ہے "STUDIES IN THE FOLK-LORE OF VISION"۔ میرا خیال ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ باقی کتاب پہنچنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجیے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں چند لیکچر اردو زبان وادب کی تاریخ پر دینے ہیں۔ صوفی تبسم سے بوساطت ایلس فیض (کیونکہ صوفی صاحب تو خود گل محمد قسم کے انسان ہیں) مناسب مفید کتابوں کی (اردو انگریزی دونوں) فہرست منگوا بھیجی ہے وہ آ لے پر دیکھوں گا کہ کون سی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ امید ہے دریغ نہ رکھیں گے۔ کہیے وہ افسانوں کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا ہے اور جس میں مجلسِ اقبال کو عموماً اور آپ کو خصوصاً پہل کرنی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ لاہور سے چلا آیا تو اس کے بعد صدائے برنخاست۔ کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے میں ایک لنچ کے موقعے پر بر سرِ عام یک لخت بے ہوش ہو گیا اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اچھے اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ خاطر خواہ علاج جاری ہے۔ لیکن کچھ ٹھیک تشخیص نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ کام اور تفکرات کی کثرت کو مجرم ٹھہراتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہیملٹ کی بے ہوشی کے اسباب مفسرین میں متنازعہ فیہ ہیں ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لئے مبہم رہے گی۔ لیکن حد ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ "غش کھانا" وغیرہ داستانوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

سالک، فیض، صوفی ان تینوں کو جب ملیں میرا سلام کہیے گا چغتائی صاحب کے ہم کلام ہونے کا موقعہ نکلے تو ان سے کہیے وہ مجھے فوراً خط لکھیں کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب ملیں تو۔ ن۔ گ۔ ل۔ ی کر دیجیے گا۔

ہاں بھائی، آغا بشیر اور رفیع پیر کو بھی میرا سلام کہیے گا۔

حجاب یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

---

(۶)

پاکستان ہاؤس۔ نیویارک

۱۲ اگست

ڈیر امتیاز۔ تنہائیوں میں آپ اکثر یاد آئے اور اس ایک سال کے عرصے میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں لیکن پے در پے مصروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شگفتہ ارادوں کو پژمردہ کر دیا۔ کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ن۔ م۔ راشد نے

نے کچھ ادبی لطیفے لکھ بھیجے اور اردو کتابوں کا ایک بنڈل۔ ایسے ہی دو تین واقعات سے طبیعت کا رُخ ٹوٹا، پرسوں آپ شدّت سے یاد آئے۔ ایک کتب فروش کے ہاں دل پشاوری کر رہا تھا۔ ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف "انڈین تھیٹر" نظر آئی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے۔ لیکن کتاب مختصر ہے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ جہل اور تعصب کا ملغوبہ ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے ہندوستانی تھیٹر کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے۔ آغا حشر کے بارے میں ازحد بخل، تعصب اور پستی کا ثبوت دیا ہے ان کا ذکر یوں کیا ہے کہ "A hack - writer called Agha Hashr .... a third rate poetaster" اور اسی طرح کی اور خرافات بک کر انہیں تین چار سطروں میں ٹرخا دیا ہے۔ پڑھ کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اے کاش آپ اردو تھیٹر پر اب بھی ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ جو مسالہ آپ کے پاس ہے اور جتنی جوانی آپ نے تھیٹر پر چھڑکی ہے وہ اور کسی کو ابدالاباد تک نصیب نہ ہوگی۔ کتاب اردو انگریزی دونوں میں چھپنی چاہیے۔ نیویارک اور لاہور میں جو بُعد ہے وہ نہ معلوم کب تک رہے گا۔ لیکن مجھے اس کام میں شریک کرنے کا ارادہ ہو تو یہ بُعد پھاندا جا سکتا ہے۔ جب تک زندگی ہے کوئی کام محال نہیں البتہ موت رستے میں حائل ہو گئی تو اسے کوئی نہ پھاند سکے گا۔ لیکن اگر شرکت کا کام مشکل معلوم ہوتا ہو تو کم از کم آپ خود ہی اللہ کا نام لے کر اردو کی کتاب لکھ ڈالیے۔ آپ کا وسیع تجربہ اور علم تو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تھیٹر کا یہ دور ہمیشہ کے لئے یاد سے محو ہو جائے گا ایسے آثار بھی باقی نہ رہیں گے کہ ہزار سال کے بعد موہنجو داڑو کی شکل میں دریافت ہو سکیں۔

لاہور کے حالات سے محض بے خبر ہوں البتہ سالک صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ ادبی گہما گہمی اب نہیں۔ نہ معلوم سالک صاحب ہجرت کے بعد لاہور سے بے تعلق ہو گئے ہیں یا مُرورِ زمانہ نے رنگینی کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بہرحال لاہور ہم سب کا معشوق ہے اور مرتے دم تک معشوق رہیگا ہماری جوانی اس سے کٹی اور کبھی کبھی شباب کے غرّے میں یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیارِ محبوب کی ہر خبر طبیعت میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے اور کوئی خبر نہ آئے تو زندگی ایک مسلسل فراق معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو تناؤ ہے اس کی اطلاع ہمیں محض سرکاری ذرائع سے پہنچتی ہے۔ تفصیلات کے لئے طبیعت تشنہ رہتی ہے اور اکثر متفکر۔ نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و ناحق میں انہیں تمیز باقی نہیں رہی۔ شاید آئندہ الیکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں کچھ کجی پیدا کر دی ہے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان کے ڈنڈن کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ یہاں کے کالم نویس اور سیاست دان بیشتر پاکستان کی ہمت اور حق بینی کے معترف ہوتے جاتے ہیں اور پاکستان کے لیڈروں کے تدبّر اور تن دہی کے قائل۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔

بڑے بڑے فلم دیکھنے میں آئے اور اکثر غائبانہ آپ کو تھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے تبادلۂ خیالات کرتا رہا لیکن طبیعت کو اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے ٹھاٹھ کا فلم "THE RIVER" ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ "JEAN RENOIR" نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں بنا ہے اور ایکٹر امریکن، انگریز اور ہندوستانی ہیں۔ زوروں کی پبلسٹی ہو رہی ہے پاکستان کے "دستاویزی" فلم بہت تھوڑے ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم زنگ آلود ہے۔ آپ کی جانب سے کوئی خط آئے، تو طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق۔ یاسمین کو پیار۔

خیریت و بہبود کا طالب

خاکسار،

بخاری

بنام ہاجرہ مسرور

گویا از نیویارک

۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

محترمہ —

آپ کے خط سے طبیعت بھی بہلی لیکن تشنگی بھی رہی۔ رسالوں کا جو حال آپ نے بیان کیا ہے وہ کم و بیش وہی معلوم ہوتا ہے جو میری کودکی اور جوانی کے زمانے میں تھا لیکن ادب اور فن کو حنا نے وہ لہو بخشا ہے کہ باوجود آنکھ سے ٹپکنے کے رگوں میں دوڑنے پھرنے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ عین میدانِ جنگ میں بھی پھول اُگتے ہیں۔ جب شاعر کی زندگی کا دار و مدار ایک جاہل اور جابر سلطان پر تھا جب بھی اس لئے ایسے حیلے تراش رکھے تھے کہ مدح کے علاوہ کئی راہیں اس پر کھلی تھیں۔ سب سے زیادہ کش مکش تو امریکہ جیسے ملکوں میں ہے جہاں منڈی کے بغیر کوئی چیز بک ہی نہیں سکتی۔ یہاں کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کامیاب شاعر (یا افسانہ گو) ہیں یا ناکامیاب۔ تو مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ آپ نے پیسے کمائے یا نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کو حسن فروغ شمع سخن نصیب ہوا یا نہیں۔

یہاں تک تو آپ کے ساتھ ہوں یعنی مضمون سے جو گریز آپ نے کیا ہے اس سے ماتھے پر بل نہیں آنے دیا لیکن میں سمجھتا تھا آپ کے خط سے احباب کا حال معلوم ہوگا۔ ندیم صاحب اور خدیجہ اور آپ کے شب و روز کا کوئی نقشہ آپ کے خط میں نظر آئے گا۔ جو ملاقات کا کام دے۔ کچھ آپ کے خط سے لاہور کی سیر ہوگی اور اس عزیز شہر کی خیریت معلوم ہوگی۔ کیا اس کے باغوں میں اب بھی سفیدے کے اونچے اونچے درخت خوشبو سے لدے کھڑے ہیں۔ کیا اب بھی راوی مغلوں کی یاد میں سسکتا رہتا ہے کیا امرلوں کی گہری اور تاریک سبزی اب بھی عنابی بادلوں کے ساتھ آتی ہے اور برسات میں رلاتی ہے؟ آنکھیں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈھتی رہیں لیکن ناکام رہیں۔ یا شاید بے نظر ہو چکی ہیں اور یہیں معلوم بھی نہیں۔ پھر خط لکھنے کا موقع ہو تو ان مجلسوں کا حال ضرور بیان کیجئے جن کی یاد دل سے کبھی محو نہیں ہوتی نہ معلوم مجھ غریب کا حشر کیا ہوگا۔ دنیا کے ہر کونے میں دل کا ایک پارہ کسی نہ کسی گلی میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے، یہ سب ٹکڑے کب یکجا ہوں گے۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو؟

میں چند دن کے لئے یہاں (جینوا) کام کے بہانے سے آگیا ہوں۔ مضافات میں تنگ کنار گلیاں ہیں۔ انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی۔ دن بھر کوہ بلانک کی برف پوش چوٹی بلور کی سی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے دن ڈھلتے ہی فضا میں اور جھیل پر ایک پُر اسرار نیلاہٹ چھا جاتی ہے۔ یہاں روح کو وسعت نصیب ہوتی ہے اور کئی پیچ و تاب تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سال میں دو تین مرتبہ یہاں ضرور آجاتا ہوں، ہفتے عشرے تک نیویارک واپس چلا جاؤں گا۔

خاکسار

بخاری

احمد ندیم قاسمی کے نام

ہوٹل ماریا کرسٹینا

میکسیکو۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۹ء

عزیزی ندیم صاحب! آپ کو راقم کا نام یاد رہا ہو تو شاید یہ بھی یاد ہو کہ آپ نے اور ہاجرہ نے اور خدیجہ نے مشترکاً اور منفرداً وعدہ کیا تھا کہ ادب کی دنیا سے

گاہے گاہے کوئی کتاب، کوئی رسالہ، کوئی نظم، کوئی اشارہ، کوئی مژدہ مجھ تک پہنچتا رہے گا۔ سو یہ وعدہ یوں وفا ہوا کہ اردو تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں میکسیکو خلافِ توقع دل کش اور رنگین پایا اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی دوراُفتادگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم کسی گیتار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور محرابوں اور سرو کے درختوں پر ہمارے وطن کی سی شوخ دھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سایے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر بلاتے ہیں تو لاہور والوں کا والہانہ یاد آتا ہے۔ رسالک صاحب کے انقلاب کا جوبلی نمبر دیکھا تو اس میں آپ کی نظم سے آنکھیں سیراب ہوئیں۔ اب معلوم ہوا کہ نقوش پھر آزاد ہوگیا ہے تو دل چاہا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ ہاجرہ کی کتاب غالباً چھپ گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو انہیں بھی میری طرف سے مبارک ہو اور ہاجرہ اور خدیجہ دونوں کو میرا سلام پہنچے۔ نہیں معلوم کہ کب واپس آؤں گا۔ دل چاہتا ہے جنوبی امریکہ میں کچھ اور صحرانوردی کروں۔ اور نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کا چکر تو بہر حال رہے گا۔ لہٰذا ابھی جنتری پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔

خاکسار

بخاری

(نوٹ: یہ خط سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب!

آپ کا خط ملا۔ گویا آوری سلام روستائی کے سلسلے میں تھی لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے میرا حوصلہ تو بہت بڑھا لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ جون کو میرا پہلا امتحان ہے ادھر موسم اس قدر خوش گوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی، کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھسنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے کہ استیاز جیسے عزیز دوست کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر، سرا نگشت رہا ہوں، عرصہ ہوا، دوستوں نے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو لیں وہ خط لکھوں گا وہ خط لکھوں گا کہ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے اس ہیجان کے دوران میں ہو سکا تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں پھر بھی میری کج میں طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔ ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے رسالہ لاہور واپس آ لینے دیجیے۔

خاکسار

بخاری، عمانوئیل کالج کیمبرج

(نیرنگ خیال ستمبر ۱۹۲۷ء)

بنام کلیم الرحمٰن

نیویارک ۲۱ دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیزی و شفیقی، سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ کام دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ایسی مشقت نہیں کہ ابھی سے کانوں پر ہاتھ دھروں "THIS I BELIEVE" یا اسی قسم کے عنوان سے بوقلموں کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نہ معلوم آپ کے زیرِ نظر کون سی کتب اس نام کی ہیں اس لئے آپ کے نیویارک کے دفتر سے کتابیں پہنچیں گی تو پورا حال معلوم ہوگا۔

آپ کا نام جب زبان پر آتا ہے تو آپ کے والد مرحوم (منشی خلیل الرحمٰن) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کا خادم اور معتقد اور ان کے دستر خوان علم و دانش کا خوشہ چین تھا۔ آپ نے جس خاندان میں تربیت پائی ہے وہ آپ کے حسنِ اخلاق اور علو فطرت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کفیل ہے اور رہے گا۔ اس کے علاوہ آپ خود بھی ماشاءاللہ روشن دماغ اور شائستگی کا نمونہ ہیں۔ اس لئے سمنڈ صاحب یا کسی اور صاحب کے سامنے آپ سے اپنایت جتا کر مجھے فخر ہوتا ہے۔ خدا آپ کی زندگی ہر طرح کامران کرے۔

آپ کی بہبود کا طالب
خاکسار بخاری

بنام حامد علی خاں

(۱)

مشفقی حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون

مجھ سے سہو ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط نیز مسودوں کی رسید آپ کو نہ بھیجی۔ مسودے بہ مطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظر ثانی کر لی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ گو ایک آدھ مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ ثقالت تھی جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ لبا اوقات تو مطلب ہی فوت ہوا جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے محض انتظار اس بات کا ہے کہ آپ نے جو مزید مسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لوں ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی دوسرا امریکن ہونا چاہیئے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائداعظم کا اور امریکی حصے میں پہلا مضمون آئزن ہاور کا۔ باقی مضامین کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے۔ تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ شمع پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکن حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہاں مضمون کے آخر میں قوسین کے اندر بخطِ خفی لکھ دیا جائے (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرزِ تحریر کی اجنبیت کو خود صاحبِ مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگاروں میں خود شامل ہونا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لئے تمہید نگار ہونا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر، خاکسار بخاری

کیا تمہید اور مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بھیج دوں تاکہ کتابت شروع ہو جائے؟

---

(۲)

مشفقی، سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۱۷ ستمبر معہ بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاء اللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔

خاکسار

نیویارک ۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء

بخاری

---

(۳)

مشفقی جناب حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بصیغہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا ہے۔ جس میں ۲۹۔ پاکستانیوں کے مسودے اور ۲۱ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں نیز ۹ مضمونوں کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ زحمت نہ ہو تو رسید سے ضرور مطلع فرمایئے۔ میں متفکر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہذا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظر ثانی کی ہے مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر پائے۔ بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلاست بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے بہرحال اب جس حالت میں مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں اوّل تو کاہلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے اکھاڑ کی وجہ سے فرصت کم رہی۔ پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا، جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا تو پھر وہی کیفیت ہوئی آخر تنگ آ کر میں نے ایک مختصر سے دیباچے ہی پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع پر تھے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سنا کہ مکتبہ فرینکلن کے کرتا دھرتا آپ ہیں تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں، بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔

خاکسار ۔ بخاری

(نوٹ: یہ خط ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو عین اس روز لاہور پہنچا جس شام پطرس کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی۔ یہ خط اسی کتاب سے متعلق ہے جس کا غیر مطبوعہ دیباچہ اس رسالہ میں درج ہے اور یہ کتاب مکتبہ جدید چھاپ رہا ہے)

بنام عبدالقدیر رشک

عزیزی رشک سلمہ اللہ تعالےٰ

سلام مسنون! آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب سے مجھے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ عمر اسی دشت کی سیاحی میں کٹے گی لیکن شرافت ملاحظہ ہو کہ آنکھیں اردو کتابیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ اوّل تو کتابیں ملتی ہی نہیں، مل جائیں تو فرصت کہاں؟

بھلے آدمیوں کی طرح صبح صبح اٹھتے ہیں جلدی جلدی کھانا کھایا اور کسی مارپیچ میں نکل گئے شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام کا روح افزا وقت ہو یا صبح کا سہانا سماں، طبیعت مچلتی ہوئی ہو یا افسردہ، ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے باتیں کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے لیکن ہم کچھ ایسے برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں کہ نہ نیند کی پروا، نہ صحت کا ہوش۔ خداوندانِ سیاست کا حکم ہوتا ہے کہ بعض باتیں کہے جاؤ۔ ایسے ماحول میں رہ کر اردو ادب کے متعلق کیا کہوں ؎

بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

وقتاً فوقتاً اردو ادب کی جو کتابیں نظر سے گذری ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بُری طرح الجھا ہوا تھا جس میں زندگی کے خدوخال نمایاں تھے نہ ان صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں، واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشتر پنہاں ہوں گے۔ اور کئی مصرعے دھڑکتے دل، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی لغزش و استقامت اور انسانی منزل کی امید افزا کرنیں نہیں پھوٹتیں۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے، ہمارے یہاں کے اکثر ادیبوں نے راہ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنایا۔ انہوں نے نرم و نازک زبان کے ذریعے ملکی ادب کو آرٹ کی نئی قدروں سے دوچار کر دیا۔ حالانکہ پاکستان میں جس زمانہ کے سایہ میں اردو ادب کی نشو و نما ہوئی، تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے ابتلا کا زمانہ ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

رومانیت کا دور گزر چکا۔ اب اردو ادب زندگی کے تلخ حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہوگا۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگ میل کی سی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی سربلندی اور انسانی بہبود کے لئے افکار و تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی خدمات میں زیادہ آلہ کار ہونا چاہیئے۔ دور حاضر کے جن ادیبوں نے اردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے ملک کے دانش ور اور عوام ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

ہم نہ روس کے ہنگامی ادب کی استوار کردہ عمارتوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور نہ ایسے ادب کی پشت پناہی کر سکتے ہیں جو انسانی خدمات کے لئے زیادہ آلہ کار نہ ہو۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا سکتا لیکن عدیم الفرصتی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

بخاری

پطرس کے مضامین

یعنی مضامین

اے ۔ ایس ۔ بخاری

بی ۔ اے (کینٹب) ایم ۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

فہرست مضامین

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے فیضِ تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔ تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اِس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

اِن مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی "ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اِس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اِس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہُوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب، خاص طور پر مبارک باد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اِس بات کا انکشاف ہوا۔ کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشو و نما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً اُن رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے۔ فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اِس کو پاسِ وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہر حال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا۔ کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار اور ایمان دار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم۔ فوٹو گرافی۔ تصنیف و تالیف۔ دندان سازی عینک سازی۔ ایجنٹوں کا کام۔ غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی۔ اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیئٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بےحد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اس پر انھوں نے بےشمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے۔ لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور۔ مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیرخوار بچہ تھا۔ تو وہ مجھ سے بےانتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قوٰی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیئٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا۔ کیونکہ ہمارے

ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پہ آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیئے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پہ غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ تو ہم نے اِس زندگی میں بھی نشو و نما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پہ چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پہ رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سُدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا۔ ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی اُن پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اُس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اُس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الہٰی!

لیکن یہ واقعہ سُن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی اُن پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال بچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اُسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیئے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک اور نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد

ہمارے خیالات میں پختگی سی آگئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کہ ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی۔ تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا "دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہئے شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا "جی ہاں"۔

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ سچ زیادہ بول لیتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں"۔

میں نے کہا "جی ہاں"۔

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت فصاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش میں نے اُس وقت توجہ سے سُنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے۔ کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت اب نہ رہتی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دَور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ

میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچیے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے ——— مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے ازحد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا۔ اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

(۲) انگریزی۔ تاریخ۔

(۳) انگریزی۔ فارسی

(۴) تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔

(۶) انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہو گا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے، پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ سب مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے اُن پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب!" "اجی کیا کہہ رہے ہو۔" "اجی یہ

بھی کوئی بات ہے"، ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی، دل کو تسلی تھی، کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں۔ اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے۔ تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو۔ وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں۔ غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے۔ وہ دن رات آپس میں شکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ ......

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور انھیں یہ مژدہ سنایا۔ کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح لپکتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں

قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے:

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا۔ تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے۔ نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مُکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔ تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں.........

"اچھا!........ اچھا!........ تھینک یُو!........ جاگ گیا ہوں........ بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جِلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے! پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرکار جب لمپ جلایا۔ اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں۔ کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبحِ کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ اُن میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا۔ کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی!........ لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں"۔

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے "تین ...... تو ...... نہیں ...... کچھ سات ...... ساڑھے سات ...... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا۔ کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا۔ کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟"

بولے "ذرا ..... وہ میں ..... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ۔ سبز۔ زرد۔ سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں۔ کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پہ ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو

جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اُٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبّی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اُٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا۔ "یس۔"

ہم اور بھی سہم گئے۔ کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی۔ صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں......"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکیں تو...... سنا آپ نے؟" چُپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا "سُن لیا۔ سُن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس نور ایلفا پلس......"

ہم نے کہا "ب۔ ب۔ ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ اُن کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں۔ کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا۔ کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اسی دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے

آپ کو کوستا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ "لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح، صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں! واہ۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کیا۔ اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا کہ "دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی، تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے۔ "خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی ...." (لحاف کانوں پر سرک آیا) .... "تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں .... بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے .... کیا بات ہے۔ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے ...." (لحاف سر پر) .... بات یہ ہے کہ تہذیبِ جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے .... ("آنکھیں بند") .... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کونسی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں

شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے...... لیکن شیکسپیئر

.... نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا........ شیکسپیئر........ ہیملٹ........ لیکن ورڈزورتھ

.... دیدہ ہیکنیفہ .... دیوانگی........ سبزہ زار........ سبز سبز........ بادِ بہاری....

.... صید ہوس........ کشمیر........ میں آفت کا پرکالہ ہوں........

یہ معمہ اب مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا۔ اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈمارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں........ اس کے بعد........ کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں؟"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک مجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس وقت...... اُے...... اُے.. نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالش کمخواب ہو۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار

ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے

نصیب یہ ہے کہ پہلے "مسٹر، مسٹر!" کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے۔ اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گدیوں کے گر پڑنے ــــــ ونچوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سُرتال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے!

جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

ـــــــــــــ

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی۔ تو انھوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر، آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کے صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے۔ کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری۔ موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے۔ جو ایسے موقع پر

ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی۔ کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیئے۔ کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگائیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مُڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اُسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں۔ سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے۔ تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اُس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیئے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اُسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو۔ تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُن کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے اُن کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟

ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی، تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انہوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفیؔ تو میندیش ز غوغائے رقیباں　　　آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدارا

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔" یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

اُردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اُس کے مُنہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے:۔

(۱) وہ دن کب آئے گا۔ جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصّل لکھو۔

(۳) دُولہا کب بنے گا۔ اور دُولہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے۔ اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رُونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ رُلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے۔ اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے۔ تو بےچاری مامتا کی ماری آگ جلا کر دُودھ کو ایک اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچہ کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دُھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے۔ کہ چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے

برتن صندوق پر چُنے ہیں۔ تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا۔ کسی میں چوُ ہے۔ چھگنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے۔ آگ جلا لے۔ جب چاہے پانی ڈال کر بجھائے۔ آٹا گوندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے۔ غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا پرونا لے بیٹھتی ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے!

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انھیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کیے۔ اب دھوبن گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آ جائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھرتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں، اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں۔ جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے! اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا اُن کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اُس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے، ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ

کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے۔ اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔ نہیں آتے۔ تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:۔

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اُٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس ٹُرا سرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ....." اس کو ہماری انتہائی بد مذاقی سمجھا گیا اور اس بد مذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی: تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:۔

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔ "خط ضرور لکھتے رہیئے۔" میں نے کہا۔ "ہر روز اور تم بھی۔"

کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے۔ اور رومال وہیں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے حبشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو یا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو، کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اُس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر!"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پہ طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک خانہ کھولا تو سرخ رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا۔ لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے۔ لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے

کہہ دیا گیا کہ حقے ہیں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔
اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا
رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ
خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ
اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اُڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے
سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا
شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔
دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس
کی شامت آ جائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے۔"
کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے
جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔"
دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے۔ "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور
کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے۔ اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم
بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"
ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی
سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول
کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔
صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اُٹھا۔ تو روشن آرا!
دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا۔
کہ تم فوراً آ جاؤ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ
میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔
روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی.... لیکن میں
کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔
اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں
دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔
اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا
سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

دستخط ہے ؟"

"جی ہاں"

"مرے جاؤ، چلے جاؤ "

"ناخن تراش دو"

"بھاگ جاؤ !"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا آپ دیکھئے تو سہی !

مُریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ والدین کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کرچکا ہوں اور اب بھی ببانگِ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکینِ نخوت کے لئے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدنیتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ وہ ایک مرتبہ بعض مغنیوں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویّہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سُنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آکر

اِس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سُناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اُس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔ جو اُسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مرید پور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔ رنگ گندمی۔ گفتگو فلسفیانہ۔ شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پہ اپنا ایک کانگرس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مُرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت۔ انشاپردازی۔ صحیح الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مُرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی ازحد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ؎

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔ خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا۔ کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبّر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اُٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لئے ماحضر لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مریدپور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مُریدپور پہنچ جاؤں گا۔ سٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

”ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔“

”ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں۔“

”ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔“

”جن قوموں نے اتفاق کی رسّی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں ”سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا“ والا واقعہ پڑھا تھا۔ اُسے نکال کر نئے سر سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی۔ کہ

”پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے | فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے | یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالیؔ پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے...... وغیرہ وغیرہ۔“

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس۔ غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت۔

آب وہوا، مغربی تہذیب۔ لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پہ ختم کروں گا۔ کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ تاکہ جلسے میں اُسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا:۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت۔

(الف)۔ افلاس

(ب) بغض

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی۔

۳۔ اس کی وجہ۔

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب وہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)

(۴) پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ)

(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ ع۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے۔ اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مُرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگلے کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگلے سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی

مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے۔ انھوں نے کہا "سر باہر نکالیے۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں"۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پہ مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سُرخ سُرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے"۔ "مرید پور کے فرزند خوش آمدید"۔ "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے"۔

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:۔

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے......"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر اِن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسان کے لیے......"

خدایا اب میں کیا کروں گا! ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہو گا۔ جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"........ان کی اعلیٰ سیاست دانی۔ ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے........"

ہاں وہ تقریر کاہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے...."

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔

مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا ہی ورے تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔ دو بگلے اور لومڑی کی کہانی؟ نہیں ٹھیک ہے دو بیل ......

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اُسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ :۔

"پیارے ہم وطنو!

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا :۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا کہ :۔

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے ہال بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے۔ کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں .... سمجھے آپ؟ (وقفہ .....) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھیے نا کہ اگر"

(بلند اور طویل قہقہہ)

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے (قہقہے اور شور و غوغا...... اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ: ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پہ چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے......"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!

تم ذلیل ہو......"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مریدپور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں ۔

زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے۔ جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر۔ ٹالسٹائی۔ ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں ۔

باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ جس کے بجانے والے دق۔ دمہ۔ کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے ۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے۔ لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے ۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے ۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں ۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آیئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو۔ اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے ۔

(کمرے میں ایک پُر اسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے۔ اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے ۔

(کتابوں کو چھوڑ کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس:۔ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کس چیز سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم:۔ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم:۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم:۔ اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس:۔ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا۔ اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ! تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم:۔ (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اُجالا ہو گیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے۔ آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اُسے قبول کر کہ ہماری احسانمندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس:۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرف قبولیت بخش (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم:۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو مفتخر فرما (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس:۔ (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادتمندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم:۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس:۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس:۔ (تنہائی میں سر بسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لئے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے۔ اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس:۔ اے خدا کے دیانتدار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو!

ملازم:۔ (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس:۔ آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر بسجود گر پڑتا ہے)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پہ نظر پڑتی ہے۔ اُن کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)

پطرس:۔ آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس:۔ اے مزدور پیشہ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاءِ علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے۔ آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر۔ اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لئے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پہ قائم ہے۔ اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس:۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دُور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بُو آ رہی ہے .... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔

یک لخت باہر سڑک پہ موٹروں کے آ کر رُک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پہ دستک دیتا ہے)

پطرس:۔ (کام پہ سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز :۔ (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس :۔ (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں۔ لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجایئے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس :۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کیجئے۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

اجنبی :۔ اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس :۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی :۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس :۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی :۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو۔ کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی زور سے چیختا ہے)

پطرس :۔ ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا۔ لیکن حضور والا۔ آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی :۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس :۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی :۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کر لیں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس:۔ آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالمِ بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی:۔ (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہِ معظم، شاہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایما پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس:۔ (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آہستہ آہستہ الکسی پڑھنے لگتا ہے)

اجنبی:۔ ان کو قبول کیجیے۔ اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

گانا۔ آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں۔

پطرس:۔ اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ اور تو کیوں گا رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کہ ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی:۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس:۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اُس کا نام سن پاتا ہوں۔ بعض دردانگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سُستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو۔ ہفتہ بھر پہلے سے انھیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن اُن کے کام میں ہرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:۔

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروّتی بھی برتی ہے۔ کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر یہ سُن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں۔ اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:۔

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "بھئی یہ ہمیں معلوم نہیں۔"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے۔"

"آپ تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟

خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگرٹ سلگا لیتا ہوں۔ اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں۔ اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سوئے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے۔ تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آجاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:۔

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سنی؟"

"اچھا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:۔

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما، سینما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

"تو چلو پھر اب چلیں"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے۔ میں سوچ رہا تھا آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں۔ اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ کہ

"مرزا بھئی للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آئیں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آجاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو۔"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کو کیا رہے ہو؟"

"پان کے لئے ذرا تمبا کو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتار سے ہوں۔ لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ۔ کرسی۔ دیوار۔ آدمی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاند اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروایا نا؟ گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں۔ اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کونسا ہے۔ اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں۔ جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں۔ تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے خمیدہ رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں۔ اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے بن ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں۔ اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ دل لگی یونہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر اُن کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتل عمد۔ خودکشی۔ زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں۔ ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں۔ اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اُچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں۔ اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی۔ لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اُسے بھی تھا۔ میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف "دریافت" کرتا۔ تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا۔ اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے بُرے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے۔ تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی۔ جو صرف صنفِ ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں۔ اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا۔ کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا۔ اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی۔ اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں۔ تم بھی پڑھ چکو گے۔ تو ان کے متعلق باتیں کریں گے

اوّل تو میرے لئے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ اور وہ نہایت

عالمانہ انداز میں بھویں اُوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لئے دروازہ کھولتا یا اُس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا ہ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے۔ لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اُتر آتا ہے۔ اُسے میری اخلاقی پستی سمجھئے۔ لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا:۔

"ہاں اچھی ہے۔ لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دورِ جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ بُری نہیں۔ بُری نہیں۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا۔ لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا:۔

"ہاں پڑھا تو ہے۔ لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی۔ اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:۔

"اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اُس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں۔ تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری دُہری لعنتیں بھیجیں گی۔ کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ اُن کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بُھلانا بھی

مشکل ہو گیا۔ کہ میں بغیر پڑھنے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا۔ کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی۔ میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا۔ اور اپنا آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بد قسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) "میبل مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔" اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہو گی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہو گا۔"

کہنے لگی "نہیں تو۔"

میں نے کہا "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا۔ وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی "ہاں، پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحُوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کُرسیاں ڈالے چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے۔ تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دُور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں۔ مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علمِ کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"مرزا۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا! کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں .... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ اُن کی دُم ہوتی ہے، تمہاری دُم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں مَیں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ مَیں بھی پیدل چلتا ہوں، اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔

یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ کر لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں۔"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا"

مرزا کہنے لگے "سمجھو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو"

میں نے کہا "وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر جوں کا توں رہا"

کہنے لگے "مفت"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے؟"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت جوانی کی خوش دلی۔ اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی۔ اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے۔ اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو"

میں نے کہا "پھر کہنا۔ پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمہاری ہے۔ تم لے لو"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ۔ ممسک۔ خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت۔ تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کر دو۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان اپنا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے۔ احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں۔ جنھیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا۔ لیکن ......"

میں نے کہا "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دیدوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک

مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا!"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ "مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا"۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا "کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کرنا .... خدا حافظ .... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا .... خدا حافظ .... اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نا کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں .... کل صبح آٹھ نو بجے تک .... ضرور .... خدا حافظ!"

مرزا کہنے لگے "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا۔ اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا۔ ورنہ تم خود ڈلوا لینا"

میں نے کہا "ہاں ہاں! وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل ضرور بھیج دینا۔ اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا .... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے۔ میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگاؤں

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا "اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آ گئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ۔ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔ اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔ اور دیکھو صاف کر دینا! اور بہت زور زور سے کپڑا ابھی مت رگڑنا۔ بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا!" اور پھر اُسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کل اور رہاہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیئے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے۔ اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ چر چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی۔ اور چڑچڑ بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا۔ اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ .... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ، چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا۔ تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرایا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا۔ جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دُور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی۔ اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے

کہا "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے!" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اُتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے۔ اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اُٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا "اچھا کر دو۔"

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہیں بدتمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟"

بولا "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ .... للو، یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا "واہ، مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے"

مستری نے کہا "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب تو جب کالج میں پڑھتے تھے۔ تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری۔ بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں کو بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔ دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے"

دکاندار کہنے لگا "پھر"

میں نے کہا "لو گے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر" ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہو گا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا۔ انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ

سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تمہیں بتاؤ۔"

کہنے لگا "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا:۔

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا۔ اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کے مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا۔ اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے۔ جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا۔ اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقیماندہ بائیسکل کو تھاما۔ اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا و کلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی۔ کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لئے جا رہے ہو!

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انہیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے۔" ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل۔ گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا یہ

سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں پیدل چلتا گیا چلتا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کرکے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ۔"

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار اُن کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ اور کہا:۔

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید ۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کرّے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع ۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے۔ وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پُل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں ـــــ اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اُسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا جس کا دار الخلافہ پنجاب ہو گا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ورم موادِ فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا ۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج بر آمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسوّدات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں۔ ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلّے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی۔ جو رائے دہندگی کے موقعہ پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسوّدات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے۔ کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گذرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سُوری نے بنایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں۔ اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو ٹنگ لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور

اس خبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریک گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کی طرح ہر ایک شخص لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات ۔ لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اہلِ لاہور مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال"۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدامِ ملت کے جلسے کا پروگرام چپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے۔ کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا۔ اور لوٹتے وقت وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں بحروفِ جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "کیتھنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فنِ تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی

تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے۔ اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد ونواح میں سے

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جودوسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں۔ لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اُسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے۔ اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کیلئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

یہ مضامین بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ترتیب سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے بہ امر مجبوری یہاں درج کیے جاتے ہیں

"غنچۂ تبسم" کے دیباچوں پر ایک نظر

نیازمندان لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ بہ غنچۂ تبسم حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے قلم سے ہیں۔

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ "ملا کتاب شائع کرتا ہے تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اٹھاتا ہے تو ملا اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو" یہاں تک تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہل قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پایہ کا دوسرا مصنف بغرض اشاعت لوگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔ لیکن "غنچۂ تبسم" کے ایک نسخے کے ہمراہ چار چار حکمائے زبان کا پرچہ ترکیب ارسال کرنا زیرے کے منہ میں اونٹ کے برابر ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شان سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شان سخن فہمی ہی دوبالا ہوتی ہے البتہ فطرت انسانی کے اس اہم اصول پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ یہ شروع شروع میں شیخ سعدی کی آڑ ہم نے اس لئے لی کہ ہم بہرحال ناظرین و قارئین کے کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف افراد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہرحال، اہل قلم، ہندا خدا کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں ورنہ جو بات اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں۔

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا۔ "سر آغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "اعلام" تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقفیٰ نام نہ مل سکا ہوگا) یہ ثقالت الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "مندرجات" لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان "مجموعہ نگارشات" فکاہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "ملنے کے پتے" کی بجائے "سبیل ہائے اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے

تو مجبوری ہے۔

ہاں تو ہم تمکین صاحب کے "سرآغاز" کا ذکر کر رہے تھے۔ چار دیباچوں میں اپنی تعریف کروانے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نخوت نہ ہوئی تو انہوں نے خود قلم اٹھایا۔ شروع میں تو لکھ دیا کہ "بنام خداوند بخشائش گر مہربان" لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا لیا اور تین صفحوں تک انا الحق ہی کہتے چلے گئے۔ جا بجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانۂ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ۱۹۲۷ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مصروف زیادہ رہنا پڑا اور ادئی اللہ "مدیران رسائل نے مضامین کے لئے مارے تقاضوں کے نام میں دم کر دیا۔"
آگے چل کر فرماتے ہیں :—

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ جا بجا کوشش کے لفظ پر ہم نے خط خط اس لئے کھینچ دئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے۔ اسی جملے کو غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی پھسپھسی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "ترا ملک دکھن تو دکھن بول۔" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں۔

"میری مادری زبان اردو ہے، اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں :

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟
تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں :

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں جنھیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔"

الحمدللہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائرکٹری تک چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گوناگوں و بوقلموں عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ردو نویس ہیں مگر،

"حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنھوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے۔"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعوےٰ نہ فاضل ہونے کا اور خدا کے واسطے یہ تو بتائیے کہ یہ اسکے

کی غلطیوں" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی انشّے کے اصولوں کے مطابق لکھا؛ اور کاتب صاحب کی کم سوادی کو آخر آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایلجبن" کو ہر جگہ "ایگرنان" لکھنا بھی انہی کے سر تھوپئے گا؛ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلام" کے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"غنچۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو فکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو فکاہات میں شامل کرتا ہوں اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو فکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے انتہا درجے کے عجز بیاں کی دلیل ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہیے تھا،

"غنچۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے۔"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو فکاہات میں شامل کر کے اتنے بڑے بڑے جمادات سے ہم حیوانات کے سر پھوڑنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی، علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہار ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع ہو"۔ ماما بے چاری دبک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زناٹے سے کہہ دیا کہ میں الف، بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا۔ اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرز تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابل قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوےٰ پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ" اس وقت سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دور حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیش نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ورجینیا وولف، کیتھرین منسفیلڈ، مڈلٹن

مرے۔ پروفیسر گریرڈ، ولسن نائٹ، وغیرہم کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ یہ فہرست ادبی نقادوں کی تھی۔ لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا گہرا کیا ہلکا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ ارل برٹرنڈرسل جو دنیا کے مشہور فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے۔ بھولے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کا ہر شعبہ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کن جہال کو اپنا مخاطب بنا رہے تھے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپرد قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:—

"جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنف ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

"پر" آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں یعنی فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔) فقرہ بہرحال کھونڈا ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیے تھا

"وہ اس صنف ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنف ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس صنف ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:—

"ذکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں "دونوں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ، "جو محاورے یا اصطلاحات گہوارے سے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں اُن اہل زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھول پن سے فرماتے ہیں کہ "ذکاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے۔" (یہ "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ ذکاہی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل اور بات اس دھڑلے

سے کی ہے گویا چلتے چلتے فنِ تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگ میل ہی تو نصب کر گئے ہیں۔ ایسی بے سر و پا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب ضرور لکھا جائے گا اتنا ہم ان سے کہے دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب موسوم بہ "خندہ" یا میریڈتھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھ لیں کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے حیرت ہے کہ نیاز صاحب "یورپ کے ہر شعبۂ علم" کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مصنفوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نومشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے کہ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے جن موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اگر ان کے شوقِ انشاپردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"تاثر" مولانا احسن مارہروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو (کہ لہجہ بدلے تو معنی بھی بدل جاتے ہیں) بڑے طمطراق کے ساتھ گلے کی رگیں پھلا پھلا کر اور ایک دو تین چار نمبر دے کر بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو وہ الجھایا ہے کہ آشفتہ بیانی کو ہمیشہ کے لئے احسن مارہروی کا مرادف بنا دیا ہے اما بعد اس مسئلے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو از حد غور سے پڑھیں)

"غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لیکچر، منبری مواعظ، اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفننِ طبع کے لئے ضروری اور جزو لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا غالی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں بہر حال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے آ کر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تو چٹک کر باہر نکل جاتا ہے اور لفظوں میں گھٹے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہو لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرتِ داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور تو کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۳ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ضرور لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو بھیل۔ گونڈ تک سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہلِ دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے بعد خطوط وحدانی کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ البر فربی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے سے تو "میٹرک (شکارپور)" لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔
اور ظریف وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف
تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کتم عدم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسوی صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس کبھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بسیار نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے

"اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو۔ ۔ ۔ ۔"

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے
ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مداح ہیں فرماتے ہیں:—

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی
کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیار الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بد ذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی

ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگذر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بدذوقی ایسی ہے کہ عذرِ ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے سُہا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے حد درجہ قابلِ نفریں ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا اور وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے۔ اور اپنی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھلا کیوں پیچھے رہ جائیں، جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں ہیں تہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔" ملا رموزی نے کہا۔ "ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔" آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ ضرور آپ کو حیدر آباد بلاتا۔" دسخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ اہاہا)۔ ملا صاحب نے کہا۔ "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً خفی قلم سے جواب دیا کہ "میں کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں" (اہاہا) ملا صاحب نے کہا۔ "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیے۔" آپ نے نوٹ اینا دکیا کہ "مسلمانوں عبرت حاصل کرو۔" (اہاہا) ملا صاحب نے کہا۔ "اللہ انہیں منصب دار بنا دے۔" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہمیں اب بھی ہے۔" (غیر مرفہ الحال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے۔) سبحان اللہ کیا ادبی پھلجڑیاں ہیں۔

"تعزیب" کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کی طرح بانگِ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتہً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً ادعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ اسپنسر، میتھیو آرنلڈ، گاران رسکن لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط ـــــ

احسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی"، تو حسن پرستی "کو" عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینت کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:-

ہنوز شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ تر شے تھے تو پتھر تھے جو تر شے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ تو خیر پھر بھی گذارے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلچوں سے بھرتی کی گئی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں!

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے اور اس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سعیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے جھٹ توسین میں اقبالؔ کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سعیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو حد درجہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا پرلے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباو اجداد کیوں بھگتیں اور پھر اچھی بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریرات ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو جائیں۔

دوسرے حصہ میں سعیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر فرداً فرداً تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے سعیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لئے بے چارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:—

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائگی کے (یا شاید اسی کم مائگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا۔"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا بچہ واقف ہے" اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سعیدی صاحب ہی کو مبارک ہو، ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:۔

"بہرحال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں سعیدی صاحب شاید "کامل" کے معنی نہیں جانتے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے ــــ آخر میں سعیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بہ قول ان کے "بہت کافی ہو گئی ہے" بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے۔ تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سعیدی صاحب کے زوردار فقروں میں بجز چڑچڑے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سعیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک

کرتے ہیں ان کی دماغی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذاللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں سوار ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور باوجود اپنی زنگ خوردہ تلواروں اور اپنے فرسودہ ساز و سامان کے سمع خراش نعروں کے ساتھ روحِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ بُرا بھی لکھتے ہیں اچھا بھی لکھتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر بھلے بُرے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے بلبلے میں چھید کرنا ان پر احسان اور اردو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ لیکن انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے ایک صاحب ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مودبانہ عرض ہے کہ شملہ بمقدار علم رکھیں۔ چلّو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم وہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ رہے بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظرِ ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا جہالت کی نشانیاں ہیں لنکن کا قول ہے۔

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن
سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے فصحائے زیرِ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد، گلبرگہ، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو تو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی گو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آئیں بائیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ بزد آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "جھانپلزم" تک کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "غنچۂ تبسم"۔ یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے۔ جو بازاری فواحشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

نیاز مندانِ لاہور

دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بوجوہ بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار سائبیریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرف چلو بھر سے بھی زیادہ نہیں اور چلو بھی ایسا جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجئے۔ کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں۔ کہتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارک باد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ آئندہ ذمہ وار لٹریچر سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی بھاری بھرکم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو ہی بھائے یا اس پر رعب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا دلی کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک ہلکا سا جلاب دے دیں تاکہ یہ قراقر رفع ہو جائے اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو پھر ٹریجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرما لیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہئے کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہوگی اب تو ماشاءاللہ اہل زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں یوں تو "اہل زبان" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں نمدہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چکنا پات لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بداخلاقی کا ثبوت

دیا ہے وہاں بیسیں تیس جگہ اپنی علیت بھی ضرور جتائی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختہ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دل چسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (دراصل "بکھرے" پر ہے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہلِ زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے کیونکہ ژولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صنعت ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"انارکلی۔۔۔۔ تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈراما ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پر ماوت سنائیں گے۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دہلی جا کر مخلص صاحب کے دار المطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جھروکے سے جو جھانکیں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈراما دہلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے۔ اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے، کب ہوئی اور اس کا کولمبس کون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکار پور کے سفر کے دوران میں وہیلر کے بک سٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوش گوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مصنفہ لال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ :—

"(انارکلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، فکشن اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہئے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونۂ عبرت ہونا چاہیئے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور اس اظہارِ علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ عطار گویدکی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بھگار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جبکہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مرواسکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

برسبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے

ساتھ رکھنا پڑا کئی فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی کئی پیراگرافوں کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑا، کئی فقروں کے معنے جوتشیوں سے پوچھنے پڑے اور اس دوڑ دھوپ کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بقول ان کے "خلش" تین چیزوں سے ہوتی ہے:۔

"، فرماتے ہیں: "اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون کا رقبہ اسی قسم کی تکرار کا ممنونِ احسان ہے)، کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے"

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ آپ کے اکبر والے کردار سے بالکل نہیں ملتی"۔ جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشاپرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیئے۔ اس کی انشاپردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشاپردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے)

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

"ڈرامہ نگار کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلافِ فطرت نہ ہو"

مخلص صاحب یہ دوسری بات کہنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ جو کہیں سے سن پایا تھا جوں کا توں اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کہی یا کی وہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور بجز جنات کی امداد کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے سہموں نقال پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو کہی تھی اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جو ان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغلِ اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف

ریختی لکھنے کے لئے مسالہ مہیا کر سکتے ہیں۔ تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات نہ صرف انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلاتشبیہہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتائیے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے رُخِ انور پر ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی، آپ کو کیا مزہ آئے گا۔ کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوعِ تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں:۔

"میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلئی شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہو گا جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بسنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے..... وہ آشیانہ منزل (جھروکہ) سے لگا لگا دیوانِ خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے...... اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشنِ نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی.... یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے.... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود دار امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انارکلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں:۔

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو ....."

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آ گیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ تو تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال تو اب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبردا

ہے۔ اگر غناظر بہت دور ہے تو کم از کم تزک بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔ کیونکہ بابر بہرحال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول مخلص صاحب وہ "بزرگ رفتگاں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مغل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب کو "تاریخی کلچر" کا درد تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق ایگریکلچر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر۔ ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا:

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی مصروفیات کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھئے، تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سایے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں: "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے، کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سایے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سایے کا طویل ہونا کہتے ہیں دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم غلیل ہو شیخو؟" "تو صائقہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص "اہل زبان" ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو ذرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہل زبان، بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہل زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرز تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طور پر انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ شکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوئے تھے ادھر ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ لوگوں کو خنجر اور رداء" اور اسی صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔

مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے۔ تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیکا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً "پختہ حسن" صرف متبدیوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس ہلدی کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے: "دنیا کی توا نار کلی انار کلی کہتے زبان خشک ہوئی جا رہی ہے۔ اور مجھے اتنی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ سے دو بول شکریئے ہی کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب کہتے ہیں "جھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "پھوٹے منہ" چاہیئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں۔ ظاہر داری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریئے کے کہہ دے۔

"پھوٹے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) عو، خراب منہ سے، برے منہ بد دلی کے ساتھ۔" توسین میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انار کلی کی ماں اس موقعہ پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انار کلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "سینچوں دار روزن" پر ہے۔ "سینچہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں "چھوٹی سیخ۔ لوہے کی چھوٹی سلاخ۔" "سینچوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سینچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے 'بزم آخر'۔ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جایئے اس میں آپ کو گنگا جل کپڑا اور گوش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابو الفضل کے آئین اکبری کا مطالعہ فرمایئے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزم آخر کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیئے پہلے اہل زبان آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درونِ در چہ کردی کہ برونِ خانہ آئی

یہ تمام ہست و بود ہے اس تنقید کی۔ قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انار کلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض ضمنی اور فروعی باتوں ہی میں الجھے رہے خود انار کلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے ارد گرد تمام واقعات و کوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انار کلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈراموں کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انار کلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا کہا تو یہ کہا کہ اگر بہت اچھا آدمی تھا سایے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ہاں سینچ نہیں فلانچہ ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ یہ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایۃً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انار کلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب اسمٰعیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرضِ بحث میں نہ لانے چاہیئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے "نقادوں" کو ذہنی اعتبار سے ابھی ہجو نویسی کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختانہ چڑچڑا پن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیئے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہیئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چاردانگِ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک دوشمان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیئے تھی۔ مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا "ذاتی کلچر" شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

یہ عصمت چغتائی کا وہ مضمون ہے جس کا پطرس نے انگریزی میں
ترجمہ کیا تھا۔ یہاں اصل اور ترجمہ دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ ادبی تالی بجانے کے لئے بھی دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرفِ عام میں ان دو ہاتھوں سے ہمارا مطلب ادب کے ہیرو اور ہیروئن سے ہے یوں تو ایسا ادب بھی ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں وہ ادب بھی ایسا ہی ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیر کے تلوے کی مدد سے تالی بجادی ہو ایسی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی جلدوں ہی میں گونج کر رہ گئی عوام تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستو بن کر حلق میں پھنس جاتا۔

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بندر بندریا کو ڈگڈگی بجا کر نچانا پڑتا ہے ویسے اگر وعظ کرنے کھڑے ہو جائیں یا حالاتِ زمانہ سنانے لگیں تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھئے نا محکمہ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کترا کر نکلتے ہیں۔

لہٰذا جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی۔ ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سے ایسی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے، کچھ احساسات کو پھسلایا، کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبہ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت دلچسپ اسباق کو حاصل ہے ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہیئے کہ بچے اس میں گلی ڈنڈے اور کبڈی کی رعنائیاں پا کر متوجہ ہو جائیں۔ ادب کا بھی کچھ یہی حال ہے کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجئے لوگ واہ وا کر کے نگل جائیں گے۔ رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کیوں، اب تک کل کی بات بنا ہوا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردے کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن "شریر بیوی" نے کونین کھلا کر اور "کولتار" نے عقلوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا، علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے صرف بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے اونگھ رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی"، ادب اور سماج، ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

ہیرو سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن "جامِ جم" کی سی حیثیت رکھتی ہے اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانہ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابلِ ذکر عورت تھی وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دل چسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا

شریف گھرانے کی عورت کہاں ملی ہوگی۔ اور وہ بھی مسلمان خاندان کی۔ اس وقت شریف بیویاں، گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولھے سے سر مار رہی ہوں گی، سڑی لسی بے ڈھنگی خادمائیں جن سے اکتا کر لوگ طوائفوں کی آغوش میں سکونِ دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے۔ یہ طوائف اتنی بازاری اور کاروباری قسم کی نہ تھی وہ بالکل شریف زادیوں کی طرح رہتی مگر شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی۔ ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغِ عام کی سی تھی جو عوام کے چندے سے عوام کی خوشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ باسلیقہ بیوی شان دار مکان میں پھولوں سے لدی اور عطر میں بسی ہوئی رکھ سکے۔ لہٰذا اس نے اس کا نہایت آسان علاج نکالا۔ گھر میں تو بیوی رکھی جو علاوہ نسل بڑھانے کے دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی رہی اور بازار میں طوائف جو جذباتِ لطیفہ کی پال پوس کرتی رہی۔ یہ بڑا کارآمد انتظام ثابت ہوا، گھر بھی رہا رنگینیاں بھی۔

مگر طوائف کی سوکن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں۔ اگر میاں سکونِ روح کے لئے طوائف کے یہاں گئے تو وہ بھی محلہ ٹولہ میں آنکھ لڑانے لگی۔ مجبوراً وہ شوہر جنہیں "باغِ عام" کی سیر ذرا مہنگی پڑتی تھی واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے۔ سوچا کہ چولہے کی ہانڈی سے تو اپنی "دال روٹی" ہی بہتر ہے۔ عورت بھی کچھ شیر ہو گئی اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے۔ آہنسا کی پالیسی کے ماتحت طوائف کے در سے بھیک مانگ کر عزت اور توجہ حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار کی فتح مند طوائف کو شکست دے کر پریم چند کی گرہستن نے پر گھونگھٹ کاڑھے، قدم قدم پر پیر چومتی، ماتھے ٹیکتی، ادب میں رینگنے لگی۔ باغِ عام کے سیلانی اپنے ہی گملے میں چھوئی موئی کا گلہ پھوٹتے دیکھ کر کچھ متحیر کچھ معزز اس کی سینچائی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر تھی ہی مگر یہ نیچی میٹھی معصوم سی بے ضرر چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ طوائف کا پلڑا اچک گیا۔ اس کی خوبیاں عیب ہو گئیں۔ وہی ناز و ادا جس کی تلاش میں ناکیں رگڑنے جاتے تھے، رنڈی کے چونچلے بن گئے۔ چوراہے کے نل کو گندہ کہہ کر لوگوں نے اپنے ہی گھروں میں کنوئیں کھودنا شروع کر دیے۔ مگر یہ کنوئیں روز بروز گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ کنارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ڈوبنا پڑا۔ طوائف بہت جھلائی بہت بگڑی مگر تاج سدا ایک کے سر نہیں رہتا۔ ناعاقبت اندیش نے پھل تو کچے پکے خوب کھائے مگر نئی پود نہیں لگائی اور ادھر معصوم گھونگھٹ والی نے نئی پود بھی لگائی اور پرانوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میٹ کر گرہستن نے دنیا بنانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چڑھ گئی۔ وہی ایڑی تلے کچلنے والے مرد اس کی حمایت میں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہراہ پر پٹخ دئے۔ وہ خود غیر جانبدار رہی نہ کسی سے لڑی نہ بھڑی۔ آہنسا کی قائل مگر جیسے گاندھی جی برت رکھ رکھ کر گورنمنٹ کو بوکھلائے دیتے ہیں بالکل اسی طرح جھکی جھکی آنکھوں سے نقاب کے پیچھے سے حشر برپا کرنے لگی۔ لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ طوائف کے بعد نفیس ایل میم یا پارسن نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا گھیرے رکھا ادب کی اس قسم کی ہیروئن نے ہر کہانی اور ہر قصہ میں گھسنا شروع کیا۔ مگر وہ جس نے طوائف کو مار بھگایا اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ مرد مجبوراً اسے گھر میں بند کر کے اکیلا باہر جاتا ہے مگر وہاں وہ اکیلا رہ نہیں سکتا۔ وہ سیدھے ہاتھ میں چھڑی اور الٹے ہاتھ میں عورت چاہتا ہے۔ تقویتِ دل و دماغ کے لئے گھر میں رکھی ہوئی معجون دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا وقتی گزارے کے لئے اس نے دفتر میں دور بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ، کبھی کبھی نظر آجانے والی نیچر کی حسین لڑکی اور ایسی ہی اکا دکا ہیروئن ڈھونڈ کر جسم تاپنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب میں "گودڑ کا لعل"، "روشنک بیگم"، "زہرہ بیگم" کی ہیروئن کو دیکھ کر ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابر جاری رہی اور جیت آخر میں اسی کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ــــ اس نے تو بالکل ہی طوقِ گلو بننے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اور بڑھی۔ پہلے تو گھر کی چار دیواری میں رشتہ کے بھائیوں ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کے اندر کشتیاں پچھاڑنی شروع کر دیں۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ یہ چھپے ڈھکے جلوے اور بھی زیادہ گدگدانے لگے طوائفوں کے نخرے

پرانے اور پریم چند کی آہنسا کی قائل مقدس چیلی، بے وقوف اور بزدل نظر آنے لگی۔ اس کے گیگلے پن سے جان جل گئی۔ جتنا بھی وہ ناک رگڑتی گئی، اس سے نفرت ہوتی گئی۔ یہاں تو اب صرف وہ ہیروئن پر جچا سکتی تھی۔ جو منہ کا نوالہ اچک لے۔ بھڑوں کا چھتہ منہ پر اوندھا دے۔ بجائے میٹھی میٹھی لفظوں کے کونین میں بجھے ہوئے تیروں سے کام دوہن کی تواضع کرے۔ پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر ذرا ذرا سی بات پر تھپڑ اور چانٹوں سے گال سینک دے۔ تنخواہ کم، گذر مشکل، لیکن اگر ایسی شوخ شاطرہ بیوی ہو جو سارے دکھ درد چٹکیوں میں اڑا دے تو پھر کون جنت کی آرزو میں مرے۔

مرد، عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جنت میں بھی رہنے کو تیار نہ ہو سکا۔ حضرت آدم نے بیٹھے بٹھائے پسلی چیر کر اس فتنے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا۔ خواہ بیوی ہو یا رنڈی جو لگام پکڑ لے ہنکے چلے جائیں گے۔ جتنے کوڑے زیادہ پڑیں گے چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے دل کے ساتھ ساتھ وہ قول و فعل کی بھی چوکیدار بن بیٹھی اور دماغ کی پاسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی۔ جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے۔ چھتری، ٹوپی اور برساتی کوٹ کی طرح ساتھ ٹنگ کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ مرد چیخ اٹھا۔ سب سے پہلے پطرس تبولے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر دہائی دینے لگے۔ ادھر چچا چھکن، منشی جی، مرزا جی اور ہزاروں جی بھی پکار اٹھے:-

"یہ زیادتی ہے بیگم! ہمیں ہنساؤ مگر نہ اتنا کہ پیٹ میں درد اٹھنے لگے"۔

ادھر ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی اس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ ذرا دبی ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ یہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے لہٰذا محلہ ٹولہ کی سلائی سے شروع کر کے اقتصادی بازار کے ہر کونے میں رینگنے لگی اس نئے روپ نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ ویسے اگر عورت بھیس بدل کر آئے تو خود اس کا میاں اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ جب کمانے نکلی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آ گیا ہے۔ عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ تماجی ہکا بکا منہ پھاڑے رہ گئے۔ عورت ڈاکٹرن گئی۔ حکیم جی مارے حیرت کے پلکیں جھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالف کو بوکھلاہٹ کے مارے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ "ہٹو! بچو! عورت آ رہی ہے۔" لوگ گھبرا کر الٹ گئے اور دھڑا دھڑ میدان مارنے لگے۔ اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا وہ دل کی دنیا کو کیوں نہ تاراج کرتی۔ لہٰذا ہر طرف تباہی مچا دی۔

تو ـــ یہ تھا ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند، بالکل لیڈروں کی طرح چاروں طرف ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہو گئی خیر کونین کھلاتی تھی تھپڑ لگاتی تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے۔ چوکیداری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر ٹسوے بہانے لگتی تھی۔ ہمزاد بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا؟ تھی تو اپنی دست نگر! اپنی بلی بھی کبھی پنجہ مار بیٹھتی ہے مگر خر خر کر کے پھر اپنا نرم گرم جسم پیروں سے رگڑ کر منا بھی تو لیتی ہے فیشن بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے تو کیا۔ ہے تو اپنی۔ ہمیں سے تو مانگ کر اڑاتی ہے۔ ہماری ہی جیبوں سے تو کھٹلا کھٹلا کر پیسہ نکالتی ہے لیکن یہ بالکل مردانہ وار اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کہہ کر کھسوٹ لے جاتی ہے یہ تو سراسر ڈاکہ زنی ہے ـــ صاف دھوکہ!

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی یہ ہیروئن ڈائن بن گئی۔ بہت سمجھایا، صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خود سر اور خود مختار عورتوں کا بڑا بد انجام ہوتا ہے حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جہنم میں جھونکتی ہے۔ دفتر میں کلرک بہکائے جاتے ہیں۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگا دیتے ہیں۔ اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی "اسکول میں ہر لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے۔" شرم دلائی "بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو۔ ڈوب نہیں مرتے۔" یہ ماسٹر دیکھنے میں کٹھائی جیسے چرخ مگر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پرسوز عشق اور عبرت ناک انجام سے پُر نظر آئے گی۔

یقیناً یہ ادب کبھی اپنا اثر دکھاتا اور ہیروئن واپس پتی کے چرنوں میں سرنگوں ڈھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں نہ جانے کیوں لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہو گئی۔ اگر ایک گریجایٹ بیس روپیہ کماتا تو لڑکی ایک سو بیس مار لیتی۔ جوں جوں تعلیم نسواں کارآمد ہوتی گئی۔ تعلیم مرداں فضول اور بے کار بنتی گئی۔ ہیروئن نے پیر مضبوط جما دیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کش مکش شروع ہو گئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑھی مگر اس تیزی سے نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی عنقا سمجھی جاتی تھی۔ اب گلی گلی گریجوایٹ اُگ آئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لئے کم از کم "آئی۔ سی۔ ایس" یا "پی۔ سی۔ ایس" تو ہو۔ کاش گورنمنٹ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا تقرر کرتی۔ تو یہ مصیبت کیوں نازل ہوتی۔ یہ گنے چنے افسر تو اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی۔ وہی لے اڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجوایٹ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گورنمنٹ آفیسر برسیں اور وہ سمیٹ لیں۔ مختلف شعبوں میں نوکر ہو گئیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ افسروں کی تعداد کم ہی تو کلرک بدقسمت اسکول ماسٹر ناکام اور اجڑے ہوئے ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے وہ تو اور بھی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چاروں کے پاس دو راستے رہ گئے یا تو جاہل لڑکیوں سے نصیبہ پھوڑ لیں یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیّلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گذار دیں۔ جنھوں نے دل پر پتھر رکھ کر سر پھیوڑ لیا ان کی روحیں بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکا کیں۔ زندگی بھر ہم خیال و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں کچوکے مارتا رہا اور جو زیادہ ہمت والے تھے وہ پاس پڑوس کی کبھی کبھی نظر آجانے والی اپ ٹو ڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگنے لگے۔ آخر الذکر تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اور مرد پیدا ہوتے گئے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ "موزوں رشتہ" کے لئے! بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑے کے گھڑے پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہوں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار موریوں میں لنڈھائے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھر جاتے ہیں سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہرے دار بٹھا دیئے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ گئیں ادھر لڑکے حیوان بنتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی، منلوج اور غیر انسانی بنتی گئی۔ اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی ڈھکی غلاظتوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس نے جو پہلا کام کیا وہ تخریب تھا۔ بوڑھے گھنے ہوئے پیڑ کا تنا اکھاڑے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے پرانے مکان کو ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری تھی۔ گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔ گرہست ہیروئن کے راج میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ناقدری اور پھٹکار نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ دیوالیہ ہو کر نکاح کر بیٹھی تھیں۔ کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹوا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا۔ اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھیننے کے لئے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ آج اس نے اسی پھینکے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی گرہستن نے اس ہتھکنڈے اور ناز و سنگار چھینے تھے آج اس نے گرہستن کی بے چارگی اور بے کسی کی آڑ لی اور سوائے بالکل نچلے طبقہ کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا اور جب یہ باغی طبقہ طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالتِ زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی۔ بلکہ بھوکی کمینی بلی بن گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگہ والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعروں میں پرو ڈالا قصیدوں میں گوندھ کر، ناولوں میں سجا کر ادب کو اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کہ لوٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کوئیوں کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی۔ اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں لٹکائے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے ہیں مگر یہ اندھا کنواں دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا چنانچہ باغی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ پڑا۔ پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بیچ بجا اٹھا تھا۔ غریب مگر خوددار جوان اس طبقے کی حفاظت کو اٹھ کھڑا ہوا جو اس کی تھی۔ اس کے کام آسکتی تھی۔ اسے سارا حسن اور تمام لطافتیں اس ٹھیائی اور فقیرنی میں نظر آئیں جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھیں۔ مگر جو اسے مل سکتی تھی۔ ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی۔ اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی۔ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ صرف نک چڑھی، خودغرض اور جھوٹی مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گالی اور عشق کو گھناؤنا سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا ہتک سمجھتی ہے اور مرد کی حفاظت اپنی توہین۔ اس میں عام طوائف جیسی گندی بھیانک جاذبیت کہاں؟ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے اس کی گندگی اور غلاظت گھن کھانے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی۔ طوائف گندی اور بیمار، کمینی اور جعلساز ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی یوں بے قدری کرتا ہے۔ نئے ادیبوں نے طوائفوں کا حال لکھ کر بے شک ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر بڑا اثر ڈالا مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے تھوڑے بہت دکھ مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف کیسی بھی ذلیل ہو، ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے اسے سڑا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے وہ جو دنیا کے ہر دکھیارے کا سہارا، ہر بھوکے کا دسترخوان ہے، وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے کچھ زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کا نوجوان گرہستن سے زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے اسے کیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہو رہی یا بیوائیں بن بیاہی سوکھ رہی ہیں یا میاں بیویوں کی ناکیں کاٹے ڈال رہے ہیں اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت نٹے یا رہے۔ دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال لڑائی کی وجہ سے وکٹوریہ گارڈن میں عمدہ بیج نہ بوئے جا سکے اس لئے اس سال تختۂ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونی چاہیئے۔

> اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں اور مکروہ کہے، زمانے نے اسے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

یہ تو ہوئی ہیروئن سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین، جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عیش کرنے کے کسی بات کی فکر نہیں —— میں نے غلط کہا۔ ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فارغ البالی کا۔ پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت، اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ۔ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو —— یہ ہنس گئے اور ہنسا گئے۔ چمڑی میں مگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادھو کی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے آنے جانے والوں سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونرول کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں۔ مس حجاب کی بے وقوف، کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہیوں سے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا —— جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے الو بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے عاجز آ کر اونگھنے کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی، عصمت کی بے چین منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی، ستیارتھی کی خانہ بدوش، عسکری کی فلسفی میم صاحب —— یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا، کچھ تعمیر کرنے کے لئے جدوجہد کا، کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے

لئے۔ دین و دنیا کو تلپٹ کر دینے کا، جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے۔ یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جاتا ہے آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہو گی نہ مظلوم بلکہ صرف ایک عورت ہو گی۔ اور ماہر من دیزدال کے بجائے ادیب اسے عورت کا رتبہ ہی بخشیں گے۔ اور پھر تعمیر شروع ہو گی۔

(ایک بات)

---

custom to re-marry should live in misery, if jealous husbands should chop off their wives' noses. It would matter little to him if all respectable women were widowed or if the whole of their tribe was wiped out. It is the drain in his own neighbourhood that he wants cleaned up. Whether the flowers in other people's gardens bloom or not is a matter of complete indifference to him, for in any case he has no access to such well-kept places. The heroine of present-day fiction may be an unclean outcaste. Nonetheless she has been shaped and moulded by the vicissitudes of life itself and it is good that she has at last caught the artist's eye.

Faked Romance

Well, such is the story of our heroine. We have seen her as Sarshar's alluring courtesan, who ate and drank and was merry without a care in the world, except the worries of love-making. That was in the age of grace and good living. Next, we met her as "Prem Chand's" obedient housewife and Raashid-ul-Khairi's pathetic, downtrodden widow. That was in the age of economic stress and social reform. Next came the humorists, full of fun and laughter, complacent and static. And then the period of drowsiness, in which the sadhu's young daughter of M. M. Aslam's stories wandered dreamily on the banks of brooks, singing among the butterflies and dallying with the passers-by ; and Hijab's stupid, indolent and futile maidens swooned away at the sight of a mouse and lived in a world of faked beauty and faked romance. And now, in our own day, we see our heroine as the living woman in Krishna Chandra's stories, as the business like woman in Bedi, as the lively, impudicious, common harlot in Manto, as the restless, outspoken unblushing girl in Ismet, as the nomad in Satyarthi and as the philosophising mem-sahib in Askari-- all pointing to the fact that ours is the age of conflict ; of the struggle to live; to shape and to build ; to destroy, in order to create ; an age, in which everything between heaven and earth must be evaluated anew.

In fiction, woman is invested with a power greater than all other forces of nature, second only, if at all, to the Almighty. We must wait and see what role is assigned to her in the days to come. As far as one can peep into the future, the heroine of the coming age will be neither tyrant nor martyr, neither goddess nor hell-hag. She will be just a woman and writers will proclaim her as such. When that happens, the foundation of our fiction will have been well and truly laid.

had once borrowed her allurement and charm, she now adopted the submissive ways of the homely woman. So much so that unless she was the lowest of the low, it was difficult to recognise her as the prostitute. When the rebels at last sought her out, they were shocked to find her sunk so low that only the beggars, the coolies and the tonga-drivers knew where she lived. She was no longer the sweet little songstress of Sarshar's novels, but only a mangy and mean-looking cat rummaging about in the refuse heap. In the days gone-by, when man depended on her for his moments of supreme joy, how he had extolled her in prose and poetry, how fiction had paid homage to her charm and beauty! And how man had cast her aside now! Having installed a water-pump in his house, he had let the wells of sweet water fall into disuse, till they were infested with reptiles and vermin. Panting with thirst, with his tongue hanging out of his mouth, he now returned in his desperation to the same wells.

Young Crusaders

Not only did he return, but he demanded that the municipality should clean them up and keep them in good repair. For, such a lot had to be done before the prostitute could once more become useful to him. So the rebels vehemently took up her cause and exposed this festering sore to the gaze of the world. Impecunious but spirited young men crusaded for her, for she, whom no one else seemed to want, could be a great source of comfort to them. They discovered all the beauties of the world in this wretched, down-and-out, fly-blow street-walker who lived in such filth and squalor because she was about the only kind of woman they could consort with. The respectable woman had so far receded from their life that they hardly knew anything about her and cared even less. To them she was just a snooty, selfish sham of a woman who was outraged at every offer of love and indignant at the suggestion of male protection. She lacked the squalid fascination of the harlot—not this time the demi-mondaine who scintillated in the highest social circles, but the hungry, street-bitch who tugged at every passer-by's leg and gave herself to every one for a handful of coppers. Her squalor, they argued, was not something to be shunned but a wrong to be redressed. If she had no morals or scruples, if she was filthy and disease-ridden, the fault was not hers but of the social system which permitted human beings to sink so low. The new writers, by dwelling on this theme, did a great deal of muck-raking which offended the fastidious, but they helped, nevertheless, by their frankness to lighten the burden of human misery. However disgusting the prostitute, she is after all part of our life and one cannot ignore her simply because she is unpleasant to contemplate. Because she is the common refuge of many frustrated and hungry men, because she is there for any one to have, the world denies her the status and dignity of woman. But she is even more useful than an ordinary woman. That is why the young crusader of to-day is more solicitous about her well-being than about the welfare of the woman-in-the-home whom he finds so aloof and remote. It is of no concern to him if women's education should not make much headway, if thousands of widows forbidden by

New Problem

In time, the supply outstripped the demand. There was a time when you had to go far to find a girl who had passed her school, now you found a whole crop of women graduates jostling with each other in the marriage market. This created a new problem. How could an educated woman marry any one who was not, at least, a civil servant? But Government unfortunately had forgotten to arrange that the number of its civil servants should keep pace with the number of educated women waiting to marry them. There was, therefore, a regular scramble for each eligible young man that appeared on the horizon and after he had been grabbed by the highest bidder, the rest of the crowd of women graduates returned to their perches and lay in wait for the next taking up various jobs in the meantime.

In the world of men, on the other hand, although civil servants were few and far between, ill-paid school teachers and penniless doctors were rapidly growing in number. These unfortunate men had only two courses open to them : to marry some uncouth simpleton and be miserable for ever, or pine away, dreaming of a life of eternal bliss with this or that woman of education, refinement and charm. Some did both. They married as the fates ordained and at the same time continued to torture themselves with dreams of the ideal soul-mate. Most of them, of course, just fell in love with the chic young lady in the neighbourhood, who though utterly unapproachable was at least occasionally visible in the flesh.

So our world filled more and more with men and women whom nature had made for each other but whom the match-maker could not "suitably" pair off. It was a scene of poverty in plenty : warehouses full of cloth and the streets full of naked people ; food overflowing into the gutter and people starving by the thousand; all the men imprisoned in one cage, all the women in the other, and Mrs. Grundy standing guard in the middle. Young women languished and became faded old maids ; young men became sex-obsessed brutes; and the pangs of hunger dehumanized both and warped their souls.

At last the pent up forces found an outlet. These stresses and strains threw up a band of rebels, who set out to destroy, to uproot the old tree and plant a new one in its place, to demolish in order to build afresh. They first crossed swords with Mrs. Grundy. She would not be easily bound and gagged. But what finally defeated their efforts was the impassable economic barrier that stood between them and the women of their choice. Thwarted and frustrated, man once more returned to the courtesan's bosom.

But the great courtesan of the early days was now just a common harlot. Gone was her glamour, for during the reign of the domestic heroine, she had been robbed of all her glory, and poverty and neglect had put their hideous stamp on her face. Some had sought refuge in marriage, some still plied their trade in the gutter, others camouflaged themselves as respectable women. Years ago, the woman-in-the-home had thrown aside her veil to win back her man from the courtesan. The bankrupt courtesan now picked up this discarded symbol of modesty and tried to disguise herself in it. Just as the respectable woman

Unperturbed, the woman not only kept her hold, but set about tightening it, if she could. She discovered, for example, that her economic dependence on man was a bad chink in her armour which she must close up. She started in a small way, by taking in the neighbours' needlework, but very soon was found crawling about in every corner of the career market. The novelty of this role added to her charms. Let woman but appear in a new guise and even the husband would fall in love with her. She became a school-teacher and the old mullas gaped at her in wonder. She became a doctor and ancient apothecaries could hardly believe their eyes. She pleaded in law courts and men in the profession stammered and spluttered in her presence. The advent of the career woman was like a grand circus come to town: every one leaned out to watch and stare. Men shouted: "Look out, for there comes the New Woman", and fled in confusion. She advanced steadily and conquered new fields. The more she cut into men's wages, the more she captured their hearts.

This was too much of a good thing. This wage-earning heroine, physically fit and mentally alert, waylaid man like a brigand, So long as she was just saucy and pert and boisterous, she was rather delightful. Even if she was spoiled and moddlesome and difficult to shake off and somewhat of a nuisance, as long as she depended on man for her bread and butter, she was quite acceptable. Now and then, perhaps, she put out her claws but in the end she always made up for it by rubbing her soft body against his legs and putting him into good humour again. Vain and extravagant, she was nevertheless man's property, proud to live on his charity and willing to pamper him to earn her keep. For her, now, to fight man as his equal in the economic field and to cheat him of his last superiority over her was sheer highway robbery !

In fact, she became quite a terror and writers felt called upon to point out the error of her ways. They told her that independent women always came to grief ; they were ravished, had illegitimate children, were seduced by clerks and doctors and school-teachers with whom they came into contact, were shunned and despised by society. They put husbands and fathers to shame for living on the earnings of their wives and daughters. They warned parents that in the schools and colleges, their daughters would learn nothing but lovemaking and would end up as unmarried mothers, for these weedy-looking school-masters were all gay Lotharios in disguise. Every other story written during this period is at pains to show how the school-girl and her teacher succumb to temptation, have a passionate affair and come to a pitiful end.

Deterred by this type of fiction, the heroine might have returned to her husband like a penitent who had learnt her lesson, but for some reason, just about this time women began to fetch higher salaries than men, which enabled our heroine to consolidate her newly acquired position. As education paid higher and higher dividends to women, it became less and less profitable to men.

Her success at first was partial, for though the courtesan had retreated, the field was held for a while by the Occidental and the Parsee, both of whom were regarded as "fashionable" types and had worked their way into many of our stories. But she, who had vanquished the courtesan, was not likely to be daunted by these. She knew, of course that as long as she stayed at home, there were dangers abroad that she was unable to avert. Confined to the four walls of the house, how could she dispel the loneliness that man would feel away from home? For, when on his jaunts, he rather fancied a woman in one hand as much as he fancied a walking-stick in the other. She was the tonic for domestic use only; how could she sustain him during his business hours, for axample? True enough, as a temporary expedient, man did cast hungry looks on the typist girl, or the manager's beautiful daughter, or found others to warm his blood. But the domestic heroines of such novels of the period as *Godari ka Lall*, *Raushanak Begum* and *Zohra Begum* kept up the fight and very much held their own against such pirates.

The role of the docile, homely woman does not, however, seem to have satisfied her for long; for, in the next phase of her career, we find her very much bolder than she had ever been before, archly flirting with her cousins, with her cousins' friends and with the neighbours. She was now transformed into the saucy, boisterous, unabashed, self-assertive famale that we find, for example, in Azim Beg's stories. The fact that she was still very much the woman-in-the-home living in purdah, added piquancy to the situation and made her sportiveness even more devastating. Beside her fetching ways, the erstwhile charms of the courtesan appeared commonplace, and "Prem Chand's" submissive and goody-goody heroines, insipid and irritatingly inane and their humility almost contemptible. The docile heroine now gave place to a much more robust and hearty female. True, she was unlettered, with no claim to grace or refinement, but she was full of crude vitality and primitive fun. She slapped and kicked and punched and played practical jokes and was up to all sorts of pranks. To the man with the modest income, such a vivacious wife was a great source of joy, brightening up his little home and lending colour to his dreary existence. Life for him had, indeed, become heavenly.

Willing Victim

The male, it is true, is ever the willing victim of the female. After all it was he, who finding even Paradise desolate without her, made her out of his rib. How gladly he hands over the reins to her, be she courtesan or wife, and follows her around. The harder he is driven and the more he is pulled about and whipped, the happier he feels. But once in a while, the limit is reached and the woman turns. It was all very well for our domestic heroine to be the queen of his heart, but when she entwined herself round him and began to bully and dominate and tantalize him and stood guard over his every word and act, man was exasperated. The first groan was at last heard in "Patras," and, later, Azim Beg and Shaukat Thanvi and many others joined the chorus. Before long, our fiction was crowded with male characters like Chacha Chhakkan, Munshiji, Mirzaji, etc, all of whom raised their voice in protest against woman's tyranny.

in those days were household drudges. They were the unappetising housewives and dowdy maids-of-all-work, from whom men turned to courtesans for heartsease and pleasure. The courtesan of Sarshar's days was not just a vulgar mercenary. She lived as graciously as any blue-blooded lady, except that she was even more refined and possessed greater wit and charm and gaiety. She was the town-garden, maintained by public donations for the pleasure of the community. Not every one could afford a fine house, adorned by an accomplished and elegant wife, flower-decked and attar-perfumed. So man adopted a convenient formula for smooth living—in the home, the wife to bear him children and to minister to his daily needs; in the street, the courtesan to appease the hunger of the soul. A most useful compromise indeed, that could thus accommodate both the domestic ideal and the romantic urge.

Jealous of the courtesan, the woman-in-the home grew restive. When man was away from home seeking joy in the arms of the courtesan, she made eyes at the neighbours. Those husbands who had already found the public garden an expensive resort, promptly returned home, arguing that after all the little that belonged to you was better than the much that belonged to all. Having won the first round, the woman-in-the-home gained a new confidence and proceeded to fight the courtesan with her own weapons.

Woman Stoops to Conquer

She proceeded slowly and with caution. At first, she stooped to conquer and insinuated herself into man's affection by following the path of docility and self-abasement. In time, Sarshar's imperious courtesan was vanquished by "Prem Chand's" homely woman, and henceforth this soft-treading, feet-kissing, modestly-veiled, obeisant creature was found crawling shyly across the pages of fiction. Those who used to feast their senses on the riot of colour in the public park, were suddenly attracted by the modest little violet growing in their back garden. Surprised, and somewhat proud, to find it there, they began to tend it with gentle care and affection. The courtesan's sway was seriously challenged. Her blandishments were now found to be distasteful and her charms, which had once enslaved the hearts of men, were put down as mere tricks of the trade. The water-pump in the public square was contaminated, declared the male—and began to dig a well in his own courtyard. But every day, the well became deeper and deeper, till at last man lost his foot-hold and began to drown.

This stung the courtesan to exasperated fury. But her day of glory had passed. While she had been resting on her laurels, the modest, ingenuous, homely female had stolen a march over her by using weapons both old and new. On the ruins of the courtesan's world, the woman-in-the-home built her tower of victory and reigned supreme. Men who used to crush her under foot, now took up cudgels on her behalf. Chivalrously, they pilloried themselves and railed against their own kind for their past neglect of her. She watched this tournament with quiet confidence and took no sides. The docile believer in ahimsa fought no one, but just as Gandhiji exasperated the rulers by his acts of renunciation, she, with her downcast eyes and submissive ways, confounded the enemy from behind the veil.

"YOU clap with two hands, not with one." says the proverb. In literature, the two "hands" are the hero and heroine of fiction. No doubt there is a type of literature which does without them. But that is like striking your hand against the sole of your foot—you make some noise which echoes within the pages of the book, but seldom travels beyond them to the common reader. Banish the hero and the heroine and most literature would be hard to swallow and would stick in the throat like dry bran.

Make a performing monkey and his mate dance to the rattle of a dugdugi and you collect a crowd. Preach and exhort and you lack an audience. People never take kindly to the mosque and the school. So when you have something to say, you lead forth the performing monkey and his mate on a string and rattle the dugdugi. You exhibit the tactics and exploits of the hero and the heroine and collect a crowd. You tickle the senses and seduce the emotions and thus achieve your end. In short, you employ the same stratagem as the wise instructor who wins over his pupil by pretending that what he is about to teach them is just another game, like kabaddi or tip-cat. Sugar-coat the bitterest pill and people will swallow it with delight.

Literature Wedded to Life

How else should the ancient *Mahabharata* and *Ramayana* be as fresh after all these centuries as though it all happened only the other day? Azim Beg Chughtai tried to abolish the purdah by quoting from the Quran and only drew the imprecations of the maulvis on his head. But in *Sharir Bivi* and *Coal-tar* how easily was the veil rent with the help of his lively heroines! Were it not for their heroes and heroines, Raashid-ul-Khairi and "Prem Chand" would now be rotting on the musty shelves of libraries instead of living in the hearts of men. Literature is wedded to society, to history; in other words, to life. Part them asunder and they both wilt and die. Banish the hero and the heroine from literature and you banish life, leaving a void behind.

Of the two, I wish to talk of the heroine and of the social level at which our fiction found her from time to time. For, she is like Jamshed's wine-bowl in which the whole universe and all eternity were reflected. Fix our gaze on her and the entire economic, social and political panorama of her age unfolds before our eyes.

Look, for instance, at the heroines in *Fasana-i-Azad*. They leave you in no doubt that the woman who really mattered in that age was that embodiment of refinement and charm, the courtesan. This is only to be expected, for where could Sarshar have come across a respectable woman in those days, above all a respectable Muslim woman? Respectable women

THE HEROINE IN URDU FICTION

By
ISMET CHUGHTAI
Translated by
A. S. BOKHARI

As a writer of short stories in Urdu, Ismet Chughtai is well known for her studies of middle class life, her intimate knowledge of woman's mind and her pungent prose. This is one of her critical articles appearing in her latest collection "Ek Bat".

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر میلاطیس میں آباد تھا۔ یہ حکما مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی۔ اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل از سر نو شروع نہیں ہوتی۔ اور نہ کبھی دائمی اختتام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کس چیز کا ہے۔ وہ ایک چیز کیا ہے جو مختلف تبدیلیوں میں آ آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کونسا ایک مادہ بنیادی ہے جو متغیر ہو ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھیلیس نے پانی کو کائنات کا مادہ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد این اکسی مینڈر آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے۔ جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ این اکسی مینیز نے اس کو ابخرات سمجھا جو رقیق حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر میلاطیس کو تاراج کر دیا اور حکما کے اس گروہ کا اپنے مرز بوم میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں میلاطیس سے کچھ فاصلے پر شہر افیسس میں ایک فلاسفر ہرقلاطیس نامی موجود تھا جو میلاطیس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلاطیس کو دنیا کی سب باتیں قابل تاسف و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جس طرح سے کہ دی مقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلاطیس کے نزدیک کائنات کا مادہ بنیادی آگ ہے۔ وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اس ابدی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر الامر دھواں بن جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے تعلقی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اُس نے بہت زور دیا ہے، وہ خود مسئلۂ تغیر ہے۔ تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آبِ رواں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیا کی حالت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اُس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے ——————————— کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بظاہر ایک دریا ہر آن ایک نیا دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلۂ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطائیلس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطائیلس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے۔ اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قرطائیلس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈھے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم بھی ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہرقلاطیس اور اُس کے پیرو مسئلۂ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان معنوں میں قائلین مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُن کا حال اُن کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر یا تو ارسطوفانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا۔ تو پہلی دفعہ وہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اُس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطوفانیس، زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اس کے اپنے اُستاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے

بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطوفانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل ایتھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از مضرت رساں ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفون سقراط کو ایک کامل رہنما۔ روحانی مددگار پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک سچا نمونہ اور رائج تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو قوم کی اور گھرانوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو انہی دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اُس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں برقی رو کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اِس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی۔ لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی جن کو اُس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔

وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔ سقراط منطقی یا وہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اُس کو الہام ہوتا ہے۔ اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی نوع انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اُس کی آزاد زندگی اُن تمام بندشوں سے رہا تھی جن کی وجہ سے ایک دنیادار پابہ زنجیر ہوتا ہے۔ اُس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے عقائد کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوئے حیات ہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون کی طرح اور افلاطون اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کرا سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا۔ مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر اتنے متمول تھے جو اُس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اُس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بذاتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبطِ نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اُسے ہمیشہ اپنے مدنظر رکھنے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی۔ جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اُس کے مشہور جانبداروں میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا۔ اور زینوفون ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں داخل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

ہرقلاطیس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے ان کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہیے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" سمجھتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے۔ جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے وہی فعل بعض اور واقعات کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے۔ جس پرخطر زمانے میں ایسے بیہودہ خیالات سے راست رَو زندگیوں کے عقیدے متزلزل ہونے کو تھے۔ اور اخلاق انسانی ایسی کج بحثوں سے معرضِ خطر میں تھا۔ اُس وقت سقراط آگے بڑھا اور اس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس نے کہا۔ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے۔ کسی اور حالت میں برا ہو۔ اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے۔ مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔" مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے۔" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف ہوتے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے۔ پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا منصف بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں۔"

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف۔ بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور اُن کے معنوں کی تحلیل اُن کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہرقلاطیس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رُخِ تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوارِ ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق محسوسات کے زمرے سے باہر ہیں۔ جن اشیا کا احساس ہمیں اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُن موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی محمول ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذاتِ خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمِ محسوسات کے علاوہ جس میں اشیا ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ایک اور دنیا حقائقِ ابدی کی بھی ہے۔ اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالمِ متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقتِ ابدی ملحق ہے۔ اور جو رائے ہم عالمِ متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں۔ اُس میں اس حقیقتِ ابدی کا علم بھی مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے زمرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بڑی آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا۔ اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط ا ب خط ج د کے مساوی ہے۔ مساوات کے علم کو تسلیم کرتا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقتِ ابدی ہے۔ جس کا احساس حواسِ خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے۔ "مساوات" بذاتِ خود جو

کل بھی وہ آج بھی ہے۔ اور کل بھی رہے گی۔ گو کل ہمیں معلوم ہو جائے کہ خط اب۔ اور خط ج د درحقیقت آپس میں برابر نہیں۔

یہ مسئلہ حقائق ابدی افلاطون کی تعمیر فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہی ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا۔ یہ لفظ اب تک انگریزی نربان میں موجود ہے۔ مگر اس کے معنی اب ان معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے اس کو استعمال کیا۔

(۲)

بیکن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشعلِ حکمت ہر ایک شخص کی شمع سے روشن کر لیا کرتا تھا۔ افلاطون کی نسبت بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہرقلا طیس اور سقراط کے علاوہ اور بھی بہت سے قدما کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیداری اور گمراہ خیالات کو ہدایت بخشی۔ اس نے بہت سا اقتباس فیثا غورسیوں سے کیا جن کے ساتھ اس کے آقا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیثا غورس مسیح سے قریباً ساڑھے پانسو سال پہلے جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی حکما تدریس کیا کرتے تھے جو بعد میں اُن یونانی نو آبادیوں میں جا بسے۔ اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی "یونانِ اعظم" کے نام سے مشہور ہے۔

فیثا غورس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے کچھ عرصے کے لئے قرطانا کی حکومت پر غلبہ پا لیا۔ پیلا طیسی حکما نے اپنے فلسفے کو مذہب کے ساتھ تعلق دینے کا خیال نہیں کیا۔ دیوتا سے اُن کی مراد کوئی ذی شعور لائق عبادت ہستی نہ تھی بلکہ اس نقطہ سے اُن کا مطلب محض نظامِ مادی کا ایک بڑا عنصر تھا۔ فیثا غورسی مذہب نے اگرچہ ایک طرف اُن وحشیانہ توہمات اور رسوم کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کنارہ کش ہو چکے تھے۔ از سرِ نو رواج دے دیا۔ مگر دوسری طرف اپنے تناسخ اور عقیدۂ دوامِ روح سے عظمتِ فردیہ اور انسانی زندگی کی ذمہ داریوں کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اُس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کرا دی کہ انسانی ہستی قابلِ وقعت اور لائقِ حرمت ہے۔ اس کو سطحِ آب پر محض ایک حباب نہ سمجھنا چاہیئے۔ انسان ایک ایسی حقیقت رکھتا ہے جس کے لیے حسن آتش سوار یا پتنگ برق کی تمثیل کسی طرح سے شایاں نہیں ہو سکتی۔ پیلاطیسیوں کی طرح فیثا غورس علاوہ حکیم ہونے کے عالم بھی تھا۔ اب تک اس کو ہندسے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اور علمِ موسیقی میں پہننگ کا موجد بھی اسی کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثا غورسیوں کی شہرت نہ صرف بہ حیثیت عالی دماغ حکما کے تھی جو انسانی روح کے انتقالات پر غور و خوض کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کے ماہر بھی شمار کئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثا غورسی عقائد نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا۔ کہتے ہیں۔ اس کی درس گاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ فانی مادی حقائق کے ابدی حقائق کے موجود ہونے کا مسئلہ فیثا غورسی بھی اپنے عقیدے میں ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثا غورس کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جب طبیعات کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے بہتیرے مظاہرِ قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطابق دیا گیا تو اُس خیال کو اور بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائقِ ابدی میں علاوہ اعداد کے اور بھی کئی باتیں شامل ہیں مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر اس کے پیرووں کی یہ عادت تھی کہ وہ اُن حقائق کا ذکر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا فیثا غورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات

میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائقِ ابدی اور فیثاغورس کے عقیدۂ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائدِ روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائقِ ابدی کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی۔ تغیر پذیر۔ مادی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ عالمِ ادنیٰ یعنی موخر الذکر دنیا کے مختصات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے ———— یہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے۔ یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپردازی اُس کی یہ کیفیتِ نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقتِ ابدی کو سمجھتا ہے تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ روح بھی اُن حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقال لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی نہ زید۔ عمر۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوتی ہے۔ اور نہ صرف حقائقِ ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ ان اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے۔ جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف اُن نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر فلسفے سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق اُن غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو اُن کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علمِ حقائقِ ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے جہاں یہ ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے۔ جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہئے جس کی کوئی بات علمِ حقائقِ ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہئے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس خاص رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ غالباً یہ بات اُس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحتِ حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا۔ کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیرووں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی مکتی کا خیال نہیں کیا۔

فیثا غورثیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیاٹی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلاطیس سے بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلاطیس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے۔ اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقامِ ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب شروع سے کوئی خلا سے لاموجود فیہ ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدیس کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے خلاء لاموجود فیہ یعنی نیست کے محلِ وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا محلِ وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا ہے اور جس چیز کو تصور سے گریز ہو اس کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابلِ انتقال حقیقت ہے جس کی نوعیت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس یکرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہیئے۔ اور فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور وہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بیدردی سے پائمال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ عقاید کی رو سے ہر ایک حقیقتِ ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الموجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریب نمود نما سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدتِ حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرتِ حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالمِ حقائقِ ابدی اور عالمِ محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالمِ صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالمِ صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے۔ مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل خالی از حقیقت، عاری از وجود اور نیستِ محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امرِ واقعہ سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ عدمِ حرکت کو خلافِ قیاس سمجھتے تھے۔ فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلافِ قیاس نظریہ کی حمایت یہ کہہ کر چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین "اظہر من الشمس حقیقت الامر") یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے جتنی خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرۂ ٹرائے کا نامور جانباز اخلیس جو اپنی سرعتِ رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا

بڑا ہی آسان معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب فرض کرو کہ اقلیس کی رفتار کچھوے سے دس گُنا ہے اور کچھوے کو شروع سے سو گز کی رعایت دی گئی ہے۔ یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اقلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اقلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اقلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوا اقلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اقلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ۱/۱۰ گز آگے ہوگا، علیٰ ہذا القیاس ابدالآباد تک کچھوا اقلیس کے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو معمائے پرواز تیر کہتے ہیں۔ جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کیمرے کے روزن کو کھولا گیا ساکن تھا۔ اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس لئے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معموں نے ہمیں یہ ثابت کرو دکھانے میں بڑی مدد دی ہے کہ ساعت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ تصور کرنا چاہیئے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریقِ مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں، یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (DIALECTIC .....) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا۔ اور افلاطون تو اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقۂ تدلیل سمجھتا تھا۔ کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انقصا غورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم میلا طیسی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا مگر کچھ عرصہ تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر فرقلیس کے ساتھ بطور صلاح کار و رفیق کے رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جس کی کہ ہماری پائمال روندی ہوئی حقیر زمین تو (نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں (اور سقراط کے وقت میں بھی) جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادی خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی خصوصاً جبکہ انقصا غورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ اولین میلا طیسی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا، مگر ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیات میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انقصا غورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہما را نفس علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مختص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انقصا غورث کے اس طرح نفسِ انسانی کو بطور ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے سے سقراط کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا

اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انقصا غورث نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفریحات بحیثیت ہر ایک کے استعمالات کے کیونکر مقرر ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضاء اور قواء کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے۔ کہ یہ دنیا کسی بڑے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے۔ اور یہ عالم عالم شہود ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالم شہود ہے۔ اور مختلف حقائق ابدی ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اُن فواید پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے متجسس ادراک کی تشفی صرف اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب محل جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اُس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے اُن "سرپرستوں" کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کردہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا۔ تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن نوجوانوں میں سے جنھوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطاطالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے۔ یا ارسطاطالیسی۔ ان دو یونانی حکما کو بلحاظ اُن کے ادراک کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمایندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اُس کا توسن عقل و فہم اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا۔ جو تجربے مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزادانہ نہ تھی۔ وہ عرصہ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون پکا منطقی تھا اور ارسطو اسقدر مقید اور محتاط نہ تھا جسقدر اس کو سمجھا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک ممبر تھا۔ مگر وہاں کا طرز خیال اور طرز تعلیم اُس کو پسند نہ آیا۔ اور اُس نے اُس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقاید پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ جن سے اُسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جس میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا بہت کم زور دیتا ہے۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائقِ ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائقِ ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے۔ جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اس کے اوپر ہوگا۔ یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ لنہ نے سے ہم نوعی کی تعبیر کے لئے ایک اور نمونہ فرض کرنا پڑے گا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا کہ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو و کل یا اصل و نقل کے تعلق سے۔ ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا ناقابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائقِ مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق دماغِ انسانی قائل تھا۔ ورنہ علمِ طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہے۔ مختصاتِ ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصاتِ صفاتی (مثلاً عظمت، سفیدی، عقلمندی وغیرہ)۔ مختصاتِ صفاتی، مختصاتِ ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اور مختصاتِ ذاتی صرف کلام میں افرادِ موضوع سے علیحدہ شمار کی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و انفعال کے لئے روح کا محتاج ہے۔ روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیا ایک قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیا کی ترکیب عناصرِ اربعہ۔ خاک، آب، آتش، باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفدا قلیس نے جو چھٹی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ اٹنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تا کہ اس کے اس طرح ایک دم غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے۔ یہ عناصرِ اربعہ جو چار خواص بنیادی۔ حرارت۔ برودت۔ رطوبت۔ یبوست سے پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام بن جاتے ہیں۔ اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے۔ اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصرِ خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے۔ اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی

نوع کے اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ کو زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا۔ اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیا کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیا کی حرکت کو خود زا نہ سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیا کی حرکت کی علت ہمیشہ علاوہ ازیں حرکت ہوتی ہے۔ یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے ان کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ خود متحرک ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیاء کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ افضل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھینچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھینچ کر نہیں آتا۔ ایسی اکمل، اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ اکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری کامل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے ادنیٰ ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے۔ جس کی طرف ان ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ مزید یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی۔ علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوۃ۔ آں را علت مادی گویند بہ تشدید دال چوں نسبت چوب با سریر۔ واگر داخل بود بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشند یا مسدس۔ واگر خارج بود اگر آں سبب موجد اوست۔ آں را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ اگر ایجاد برائے آنست آں را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور مؤخر از ہمہ علت ہاست و در ذہن و تعقل از ہمہ مقدم...... علت غائی غایت و منتہائے جمیع علیتہائے اربعہ است........ وبدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ و تعالےٰ روا ندارد و چہ اگر حق تعالےٰ در خلقت اشیا محتاج بغرضے نیست۔" اگر بنظر دقیق دیکھا جائے تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال (علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت

رکھتی ہیں (مثلاً سنگ مرمر) کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" بن جائیں (مثلاً سنگ مرمر کا بت)۔ مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا (ارسطو کے خیال کے مطابق) شکل بغیر مادہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگر کسی شغل کو خدا کی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک شغل علم ہے۔ اسی لیے وہ انسان کے لیے اس کو اعلیٰ ترین اشتغال جانتا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ تحصیل علم سے ہی انسان اپنی سب سے اشرف قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگانِ زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی مسرتِ قلبی کا باعث ہو سکتی ہے چونکہ انسان ادراکِ محض نہیں بلکہ ادراک اور جبلت کا ایک معجون مرکب ہے۔ اس لیے یہ مسرتِ قلبی تمدنی اور معاشرتی فرائض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوانِ متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے ارفع زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد اشخاص کے مہذب فرقوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا اپنے علم اور یقین کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی آج تک ایسی مدنیت کے قابل ہوئی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین کا خاکہ کھینچا ہے۔ اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندرِ اعظم کی بادشاہت میں پرانی مدنی حکومتوں کے الحاق اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک مہذب حکومت وہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولتِ مشترکہ ہی ہو سکتی تھی جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور جو اتنی بڑی نہ ہو کہ اس کے تمام باشندے معاملاتِ جمہور میں ذاتی حصہ نہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کیلئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لیے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کو سپرد کر کے حکومت کیلئے وقت نکالنا چاہیئے۔ طریقۂ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمراں انتخاب کر لیتی ہیں جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دولِ مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہیئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تمول اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون تو کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افرادِ جمہور کی ملکیتِ مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند۔ اپنی بیوی۔ اپنا بچہ۔ اپنی ماں۔ اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ "ہرچہ از یار ماست از ماست" کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ وہ تو یہی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لیے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولتمند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ مالداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

"پطرس"

کہکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبالؒ

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا۔ وہ بطور ایک عالم متبحر اور تاریخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی اعلےٰ شاعری تک رسائی سے قاصر تھے، منبع فیض وجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا لیکن ادبی اور عمرانی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تر تھا۔ اس کی وفات سے جہاں مسلمانوں سے ایک فصیح اللسان پیغامبر اور ان کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا ہے وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی دراز مدت کے لئے اہمیت اور منزلِ مقصود چھن گئی۔

کم و بیش چالیس سال گذرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اگرچہ لوگوں میں مقبول تھی اور ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں، بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا مگر یہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، نرم و نازک، دل خوش کن، مزاحیہ یا ہجویہ، لیکن سراسر بے ربط۔ اسی لئے اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا۔ اور لوگوں کی زبان پر تعمیراتِ ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو پھر ڈھونڈ نکالا کر یہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلےٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حالی ایسا غزل گو عہدِ شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خوابِ غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس کے ولولۂ عمل سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذباتِ محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُر اثر اپیل ہے۔ جو کسی محبِ وطن کے قلم سے نکلی ہو۔ اور اس کا شہرہ آفاق گیت "ہندوستان ہمارا" میرے

خیال میں بہترین قومی گیت ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے غائر مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتا۔ وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصد عطا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت العلل کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

حجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گذر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ہم اس میں ایک خاص غمناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فن کار ایسا ہو جس کے قرون میں گھر کے لئے ادا سی بطور مرض کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بمنزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اثر اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقادات کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ گو اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو محض اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہیں کر دہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں" اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔ پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغؔ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ مانا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پہلو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے۔ اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو ترقی اور مختار صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف

تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور شیرینی بخشی جس کا راز انہوں نے عربی زبان کے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن پیچیدہ مضامین یا پُراثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے اور شاعر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیشرو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لیے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ از صوفی ریاض حسین)

ویلٹن صاحب اور مَیں

نتھیا گلی شمال مغربی سرحدی صوبے کا کوہستانی دارالخلافہ ہزارے کی سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے ایک نہایت معمولی پہاڑی مقام ہے۔ اور سب سے زیادہ یہی وجہ ہے کہ میں نتھیا گلی کا گرویدہ ہوں۔ وہاں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کے جنون تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے علمبردار آسماں بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ ندی نالے اپنے قدرتی آبریزوں میں اچھلتے کودتے بہ رہے ہیں۔ وہاں کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کشمکش حیات انسانی کے وہ روح فرسا مناظر جو بڑے بڑے شہروں میں بہت عام ہوتے ہیں، وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ تمدن کی فضا کو متاثر نہیں کی رنگ آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لئے کثیف اور میرے حساس دل کے لئے زہر آلود بنا رکھا ہے۔ مری جسامت کے لحاظ سے تو نہیں لیکن نوعاً بعینہٖ شملہ ہے۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اسے شملہ پر ترجیح دوں۔ ایبٹ آباد میں میرے آشناؤں کی کثرت میری تنہائی پسند طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گزشتہ گرمیوں کے موسم میں اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جبر مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ویلٹن صاحب جن کو میں دوست کہنا تھوڑی سی لاف زنی اور دوست کے علاوہ کسی اور نام سے پکارنا غلط بیانی سمجھتا ہوں۔ گزشتہ موسم گرما میں باندہ گلی مقیم تھے اور انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ باندہ گلی نتھیا گلی سے پانچ ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے جس میں ایک ہوٹل بخصیل، خزانہ، کچہری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ویلٹن صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار بمشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر کھڈ کی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانہ سے شاید اس کی عمارت "دربکاریت" سے مرعوب ہو کر ذرا فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار ہی سے ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم مایہ دکانوں اور بیکار ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہفتے کے دن دو بجے کے قریب میں اس برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو

رہی تھی۔ اور میں اس کی روح افزا کیفیت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لطیف سحاب پارے اوپر نیچے دائیں بائیں تگ و تاز میں مصروف تھے۔ بارش کے چلمن میں سے میں سامنے کی دکانوں کو دیکھ رہا تھا جن کے مالک اس شدید بارش میں خریداروں سے مایوس بیٹھے تھے۔ بارش کے مسلسل شور سے میرے دماغ میں ایک عجیب نیند سی چھا گئی اور میں خواب بیداری میں ویلیٹی صاحب اور اپنے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا۔ وہ عیسائی میں مسلمان۔ وہ انگریز میں ہندوستانی، ان کی زندگی آزاد اور خود مختار میں نئی نئی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روزگار کا متلاشی۔ ہمیں جاننے والی دنیا حیران تھی اور میں خود بھی حیران تھا کہ باوجود اس نادر تفاوت کے ان کی میری کیونکر نبھتی ہے۔ پانچ سال کی باہمی آشنائی نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت مانوس کر دیا تھا۔ مجھے اپنی نسبت تو یقین ہے کہ انھوں نے مجھے کسی عجیب طریقے سے مسحور کر رکھا ہے۔ اس قدر کہ بعض اوقات ان کے متعلق میرے جذبات میں صاف نسوانیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کی نسبت میں یہ کہوں گا کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ ان کا مجھے شرف بخشنا میری کسی صفت کی بدولت ہے یا محض ان کی فیاض دلی کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ لیکن کبھی تو میں ان کے سامنے اس طرح سہم جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے۔ اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن میں برسوں کھیلتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ میرے بائیں ہاتھ میں سگرٹ بجھ گیا۔ مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے زیادہ بیدار کر دیا اور سگرٹ جلاتے جلاتے میں نے کنکھیوں سے باندہ گلی کی سڑک کی طرف دیکھا۔ پتھریلی، تر سڑک پر ایک سوار برساتی ٹوپی اور برساتی کوٹ میں چھپا ہوا تیز دلکی پر نتھیا گلی کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کے سیاہ ننگے پاؤں مجھے رکابوں میں نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی سائیس ہے۔ بازار میں پہنچ کر وہ گھوڑے پر سے اترا اور باگ کو اس کی گردن پر سے اتار کر بانہہ میں ڈال لیا۔ اور ہماری کوٹھی کی طرف چڑھنے لگا۔ میں پہلے سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قریب آ کر اس نے مجھے ایک خط دیا جس کا بڑا نیلا لفافہ صاف کہہ رہا تھا کہ باندہ گلی ہوٹل سے کوئی پیغام آیا ہے۔ خط بلاشبہ ویلیٹی صاحب کا تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سگرٹ کو پھینک اسے جلدی جلدی کھولا۔ ویلیٹی صاحب افوہ کتنے خط لکھا کرتے تھے۔ مگر یہ سب سے نرالا تھا۔ یہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے اور اس وقت میں اس کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ کر رہا ہوں:۔

باندہ گلی

پیارے امجد!

سواری کا لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ اور اپنے ساتھ بھرا ہوا پستول، چھ فالتو کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ چھ نوٹ پیپر لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص

"ایچ۔ ڈبلیو۔ ویلیٹی"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے چھ کارتوس نکالے۔ تکیے کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ پیپروں کے دستے سے چھ کاغذ پھاڑ کر تہ کئے۔ پاس ہی سے ویلیٹی صاحب کے کمرے کی چابی اٹھائی (ویلیٹی صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے استعمال کے لئے دے رکھی تھی کہ میں بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پھرتے

پھر نے باندہ گلی کے قریب جا نکلتا اور تھک کر آرام کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا۔ سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور برساتی کوٹ پہنتا پہنتا باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ "خدا جانے میں کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔" یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد۔ اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک رویہ بازار، ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک مسلسل سا نصف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بازار بالکل ننھا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک درزی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ بیٹھ فروزجی کا شراب، تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ اسی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، تھانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھیڑ کے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رُخ کیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۲۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا۔ لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ولیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا۔ جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ولیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے:۔

"میرا پتہ منیجر سے پوچھ لو ——— یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیاسلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے منیجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا تھا ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ولیٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس سے جب ملا اُسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اُس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے بہت ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور برساتی کوٹ کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ تبسم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:۔ ———

"ولیٹن صاحب ۲ نمبر کمرے میں ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا:۔

"ولیم! تم آج اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا:۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا:۔

"ولیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ کہ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو۔"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا:۔

"آپ کسی سے کہیے نہیں؟"

"مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل؟ کب؟ کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ویلنٹ صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ولیم کی آواز نے آخر کار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آ کر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد۔ اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتہً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہ ویسے پایا۔ جیسے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے حقیقت از نام ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھیے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا۔ وہ کہاں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیے جاتے ہیں؛ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ ہوں ہی بدقسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا زمانہ کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے بمبئی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا لیکن تھوڑے

عرصے کے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ چارلس کو علیحدہ کر دوں۔ اس کی عادات مجھے پسند نہ تھیں، اس کی سرکشی اور فضول خرچی ہوٹل کے کاروبار کیلئے ازحد مضرت رساں تھی۔ بھائی کو اس طرح علیحدہ کر دینا مجھے سخت ناگوار تھا مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ بریلی کے ہوٹل کا کام بہت زیادہ تھا اور میں اکیلا اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اسے چھوڑ کر میں نے اس جگہ ہوٹل کھولا اور اب یہاں یہ قتل ہو گیا ہے۔ اب یہ ہوٹل بھی ٹوٹ جائے تو بتلائیے میں جہنم میں جاؤں؟"

ولیم کی داستانِ درد سے میں ازحد متاثر ہوا مگر باوجود اس کے یا شاید اسی وجہ سے میں اس کے پاس سے بہت جلد چلا جانا چاہتا تھا۔ ہزاروں طرح کے سوالات میرے دل میں اٹھے مگر میں نے سب کو دبا کر کہا۔

"ولیم! تم ناحق اس قدر فکر کرتے ہو۔ امید ہے قاتل کا پتہ بہت جلد مل جائے گا۔ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم نے کیا کہا؟ ویلیٹن صاحب ۱۲ نمبر میں ہیں؟"

"ہاں۔ مگر آپ ۱۲ نمبر کمرے میں غسلخانے کے رستے جائیے۔"

میں "کیوں؟" کہنے کو تھا، مگر "اچھا" کہہ کر باہر نکل آیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور پھٹتے ہوئے سفید بادلوں میں سے نیلا نیلا آسمان کہیں کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

غسلخانے کی طرف سے ۱۲ نمبر کمرے میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پر براؤن کی لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ یہاں سے میں نشستگاہ میں گیا۔ اس وقت، داخل ہوا جس وقت ویلیٹن صاحب کمرے میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے سگرٹ کیس سے سگرٹ نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے سگرٹ کیس میری طرف بڑھایا۔ سگرٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے میں دیا سلائی جلا رہا تھا کہ ویلیٹن صاحب بولے:۔

"اچھا۔ تو تم سارا قصہ ولیم سے سن آئے ہو؟"

"ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

وہ سگرٹ جلا چکے تو دیا سلائی کو انگیٹھی میں پھینک کر کہا:۔

"جس وقت تم تھڈی گلی سے چلے تو بارش ہو رہی تھی نا؟"

"موسلا دھار"

"تو تمہارا باران کوٹ کہاں ہے؟"

"وہ تو...... میں منیجر کے کمرے میں بھول آیا ہوں"

"اور تم وہاں ہرگز نہ بھول آتے اگر تم منیجر سے فقط میرا پتہ پوچھ کر چل دیتے۔ اچھا۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ فیروز جی اپنے بل فارم کس قدر خوبصورت چھپواتا ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے میرے ہاتھ میں فیروز جی کی دکان کا ایک بل دیا۔ بل اسی قسم کا تھا جس قسم کے نقد چیزیں خریدنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو بطور ایک رسید کے ہوتے ہیں۔ بل پر خریدار کا نام درج نہ تھا۔ صرف اس قدر لکھا ہوا تھا۔

ایک ڈبہ پانامہ سگار	۲۵	۰	۰
ایک چھوٹا وسکی	۰	۶	۰
	۲۵	۶	۰

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگ دار روشنائیوں میں واقعی نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا:۔

"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب ؟ معمولی درجہ کی ؟"

"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو۔ ہمارے ہوٹل کے فارم اگرچہ سائز میں اس سے بڑے ہیں مگر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں۔"

اب کے بار انھوں نے باندرہ گلی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا ویلنٹ صاحب نے مجھے تھیا گلی سے اس لئے بلایا ہے کہ انھیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی:۔

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۱۲ بابت ماہ جولائی

	روپیہ	آنہ	پائی
خوراک وغیرہ	۱۱۰	—	—
کرایہ	۳۰	۰	۰
	۱۴۰	۰	۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ویلنٹ صاحب بولے۔

"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ کل شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھتے ہی میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ مینجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب بالکل نہیں پیا کرتا تھا۔ نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں لئے جاتے تھے۔"

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آفریں کہا کہ ایک نیکی کا کام تو کرتا تھا) ۔ ویلنٹ صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا:۔

"اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدق ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا ؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

"اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن اپنے

مقررہ معمول سے اس قدر انحراف کرے۔ کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے۔ چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خرید لے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا؟ لیکن نہیں۔ انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقیماندہ حصے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ اغلباً یا نامہ سگار یہی ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے)۔ تو گویا اس کمرے میں دو یا نامہ سگار پیئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے ـــ اب چلو خوابگاہ کا معائنہ کریں۔"

یہ کہہ کر ہم دونوں خوابگاہ میں گئے۔ ولیٹن صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر بہتر برس کی عمر کا ایک پتلا دبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابل غور ایک اور بات ہے۔ وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے۔ جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل تازہ پھٹا ہوا ہے۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے۔ جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھا تو کیا براؤن میں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹن صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب میں ولیم کے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹن صاحب مجھے ساتھ لے کر غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:۔

"یہ ہم چوروں کی طرح غسلخانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کی جارہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا۔ اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دن تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انھوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انھیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

"اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

"او ہو۔ ولیم نے تم سے نہیں کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب خانی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ منیجر کے کمرہ میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے، مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

"تو انھوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

"پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ تم اب ان سے جا کر پوچھو تو انھیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہو گی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی خالتو آئے تھے۔ وہ صرف ایک فیروز خاں بہرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہوٹل میں رہا۔ اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔"

"چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے؟"

"ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا۔ اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل وہ یہاں سیر کے لئے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ ہے۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ویلنٹن صاحب کو دیکھ کر بہم ورجا کے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں ...... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باران کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ویلنٹن صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو مجھے دوست یوں بھی دسترخوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتقام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ویلنٹن صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں چھ نالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انھوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔

میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہی ہیں مگر کسی خیال سے چپ رہا۔ اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگے :۔

"میرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار ہوں۔"

ان کا یہ لیٹا ہر تکلف فی الحقیقت عین بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انھوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا :۔

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پاناما کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے خریدا تھا؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو۔ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لئے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دور ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیٹن صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ ۴۔ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور مینجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پاناما سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انھوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکہ دار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انھیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لئے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیٹن صاحب سے کہا :۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھایئے۔"

انھوں نے فوراً میرے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے ایک ٹکڑا لے کر اسے کھولا پھر ان چھ پاناما سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ولیٹن صاحب سے کہا۔

"آپ کا قیاس ٹھیک تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار بے شک پاناما سگار ہیں۔"

انھوں نے جھک کر کہا۔ "یہ آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ دو پاناما سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ دو گھوڑے

لیے، اپنے باران کوٹ وہاں باندھے جہاں سبکتگین نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا۔ اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

بانڈہ گلی سے آدھ میل نکل کر ہم نے گھوڑوں کو دلکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں کی مہیب عظمت، چیڑ، تو، کھنڈ اور بن کھوڑ کے اونچے اونچے درخت، ایک طرف پہاڑوں کی سپہر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھڈ کی پر اسرار گہرائیاں تنگ، پیچیدہ سڑک، اس پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز، آبشاروں کا شور، کوئلوں کی دردناک کو کو۔ میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نظارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر مجھے بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں موتی پھینک رہا تھا۔ میرا دل بارہا کھڈ میں کود پڑنے کو چاہا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ولیٹن نے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے، اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ وہ بولے:

"مری بائیسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ...... ساڑھے چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائیسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا ہلکے ہلکے نہ چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ولیٹن صاحب نے قمار بازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُرزور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شد و مد سے کہ میں سمجھا اس فعل مذموم کے اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُر مغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انھوں نے دفعتہً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہل فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سرِ نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز کر دیا ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے برائون کی موت پر دقیق غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے۔ جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش الٹی سوچ میں مصروف تھا۔ ولیٹن صاحب میں میں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے

کہ وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پہ بحث کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزارہا آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھنواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں اور لکچر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اردگرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ولیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری بائیسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ولیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوک کرنا شروع کیا۔ ولیٹن صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کو کنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور —— شاید...... ہر ایک ...... عقلمند......"

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ولیٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انھوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا:۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو، تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا:۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔ اور چونکہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اغلباً رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خوابگاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا معجون مرکب، ان کے چہرے کی طرف منہ کئے بادر کرنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ولیٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگرٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں

کہیں اچھال دیا اور بولے:۔

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل اور ہوٹل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے ٹھہر گئی کہ اسے کوکنے والا مر گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیتا) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہ خیال کی۔ لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں پونے دس بجے پر ساکن تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت ٹھہرا ہے جس وقت اس کی کوک ختم ہو گئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن اپنے ٹائم پیس کو ——— اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دینا احسن ہے تو دونوں گھڑیوں کو ——— قریباً نو بجے (غالباً رات کے نو بجے) کوک کا کرتا تھا۔ جیبی گھڑی جو چار بجکر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا ٹھہر جانا اس جسمانی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے جو براؤن کو موت کے وقت اپنے قاتل کے ساتھ یقیناً کرنی پڑی۔ اگر تم اور میں جو شاید بہت باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جس کی زندگی کی ہر ایک حرکت تلی تلی اور ہر ایک عادت باقاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ اغلب بلکہ یقینی نہیں کہ وہ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر آشکارا ہوتی گئی۔ ایک دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی ولیٹن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے:۔

"سیٹھ فیروز جی کا بل اور روپانا مہ سگاروں کے جلے ہوئے باقیماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم نہ صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چاہیئے) سو یہ تو ہم بغیر خوف و تردید فرض کر لیں کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا۔ اور براؤن کی تبدیلی لباس اور خوابگاہ کی بدنظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں:۔

اول:۔ یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم:۔ یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم:۔ یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہارم:۔ یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہو گا؟ غالباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟

"شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و نواح کی سب چیزیں بھول گیا۔ ویلنٹن صاحب جدھر جدھر مڑتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا، آخر کار وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرے اور کہنے لگے :۔

"یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں ان کی ملاقات ہمارے لئے فخر اور مسرت کا باعث ہو گی۔"

اس وقت شاید ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی رات کی محیط تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب سا خاموش مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمروں کے باہر کہیں کہیں کوئی نوکر پھرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ دفتر کا دروازہ کھلا تھا اور میز کے سامنے دو بابو بیٹھے حساب کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے منیجر کا پتہ پوچھا۔ تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے، چارلس ولیم ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوش نما کنٹر اور ایک گلاس اس کی عیش پرست طبیعت کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے لیکن اس کے تبسم اور جان ولیم کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا اس کے چہرے سے صاف گوئی اور نیک نیتی ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور جبر کے عنصر غالب تھے۔ جو اس کے تبسم کو مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ رسمی لہجے میں کہنے لگا :۔

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ویلنٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا :۔

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں دو سونے کے کمرے دے سکو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ نمبر ۲۳ میں لے جاؤ۔" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :۔

"آپ کو کھانا تو نہیں چاہیئے؟"

ویلنٹن صاحب بولے :۔

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔ ویلنٹن صاحب نے اس سے کہا :۔

"منیجر کو یہاں بھیج دو۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا :۔

"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا اور ہمارے سامنے آ کر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ویلنٹن صاحب نے مسکرا کر کہا :۔

"مسٹر چارلس ولیم۔ میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ وہاں کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تمہ ہوٹل کی بد انتظامی کی نسبت قائل

کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ ایک تو وہ قتل کرنے کی تکلیف اٹھائے۔ پھر نعش کو اپنے کندھے پر ڈال کر محفوظ جگہ میں لا کر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے۔ اسے ڈریسنگ گون پہنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا ایک بل مقتول کی جیب میں چھوڑ جائے۔ تاکہ اس کا پتہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی کافی کے علاوہ آپ کی شرافت کی داد دوں۔"

میرے کان ولیٹن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طنز آمیز اور پُر حقارت تقریر سے تمتما اٹھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ در پیچ تیوری ڈال لی۔ منہ کو زور سے بند کر کے کرسی کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ولیٹن صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ اٹھائی۔ غصے کے آثار دیکھ کر میں نے ہولکے سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ولیٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کافی کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دفعتہً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اور اگر میں ایک لمحہ بھی توقف کرتا تو کرسی پورے زور میں ولیٹن صاحب کے سر پر آ پڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو کم از کم ملتوی کر دے۔ ولیٹن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"امجد۔ چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں۔" ولیٹن صاحب باقی کی کافی پی کر کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ اسے پھرا کر تالا بند کر دیا۔ اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے:۔

"اسے جیب میں ڈال دو۔ میں چارلس صاحب سے لڑنے تو نہیں آیا۔"

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے:۔

"مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے۔ (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) تم قدرتی طور پر یہ پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ جان ولیم بانڈہ گلی ہوٹل کا مالک تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکالیف اور رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بد دیانتی کا تختہ مشق بن گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر بانڈہ گلی میں اپنے سرمائے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر مری میں تم سے یہ ہوٹل کھلوا لیا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے از سرِ نو شریفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہو گی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں

قتل کے الزام میں گرفتار رہے۔ گو یا تم میں شرافت اور صداقت اس درجہ مر چکی ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ لو گے۔"

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ انتقام، غضب، استفہام، توجہ، نرم دلی، ندامت وافسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ویلیٹن صاحب نے اپنی تقریر اس وقت ختم کی جب بالآخر چارلس کے ماتھے پر اور اس کے کندھوں کے پیچھے ہٹنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا:۔

"فیروز خاں ہرگز پھانسی نہ پائے گا۔ آپ اطمینان رکھئے جو کچھ میں نے کیا، بہت برا کیا اور میں از حد شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور شاید میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"ہاں تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات ہمیں سنا دو، تو میرے یہ دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔"

ویلیٹن صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے فوٹ پیپر (وہی جو میں نتھیا گلی سے ساتھ لایا تھا) نکال کر پھیلائے اور ویلیٹن صاحب سے ان کا قلم لے کر جو جو چارلس کہتا رہا، لکھتا گیا۔

وہ تحریر نہ تو اس وقت مجھے لفظ بلفظ یاد ہے اور نہ اس کا یہاں ہوبہو نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جب جمعہ کے دن باندہ گلی گیا تو شام کو چائے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے سے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے سات آٹھ گز نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا۔ اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا۔ چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ٹی براؤن ہے۔ اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے۔ پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بڑا ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آ کر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آ کر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ قریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا۔ اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خوابگاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے۔ اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے میں رہا۔ جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ویلیٹن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پر دستخط کر دو۔"

کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرا لئے گئے۔ پھر ویلیٹن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوا لیا:۔

سب انسپکٹر پولیس۔ باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ۔ ایبٹ آباد

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے کہا:۔

"اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ تحریر فیروز خاں کی رہائی کے لئے کافی ہو گی۔"

———

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۳۵ نمبر کمرے میں، میں اور ویلبٹن صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ویلبٹن صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا خاموشی سے سگرٹ پی رہا تھا اور دل میں کل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ویلبٹن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:۔

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آ گیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے۔ وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکر گزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکر گزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

"جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔"

———

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا:۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر ٹی براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا

ہوگا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جنرل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

"........"

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے بچارے ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں؟

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسرِ نفسی ہی سمجھیں مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانت داری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا:

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو، ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ آکر ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو، جو ہمارے پاس لائے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔"

دکان والے نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا، تو اسے اطمینان ہوا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب کرنے والے آدمی نہیں اور پھر لاکھوں کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی۔ یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب چاہوں گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپیہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دوکان والے کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا: "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں، ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں یہ دیکھو ان کا رقعہ ذرا ٹھہر جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا۔ کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے

بیس روپے وصول کروں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے کھن کھن گن دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دیانت داری پر سب کو بھروسہ تھا۔ اور جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا کہ ان کا کیا پتہ۔ آدمی نیک اور شریف اور دیانت دار سہی، لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہٰذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے۔ بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہیئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔ بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلوا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو، عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے، وہ اسے دس روپے کا چک لکھ دیتا ہے۔ چک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں ——

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چک لے جاؤں گا۔ مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا۔ اور کہا کہ مجھے اس چک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہیگا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں، مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقعہ پیش آتا ہے، کہ بنک چک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔ اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی آمد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک جانا پڑا اور روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چک، ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے)

(خیابانِ اردو)

رونا رُلانا

ایک امریکن ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک ہنسوڑا جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رہتا ہے۔ مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہرحال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ ایک ہی موت کی خبر کے لئے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں، کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اڑتی اڑاتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو۔ غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ؎

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں سبھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے غم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا ہر صفحہ غم والم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور کبھی رقت دلانی ہو تو اسے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ "میری بوڑھی ماں مر رہی ہے، دوا کے لئے پیسے نہیں۔ خدا کے نام کا کچھ دیتے جاؤ" کبھی کسی سگھڑ خوب صورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا۔ یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور وہاں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والی ہیں کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع،

بیماری، دق، سل، خودکشی، زہر، ظلم تشدد ایک نہ ایک چیز کا سماں باندھ دینا گویا فرض جانا۔ ہاں کوئی کروشیا یا کھانا پکانے کی کتاب ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ بات بات پر صفِ ماتم بچھ جانا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس ارنگین نقادنے کیا غلط کہا؟ جل کے کہا سہی۔ لیکن بری بات کیا کہی؟

کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو زنانے اور مردانے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کئے چپ چاپ۔ آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔ کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر تھکن اور اداسی سی ہے۔ اور قدم ذرا آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ اور زنانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے۔ اور جب کوئی نئی فلاں بی بی ڈولی سے اتر کر اندر جاتی ہے تو ماتم کی بھنبھناہٹ میں از سرِ نو ایک لہر اٹھتی ہے جیسے یک لخت کوئی ہوائی جہاز پر سے گر پڑے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کو ایک کلب قائم ہو جاتی ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں کھائی جاتی ہیں اور چیخوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی کو جاتی ہیں تو بیمار میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے وہم و گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ بے چارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار و ناچار منحنی آواز میں بولنا پڑتا ہے جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہو گا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مزے لے لے کر روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری گھر والی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کہ کوئی پڑوسن آکے کہہ دے اکہ اے بوا! ماشاء اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجلا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے دیدوں میں خاک۔ میں تو مری جاتی ہوں اور میرا چاہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کٹی نظر آتی ہوں۔ اور کوئی آکے کہدے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہو گیا۔ تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر داد لیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غم گین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ، ضبط، تحمل، اور خندہ پیشانی سے دور ہو سکتا ہے کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے۔ اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ۔ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ غم نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص اصول ہے جو اپنی تحریر سے ہزار ہا لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہو گا جو اپنے زورِ قلم سے ہزار ہا جوان، معصوم خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رُلاتا ہے۔ اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں۔ پھول اور پرندے۔ نغمہ اور نکہت۔ رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے۔ جس کو دیکھ کر دل میں امنگیں اُٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے پلٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھپ چھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں۔ یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کہ اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک پہنچا دے۔ اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! کیا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہ رہے ہیں۔ میری ضعیف التجائے درد کو سن سکتی ہے؟

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں۔ کہ میرے نغمے کی نکہت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینے کے ٹکڑے پھینک دیئے تھے۔ میرے دل میں خراش ہو رہے ہیں۔ اس بلبل کو بھیج دے کہ آ کے سن جائے۔ اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصود انتظار! تو بارش کے اس پار آ جا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں۔ اس پار آ جا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

مسئلہ تونیسیہ

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۴؍ اپریل ۱۹۵۴ء کو حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے۔ اگر میرے رفقاء کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کروں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جن کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی طرف سے اس قسم کے رویّہ کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی، جو یہ سوال ایجنڈے پر آجانے کے بعد ہی کی جاسکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرزِ عمل بظاہر اس لئے اختیار کیا کہ کم از کم اسے واقعی سیر حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف رائے دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ حالانکہ وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقعہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ انہیں بحث میں حصّہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک ناواجب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کرلی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ـــــ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ـــــ گویا اس نمائندے کی حد تک، ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کرکے دس دوسرے وفود کو اظہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری درخواستیں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کرلیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ اور فرانس کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ـــــ واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو جمعیۃ اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے

درخواست کر چکی ہیں۔

فرانس کا نمائندہ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ یعنی دس وفود نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو توضیحی نوٹ اور ناخوش گوار ریمارک ــــ نمائندہ فرانس کے نزدیک ناخوش گوار ــــ بھیجے تھے ان میں سے وہ تمام عبارتیں پڑھ دیں جن کی تردید اس کے خیال کے مطابق ضروری تھی۔ موصوف نے نہ صرف ان باتوں کا جواب دینے پر زورِ فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے بھی تعبیر کیا۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومتِ فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے دس وفود بھی ــــ اگر انہیں اظہارِ خیال کا موقع ملا تو ــــ اس کے خلاف احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریق سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلیس ڈی چیلو" کی رواقوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھا لیا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہئے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا۔ کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا، ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ غور و خوض کی غرض حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونیسیہ کے دو وزیر ــــ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا ــــ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا۔ جس میں کونسل کی توجہ تونیسیہ کے بعض افسوس ناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوامِ متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سورج کی کرنیں نہ اسے پیرس کے "پیلیس ڈی چیلو" میں چھو سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھیجی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچایا گیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں تونیسیہ قتلِ عام، فسادات، گرفتاریوں اور تخریبی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ــــ میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا ــــ اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بڑے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوش گوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی۔ جن کا شمار روئے زمین کے شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تحمیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع سے غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ ناواجب جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے، اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہئے۔ پندرہ ملکوں کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی

کے صدر مسٹر پڈ لائر ڈ و کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفد فرانس سے نیز اس کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہلِ تونیسیہ کو مایوسی کی اس منزل پر نہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ امن عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد حفاظت کا تقاضا یہی ہے اور قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پلیس ڈی چیلو کے برآمدوں میں سراسیمہ وار گشت لگانے والے لوگ تیونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دئے جائیں جنہیں وہ بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے عین مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں بھی اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ کیا کہ یہ پیغام حکومتِ فرانس تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہیے، اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں۔ انتہائی الم انگیز، افسوس ناک اور ناخوش گوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیرِ بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی یقیناً اس نے لکھا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ "فی الحال" کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لئے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیرِ بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم دل شکستہ ہو گئے۔ پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم ہر روز اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے ہر روز اصلاح احوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے، ہر روز یہی توقع لگی رہی کہ فرانس اور اہلِ تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہلِ تونیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کاملاً انحصار نہ کر لینا چاہیے اور غالباً بہتر ہو گا کہ اہلِ تونیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا جائے تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہلِ تونیسیہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابلِ عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونیسیہ کے ذمہ دار وزرا سے ان کے سفارتی پروانہ ہائے راہداری واپس لے لئے گئے ہیں۔ اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ بہرکیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزرا پروانۂ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آ سکتے تھے۔ عالمِ اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں۔

اس کے بعد ان چند اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دئے گئے ہیں، ہمیں بتایا کہ حکومتِ فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُر امید

نہ تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانش مندی نہ سہی جوانمردی کا تقاضا یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کو استحکام مل جانے کا انتظار کیا جائے آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کو استحکام مل گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر امید تھے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تونیسیہ میں صورتِ حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے مایوسی، دہشت اور حیرت کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تونیسیہ کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آ سکتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حکومت فرانس کابینہ کے دو مجرموں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت کے لئے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ کابینہ اب جیل میں پہنچ گئی۔ تونیسیہ کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ تونس سے سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی یعنی حزب دستور کا کوئی نیشلسٹ لیڈر ایسا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق ہزاروں تونیسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ سیکڑوں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تونیسیہ کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا۔ اور سوچا کہ بہر حال ہم پوپ سے بڑے کیتھولک ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ اگر خود اہلِ تونیسیہ ایک اور حکومت کی تشکیل کر لیں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لئے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گذر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ باکوش نام کے ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کئے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے۔ دورانِ جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے وزارتِ عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہوئے تھے۔ تونیسیہ میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے دباؤ کے تحت وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گذرتے گئے۔

یہ مسٹر باکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی، ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور امداد ان کی پشتیبان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لئے کمر بستہ ہے لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے۔ "ہیرلڈ ٹریبیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تونیسیہ کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے (حکمران تونیسیہ) سے ملنے کے لئے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم یا فرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص اور صرف ایک شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی ہامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تونیسیہ نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنئے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہلِ تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو پشتارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے لئے میں فراہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیسیہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیسیہ کو درست بنائیں۔ اور فرانس کے دعوے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالامال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳؍جنوری کو تونیسیہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنایا گیا۔ جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ جدھر سے گذرے سڑکیں مسلح فوجیوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا شہر بکتر بند گاڑیوں، مسلح کاروں اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا لیا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست رابطہ رکھنا پسند کریں گے، تاہم وزیر اعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو بے کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیر اعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسیہ ۱۴؍جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا۔ اور انہیں وزیر اعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵؍جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بے سے وزیر اعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گاربے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گاربے وہی ہیں کہ جن کے نامۂ اعمال میں مدغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے۔ بے نے وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے۔ وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیر اعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیر اعظم کے اختیارات ہی کافی تھے لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گاربے کو پیرس طلب کر لیا گیا۔ وہ ۲۲؍مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے نجی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴؍مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزرا بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا۔ حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ——— مجھے امید ہے کہ میں بعد میں کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ——— اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک

فرانس کی حکومت تونیسیہ کے حکمران سے کر رہی ہے۔ جس کے بارے میں فرانسیسیوں کا دوستی کا دعوےٰ ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل پستول کی نالی سیدھی کر کے اور اسلحہ کی قوت کا ہولناک مظاہرہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اس طریق سے جواب حاصل کر کے منطقی اور آئینی ضمیر کے سوا اور کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو بجری تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے نام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تونیسیہ کے وزیراعظم اور تین اور وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث اسے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے۔ اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا۔ مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔ ان سب کو تونیسیہ کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا سیکڑوں سیاسی کارکنوں، صحافیوں، مدرسوں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے ساتھ تھیں، گرفتار کر لیا گیا تمام نیشنلسٹ اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ تمام ہائی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے۔ اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں جس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نظربندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی؟

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۲۵ کی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا۔ مگر اس انٹرویو میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تونیسیہ کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوش گوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں" یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اور جو تونیسیہ میں فرانسیسی حکام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقدور بھر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورت حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلہ کار کو جس کا نام باکوش ہے وزیراعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کتنے تک وزیراعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیر اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا۔ اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوب صورت سکیموں اور تونیسیہ کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقعہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ عام عقل اور منطق کے نام بھی حد درجہ لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورتِ حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ "چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں بحث کے لئے شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوش حالی، شادمانی اور دوستی کا دور شروع ہو رہا ہے" ——— لیکن حالات وہی ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونیسی جیلوں میں بند ہیں۔ پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام بڑے لیڈر جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا یہی وہ خوش حالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے نے سنائی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اس صورتِ حال پر بحث نہیں کرنی چاہیے؟

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے۔ میں اسے مختصر رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں۔ میں اس مسئلے پر پھر اظہار خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری اطلاع کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے لئے سات مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال یہی ہے کہ اتنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقار کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا۔ لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے رواقوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ ہیں۔ اقوام متحدہ کا معتد بہ جزو ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہِ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہل تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے سبقت سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؟ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھجوانا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام ان فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے اجزا زود یا بہ دیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورتِ حال پر اقوام متحدہ میں بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام گیارہ ذمہ دار ممالک کی وساطت سے ——— نمائندہ فرانس اور دوسرے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں ——— اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟ عملی طور پر سارا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجئے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ تونیسیہ کو آج ہی پروانۂ آزادی دے دیجئے۔ صرف یہ کہتا ہے کہ ازراہ کرم اس سوال پر بحث کیجئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو، ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے تم اس مسئلے پر خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آجائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے محکمے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھئے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے یہ بڑی عجیب صورتِ حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دل چسپی لیتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گذرا کہ وہ ناسازگاری کی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں۔ جن کا تختۂ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم اہلِ تونیسیہ کی حالتِ زار کو فراموش نہیں

کر سکتے ہم ان سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدید کے مطابق خواہ کوئی فیصلہ کرے یا کرنا چاہے۔ (اس کونسل کے میز پر بعض ایسے آدمی بھی براجمان ہوں گے جن کا طرزِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا ہوگا کہ ہم اس معاملے کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں) ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا کر گزرنے میں قطعاً دریغ نہ کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال رک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تونیسیہ کی صورتِ حال کے مزید پردے چاک ہو جائیں گے۔ اور وہ استعماری کیفیتیں سامنے آجائیں گے، جو وہاں موجود ہیں اور اس پوری بے چینی اور اضطراب کی بنیاد واساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آ گئے ہیں لیکن ان کا اصل باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لئے۔

یہاں میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

---

(۲)

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری ۔پطرس۔
کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے:

تقریریں کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے وہ دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام ہے ان میں سے تین ملک ایسے ہیں کہ جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں۔ چوتھے ملک کی عظمت وشان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے بھی کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں ہی کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں ووٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی، ہم ہار جائیں گے۔

آج کا دن ـــــ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء ـــــ اقوام متحدہ کی سرگذشت میں ایسا دن متصور ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو وادینے کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے دور اندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو حد درجہ افسوسناک اور الم انگیز طریق پر الٹ دیا گیا۔

پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا، تو اس کی ضرورت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر حد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرزِ عمل سے محترز

رہنا چاہیئے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومتِ فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر دی گئی تھی کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب تونیسیہ کا مسئلہ قطعاً زیرِ بحث نہ تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۴۶ء کو حفاظتی کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایت پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر فرمائی تھی۔ میں اس میں کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ نمائندۂ فرانس مسٹر پیروڈی (MR. PARODI) نے اس موقعے پر کہا تھا:—

"ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ فلاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال کے متعلق قیاسی علم کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دیگی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اس قسم کی شہادت کے پیشِ نظر کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی اور ان مقاصدِ انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے انجمن اقوامِ متحدہ کے پورے نظام کے نشو و ارتقا میں حصہ لیا تاکہ انصاف مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے۔ لیکن آج اسی فرانس کا وفد (اسی ملک کے ایک سابقہ نمائندے کے الفاظ میں) عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیشِ نظر نہیں رکھے جو اس خاص مسئلے میں پیشِ نظر رہنے چاہئیں تھے۔

جس حد تک میرے معزز دوست نمائندۂ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی مداخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا چاہیئے—

میں نے سلطنتِ متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈون جیب (SIR GLADWYN JEBB) کی تقریر سنی۔ اس سے بطورِ خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوش گوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی زبان کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے گلہ ہے کہ سلطنتِ متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترک محبوب کی بے حرمتی کر دی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جب وہ اس فقرے پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یہ گیارہ قومیں حفاظتی کونسل سے معتدل اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے میں نمائندۂ برطانیہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الّا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر گلیڈون یہ بات کہہ کر بے تکلفی سے آگے بڑھے اور فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کی رائے یہ نہیں کہ فرانس یا تونیسیہ پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا لفظ موجود ہے جس سے قوت یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جا سکے یا سمجھا جا سکے۔ کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے؟ اگر سلطنت متحدہ کے وفد کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویزیں یا سفارشیں پیش کر سکتا تھا۔ جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتی" سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ آئیے اس مسئلے پر بحث کریں۔ ہمیں تونیسیہ یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا نہ چاہیئے۔ محض یہ سفارش کر دینی چاہیئے کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کر لیں۔ کیا اسے فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور لغو تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی اور ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات ضرور تھی۔ جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لئے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا حل تونیسیہ یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونس دے۔ یہ امر حقیقت سے منزلوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک مسلمہ پالیسی کا بھی اہم اور الم انگیز نقض ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں؟ اس موقعہ پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکائتیں زیر غور تھیں ——— مسٹر بیون (Mr. BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا ———

"میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی باتیں سنے خواہ وہ کوئی ہوں اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی چھوٹی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایات کے بعد وہ اس کونسل میں نہیں آ سکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کر سکتی۔ تو میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں۔ اسے بھی امن کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم گردانا گیا ہے۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے اس کی پوری تحقیقات کر لی جائے۔ اور اس پر بحث بھی ضرور کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔ اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو ضرور موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو ایجنڈے پر رکھا جائے اور اس پر برسر عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط۔" (سرکاری ریکارڈ سال اول سلسلہ اول صفحہ ۱۷)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی۔ بلکہ ——— مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ——— اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہونچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت برا اثر ڈالے گا۔

اگر کسی معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوامِ متحدہ پر بُرا اثر پڑتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوامِ متحدہ کا اور کونسا بڑا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنتِ متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوامِ متحدہ کو اخطاط سے بچانے اور گیارہ قومیں اس پر جو بُرا اثر ڈالنا چاہتی ہیں ان سے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کردی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تاکا کریں جس میں ہم جمع ہیں۔

سلطنتِ متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات بڑے خلوص اور دیانت سے کہی؛ اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیسیہ میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے۔ دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام ارکانِ وزارت جیل میں ہیں۔ اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیسیہ کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پیٹا گیا یا کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیسیہ میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ پھر فرانسیسی اس وقت کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیسیہ میں کون سا ایسا درجہ نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری لب کشائی سے معرضِ خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوامِ متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیسیہ کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی بُرے کام ہی کے درپے ہوگا۔ جس میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوامِ متحدہ میں کوئی بحث بہبودِ انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیسیہ میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہوگی یہ بات شروع ہی سے کہی جا رہی ہے یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل وہاں کے اصل باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں۔ اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہیں۔ جس حد تک مجھے علم ہے اہلِ تونیسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہٰذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہلِ تونیسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ کبھی کبھار ایک بم پھینک سکتے ہیں وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت فوجی کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے ــــ یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیسیہ میں فی الحال اور کچھ نہیں ہو رہا۔ البتہ ریذیڈنٹ جنرل سرتوڑ کوشش کر رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت ازسرِنو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنتِ متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنتِ متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ سے زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ "مقامی معززین" نے حکومتیں بنالی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیسیہ میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہوگئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ جب تک عوامی

خواہشات سے اعراض جاری رہا۔ اصلاحات کی کوئی قسط اطمینان وصلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ انجام کار ایک ایسے طرز عمل کی بنا پر جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور برتر رہے گا سلطنت متحدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اس کے بعد ہی پاک و ہند اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرات مندانہ اور خیال انگیز قدم نہ اٹھایا۔ روز بروز وقت گذاسانہ تدبیروں سے کام لینے اور دنیا کو اپنے ارادوں اور روش کے متعلق دھوکہ دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرات مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہو گئی اور عوام کے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کر لی۔ فرانس تونیسیہ میں یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہمیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر مستعمرات اور برطانیہ کے وزیر مستعمرات کے درمیان بات چیت ہوئی تھی، اور موضوع گفتگو تونیسیہ تھا۔ اگر سر گلیڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو ملکہ معظم کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لئے دیا گیا ـــ تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سر گلیڈون جیب نے انگریزی زبان پر قابلِ رشک دسترس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کچھوے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی ـــ اس طرح مجھے جلد بازی کا ملزم گردانا۔ موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں، مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو میرے نزدیک حد درجہ بے دردانہ گھاؤ ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف جس حد تک آزادانہ بحث و تمحیص کا تعلق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ عزت مندانہ ریکارڈ پیش کر سکتا ہے۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ حد درجہ بلند آہنگ تھی۔ گذشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادئ تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے ـــ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتیرے اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افروز ہیں ـــ میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آچکا ہے۔

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی جب مسٹر سٹےٹینیس (MR. STETTINIUS) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی۔ میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات سنانے کا حق حاصل ہے۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات

کو اسی کونسل میں لے آئیں۔"

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے یونان کے خلاف جمہوریہ شورائیہ یوکرین کی شکایت پر ستمبر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا:—

"اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف برابر یہ رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل اسے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میری حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں پھر کہا:—

"یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے اور آدمی مارے جا رہے ہیں، لہٰذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے خواہ سیادت کا تصور کچھ ہی ہو۔ اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے۔"

روس نے چیکوسلواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت پیش کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن ——— (MR. WARREN AUSTIN.) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:—

"جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسے معاملے کے مالہٗ و ماعلیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر ضرور غور کر لینا چاہیے، تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا:—

"کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا۔ جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی بلند آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں مسٹر جیسپ (MR. JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔ کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا:—

"اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی، تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آسکتا ہے، جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے

پر غور و خوض ہو جائے یہ انکار پیشتر نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ انکار کے معقول وجوہ موجود ہوں۔"

تاہم یہی روش ان متعدد وفود نے اختیار کی جو اس موقعہ پر ہمارے نقطۂ نگاہ کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے معاملے کی طرف اشارے مزید کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان پر بحث نہیں کی گئی بعض نمائندوں نے کہا کہ جب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی رضامندی نہ دی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے سالہا سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ طرزِ عمل ہمارے لئے بہت بڑی مایوسی کا باعث ہوا۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گذشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ نے اسے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ ہمیں اس معاملے میں امریکہ کے انکار اور طرزِ عمل کی سرگذشت کا علم تھا ہم نے محسوس کیا کہ یہ امریکہ کے اس راستے سے ایک خفیف سا انحراف ہے جو اس نے اپنے لئے چن رکھا ہے۔ محض یہی نہیں ہم یہ سمجھتے ہوئے خوش تھے —— اور اس کے لئے مجھے امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہئے —— کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ ہی کو شدید الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگذشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہئے۔ غالباً بہت سی مصلحتیں پیش نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیش نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مصلحت یہ تھی کہ ہمارا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں انہیں یاد ہوگا کہ فرانس کے وزیر خارجہ نے جو تقریر کی تھی ویسی عجیب و غریب تقریر اقوام متحدہ میں کبھی نہیں سنی گئی۔ اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ دوسرے معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی مہمان ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ جو وفود اس موقعے پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش خلقی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی تھی۔ اس قسم کی مروت و خوش خلقی پیکار جوئی دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشیوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں نہ ہوتی جس طرح آج لاکھوں تونسیوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کس کے مہمان ہیں کہ وہی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ جو پیرس میں اختیار کی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز پیرس میں ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد دلانا میرا کام نہیں۔ کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادیٔ فکر و خیال کے حامی عناصر کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث رنج ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل کے گذشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹٹول لینے کے بعد اس پر گہرا غور و خوض ہوا۔ میں کسی ملک کے کسی آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں۔ جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی۔ اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح محاسبہ و موازنہ کر چکنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور ہم گیارہ ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لائے —— محض ہمیں نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قومیں —— کشیدگی اور تناؤ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع سے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری اپنی خاطر اور امن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں غیر ضروری رکاوٹ ثابت نہ ہو۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکتا ہوں طویل مدت تک ایک واضح طرزِ عمل اختیار کر چکنے کے بعد، یکایک اس کے برعکس کاربند ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جس
کی کوئی معقول توجیح امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ تو تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے کہ جس بازار میں سواریاں صرف ایک رخ پر جا سکتی ہیں
امریکہ نے اس میں چلتے چلتے اچانک الٹے رخ گامزن کا فیصلہ کر لیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرزِ عمل کے نتائج کیا ہوں گے تاہم میں امریکی وفد کے ارکان کو مبارکباد
دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے حوصلہ افزا الفاظ فرمائے۔ انہوں نے قوت و طاقت کے استعمال کی مذمت کی اور یہ مذمت تونسیوں تک ہی محدود
نہ رہی بلکہ اس میں فرانسیسیوں تک کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں کہ قوت و طاقت کے آلات تونسیوں کے پاس نہیں۔ ان ہلاکت بار ہتھیاروں
سے فرانس کا پلڑا زیادہ سے زیادہ بھاری ہے نہ کہ تونسیوں کا۔ لہٰذا میں ان کے جملے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے قوت استعمال کرنے کے متعلق فرانس کو
برسرِ عام متنبہ کر دیا ہے۔ فرانس اب تک تونس میں قوت ہی استعمال کرتا رہا ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اس وقت تک یہی کرتا رہے گا جب تک عالمی رائے عامہ
کو اس صورتِ حال کے خلاف بیدار نہ کیا جائے گا۔ فرانسیسی کس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوت استعمال نہیں کر رہے جب حالت یہ ہے کہ ایک بھی قابلِ ذکر شخص آزادانہ
بازاروں میں چل پھر نہیں سکتا؟

لہٰذا میں خیر سگالی کے ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اہلِ تونسیہ بھی ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ان لوگوں نے بارہا مدد کے لیے امریکہ
پر نظریں جمائے رکھیں۔ اہلِ تونسیہ نے جب پہلی مرتبہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی تھی تو اس زمانے میں مسٹر ولسن صدر تھے۔ لوگ یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ تونسیہ
میں تین یا چار مرتبہ بڑے انقلاب برپا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ لوگ بھول رہے ہیں کہ موجودہ قومی تحریک کا آغاز تقریباً ۱۹۰۰ء میں ہوا تھا۔ یہ تحریک کل کی پیداوار نہیں
ہم نے اس معاملے پر کل، آج اور گذشتہ ہفتے بحث کی۔ اہلِ تونسیہ جب یہ الفاظ سنیں گے تو مجھے یقین ہے ان کی ہمتیں بندھیں گی۔

ہم امریکی مندوب کے آخری جملے سے بھی اس حد تک تسکین حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جس حد تک ممکن ہو گا یعنی امریکہ صرف "اس مرتبہ"
ووٹ دینے سے احتراز کر رہا ہے جب پیرس کے اجلاس میں مراکش کا مسئلہ مسترد کیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اس وقت کہا گیا تھا کہ ہم فی الحال
ووٹ دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ آج امریکہ نے "اس مرتبہ" کا جملہ استعمال کیا ہے۔

میرے رفیقوں کو معلوم ہے کہ پیشہ ورانہ ڈپلومیٹک بولی میں "اس مرتبہ" کے الفاظ محض لیپ پوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس جملے کو کسی فقرے
میں ایسی جگہ رکھنا جہاں زیادہ سے زیادہ زور کے ساتھ کم سے کم معنی مقصود ہوں یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ کہنے والے کے دل میں ابھی خاصے تحفظات باقی ہیں۔
ہم اس جملے کے استعمال کو یہ بڑے معنی نہ پہنائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ اس جملے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی سی کرن
اوقیانوسی ڈپلومیسی کے دھندلکے سے پنجہ آزمائی کرتی رہی۔ اس لحاظ سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت نہ آئے گا جب ہمیں ریاست
ہائے متحدہ امریکہ کو پابندیٔ قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ہماری ناکامی اہلِ تونسیہ کی ناکامی نہ ہو گی۔

مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے پھر میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔

ہم اس معاملے میں فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے نہ ہم ہمدردی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو جنگلے کے دوسری جانب
بیٹھے ہوئے مختلف ملکوں کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مثالی شجاعت کا ہمیشہ احترام کیا۔ مصائب و آلام کے دور میں ہمیں
اس کے ساتھ گہری ہمدردی رہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمدردی ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور ہم مستقبل میں اس کے لیے امن و خوش حالی کے آرزومند ہیں۔
تاہم، ہم نے یہ مسئلہ اس لیے اٹھایا کہ ہم بصمیم قلب یقین رکھتے ہیں فرانس کے مفاد کا تقاضا اہلِ تونسیہ کے حقیقی نمائندوں سے پر امن مفاہمت
میں ہے ان پٹھوؤں کے ساتھ مفاہمت نہیں جنہیں خود فرانس بروئے کار لایا۔ مسٹر ڈی ہاٹی کلوک (MR. DE HAUTECLOCQUE)

(ریذیڈنٹ جنرل) اس وقت انتہائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں اور انہیں امید ہے کہ چاروں یکے کسی وقت بھی ان کے ہاتھ آ جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چار یکوں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی ہاٹی کلوک نے نیفے میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے ارباب بست وکشاد غالباً یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ـــــ ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائیں ـــــ شطرنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہیئے ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ ہم ان سے شطرنج نہیں کھیل رہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ شکایت بڑی سنجیدگی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کے لئے یہ عذر پیش کرنے کا موقعہ نہ رہتا کہ ہم نے اہل تونیسیہ کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے یہ معاملہ آج یا کل شکایت پیش کرنے کا نہیں۔ اگر مسٹر ڈی ہاٹی کلوک کل اپنی آستین سے کابینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا دنیا کے کسی آدمی کو مبتلائے فریب نہ کر سکیں گے۔ وہ ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے۔ اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے سر توڑ مٹکر لینا پسند کریں گے تو برابر ناکام رہیں گے۔

لہٰذا میں تونیسیہ کے فرانسیسی ارباب بست وکشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تیز تیز چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقعہ نہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جریدے نیشن کے الفاظ میں وحشیانہ تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے حل ہو جائے گا۔ یہ معاملہ گہری مفاہمت کا متقاضی ہے اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار میرے دوست نمائندہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عزم بروئے کار آئے گا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست وکشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان مٹھی بھر فرانسیسی آبادکاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ جنہوں نے تونیسیہ میں حد درجہ وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں حد درجہ پر زور اور گرم جوش ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جس نے تونیسیہ کی موجودہ صورت حال کو "ذلت خیز" قرار دیا۔ فرانس آزاد خیالی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تونیسیہ کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آبادکار ان روایات کی درخشانی کو مدہم کر سکیں گے وہ تھوڑی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہٰذا اگرچہ ہم پندرہ قومیں ـــــ پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس معاملے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں ـــــ ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں۔ جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ چھ قومیں ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود اس واقعے سے صحیح نتائج اخذ کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غمناک صورت حال کے مداوا کی موجودہ مرحلے پر کیا صورت ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے ہیں؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ پیش نظر خطوط کے مطابق کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے۔ جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳۵ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ موقعہ جس کے بھروسے پر ابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک نہیں آ سکتا۔ جب تک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آ جائے ہماری درخواست اس وقت رد ہو جائے گی جب ووٹ لئے جائیں گے۔

اندریں اثنا طریقِ کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں وہ جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں۔ اور ایک قوم وہ جو کونسل کی ممبر ہے ان گیارہ قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ میرے فرانسیسی رفیق نے ہماری ہتک کی۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ جو بیانات ہم نے دیئے ان کا مقصد پروپاگنڈہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہم میں سے بعض پر ویسا اعتماد نہیں رکھتا جیسا دوسروں پر رکھتا ہے لیکن میں زیادہ سے زیادہ دور افتادہ ملک کا معاملہ سامنے لاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ فلپینز کے دل میں پروپیگنڈے کی کونسی غرض ہو سکتی تھی جب وہ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا؟ نمائندہ فرانس نے ان وفدوں اور ان کی حکومتوں پر حفاظتی کونسل میں پھبتیاں کسیں جب طریقِ کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ اگر انجام کار ناکامی ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں ازراہِ مروّت جواب کے اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے ہم پر الزامات لگائے گئے ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اقوامِ متحدہ کے تمام مباحث کے دوران میں اوروں کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کر چکے ہیں جسے قطعاً آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تونیسیہ پر بحث کے بعد دس گیارہ قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا موقعہ ضرور پیدا کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ دروغ بافی، پروپاگنڈے اور غرض مندانہ بیانات کے سنگین الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی نمائندے نے گذشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہمارے خلاف عائد کئے۔ اس وجہ سے میرے رفیقوں کی تجویز یہ ہے کہ زیرِ غور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر ہمیں حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہیئے جنہوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے۔ اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

---

(۳)

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا

مسئلہ تونیسیہ کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں، پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں ضروری تصریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہاں ہوں۔

سالِ رواں کے قریباً آغاز ہی سے تونیسیہ میں شدید بے چینی جاری ہے، قتل، تشدد، آتش باری، اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوامِ متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گذشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تونیسیہ میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی کے واقعات پیش آئے۔ جسے روکنے کے لئے نظم و قانون کے محکمے کو عام اقدامات کرنے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورتِ حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آ رہے ہیں۔ اسی لئے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ووٹ

اور نقطۂ نگاہ کی توضیح و جواز کے لیے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہلِ تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ اس کش مکش کا محض تازہ ترین منظر ہے جو سالہا سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (مورخ کے بیان کے مطابق) "الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی منظور تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے نمائشی نقاب تیزی سے اتار پھینکی۔ دارالحکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اور حاکمِ تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔"

اسی سال معاہدۂ باردو قرار پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا۔ جو استعمار کے دورِ عروج میں طاقت وروں اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ بہرحال اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ "فریقین دوستی اور خوش گوار ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزو مند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔" اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیامِ امن بحال رکھنے کا اہل ہے۔

یہ عارضی تصرف جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے بدستور اب تک قائم ہے اور اس کی کڑیوں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت برابر سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے۔ جب ۱۸۸۳ء میں ایک کنونشن پر دستخط ہوئے جو لامرسیٰ (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لیے "زیرِ حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی، اور نہ اسے بدلا گیا۔ جو "دو حکومتوں کے درمیان" ہو چکی تھی۔ اس کا مفاد یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان تعاون رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس انتظامیہ کا براہِ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی محکومی کا آغاز تھا۔ کیونکہ اس کے بعد صدرِ جمہوریۂ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمرانِ تونیسیہ سے اجرائے فرامین کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لیے پھر بہت جلد یک طرفہ حکم ناموں ہی کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی نمائندے کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیے اور وہ نمائندہ بطورِ خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تحویل دار بن گیا۔

کسی علاقے کو زیرِ حمایت لے لینے کی وجہ جواز یہ پیش کی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے لیکن تونیسیہ کے تعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی سیادت اور برتری کھا کھا کر ختم کر دی گئی۔ اور جو خود مختاری لسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آبادکاروں کو زمینیں بھی دی گئیں۔ اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آبادکاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہِ راست فرانس سے آئے تھے یا ماضیِ قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے سے ان تمام جنگلات کی درجہ بندی کر کے خالص آبادکاروں کے فائدے کے لیے از سرِ نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی تینتیس لاکھ کے قریب ہے ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں۔ گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لیے ایک افسر مقرر ہے ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبہ کا تناسب ۱۲½ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی

طلبہ کا تناسب ۸۰ فیصد ہے۔

سب پرستنز ادیہ کہ فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمران کے تمام اختیارات غصب کر لئے ہیں اور اس غریب کی برتری کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو اگرچہ وہاں وزیر مقرر کر دئے گئے ہیں تاہم احکام نافذ کرنے کا پورا اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہلِ تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوت و حرکت پیدا ہوگئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دورِ حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی وہ بیدار ہوئے آزادی کے لئے جد و جہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں اب تک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

اہلِ تونیسیہ کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائلِ ملک پر قبضہ کر رکھا ہے، ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کوتاہ اندیشانہ استعمال۔ قوم پرست لیڈر پے در پے یا تو جیلوں میں ٹھونس دئے گئے یا جلاوطنی پر مجبور ہو گئے۔ اور یہ تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض جلاوطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک بجا ترقی کرتی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہلِ تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے۔ جریدہ اکانومسٹ (ECONOMIST) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے افسروں اور چھوٹے چھوٹے آبادکاروں کی تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے۔ بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت "نو دستور" کے ساتھ ہو گئے۔ بعض نے آبادکاروں کی پشتی بانی اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ ہر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہلِ تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک طرف نو دستور پارٹی حد درجہ مایوس ہوگئی۔ اور اس نے آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام کمر باندھ کر تیار ہو گئے۔ اس طرح وسیع پیمانے پر کش مکش کا اکھاڑہ قائم ہو گیا۔ قریباً ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دئے گئے فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں محاصرے کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورتِ حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے لیل و نہار گذر چکے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز تھا نہ اسے انصاف و آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں پھر جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدۂ مذکور منظر ہے:-

"جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر

کردی گئی تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی۔ (ایک تونسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر) لیکن ان کونسلوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ لوکل گورنمنٹ برائے نام تونسیوں کے حوالے کردی گئی تھی۔ عملاً پورا اقتدار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا حکمران تونیسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی ضروری تھے۔ سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں کے ہاتھ میں عام ملکی اختیارات تھے وہ بلدی اور دیہاتی اداروں کے بھی نگرانِ اعلےٰ تھے۔"

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں، ۱۹۴۹ء کے واقعات نے دو اہم نتیجے پیدا کئے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت اصلاح دشمن عناصر کی مخالفت کے باوجود نئے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کردی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہلِ تونیسیہ کی حمایت حاصل کی جائے اوّل فوراً وزارت از سرِ نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کردی جائیں تاکہ اہلِ تونیسیہ بھی مقررہ تعداد میں لئے جا سکیں اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ رہے۔ جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے تھے۔ سوم بلدیاتی خود مختاری جاری کردی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونسیوں اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ اور اس کی صدارت تونیسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونیسی ارکان مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گذاری پر راضی ہوگئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تونیسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے کئی تبدیلیاں کرلیں۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی۔ کہ وزارت جو فیصلے کرے گی انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توثیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سوا سب اس صورتِ حال پر خوش تھے پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے "ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل و اساس یہ ہے کہ نو دستور پارٹی نیز تونیسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیئے۔"

وزیراعظم تونیسیہ نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مداخلت ہوتی ہے۔ ..... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونیسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے تونیسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی روش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت و شنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تونیسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیئے گئے خاص سیاسی نقطۂ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے قرضوں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے مخلوط مندوبین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔"

۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیراعظم نے پھر ایک چٹھی ریذیڈنٹ جنرل کے نام لکھی جس میں ان تمام کارروائیوں کی قلعی کھولی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے وفدوں کے روبرو پیش کئے

گئے۔ دباؤ کی کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ مثلاً پیرس تار بھیجے گئے، مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی حکام رہے تھے انہوں نے معاندانہ شعار بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان نازیبا اشاروں کا ذکر نہ کروں گا جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا ہے نہ ان فروگذاشتوں کو یاد دلاؤں گا جنہیں میں سراسر غیر ارادی سمجھنے کیلئے تیار ہوں ـــــ البتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف ضرور منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہلِ تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیش عداوت اور تونیسیہ میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں، تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے، سمجھوتے کے امکانات موجود ہیں دیانت دارانہ اور خیر خواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ خیر سگال لوگ جن پر وزارت مشتمل ہے مایوسیوں اور دور باشیوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی اور انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔"

دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے کاملاً کچل کر رکھ دی جن کی غرضیں تونیسیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو کس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہلِ تونیسیہ کی خود مختاری بحال کرنے کے لئے حکومت فرانس سے گفت و شنید کرے، اسے غلط طریق پر محروم اختیارات کر دیا گیا، فرانسیسی آبادکاروں کی سازشوں اور جا بے جا مداخلتوں نے وزارت کو بے اصل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل ذلت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و نومیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخری حصے میں عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو از سرِ نو عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیرِ خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا ہر آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں بلدی اصلاحات کی ضرورت کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لئے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا۔ تونیسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اس جواب نے اہلِ تونیسیہ کو حد درجہ مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں ایم رابرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے کہا کہ "فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں کے لئے ہمارا نصب العین آزادی ہے۔" اس سے اہلِ تونیسیہ کے دل مسحور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی۔ "حکومت فرانس، موجودہ ادارے (گرانڈ کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں لیکن اس کے نزدیک ہزہائی نس بے کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجراء کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔"

اس ہمت شکنی اور مایوسی سے اہلِ تونیسیہ کو جو صدمہ ہوا، اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیر اعظم نے حالات کی اس اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدر فرانس کو لکھا۔

"تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت تونیسیہ نہ صرف ان مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ بے اور اہلِ تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ لیکن ان مفادات کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جن کے تحت اہلِ فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور نمائندہ اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے ..... جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری پوری وضاحت

کردینا ضروری ہے۔ کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس کا اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں، اور جس کے اندراجات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیر عنوان "قرضہ تونیسیہ" کئے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ قدرتی ذخائر، نقل و حمل کے وسائل اور بجلی وغیرہ کی تیاری کے لئے مراعات ہیں۔ ایسے مفادات میں تونیسیوں کا حصہ عملی طور پر صفر کے برابر ہے۔ جناب صدر! صاف گوئی سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اہل تونیسیہ پر فرانس کے احسانات کا تو بے انتہا چرچا کیا جاتا ہے لیکن تونیسیہ نے آڑے وقت میں فرانس کی جو مدد کی اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے...... کیا یہ سب کچھ بھلا دیا گیا ہے؟ کیا تونیسیہ کو واقعی فرانس کا ہمیشہ کے لئے دست نگر تصور کر لیا گیا ہے؟"

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا کسے علم نہیں؟ تونیسیہ کے ہر دل عزیز محب وطن رہنما حبیب بورقیبہ (HABIB BOURQUIBA) اور دوسرے قومی لیڈر جنہیں تونیسیہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ۱۳ر جنوری کو گرفتار کر لئے گئے فسادات رونما ہوئے گولیاں برسائی گئیں، جان و مال کا نقصان ہوا، ہزاروں تونیسیوں کو اور انجام کار تمام تونیسی وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے کہ کشمکش کے گذشتہ تین مہینوں میں دونوں طرف جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جاسکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے اس افسانوی کردار کے آئینے میں جانچئے جس نے ایک مظلوم کا گلا صرف اس جرم کی پاداش میں شدت کے ساتھ دبایا کہ دم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونیسیہ کی صورت حال کو محض ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے ہمارے دلوں میں اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس نے تونیسیہ کے ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے؟

تونیسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ بہت اضطراب انگیز ہیں۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تونیسیہ کی کابینہ" کے زیر عنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ "۱۲ر اپریل کو تونیسیہ میں نئی کابینہ قائم ہو گئی" لکھتا ہے:-

"اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اختیار حاصل نہیں۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب قریب ہی قرطاجنہ میں منائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے زیر حمایت علاقے تونیسیہ کے برائے نام حکمران بے کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل جین ڈی ہاٹ کلوک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارت خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ تونیسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی

فوج ملک پر حکومت کر رہی ہے۔ جن خطوں میں خالصتاً عرب آباد ہیں وہ اس وقت محصوری کی حالت میں ہیں..... ہفتاد سالہ بے سدی محمد الامین پاشا پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مسٹر باکوش ـــ (MR. BACCOUCHE) کو بحیثیت وزیر اعظم قبول کر لیں۔ باوثوق عرب ذرائع کا کہنا ہے، کہ تیس لاکھ تونسیوں کی غالب اکثریت اور خود بے کے بارہ بیٹے اس جھک جانے پر برافروختہ ہو گئے ہیں پیرس کے بیشتر اخباروں نے بھی باکوش کی موجودہ حکومت کو کٹھ پتلیوں کی کابینہ قرار دینے میں تامل نہیں کیا اور فرانس نے تونیسیہ کی جدوجہد آزادی کو جس انداز میں نمٹانے کی کوشش کی اس پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس پھر ایک مرتبہ اصل کی جگہ ظل کو لانے کی خواہاں ہے بارہا دہرائی ہوئی استعماری صورت حالات کو از سر نو دہرانا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذبات خود مختاری کو دبا کر ایک موہوم اور شعبدہ کارانہ سکون پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ یہ استعماری طاقت کی کوتاہ اندیشانہ پالیسی کے لئے سازگار نظر آئے۔ استعماری طاقت کے لئے دانش مندی کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا کرے۔ محکوم قوم کے ان جذبات کے احترام میں متامل نہ ہو جنہیں دوسرے مقامات پر شاندار اور جواں مردانہ حب وطن کا مظہر سمجھا جائے گا۔

ایک مشہور امریکی رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے: "یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ افریقہ سے دست کشی کے مسائل اولاً اور عموماً فرانس کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو اوقیانوسی طاقتوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ اب برطانیہ اپنی نصف سلطنت ختم کر چکا ہے" اور مقالہ نگار کے قول کے مطابق "فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بنا ہوا ہے اس نے آٹھ کروڑ افراد کو محکوم بنا رکھا ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اتنے بڑے خطے میں آباد ہیں جو رقبہ میں ریاست ہائے متحدہ سے ڈیڑھ گنا ہے..... فرانس کے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ افریقہ میں دانش مندی کی پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون کا نظام رائج کر دے اور مقصد یہ ہو کہ بہرحال وہ افریقہ سے دست کش ہو جائے گا۔ اس طرح فرانس تمام اوقیانوسی ممالک کے لئے ٹرسٹی کی حیثیت میں عمل پیرا ہوگا۔"

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لئے انجام کار اس سے زیادہ تر روش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نوآبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن دوست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہوگی۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا۔ اور فریقین میں ایسی خوشگوار یادیں باقی رہ جائیں گی جن سے دنیا میں امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں میرے وفد کے مقاصد یہ تھے:ـــ

۱۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تونیسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب مصیبتیں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تونیسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۲۔ افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات یہ منظر دیکھ کر برانگیختہ ہو رہے ہیں کہ ایک کمزور، بے یار و مددگار اور شریف قوم اور ایک حد درجہ قوی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جدوجہد جاری ہے وہ یورپی طاقت بدرجہا زیادہ قوی ہے اور دوسری قوم کے زاد بوم پر قبضہ و تصرف کے لئے آج کوئی اخلاقی وجہ جواز پیش نہیں جا سکتی۔ باشندگانِ افریقہ و ایشیا کے جذبات کی برانگیختگی کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو مخلصانہ احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے :۔ "بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان علائق کو مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندہ فرانس کے صبر و تحمل پر زیادہ بار ڈالا ہے تو میں بصمیم قلب عذر خواہ ہوں۔

ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ سفیر احمد شاہ بخاری کی اس افتتاحی تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو انہوں نے برناڈر کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پچیسویں اجلاس میں ۷ را پریل ۱۹۵۲ کو فرمائی :-

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے رئیس تدریسیات میک انٹاش[1]، پروفیسر پیرڈون[2]، مسٹر ولیم ہنڈرسن[3] اور مس روتھ شکٹر[4] کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے طفیل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لحظہ کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ اجتماع جس نے اپنے لئے "ماڈل اسمبلی" کا نام تجویز کیا ہے اپنا نظام اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی۔ جو دریائے ایسٹ پر مختصر سی جگہ واقع ہے یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کر لی گئی ہے کہ وہ تدریجاً اپنے طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنالے گی۔ آپ یقین مانیں کہ ہم لوگ جو اقوام متحدہ میں ہیں اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب ہے اپنے طرز عمل اور طریق کار کو آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ اس یقین کیساتھ کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سنوارلے گا اور آخرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو "مباحثے" کریں گے ان کا انداز کیا ہوگا لیکن اگر انہیں اسی مثال پر قائم رہنا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو پھر میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلاف رائے سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو شکست کے کنارے لڑکھڑاتا ہوا بھی پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے ؛

اختلافات کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن میں ایک ملنے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان میں سے پہلے اختلاف کی توضیح بالکل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی تانیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بار ہا ٹوٹی ہیں۔ اور جس کے نعرے اس مجلس میں بار ہا بلند ہوئے ہیں۔ اسے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

---

[1] MACINTOSH, [2] PEARDON, [3] MR WILLIAM HENDERSON, [4] MISS RUTH SCHACTER

میرے نوجوان امریکی سامعین کو تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ آویزش کیا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی امریکی نوجوان، مرد یا عورت، اس کش مکش کے مالہ و ماعلیہ سے آگاہ نہیں اور اپنی رائے پر ثابت قدمی سے قائم نہیں رہ سکتا تو اور کس سے ایسی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

لہٰذا میں دوسرے اختلاف کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اقوام متحدہ میں روز بروز نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں اور اس کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر یہ جمہوری طریق کار کے دائرے کے اندر رہے تو اس کے سنے تضحیک کا باعث بننے کے بجائے انجام کار تقویت و استحکام کا موجب بنے گا۔

آپ نے انسانوں کے ایک ایسے گروہ کا حال اکثر سنا ہوگا۔ جسے اخبارات اپنی شہ سرخیوں میں "عرب ایشیائی بلاک" کہتے ہیں۔ اس کے لئے "بلاک" کا لفظ یقیناً اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختصر ہے اور اخبار کی ایک کالمی سرخی میں کھپ جاتا ہے ورنہ ایسے لفظ "بلاک" کے مفہوم میں کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں۔ نہ یہ کسی خاص قسم کا سیاسی گروپ ہے۔ یہ چند ایسے مفادات کا ایک عام سا اجتماع ہے جو بعض قوموں میں ماضی کی تاریخ اور روایات کے باعث مشترک ہیں۔ میں خود ایک ایشیائی ملک کا نمائندہ ہوں اسی لئے شاید آپ کو کچھ بتا سکوں گا کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اور انہیں رفع کرنے کی تدبیر کیا ہے؟

یہ اختلافات دو فریقوں میں ہیں۔ ایک فریق تو وہ ہے جسے عام طور پر مغربی یورپی اقوام کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا فریق یہی مشرقی اقوام ہیں۔ یہ لوگ آپس میں کس نقطۂ نگاہ پر متحد ہوئے اور ان میں قدر مشترک کیا ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ میں نے نقطۂ نگاہ کہا ہے؟ میرے لئے آسان تھا کہ میں فرسودہ محاورہ بندی کا لعنت استعمال کرکے اسے نظریہ یا تصور کا نام دیتا۔ آج کل نظریہ یا تصور کا لفظ نہایت مسرفانہ طریق پر جا و بے جا استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی یورپی قوموں کے اس گروہ میں جو بحر اوقیانوس کے کنارے آباد ہیں۔ تین چار اختلافات تو انداز فکر و نگاہ ہی کے ہیں ——— میں عقائد نہیں کہتا اور نظریہ کا لفظ تو ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

ان میں پہلا اختلاف دنیا کے نسلی مسائل کی جذباتی تعبیر کے متعلق تھا ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم یا ان میں سے اکثر و بیشتر اقوام ماضی میں شدید نسلی امتیازات کا شکار رہی ہیں۔ اور بعض اب بھی اسی امتیاز کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ان بے انصافیوں کو ہمیشہ کے لئے فراموش نہیں کر سکتیں جو نسلی امتیاز کا عقیدہ رکھنے والوں سے سرزد ہوں اور ان کے جذبات مشتعل کرنے کا سبب بنیں تو آپ انہیں قابل عفو سمجھیں۔ وہ نسلی امتیاز کے اس احساس کی علامات جہاں کہیں بھی دیکھیں گی۔ شدید مخالفت کریں گی آپ از راہ کرم میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھیں۔ میری مراد ان چھوٹے موٹے حادثات سے نہیں جو آپ کے ملک یا میرے ملک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میں اکا دکا انفرادی واقعات کی جانب قطعاً اشارہ نہیں کر رہا۔ وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب کوئی ملک سینہ تان کر یہ دعوے کر سکے گا کہ اس کے حدود میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ میں اس نسلی امتیاز کا ذکر کر رہا ہوں جو وسیع بین الاقوامی پیمانے پر کیا جا سکتا ہے اور جو نہ صرف وقار انسانی کے منافی ہے بلکہ امن عامہ کے لئے بھی خطرے کا باعث ہے۔ آپ نے اخباروں میں کئی ملکوں کی خبریں پڑھی ہوں گی۔ جہاں نسلی امتیازات کے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے واقعات افریقی ملکوں میں بھی رونما ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی۔ مجھے مغربی یورپ یا اوقیانوسی ممالک کا کوئی ایسا نمائندہ نہیں ملا جس کے خیالات ویسے ہی نہ ہوں جیسے ہمارے ہیں البتہ فرق ہے تو صرف صورت حال کے جذباتی رد عمل کا ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقوام کے اس گروہ کے حساسات بڑے شدید ہیں اسے عام طور پر استعمار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ گروہ اقوام دنیا کی نصف سے زائد آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا پڑتی تھی اور لوگ اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہ ہوتے تھے جب تک اعداد و شمار کی دستاویزیں دیکھ کر اپنا اطمینان نہ کر لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آج دنیا

اتنی ناواقفیت نہیں کہ اس سادہ سی حقیقت کا اندازہ نہ کر سکے یعنی یہ کہ دنیا کے نصف سے زیادہ نفوس ایشیا میں رہتے ہیں۔ اور اگر انسان ہونے کی کیفیت و حیثیت کے اعتبار سے نہیں تو کم از کم مقدار و عدد کے اعتبار سے وہ بہت وزن رکھتے ہیں۔ ان کے احساسات بھاری تعداد کے مطابق المضاعف ہو کر عالمی حیثیت میں بڑی اہمیت و قوت رکھنے والا عامل بن جاتے ہیں۔ متعدد ممالک ایسے ہیں جو قریب تر ماضی میں استعماری اقتدار کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کمرے میں بیٹھنے والے سب کو نہیں، تو آپ میں سے بہتوں کو خدا نے استعماری نظامِ حکومت کا مزہ چکھنے سے بچا لیا ہے۔ ایک وقت تھا جب آپ کے آباؤ اجداد اپنے آپ کو انگلستان کا محکوم اور اس کی نوآبادی سمجھتے تھے۔ ان کے سینوں میں اس کے خلاف طوفان اٹھتے تھے لیکن ایک نسل پر دوسری نسل کے غلبے و اقتدار سے پیدا ہونے والے بعض مکروہ پہلو ایسے ہیں جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ یہ قیاس تو آپ آسانی سے کر سکتے ہیں کہ جب کبھی استعمار کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس گروپ کے جذبات بے انتہا شدید ہوتے ہیں۔ استعمار ـــــ ہم نے تو اسے نہایت قریب سے دیکھا ہے ـــــ دوہری لعنت ہے یہ اس کے لئے بھی لعنت ہے جو حاکم و مقتدر بنتا ہے اور اس کے بھی جسے غلام و محکوم بنایا جاتا ہے۔ استعمار میں مقتدر وجود مادی فائدے تو اٹھاتا ہی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ساتھ ہی انسانی فطرت کو اس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد انسانیت کا وقار خاک میں مل جاتا ہے اور استعمار زدہ لوگ اس نوع میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتے جس کے افراد ہونے کے وہ دعوے رکھتے ہیں۔ استعمار محکوموں اور حاکموں دونوں کی نفسیات برباد کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ہر استعماری حکمران، بشرطیکہ وہ روشن دماغ ہو محسوس کرے گا کہ یہ کیفیت اسے شعوری طور پر فائدہ پہنچانے کی بجائے لاشعوری طور پر بے طرح نقصان پہنچا رہی ہے یہی مسائل ہیں جن پر آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ استعمار زدہ ملکوں کی بھاری تعداد کسی صورتِ حال کے شدید جذباتی ردِ عمل کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے دوسرے لوگوں کے لئے بسا اوقات اس کا سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ ممالک دنیا کے غریب ترین باشندوں کے نمائندے ہیں۔ میں نے اپنے امریکی دوستوں سے غربت و افلاس کے بارے میں بارہا گفتگو کی ہے وہ اس کے معنی تو جانتے ہیں لیکن ان کے لئے اس حالت کا تصور دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے جس کے لیے یہ لفظ وضع کیا گیا تھا وجہ یہ ہے کہ معیشت کے معیار مختلف ہیں۔ امریکہ میں جس شخص کو مفلس کہا جاتا ہے ہمارے بہت سے ملکوں میں ایسے آدمی کو خاصا خوش حال قرار دیا جاتا ہے امریکی دوستوں کو یہ سمجھانا بے حد مشکل ہے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں آدمی کی سالانہ آمدنی سالہا سال تک پچاس ڈالر سے زائد نہیں ہوتی۔ انہیں یہ یقین دلانا دشوار ہے کہ بعض ملک ایسے بھی ہیں جہاں انسان کا اوسط عمر ۲۷ سال سے زیادہ نہیں اور خواندگی کا تناسب صرف پانچ سے دس فی صد تک ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ یہ غریب ممالک بین الاقوامی تبدیلی احوال کے باعث اچانک اپنے آپ کو عالمی سٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ان سے کہا جاتا ہے کہ عالمی برادری کے فرد کی حیثیت سے دوسروں کے برابر ذمہ داریاں اٹھائیں۔ یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ایسی ذمہ داریاں قبول کریں اس میں کوتاہی ان کے لئے انتہائی شرم و ندامت کا باعث ہو گی لیکن انہیں جو وسائل میسر ہیں ان کے ساتھ وہ عالمی کوائف سے عہدہ برآ ہونے میں اس اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکتے جو ان کے بعض ترقی یافتہ رفیق ملک پیش کر سکتے ہیں۔ یہ ممالک کہتے ہیں کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کر کے دنیا سے شدید اقتصادی نامساوات دور کی جائے۔

ایک وقت تھا ـــــ اور تاریخ کا کوئی طالب علم ہی اس کی تاریخ بتا سکے گا ـــــ جب ہر ملک اور ہر قوم کے زیادہ آمدنی والے لوگ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ مفلس اور بے روزگار لوگوں کی امداد کے لئے زیادہ آمدنی والوں سے بھاری ٹیکس کیوں وصول کئے جائیں۔ یہ لوگ بھاری ٹیکس کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ غریبوں اور بے روزگاروں کو اپنے برابر رائے دہی کا حق دینے کے مخالف تھے۔ اس دور میں اسی قسم کے مسائل حقیقی اور واقعی طور پر درپیش تھے اور اصلاح کے علمبرداروں کو یہ سعی اور اقتصادی انصاف کے اصول کا پرچار کر کے عوام کو ترغیب دینی پڑتی تھی۔

کردہ ان اصولوں کو مان لیں۔ آج ہمیں ایسا نہیں کرنا پڑتا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیر لوگوں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس کیوں وصول کرنا چاہئے؟ گویا یہ باتیں تسلیم کر لی گئی ہیں اور معاشرے کا ہر فرد اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے، تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوئی۔ آج اگر برادری کا کوئی رکن پس ماندہ ہے، ناخواندہ ہے، بیماریوں کا مارا ہوا ہے، افلاس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے تو کم و بیش یہی تصور کر لیا جاتا ہے کہ اسے یہ امداد خیرات کے طور پر دی جائے یہ وہی جذبہ ہے جو اب سے ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں کارفرما تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے۔ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے، ہم اسے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ "ہر شخص سے اس کے مقدور کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے"۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو ملتی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط و قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد و مدعا کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفسِ مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ وہی تھے اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی حرفتیں دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر ہو، تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے، دوسری طرف ہمیں جو امداد باہر سے ——— مثال کے طور پر اقوام متحدہ ہی کہہ لیجئے ——— ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق کہے گی۔

لہٰذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہیے۔ جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے جا چکے ہیں اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گذر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے۔ یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان بنیادی اصول پر کامل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزاد فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جد و جہد نہ کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم نہ کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد

پر استوار کر رہے ہیں۔ آپ کا ملک بڑا وسیع ہے، آپ پسند کریں یا نہ کریں پھر بھی دنیا کے متعلق آپ کی ذمہ داریاں بھاری ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے تہذیب و تمدن کے مستقبل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو کس درجہ خوش دلی سے قبول کرتے ہیں؟

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہیے کیونکہ مجھے معلوم ہے اس اجلاس کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں نیز میں آپ کے لئے ناصح مشفق بننے کا بھی خواہاں نہیں جیسا کہ میں نے کہا۔ میں آپ کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ کی سرگرمیاں ہمارے لئے محرک ثابت ہوں گی آپ میں صرف ایک وفد ایسا ہے جسے میں کچھ نصیحتیں کرنے کی جرات کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے میں اس وفد کو مشورہ دوں گا کہ وہ ہمیشہ یہ حقیقت پیش نظر رکھے وہ ایسے پس ماندہ ملک کا نمائندہ ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کئے ابھی صرف چار ہی سال گذرے ہیں۔ اسے اپنے آپ کو کسی بڑی طاقت کا نمائندہ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ ایسا نہیں ہے البتہ اسے کوشش کرنی چاہئے کہ عالمی مشکلات کے بہترین حل میں اپنا فرض انتہائی خلوص سے بہترین طریق پر ادا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت بین الاقوامی معاشرے کے مفاد کو اپنے ملک کے نسبتاً محدود مفاد کے تابع کرنے کی ترغیب اس کے سامنے آ جائے۔ ایسے موقعے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے اس قسم کی ذہنی کش مکش طبعی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مجھے امید ہے کہ ایسی کش مکش کے موقع پر انجام کار بین الاقوامی معاشرے کی بہبود کو ضرور ترجیح دیں گے۔

پاکستان کے وفد کے لئے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو تو ضرور کہیں، لیکن جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیں۔

تقریروں کے اردو ترجمے کے لئے ادارہ
مولانا غلام رسول مہر کا شکر گزار ہے

پیغامات

خلیفہ عبدالحکیم

کل شام ریڈیو پر یہ المناک خبر سنی کہ میرے حبیب قدیم احمد شاہ بخاری اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انشا کا یہ شعر زبان پر جاری ہوگیا ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ایسے باکمال یگانۂ روزگار کی موت ایک قومی حادثہ ہوتا ہے۔ جسے کم و بیش ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ لیکن احباب و اقربا کے دل پر جو چوٹ لگتی ہے۔ اس کا صدمہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔

احمد شاہ مرحوم کے ادبی ذوق میں کمال درجے کی وسعت اور ہمہ گیری تھی۔ ایک طرف انگریزی لٹریچر کی مستند کتابیں پڑھتے تھے تو دوسری طرف فسانۂ آزاد اور طلسم ہوشربا میں بھی غرق ہوجاتے تھے۔ انگریزی میں کمال پیدا کرنے کے باوجود وہ انگریزی زدہ نہ تھے۔ اردو اور فارسی کی نظم و نثر کا ذوق مغربی ادبیات کے دوش بدوش ترقی کرتا رہا۔ محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ آئندہ ہماری قوم میں ادبیات کی ترقی فقط ایسے ادیبوں کی بدولت ہوگی جن کے ہاتھوں میں شرق و غرب دونوں کی کنجیاں ہوں گی ـــــ بخاری مرحوم جب انگریزی لکھتے یا بولتے تھے تو انگریز اہل زبان سے خراجِ تحسین وصول کرتے تھے اور جب اردو میں کوئی مضمون لکھتے تھے تو ان میں اردو کے باکمال ادیبوں کا انداز پایا جاتا تھا۔ ادبیات کے علاوہ دیگر تمام فنونِ لطیفہ سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی۔ طالب علمی کا زمانہ ہو یا استادی کا دور، ان کی مخصوص شخصیت دوسروں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ کاش کہ وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرکے اپنی طبیعت کے مخصوص جوہر کو اجاگر کرتے۔

مرزا غالب کی نسبت حالی نے لکھا ہے کہ ان کو حیوان ناطق کہنے کی بجائے حیوان ظریف کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخاری بھی اسی انداز کا شخص تھا گفتگو علمی ہو یا ادبی یا سیاسی یا معاشرت پر تنقید ان کے منہ سے جو بات نکلتی تھی وہ ظرافت کی چاشنی کے بغیر نہ ہوتی تھی۔ اسی خصوصیت نے ان کو بزم آرا بنایا تھا۔ جب کبھی وہ کسی محفل میں آ بیٹھتے تو وہاں ظرافت کا دربار لگ جاتا۔ ایسے ذہین و فطین اور ہمہ گیر صلاحیتوں والے انسان فطرت کبھی کبھی پیدا کرتی ہے۔ احمد شاہ بخاری زندہ دل بھی تھا، اور روشن دماغ بھی۔ ایسے چراغ جب بجھ جائیں تو زندگی ظلمت کدہ بن جاتی ہے ؎

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

حفیظ جالندھری

احمد شاہ بخاری کا انتقال ہوگیا ہے۔ بخاری سے میرا بھی یارانہ تھا۔ میں بائیس برس کا تھا جب ۱۹۲۲ء میں لاہور آیا تو میری شناسائی پطرس بخاری سے ہوئی، پہلی ہی ملاقات "من تن شدم تو جاں شدی" بن گئی۔ عبدالمجید سالک، جگل کشور مہرا (اب احمد سلمان) شیخ عبداللطیف تپش، سید امتیاز علی تاج۔ تقریباً ہر سہ پہر تاج صاحب کی بیٹھک میں بیٹھتے۔ کبھی کبھی ایک ہوٹل میں جمتی۔ مچھلی کے شکار کو بھی جاتے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر بخاری ولایت چلا گیا۔ محفلیں سونی پڑ گئیں۔ بکھری ہوئی شگفتگی پھر گلدستہ بن گئی۔ اب تاثیر اور مجید ملک اور پنڈت ہری چند اختر بھی اس بزمِ احباب میں شامل ہو گئے، اور سب نیاز مندانِ لاہور کہلائے۔ لیکن اس انجمن کی شمع پطرس بخاری ہی کی ذات تھی۔

شعر و سخن، ادب و فن اور نقد و نظر کے ایسے ایسے نکات اور لطائف و ظرائف بخاری کی زبان سے ظہور میں آتے جو ہم سب کے لئے بصیرت بنتے۔

پھر وہ ریڈیو کا مہتمم اعلیٰ بن کر دلی چلا گیا ـــــ کچھ مدت بعد میں، مجید ملک، تاثیر، ہری چند اختر، فیض اور حسرت بھی دلی ہی میں جمع ہو گئے ـــــ بیشتر بخاری ہی کے ہاں۔ کبھی کبھی میرے ہاں میلہ لگتا۔ سالک صاحب لاہور سے آجاتے، یا جناب چغتائی اور صوفی تبسم بھی قدم رنجہ فرماتے اور ہم مل بیٹھے۔ پاکستان بننے کے بعد بخاری برائے کار و پیکارِ وطن دنیا کی سب سے بڑی انجمن میں شامل ہوگیا۔ دوستی کی محفل بے چراغ ہوگئی۔ امید تھی وہ آجائے گا اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آجاؤں گا۔ اور رہے سہے حواس پھر جمع ہو جائیں گے لیکن آج اس کی سنائی سن لی ہے جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ؂

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

لیکن اس سے میرا رشتہ آسانی کے ساتھ ٹوٹنے والا نہیں۔ جہاں تپش، حسرت، تاثیر، ہری چند اختر ہیں۔ بخاری وہاں پہنچ گیا ہے ـــــ اور میں بھی جلد اسے وہیں پالوں گا۔

خواجہ منظور حسین، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی وفات پر ان کے پرانے کالج کے سوا کسی ادارے کو بھی، جس سے ان کا تعلق رہا، سوگوار ہونے کی اتنی وجہ نہیں کیونکہ ہمارے رفقا کار میں سے کسی نے ان سے زیادہ نہ اس کالج سے کچھ حاصل کیا نہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے اس جگہ اور کیمرج میں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ مسرت بخش اور فیض رساں سال بسر کئے۔ یہی وہ درس گاہ ہے جہاں ان کی شخصیت نے پہلے پہل چکا چوند کر دینے والے اوصاف دریافت کئے اور ان عطیات کو استعمال میں لانے پر خوشی کے شادیانے بجائے یہیں سے ان کی اثر آفرینیوں نے دور و نزدیک کمندیں پھینکیں اور تہذیب و شائستگی پھیلانے کی سر توڑ کوشش کیں۔ وہ ایک ممتاز اور متبحر عالم تھے جو مشرق و مغرب کی حیات پرور ادب کے نشوں سے سرشار تھے۔ ایک جوش آفریں استاد کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ تراشیدہ لطائف اور درخشاں فصاحت رکھنے والے ادیب اور مقرر تھے۔ بات بات میں نکتے پیدا کرنے اور کٹار کی طرح تیز کاٹ رکھنے والی ظرافت کے مالک تھے۔ انہوں نے جس چیز کو چھوا، اس کی ہیئت بدل دی اور جس سے ملے اس کی رفتار تیز تر کر دی۔ تحقیق و تجسس کا شوق

انہیں نئی نئی گذرگاہوں میں لے گیا۔ تازہ بتازہ قوت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کئی رود بار عبور کئے۔ گوناگوں اور بوقلموں پھولوں سے دامن بھر کے لٹایا، زمینوں کو سیراب کیا۔ دریاؤں میں طغیانی پیدا کی یہاں تک کہ وہ کناروں سے اچھل پڑے۔ بزم ادب یا تمثیلات کی مجالس میں وہی جانِ محفل تھے وہ اپنے ہم ذوق لوگوں کی صحبت میں تکلفات کا نقاب اتار کر کھل کھیلتے تھے خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے ان کی بے پناہ شگفتگی کا نظارہ ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ وہ عہد آفریں تھے۔ ان کے ہمعصر اپنی ترقی پسندی، روشن خیالی، ذہنی ارتقاء اور بے پایاں حرکی قوت کے لئے بخاری ہی کے مرہون منت ہیں۔ (ترجمہ)

سیّد عابد علی عابدؔ

پروفیسر احمد شاہ بخاری کے رخصت ہو جانے سے بہت سی چیزیں ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ رفاقت، دوستی اور مروّت کی وہ اعلیٰ اقدار رخصت ہو گئیں جو مشرقی اور مغربی وضعداری کے نہایت بانکے امتزاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اسلوب تحریر رخصت ہو گیا جس میں مختلف زبانوں کی جوہری لطافتیں اس طرح جھلکتی تھیں جیسے شفق کے رنگ کی موجیں۔ ان کے ساتھ ادیبانہ خطابت، خطیبانہ ادبیت، متین ظرافت اور ظریفانہ متانت یوں رخصت ہو گئیں کہ یہ شعور ہوتا ہے جیسے اب کبھی لوٹ کے نہ آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ادیبوں انشاپردازوں اور سخن فہموں کی ایک مخصوص جماعت کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ ان کے جانے کے بعد اگرچہ اس جماعت کے گنتی کے کچھ افراد باقی ہیں۔ لیکن اس جماعت کی وہ تابندہ و درخشاں روح رخصت ہو گئی، جس کی جوت سے اس جماعت کے سارے افراد جیسے پڑے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔

شائستگی اور بخاری ایک دوسرے کو کچھ اس طرح لازم ہو گئے تھے کہ میں تو جب شائستگی کے متعلق کچھ سوچتا تھا تو بخاری کو اس کا نظام شمسی بنا کر سوچتا تھا۔ انہیں فطرت نے گوناگوں صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا کہ سائنس میں بصیرت رکھتے تھے۔ آرٹ کے رموز پر کاملاً مطلع تھے۔ ادبیات کے دلدادہ تھے اور حسنِ انتظام کی ہنستی بولتی چلتی پھرتی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ الحمدللہ کہ ان کی یہ تمام صلاحیتیں پاکستان کے کام آئیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مسئلے کے سلسلے میں ایسی گرہ پیدا ہو گئی ہے کہ سلجھائے نہیں سلجھتی اور بخاری سے جو رجوع کیا گیا ہے تو انہوں نے پہلے مسئلے کو چٹکیوں میں سلجھا دیا ہے اور پھر اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کام لے کر بات کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیا ہے۔

اردو ادبیات کے سلسلے میں ان کی تخلیقات گنتی کے چند مضامین اور منظومات پر مشتمل ہیں۔ لیکن ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے اور ہر مضمون پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ بخاری اس سے بہتر مضمون نہ لکھ سکیں گے۔ پھر بار بار یہ گمان غلط ثابت ہوتا ہے ہر دوسرا مضمون پہلے سے بڑھ کر خوب صورت ہوتا ہے۔

باقی اور اوصاف سے قطع نظر ان کے بانکپن کی یاد کون فراموش کر سکتا ہے کہ مرتے ہوئے ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہوئے مر رہے ہیں۔ شاید لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کو ان کی موت کے بعد معلوم ہوا ہو گا کہ ان کی بیماری کتنی خوفناک شدید اور طویل تھی اور وہ اپنے فرائض منصبی کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج تاثیر مرحوم کی موت کا داغ تازہ ہوا۔

ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے محفل آرا ناگہاں چپ ہو گئے

دوچار باتیں

۱۔ نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا۔ جو دیگر رسائل کے سالناموں سے زیادہ بہتر ہوگا۔ انشاءاللہ!

۲۔ عام نمبر کے بعد نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا انتخاب پیش کریگا جو بلاشبہ ایک کارنامہ ہوگا۔

۳۔ نقوش کا غزل نمبر کئی اہم اضافوں کے ساتھ جلد ہی مارکیٹ میں آجائیگا شاید نومبر تک۔

۴۔ افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر (دوم) منٹو نمبر اور طنز و مزاح نمبر مل سکتے ہیں مگر صرف لائبریریوں کو۔

۵۔ نقوش کے پرانے نمبروں میں یہ شمارے بھی مل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۵، ٦، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

٦۔ بعض دیگر نمبروں کے لئے ہماری ایجنسی طاہر نیوز ایجنسی نِکل روڈ کراچی کو لکھیں شاید چند ایک شمارے مل جائیں۔

۷۔ ادارہ نقوش ڈرامہ نمبر کے لئے بھی پَر تول رہا ہے۔ کچھ مشورے دیجئے، کچھ مواد کی فراہمی میں مدد کیجئے۔

۸۔ نقوش کے سابقہ کارناموں پر رائے اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کا موجب ہوں گے۔ کچھ لکھئے تو۔

(ادارہ)

Regd. L. No. 5312



نقوش پریس - اردو بازار لاہور